تاریخ آغاز تالیف

داستانِ تاریخ اُردو

نثر کے متعلق

ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اُردو زبان و ادب کے نشو و نما کی تاریخ، مصنفینِ نثر اُردو کے حالات اور تصنیفات کے نمونے

تاریخ اختتامِ تالیف ۔ بوستانِ تاریخ اُردو
۱۹۴۱ء

مؤلفہ
حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ

ناشر
لکشمی نرائن اگروال، تاجر کتب آگرہ

سنہ ۱۹۴۱ء
باہتمام خواجہ فراست حسین منیجر
آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ میں چھپی

بسم اللہ العلی العظیم

"بذکرِ خدا سے بیاں آفریں"

دیباچہ

اُردو کی خدمت "تذکرہ" نویسی کی صورت میں دو سو برس سے ہو رہی ہے۔ سب سے قدیم تین تذکرے ہیں جو ایک ہی سال (۱۱۶۵ھ) میں مرتب ہوئے یعنی "گلشن گفتار" (خواجہ خان حمید اورنگ آبادی)، "نکات الشعراء" (میر تقی) اور "تذکرہ ریختہ گویاں" (فتح علی گردیزی)۔ پھر اسی بارھویں صدی کے آخر تک تین تذکرے: "مخزن نکات" (قائم چاند پوری) ۱۱۶۸ھ میں، "چمنستان شعرا" (لچھمی نراین شفیق) ۱۱۷۵ھ میں اور "گلزار ابراہیم" (نواب علی ابراہیم خاں خلیل) ۱۱۹۸ھ میں لکھے گئے۔ اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری میں دہلی، دکن، گجرات وغیرہ مقامات پر آزاد کے "آب حیات" سے پہلے ایک درجن کے قریب تذکرے تالیف کیے گئے (یورپین مصنفوں کے لکھے ہوئے تذکرے ان پر مزید اضافہ ہیں)۔ لیکن یہ سب (مع آب حیات) شاعری اور شاعروں کے تذکرے تھے۔ کسی نے مصنفین نثر کی طرف توجہ نہ کی۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے اردو نثر اتنی اور ایسی نہ لکھی گئی تھی کہ مفصل و مسلسل تاریخ و تذکرہ کے قابل سمجھی جاتی، اور ایسے تذکرہ سے عام دلچسپی کی بھی امید مشکل تھی۔ لیکن آخر صدی تک تصانیف نثر اور انشا پردازی

نے اتنے مدارجِ ارتقا رطے کر لئے تھے کہ کسی تاریخ کا مرتب نہ ہونا اہلِ قلم کے "تغافلِ علمی" کا ثبوت تھا۔

اس طرف غالباً سب سے پہلے مولوی محمد یحییٰ تنہا (بی اے، ایل ایل بی، وکیل غازی آباد) کو توجہ ہوئی اور انھوں نے ۱۹۱۴ء میں "سیر المصنفین" کی پہلی جلد، اور ۱۹۲۴ء میں دوسری جلد شائع کی۔ دونوں میں مصنفوں کے حالات اور طرزِ تحریر کے ساتھ تصانیف کے نمونے بھی درج کئے۔ لیکن پہلی جلد میں اردو سے قدیم کو روا روی میں لکھا اور تشنہ چھوڑ دیا، اور دوسری جلد کے لئے صرف چوٹی کے سات آٹھ مشہور مصنفوں کو چُن لیا۔ اور سرشار و شرر پر کتاب کو ختم کر دیا۔ بہرحال تقدّم کی فضیلت میں وہ "تنہا" ہیں۔ تنہا سے پہلے کسی نے نثرِ اردو کا تذکرہ نہیں لکھا تھا۔

اس کے بعد اردو نثر و نظم دونوں کی یکجا تاریخیں متعدد لکھی گئیں، جن میں سب سے بڑی اور اچھی مسٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی تالیف، اور اس سے بڑا اور اچھا، اس کا اردو ترجمہ "تاریخ ادب اردو" (مترجمہ مرزا محمد عسکری بی اے لکھنوی) ہے۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر گراہم بیلی (پروفیسر اردو لندن یونیورسٹی) نے انگریزی میں مختصر تاریخ ادب اردو مرتب کی۔ (اس کا تذکرہ "داستانِ تاریخ اردو" میں آچکا ہے)۔ پروفیسر اعجاز حسین (الہ آباد یونیورسٹی) کی تالیف مختصر تاریخوں میں بہتر ہے۔

لیکن یہ سب صرف زبان و ادب کی تاریخیں اور مصنفوں کے حالات ہیں — تصانیف و تحریرات کے نمونے کسی میں نہیں۔ گویا "زبانی باتیں" ہیں۔ اس کمی کو ایک فاضل بزرگ مولانا احسن مارہروی مرحوم (متوفی ۱۹۴۰ء) نے ایک اور صورت سے پورا کیا۔ یعنی "نمونۂ منثورات" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی جس میں نثرِ اردو کے مصنف اور نمونۂ تحریر ہیں، مثلاً تصنیف و تالیف، تقریظ، عدالتی تحریر، اخبار، خطوط وغیرہ۔ چونکہ یہ نمونے صدی وار مرتب کئے ہیں، اس لئے گویا "تاریخ نثرِ اردو"

بھی ہے اور اپنی نوع کی منفرد تالیف ہے۔ ان دو کے درمیان میں مولوی سید محمد ایم اے حیدر آبادی نے "فورٹ ولیم کالج" کے مصنفوں کے حالات اور نمونے "ارباب نثر اردو" کے نام سے مرتب کئے، اور حق یہ ہے کہ تاریخ اردو کے اس دَور کا حق ادا کر دیا۔ ان کے علاوہ کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں ہے جس میں تاریخ کے ساتھ نمونے بھی ہوں۔

کسی مُصنف کے طرز تحریر، اور اس کے تجزیہ و خصوصیات کا بیان تشنہ رہتا ہے جب تک ہر قسم کی تحریر کے نمونے اور مثالیں پیش نظر نہ ہوں، اور ان کا تبصرہ و انتقاد مطالعہ کی رہنمائی کرنے کے لئے ساتھ نہ ہو۔ میں اس ضرورت کو ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا۔ جس وقت میں نے مرزا محمد عسکری صاحب کا ترجمہ دیکھا جو حُسنِ ظاہر میں بھی مطبع نو لکشور کی شائستگی کا دلفریب نمونہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ مرزا صاحب نے جہاں اتنی محنت کی کہ ۹۰۰ صفحہ کا ترجمہ تیار کر دیا اتنی زحمت اور گوارا فرماتے کہ ہر مصنفؔ شاعر کے جملہ تصنیفات و کلام کے نمونے بھی اضافہ کر دیتے۔ کتاب دو ہزار، تین ہزار صفحے کی ہو جاتی، اور اچھا ہوتا، مرزا صاحب اس کے اہل تھے، اور مطبع نو لکشور کے لئے پانچ ہزار صفحے شائع کر دینا بھی کوئی بات نہ تھی۔

بہر حال میں نے "**داستانِ تاریخ اردو**" میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے، تاریخ وارتقائے اردو کے ساتھ ہر دَور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور، لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کئے ہیں، اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف پر، بلکہ ذاتِ مصنف پر بھی (مصنف کی حیثیت سے) اب تک "پل صراط" پر گذرنے سے کم نہیں ہے۔ لیکن میں نے اس کی "جسارت" کی ہے۔ میں نے تصنیفوں اور مُصنّفوں پر اعتراضات کئے ہیں، دوسروں

کے اعتراضات نقل کر کے حسب موقع ان کی تائید یا تردید کی ہے۔ میری تنقیدیں شاید تلخ و بیباک نظر آئیں، لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت ہوں گی۔ میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے مورخ و تذکرہ نویس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرہ کے ضروری اجزاء تھے۔ بغیر اس روشنی کے، کسی تصنیف و مصنف کے مطالعہ کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔

مجھے اس تالیف کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصوں کے نامکمل رہ جانے کا اعتراف ہے۔ جس وقت سنہ ۱۹۳ء میں اس کی تالیف و طباعت ساتھ ساتھ شروع ہوئی تھی، یہ ارادہ نہ تھا کہ اس قدر طویل و مفصل لکھی جائے۔ یہ ارادہ بعد کو موقع تفصیل پیش آنے پر قائم ہوا۔ اس لئے ابتدائی حصہ مختصر رہ گیا۔ پہلے سے پوری تاریخ نثر کے لئے ۵۰۰ صفحے تجویز ہوئے ہوتے، تو ابتدائی حالات اور پہلے دو دور بھی زیادہ تفصیل سے لکھے جا سکتے تھے۔ اور حصوں میں بھی، باوجود تحقیق و تفصیل کے، ترقی و اضافہ کی گنجائش باقی ہے۔

میں نے اس کتاب میں بے شمار تصانیف اور دوسری مطبوعات سے مدد لی ہے، اور متن یا حواشی میں ان کا حوالہ دیدیا ہے۔ اگر کہیں حوالہ رہ گیا ہے تو وہ میری عجلت یا غفلت کا نتیجہ ہے۔ قصد و ارادہ شامل نہیں ہے۔ اردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق فاضل مصنفینِ حیدرآباد نے بہترین معلومات فراہم کردی ہیں۔ ہر مولف کے لئے ان کی تصانیف سے استفادہ ناگزیر ہے۔ میں نے بھی "اردوے قدیم" (مولفہ حکیم شمس اللہ قادری)، "دکن میں اردو" (مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی)، "اردو شہپارے" (مولفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور)، اور "ارباب نثر اردو" (مولفہ مولوی سید محمد ایم اے) سے اپنی تالیف میں جابجا مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ جن مفصل و مختصر تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب میرے پیشِ نظر تھیں۔ "سیر المصنفین"، سب سے زیادہ کام کی تالیف ہے،

میں نے اس سے کام لیا ہے، اور ہر جگہ حوالے دیئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی بعض تالیفات مثلاً "چند ہم عصر" اور مجلہ "اردو" سے بھی میں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور بہت سے رسالے، خصوصاً "مخزن" اور "زمانہ" کے قدیم و جدید فائل بہت کام آئے۔ اہلِ دکن کی سی "علیکیات" لکھوں تو بہت طولِ امل ہو جائے۔

احباب میں اتفاق سے مجھے ایک ہی صاحب کا ممنون ہونے کا موقع ملا۔ یعنی مفتی انتظام اللہ صاحب صدیقی گوپاموی ثم اکبرآبادی کا۔ آگرہ میں مفتی صاحب اپنے علمی و تصنیفی ذوق و شوق میں انفرادی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کتب خانہ سے مجھے مطبوعہ و قلمی کتابیں اور مصنفوں کے حالات اور نمونے مرحمت فرمائے۔ اور سب کے ساتھ مفتی صاحب کا بھی شکر گذار ہوں۔

اس "**داستان تاریخ اردو**" کی تعریف (مدح نہیں، صورتِ حال) اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو اس کو "**عجیب**" کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں تاریخ و تذکرہ کی کتاب عجیب نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ تالیف اپنی "ہیئت کذائی" میں کچھ ایسی ہی بن گئی ہے۔ بہر حال میں اس نوعیت کے لئے کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اپنی اس کوشش کو میں کوئی "کارنامہ" نہیں سمجھتا، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "کارے کردم"۔ ہاں، کام کرنے کی ایک نئی راہ نکال دی ہے۔

دیگراں آیند و "کارے" ہم کنند

حامد حسن قادری
پروفیسر سینٹ جانس کالج
آگرہ

علی پور سیدان (ضلع سیالکوٹ)
یکم رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ
۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

۲۹؍۲۰؍۹۱
م ح ق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین داستانِ تاریخ اردو

نثر کا تیسرا دور ۸۵

نثر کا چوتھا دَور

نثر کا چوتھا دور　۱۸۷

نثر کا پانچواں دور (۱۸۷۱ء - ۱۹۰۰ء)

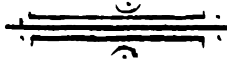
٢٨٦
٣٢

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"بذکر خدائے زباں آفریں"

داستانِ تاریخ اردو

١٩٣٨



آغازِ اُردو سے پہلے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدہا سال قبل، گوتم بُدھ بانیٔ مذہب بدھ اور مہابیر بانی جین مذہب سے سیکڑوں برس پہلے، آریا قوم کے ورودِ ہندوستان کے وقت ہندوستان کے قدیم اور اصلی باشندے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولتے تھے۔ آریا لوگوں نے اپنی زبان سنسکرت کو رواج دیا۔ سنسکرت میں وسعت و تکمیل کے جوہر تھے۔ ہندوستان میں اس زبان کو اس قدر ترقی ہوئی کہ لسانی و ادبی و علمی حیثیت سے دنیا کی بہترین زبانوں میں اس کا شمار ہے۔ لیکن گردشِ زمانہ سے صدہا سال حکومت کرنے کے بعد سنسکرت کو زوال شروع ہوا، اور مختلف صوبہ وار زبانیں جن کو پراکرت کہتے ہیں

سنسکرت کی جگہ لینے لگیں۔

ان پراکرت زبانوں میں ایک سورسینی پراکرت تھی جو برج یعنی متھرا کے علاقے سے شروع ہوکر پنجاب، سندھ، بہار، مالوہ تک شائع و عام تھی۔ اسی کی ایک شاخ کو برج بھاشا کہتے ہیں یعنی متھرا کی زبان یہ سب سے زیادہ وسیع تھی اور حضرت عیسیٰ کے زمانے سے قبل علمی زبان بن چکی تھی یعنی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

حضرت عیسیٰ سے نصف صدی قبل اجین کا مشہور راجہ وکرماجیت گزرا ہے۔ جس کے دربار کا جوہر بے بہا کالیداس شاعر تھا۔ اسی راجہ کے دربار کے ایک پنڈت ورارو چی نے برج بھاشا کے قواعد صرف و نحو مرتب کئے تھے۔ یہ کتاب اب تک موجود ہے۔ اور پراکرت پرکاش کے نام سے ۱۸۶۸ء میں لندن میں شائع ہوئی ہے۔ اس دو ہزار سال قبل کی کتاب میں برج بھاشا کے ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو ہماری موجودہ اردو زبان میں شامل ہیں۔

گوتم بدھ کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے چھ صدی قبل ہے۔ مہاتما بدھ کی زبان یہی سورسینی پراکرت یا برج بھاشا تھی، اسی زمانے میں مہاتما مہابیر نے جین مت پھیلایا، ان کی زبان بھی یہی تھی۔ سکندر اعظم نے حضرت عیسیٰ سے ۳۲۵ سال قبل ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت بھی برج بھاشا اور دیگر پراکرتیں ہندوستان میں رائج تھیں۔ راجہ اشوک حضرت عیسیٰ سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے تھا۔ اس کی زبان بھی یہی برج بھاشا تھی، اور اس کے مشہور کتبوں پر یہی زبان پتھر کی لکیر بنی ہوئی ہے۔

عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلہ تجارت

اسلام ۵۶۹ء میں شروع ہوا ہے۔ زمانۂ اسلام سے بہت پہلے عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلۂ تجارت قائم تھا۔ عرب سواحلِ ہند پر تجارت کی غرض سے آتے تھے، اپنا مال فروخت کرکے ہندوستان کا

مال خرید کرلیجاتے تھے۔ لیکن یہ لین دین صرف مال و متاع تک محدود نہ تھا۔ بلکہ الفاظ کا ادل بدل بھی ہوتا تھا، یعنی اشیاء خرید و فروخت کے عربی نام ہندوستان میں رہ کر ہندی تاجروں کی زبان میں مل جاتے تھے، اور ہندوستانی نام عرب میں پہنچکر عربی زبان میں شامل ہوتے تھے۔

عربی و ہندوستانی الفاظ کا مبادلہ

چنانچہ اس فہرست سے اس مبادلۂ الفاظ کا اندازہ ہوسکتا ہے:-

عربی الفاظ	ہندوستانی الفاظ	عربی الفاظ	ہندوستانی الفاظ
املج	آنولہ	صندل	چندن
بلیلج	بہیڑہ	سرشف	سرسوں
جزر	گاجر	کافور	کپور
بنج	بھنگ	دخان	دھواں
خیار	کھیرا	اختیار	آدمی کار

مسلمانوں کے ابتدائی حملے ہندوستان پر

۱۶ سنہ ہجری (مطابق ۶۳۷ء) میں جس سال حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا، اسی سال مسلمانوں نے ہندوستان کے ساحل سندھ پر حملہ کیا، لیکن ملک کو فتح نہ کرسکے۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر حملہ آور ہوئے اور پھر ناکام رہے۔ آخر خلافتِ بنی امیہ کے آغاز میں ۴۴ھ ۶۶۴ء میں کابل کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا اور کابل سے ملتان تک قبضے میں کرلیا۔ اب حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سواحل و سرحد کا بہت سا حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ سندھ پر بھی چند بار حملے کئے، اور ناکام رہے۔ پھر ۷۰۵ء ۸۶ھ میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ

پر حملہ کامیاب ہوا۔ اس کے بعد ۹۶ھ ۷۱۴ء تک مسلسل فتوحات کر کے ملتان تک قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے مسلمانوں کی سلطنت سندھ پر صدیوں قائم رہی۔ اسلامی سلطنت بنی امیہ سے بنی عباس میں منتقل ہوگئی تو سندھ کی اسلامی حکومت بھی خلافت عباسیہ کے زیر اثر آگئی اور خلیفہ واثق باللہ (زمانہ خلافت ۲۲۷ھ ۸۴۱ء تا ۲۳۲ھ ۸۴۷ء) کے زمانے تک دربار خلافت سے سندھ کے حاکم و والی (گورنر) مقرر ہو کر آتے رہے۔ لیکن اس کے بعد خلافت بغداد کے ضعف کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی حکومت ہند و سندھ بھی کمزور ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنے مفتوحہ ممالک سے باہر نہ پھیل سکے۔ اگرچہ سندھ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و زبان سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی (مطابق چوتھی صدی ہجری) میں ہندوستان آئے۔ اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی وضع اور معاشرت اس قدر یکساں ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ دونوں قوموں میں نہایت اتفاق و ارتباط قائم ہے۔ عربی و سندھی دونوں زبانیں رائج ہیں۔ اور ملتان میں ملتانی کے ساتھ فارسی زبان بولی جاتی ہے۔

تاہم اس زمانے تک دیسی اور بدیسی یعنی برج بھاشا اور عربی و فارسی زبانوں کی ایسی آمیزش نہوئی تھی جو ایک مخلوط زبان کا سنگ بنیاد ہو سکتی۔

سبکتگین کا پنجاب پر حملہ ۳۷۶ھ ۹۸۶ء سبکتگین غزنی کا بادشاہ تھا اس نے پنجاب کے راجہ جیپال پر فوج کشی کی، راجہ صلح کرنے پر مجبور ہوا، لیکن صلح توڑ دی۔ اس لئے سبکتگین نے دوبارہ حملہ کیا اور پنجاب سے پشاور تک اس کے قبضے میں آگیا۔ مسلمان ان ممالک مفتوحہ میں رہنے لگے۔

محمود غزنوی کے حملے ۳۹۲ھ ۱۰۰۱ء تا ۴۱۸ھ ۱۰۲۷ء سبکتگین کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی نے ۲۷ سال میں ۱۷ حملے کر کے پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج، متھرا، گجرات پر قبضہ کر لیا۔

خاندان غزنوی کی حکومت (پنجاب میں اُردو کا آغاز) ۳۹۲ھ تا ۵۸۲ھ ۱۰۰۱ء تا ۱۱۸۶ء

محمود کے بعد سب ممالک مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے، لیکن پنجاب پر قبضہ رہا اور دو سو برس کے قریب خاندان غزنوی نے پنجاب میں حکومت کی۔ لاہور دارالحکومت رہا۔ مختلف اقوام و ممالک کے مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہل ہند کے ساتھ تمدن و معاشرت، لین دین، شادی بیاہ، ہر قسم کے تعلقات پیدا کئے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کئے۔ اور اہل ہند نے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے۔ اس طرح اُردو زبان بننی شروع ہوئی۔ دو سو برس کی مدت اس زبان کی عمومیت و اشاعت کیلئے کافی تھی۔ اس عرصہ میں یہ نئی زبان بول چال سے بڑھ کر شاعری میں بھی داخل ہو گئی۔

اردو زبان

اردو زبان کی اصل کونسی زبان ہے

زبان کی تشخیص و تمیز کا اصول یہ ہے کہ کسی مخلوط زبان میں جس زبان کے افعال و ضمائر و متعلقات فعل کا غلبہ ہوتا ہے وہی زبان اس مخلوط زبان کی اصل و ماخذ قرار دی جاتی ہے۔ اُردو زبان میں مذکورہٴ بالا اجزا برج بھاشا کے ہیں، اس لئے برج بھاشا اردو کی ماں ہے۔

فارسی و عربی کو اردو کی اصل سمجھنا غلطی ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ ہندوستان میں غیر ملک سے آنے والے سب سے پہلے مسلمان تھے اور ان کی زبانوں کی آمیزش سے برج بھاشا سے اردو پیدا ہو گئی۔ اگر مسلمانوں سے پہلے ڈچ یا فرنچ یا انگریز آتے تو ان کی زبانوں کے اسماء و صفات، برج بھاشا کے افعال و متعلقات فعل میں ملکر کچھ اور زبان بن جاتی۔

لفظ "اردو" کی تحقیق

اردو زبان کو اُردو اس لئے کہتے ہیں کہ "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے

اور اس کے معنی لشکر کے ہیں، اور لشکر اسلامی کے ورود ہندوستان کے بعد اسلامی زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کے الفاظ برج بھاشا میں شامل ہوئے۔ لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لئے اردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ لفظ "اردو" کا لشکر و لشکر گاہ بلکہ دار السلطنت کے معنوں میں استعمال ہونا علاء الدین بن عطا ملک جوینی کی تاریخ "جہانکشا" (مصنفہ ۶۵۸ھ ۱۲۶۰ء) سے ثابت ہے۔ علاء الدین نے اپنی تاریخ میں چنگیز خاں اور اس کے خاندان کے حالات لکھے ہیں۔ اور ان کے لشکر و لشکرگاہ کے لئے اردو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنگیز خاں ۵۵۸ھ ۱۱۶۲ء میں پیدا ہوا اور ۶۲۴ھ ۱۲۲۷ء میں مرا۔ مغلوں میں سب سے پہلے چنگیز خاں نے سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن یہ حملہ فتح ملک اور تاسیس حکومت کے لئے نہ تھا۔ چنگیز خاں کے بعد مغل برابر ہندوستان پر حملے کرتے رہے۔ اس لئے یہ قیاس درست نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانے سے ہندوستان میں اردو کا لفظ لشکر و لشکرگاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ بابر، اکبر، جہانگیر کے فرمانوں اور سکوں میں اردو کا لفظ لشکر کے معنی میں درج ہے۔ بابر اپنے لشکر کو اردوے نصرت شعار کہتا ہے۔ جہانگیر نے سفر کشمیر کے راستے میں جو سکہ بنوایا ہے اس پر یہ شعر کندہ ہے۔

سکۂ اردوے جہانگیر شاہ   یاد رواں تا کہ بود مہر و ماہ

شاہان مغلیہ کے زمانے میں شاہی لشکر و لشکرگاہ کو اردوے معلی کہتے تھے اور بازار لشکر کو بازار اردو یا اردو بازار۔

اردو زبان کا نام "زبان ہندی" | لیکن اس زمانے تک زبان لشکر کے لئے اردو کا لفظ مستعمل نہ ہوا تھا۔ سب سے قدیم تحریر حضرت امیر خسرو دہلوی (۶۵۲ھ ۱۲۵۵ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) کی ملتی ہے۔ وہ اپنے دیباچۂ دیوان میں اپنے اردو کلام کو کلام ہندوی فرماتے ہیں۔ دوسری قدیم کتاب سیر الاولیاء ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے

ایک خاص مرید حضرت سید مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف ہے۔ اس میں حضرت
بابا فرید شکر گنج کے ایک قول کے متعلق لکھا ہے فرمود بزبان ہندی اور بھی بعض قدیم
تحریروں میں اردو زبان کو زبان ہندی کہا گیا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امیر خسرو کی تصانیف سے اکبر و جہانگیر کے زمانے
کی تصانیف تک یعنی تیرہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک جہاں
جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ پنجاب کے کسی
بزرگ کے قول کو زبان پنجابی و زبان ملتانی کہا گیا ہے۔ اہل گجرات کی زبان کو
زبان گجراتی، اہل دکن کی زبان کو دکنی، نیز بلا امتیاز ان زبانوں کو زبان ہندی بھی کہدیا
گیا ہے۔ لیکن اہل دہلی و نواح دہلی کی زبان کو زبان ہندی ہی کہا گیا ہے۔ اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا نے جس کی اصلی ٹکسال متھرا و نواح متھرا تھی، قدیم زمانے
ہی سے مختلف صوبوں میں مختلف شکلیں پیدا کر لی تھیں جو امتیاز کے لئے مقامی ناموں
سے معروف تھیں۔ اردو زبان اگرچہ ان سب بولیوں سے ملکر بنی ہے، پھر بھی اس کا
اصلی سانچا متھرا و دہلی کی زبان ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسرے صوبوں کی
مخصوص زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں، لیکن موجودہ صوبجات متحدہ کی زبان
وہی زبان ہندی ہے جس نے اب اردو کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اردو زبان کا نام "زبان ریختہ"

بہرحال شہنشاہ جہانگیر کے زمانے تک زبان کے لئے اردو کے لفظ کا
رواج ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن زبان ہندی کے ساتھ ساتھ زبان ریختہ
کا استعمال پایا جاتا ہے۔ خصوصاً نظم اردو کو نظم ریختہ کہتے تھے۔ "ریختہ" کے معنی
گری پڑی چیز کے ہیں۔ اور فارسی شعرا اس نظم کو بھی ریختہ کہتے تھے جو مختلف زبانوں
سے مرکب ہو۔ قدیم شعراے اردو کے کلام میں فارسی و ہندی ملی جلی ہوتی تھیں اس
لئے اس کو ریختہ کہنے لگے۔ نیز اس لئے کہ اردو زبان فارسی، عربی، ترکی،

ہندی وغیرہ سب زبانوں سے ملکر بنی ہے۔

شیخ مخدوم سعدی کاکوروی (متوفی ۱۰۰۲ھ ۱۵۹۲ء) اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کی ایک مخلوط غزل ملتی ہے۔ انہوں نے مقطع میں غزل کی زبان کو ریختہ فرمایا ہے:-

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے بعد عام نظم اردو کو ریختہ کہنے لگے۔ اور یہ نام انیسویں صدی عیسوی تک مستعمل رہا مثلاً

(۱) قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی (قائم چاندپوری)

(۲) خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا (میر تقی میر دہلوی)

میر کے شعر سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ریختہ گوئی کا عام رواج دہلی سے پہلے دکن میں ہوا تھا۔

(۳) مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں :- "مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد۵"

(۴) مرزا غالب دہلوی تک ریختہ کا لفظ مستعمل ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب (غالب) کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

زبان کے لئے لفظ اردو کا استعمال | غالباً شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یعنی سترھویں صدی سے اردو کا لفظ زبان کے لئے استعمال ہوا۔ لیکن شاہجہاں و اورنگ زیب کے زمانے تک اس کا استعمال بہت محدود تھا۔ خود شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے ایک رقعہ میں زبان ہندی ہی لکھتے ہیں۔ شاہجہاں سے کوئی تحریر اپنے زمانے کی اردو زبان

---

۵ منقول از آب حیات۔

میں اپنے قلم سے لکھی ہے اس کے متعلق عالمگیر شاہجہاں کو لکھتے ہیں :-

"آں فرمان عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقمی فرمودہ شاہد ایں معانی است"

عالمگیر کے بعد اٹھارہویں صدی میں جتنے تذکرے شعرائے اردو کے لکھے گئے، ان میں اردو کو ہندی یا ریختہ کہا گیا ہے۔ تاہم اس زمانے میں اس نام کا استعمال ثبوت سے خالی نہیں ہے۔ ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۱ء) میں مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری دکنی نے چند اخلاقی و مذہبی نظمیں دکنی اردو میں لکھی ہیں۔ ان کی وجہ تصنیف نثر میں بیان کی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں :-

"ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نیں کہا ہوں۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں"

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس زمانے میں غیر صوبوں کے لوگ اردو دہلی کی زبان کو کہتے تھے۔ اس کی تصدیق اور شہادتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جب ولی دکھنی دہلی آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور اپنی دکھنی زبان کی غزلیں سنائیں تو بقول قدرت اللہ صاحبِ تذکرۃ الشعرا کے شاہ صاحب نے ولی کو یہ مشورہ دیا:-

"ایں ہمہ مضامین فارسی را کہ بیکار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار بہ ... " [sic — see below]

شاہجہاں نے دہلی کا لال قلعہ بنایا، دہلی کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ قلعہ کو قلعۂ معلیٰ اور شاہی لشکرگاہ کو اردوئے معلیٰ کہتے تھے۔ جب اردو زبان قلعہ معلیٰ میں داخل ہوئی تو اردوئے معلیٰ کا خطاب پایا۔

آغاز اُردُو

پنجاب میں مسلمانوں کے مستقل قیام، مختلف ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں اور ان کی زبانوں کے اجتماع، اہل ہند سے تعلقات نے ایک مخلوط زبان کی ضرورت اور صورت پیدا کر دی۔ اہل ہند برج بھاشا بولتے تھے، مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ ضرورت پیدا ہوتے ہی ایک نے دوسرے کی زبان سیکھنی شروع کر دی ہوگی۔ لیکن گیارہویں صدی عیسوی کی یہ بول چال کتب تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ البتہ اُس زمانے کی نظم سے تصدیق ہوتی ہے۔

فارسی شاعری میں ہندی الفاظ
بزمانۂ مسعود غزنوی ۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۲ء / ۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ

سلطان محمود غزنوی کے فرزند و جانشین سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ میں ایران کا مشہور شاعر منوچہری ہندوستان آیا، اس نے اپنے فارسی کلام میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بجنسہ نظم کئے ہیں۔ مثلاً

الا تا ہند وان گیرند لنگھن   الا تا مومناں دارند روزہ

اس سے زیادہ دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایران کے ممتاز صوفی شاعر حکیم سنائی (جن کا انتقال بارھویں صدی کے وسط میں ہوا ہے) کبھی ہندوستان نہیں آئے۔ لیکن بعض ہندی الفاظ کو اپنی نظم میں لکھا ہے۔ مثلاً

نہ دراں معدہ جز حسد زندہ   نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

فارسی شاعروں کا ہندی کلام
بزمانۂ ابراہیم غزنوی ۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۸ء / ۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ

مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ النکتی ہندوستان میں پیدا ہوئے، فارسی کے شاعر تھے، لیکن ہندی زبان میں بھی شعر کہے اور اپنے ہندی دیوان مرتب کئے۔ یہ کلام اب موجود نہیں ہے لیکن محمد عوفی اور امیر خسرو دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

ہندی شاعری میں عربی الفاظ بزمانۂ پرتھی راج
ولادت ۱۱۵۹ء (۵۵۴ھ) تا وفات ۱۱۹۲ء (۵۸۸ھ)

پرتھی راج راجہ اجمیر و دہلی کے وزیر و درباری شاعر چاند بردائی نے ایک طویل ہندی نظم پرتھی راج راسو کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں پرتھی راج اور اس کے زمانے کے تمام حالات تاریخ و معاشرت، رسم و رواج، رزم بزم وغیرہ کے متعلق لکھے ہیں۔

اس نظم میں بہت سے عربی و فارسی الفاظ پائے ہیں۔ مثلاً سلام، بادشاہ، پروردگار، دُنیا، اُست، کھلک (خلق) پگام (پیغام) پھرمان (فرمان) ایک شعر یہ ہے ؎

بارہ بانس بنیں میں چار انگل پھرمان — اتے گھر بادشاہ ہے مت چوکے چوہان

محمد غوری کے حملے اور اُردو کی وسعت ۱۱۷۵ء (۵۷۰ھ) تا ۱۱۹۲ء (۵۸۸ھ)

(۱) ۱۱۷۵ء (۵۷۰ھ) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ملتان اور اوچ فتح کیا (۲) ۱۱۷۸ء (۵۷۳ھ) میں گجرات پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ (۳) ۱۱۸۷ء (۵۸۲ھ) میں خسرو ملک غزنوی حکمران پنجاب پر حملہ کرکے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ (۴) ۱۱۹۱ء (۵۸۷ھ) میں پرتھی راج اور محمد غوری میں بمقام ترائن (علاقہ کرنال) جنگ ہوئی، مسلمانوں نے شکست پائی (۵) ۱۱۹۲ء (۵۸۸ھ) میں دوبارہ محمد غوری نے راجپوتوں پر حملہ کیا اور پرتھی راج کو شکست دی۔ اس لڑائی میں پرتھی راج اور اس کا درباری شاعر چاند بردائی دونوں مارے گئے۔ اس جنگ سے اجمیر، دہلی، کول (علیگڈھ) ہانسی، سرستی سب مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ محمد غوری نے پرتھی راج کے بیٹے گوبند راج کو تاج و تخت دیکر اجمیر کا راجہ بنادیا اور دہلی میں اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام کرکے غزنی کو واپس چلا گیا۔

مسلمانوں کے ساتھ ان کی مادری زبان بھی ہر جگہ پہنچتی رہی اور نئی مخلوط زبان (اُردو) کو ترقی ہوتی رہی۔ مسلمان ابتک اپنی بول چال، خط و کتابت وغیرہ کے لئے فارسی زبان ہی سے کام لیتے تھے۔ لیکن بوقت ضرورت اہل ہند کے ساتھ نئی مخلوط زبان (اُردو) میں معاملہ کرتے تھے۔

دہلی میں اُردو کا رواج
۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ

اب تک پنجاب و گجرات وغیرہ پر مسلمانوں کا تسلط ہوا تھا اور انھی علاقوں میں اُردو کی اشاعت ہوتی رہی۔ دہلی پر سب سے پہلے ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں قبضہ ہوا قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء ۶۰۲ھ میں دہلی کا پہلا بادشاہ بنا۔ اسی زمانہ سے اہل دہلی فارسی زبان سے مانوس ہوئے۔ محمدؐ غوری کے جس لشکر نے قطب الدین کی سپہ سالاری میں دہلی پر قبضہ کیا اس میں کثیر تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو سالہا سال سے پنجاب میں رہتے تھے۔ اور پنجاب کی مقامی زبان (جو برج بھاشا کی ایک صورت تھی) بولتے یا بول سکتے تھے۔ دہلی کی مقامی زبان بھی برج بھاشا ہی کی ایک شکل تھی اور پنجاب کی زبان سے اسی قدر مختلف تھی جتنی بُعد مسافت امتداد زمانہ، اور لب ولہجہ کے اختلاف سے ہر زبان ہو جاتی ہے۔ اب دہلی کی فضا میں دہلوی لب ولہجہ کو غلبہ ہوا اور دہلی کی بھاشا، پنجاب کی بھاشا، عربی، فارسی سب زبانیں ملنی شروع ہوئیں اور دہلوی اُردو کی ابتدا ہوئی۔

اردو پر اولیاء اللہ کا فیضان

اردو زبان کی ترویج واشاعت میں اولیاء اللہ کے فیض و کرامت کو بھی بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائے قیام ہند سے ہی صوفیائے کرام ہندوستان تشریف لائے اور اپنے نور باطن سے اہل ہند کے دل و جان کو روشن کرنا شروع کیا۔ ان بزرگوں کی نظر میں ملک و قوم، مذہب و ملت کی کوئی قید نہ تھی۔ ان کا فیضان مسلم و ہندو سب پر یکساں تھا، کتنے ہندو مسلمان ہوئے اور اولیاء اللہ سے فیض حاصل کیا۔ اسی فیض یابی کی خاطر اگرچہ اہل ہند نے فارسی کی مشق بہم پونہچائی، لیکن فیض رسانی کے لئے اولیاء اللہ کی زبان فیض ترجمان پر بھی اکثر ہندی الفاظ جاری ہوئے۔

۱۔ حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (متوفی ۴۶۵ھ ۱۰۶۳ء) حکومت غزنویہ کے زمانے میں لاہور تشریف لائے۔ مزار پاک بھی وہیں ہے۔

۲۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۵۳۲ھ/۱۱۴۲ء تا ۶۲۳ھ/۱۲۳۵ء) راجہ پرتھی راج کے زمانے میں اجمیر تشریف لائے۔ داتا صاحب اور خواجہ صاحب کا کوئی قول ہندی زبان کا نہیں ملتا۔ تاہم خواجہ اجمیریؒ کے تکلّم زبان ہندی کے متعلق شہادت ملتی ہے۔ یعنی ملک محمد جائسی کی نظم اکھروٹی کا شارح تمہید شرح میں لکھتا ہے[۱]:۔

"گماں نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندی تکلّم نکردہ۔ زیراکہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس اللہ سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ"۔

۳۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء تا ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی تشریف لائے۔ خواجہ اجمیریؒ کے خلیفہ اور باباشکر گنج کے پیرو مرشد تھے۔

۴۔ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ[۲] (۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء تا ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) نے غلام خاندان کی حکومت کے زمانے میں پاک پٹن (پنجاب) میں سکونت اختیار فرمائی، خواجہ بختیار کاکی سے فیض باطن پایا، پنجاب بلکہ تمام ہندوستان کو اپنے نور باطن سے منور فرمایا۔ بابا صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کے فتح پنجاب و حکومت ہند کو دو (۲۰۰) سو برس کے قریب گزر چکے تھے۔ اردو زبان کی تشکیل ہو چکی تھی اور رواج بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر خود بابا صاحب کثیر الاولاد تھے، ان کے صدہا خلفاء اور ہزارہا مرید پنجاب اور تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اہل ہند کی تعلیم و تلقین کے لئے بابا صاحب

---

[۱] "اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔ [۲] حضرت باباشکر گنج کی تاریخ ولادت ووفات میں مورخوں کا بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے سال ولادت ۵۶۹ھ لکھی ہے۔ اور شاہجہاں بادشاہ کے زمانے کے ایک مصنف صاحب سیر الاقطاب نے تاریخ وفات لفظ "مخدوم" سے نکالی ہے جس سے ۶۹۰ھ نکلتا ہے۔ اگر ولادت وفات کے یہ دونوں سال صحیح مانے جائیں تو باباصاحب کی عمر ۱۲۱ سال کی ہوتی ہے۔ لیکن کسی تذکرے سے یہ عمر ثابت نہیں ہوتی۔ ہمارے سنہ خزینۃ الاصفیاء سے ماخوذ ہیں۔

ہندی زبان سے بھی کام لیتے تھے۔ چونکہ نہایت مقبول اور کثیر الفیضان بزرگ تھے اس لئے سب اولیاء اللہ سے زیادہ ان کے اقوال و اشعار مشہور ہیں۔ مثلاً

(۱) سیر الاولیاء مولفہ مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد میں درج ہے:۔
شیخ شیوخ العالم قدس سرہ العزیز (یعنی بابا گنج شکر) فرمود بزبان ہندی "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" یعنی ماہ شب چہاردہم در اول شب خوردمی باشد کہ بتدریج بکمال می رسد۔[۱]

(ب) ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا مقام کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا "بیچ سر کے"

(ج) ایک پرانی بیاض میں بابا صاحب کی یہ نظم دستیاب ہوئی۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک	پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے	بوکڑ واں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں	گاے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
عشق کا رموز نیارا ہے	جز مدد پیر کے نہ چارہ ہے[۲]

(د) بابا فرید شکر گنج کی ایک غزل ریختہ بھی ملی ہے:۔

وقت سحر وقت مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تن تنہا چہ روی در زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پند شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے[۳]

---

[۱] و [۲] و [۳] یہ سب اقوال مولوی عبدالحق صاحب کی تالیف مذکورہ بالا سے ماخوذ ہیں۔

ان کے علاوہ بہت سے پنجابی زبان کے اشعار پنجاب میں زبان زد خلائق ہیں۔ بعض اشعار و اقوال میں ذکر کے طریقے تعلیم فرمائے ہیں۔ بابا صاحب کے بعض اعمال محفوظ ہیں۔ خاکسار راقم بھی بابا شکر گنج کی اولاد میں ہے۔ راقم کے خاندان میں بابا صاحب کا ایک خاص عمل رائج ہے جو اُس زمانے کی اُردو زبان میں ہے۔

۵۔ حضرت شاہ بو علی قلندر پانی پتی (متوفی ۷۲۴ھ ۱۳۲۴ء) سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں تھے۔ ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں گئے اور کچھ گانا سُنایا۔ شاہ صاحب خوش ہوئے اور اپنا کلام امیر صاحب کو سنایا۔ امیر اُس کو سُن کر آبدیدہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا تُرکا کچھ سمجھ دار ہے۔ امیر خسرو نے کہا اسی لئے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا۔

حضرت شاہ بو علی قلندر کی زبان مبارک سے مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے موقع پر یہ دوہا نکلا تھا:۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوے

اسی مضمون کو آپ نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے:۔

من شنیدم یار من فردا رود در راہِ شتاب   یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب[۱]

۶۔ حضرت نظام الدین اولیا (۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) خلیفہ حضرت بابا فرید شکر گنج و پیر و مرشد حضرت امیر خسرو سے کوئی قول ہندی زبان کا منقول نہیں ہے۔ لیکن ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا:۔

"کلام حق را در روز میثاق با ہنگ پوربی شنیدم"[۲]

---

[۱] یہ اقوال بھی مولوی عبد الحق صاحب کی کتاب مذکور سے ماخوذ ہیں۔
[۲] از مضمون افتخار عالم صاحب مارہروی مطبوعہ رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۱ء

۷۔ حضرت امیر خسرو (۶۵۲ھ ۱۲۵۵ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین محبوب الٰہی سے تربیت باطن حاصل کی۔ سلطان غیاث الدین بلبن (خاندان غلامان) سے سلطان محمد تغلق تک گیارہ شاہان دہلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی، اس زمانے میں پنجاب و بنگال کا سفر کیا، جنگوں میں شریک ہوئے۔ امیر خسرو ان باکمال و منتخب ہستیوں میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صدہا سال کے بعد کبھی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سپاہی بھی تھے اور عالم بھی، دنیا دار بھی تھے اور ولی کامل بھی، شاعر بھی تھے اور ماہر موسیقی بھی، عاشق بھی تھے اور زندہ دل بھی، ہندوستان کے فن موسیقی میں جدتیں پیدا کیں، فارسی زبان کے تین دیوان مرتب کئے، اور آٹھ مثنویاں لکھیں۔ ہندی زبان میں بہت کچھ کہا جس کا ذکر اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے۔ لیکن وہ ہندی کلام اب محفوظ نہیں ہے۔ بعض گیت، دوہے، پہیلیاں، انملیاں، کہہ مکرنیاں ان کے نام سے مشہور ہیں لیکن کسی تاریخی سند سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہی کی تصنیف ہیں۔ زبان ریختہ کی بعض غزلیں اور قطعے البتہ انہی کے ہیں۔ یہ تو یقینی ہے کہ امیر صاحب ہندی زبان بے تکلف بول سکتے تھے، لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندی زبان سے خاص محبت تھی اس لئے کہ ہندی الفاظ اپنی فارسی نظموں میں کثرت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً

(ا) اے دہلی واے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

(ب) یک گل بیل دِہ دیگر درون
گل زگل و گل زگل آید برون

(ج) صفت بیڑہ تنبول کہ نزد ہمہ خلق
بہ ازاں نیست نبات ہمہ ہندوستاں

(د) تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے — از دست و زبان چرب او وا ویلے
خالے بلبش دیدم گفتم کہ تل است — گفتا کہ برو انیست درین تل تیلے

(۲) گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی — آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزند — ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی

(د) زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑ کے سنوار کے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

(ہ) نسا خوار شدم زار شدم لٹ گیا — در غم ہجر تو گھٹتا رہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوے من — بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھتا ہے
روے تو رونق شکن آفتاب — سرو بہ پیش قد تو بوٹا ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتی کہ بیٹھ — وہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹتا ہے

(ح) شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

(ط) کہہ مکرنی :-

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں — بوجھو نہیں تو چھوڑو گاؤں

کہہ مکرنی اس پہیلی کو کہتے ہیں جس میں اس کی بوجھ موجود ہو لیکن بظاہر نظر نہ آئے۔ امیر خسرو نے اس طرح کی بہت سی کہہ مکرنیاں کہی ہیں اور ان کو بڑی ذہانت کے ساتھ موزوں کیا ہے۔ اس کہہ مکرنی کے بوجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ چراغ جلانے کو دیا بالنا

۱ دہی لو دہی۔ ۲ لٹ گیا۔ ۳ گھٹتا۔ ۴ روٹھا۔ ۵ بوٹا۔ ۶ بیٹھ۔ ۷ پھوٹا۔

کہتے ہیں، اور چراغ بجھنے کے لیے دیا بڑا ہونا بولتے ہیں۔ اب پہلے شعر کے یہ معنی ہوئے
کہ جب دیا بالا تھا (یعنی چراغ جلایا تھا) تو سب کو بھایا۔ جب دیا بڑا ہوا (یعنی چراغ بجھ گیا)
تو کچھ کام نہ آیا۔ تیسرے مصرع کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں: "خسرو کہہ کہ اس کا نام دیا
ہے"۔ اس طرح بوجھ بھی بتا دی۔

اگرچہ ان پہیلیوں کا امیر خسرو کی تصنیف سے ہونا کسی معتبر ذریعہ سے تحقیق نہیں ہوا۔
لیکن امیر خسرو نے اپنی تصنیف اعجاز خسروی میں زبان و محاورہ، ادب و بلاغت کے
جو لطائف و نوادر پیدا کئے ہیں ان پر قیاس کر کے ان پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، انملیوں،
دوہوں، گیتوں، نقلوں کو ظن غالب کے ساتھ امیر خسرو سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

(ی) یہی حال امیر خسرو کی مشہور تصنیف خالق باری کا ہے کہ اس کے لئے بھی
کوئی معتبر شہادت تاریخی نہیں ہے۔ لیکن اس کا ان کی تصنیف ہونا تعجب بھی نہیں۔
"خالق باری" منظوم لغت کی کتاب ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

خالق باری سرجن ہار واحد ایک بدا کرتار

۸۔ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر (متوفی ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء) حضرت بابا فرید شکر گنج کے
بھانجے اور داماد تھے۔ پیران کلیر شریف میں مزار مبارک ہے۔ "سیر الاقطاب" (مصنفہ
۱۰۵۶ھ/ ۱۶۴۶ء بعہد شاہجہاں) سے منقول ہے کہ حضرت مخدوم صابر صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے
تھے۔ فارسی میں احمد اور ہندی میں صابر تخلص فرماتے تھے۔ مصنف سیر الاقطاب نے
"زبان ہندی" کا صرف یہ شعر درج کیا ہے:-

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

اس سات سو برس پہلے کے شعر کی زبان وہی ہے جو آج صحیح و فصیح اردو کی ہے۔ اس لئے
اس شعر کا انتساب مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

۹۔ حضرت شیخ سراج الدین عثمان معروف بہ اخی سراج (متوفی ۷۵۸ھ/ ۱۳۵۷ء) حضرت

سلطان الاولیا کے مرید تھے۔ ان کے وصال کے بعد بنگالہ سے دہلی آئے اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے خلافت حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے حکم دیا "بنگالہ جاؤ"۔ شیخ صاحب نے عذر کیا کہ وہاں شیخ علاء الدین تِل پہلے سے موجود ہیں۔ میری کیا ضرورت ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "تم اوپر وے تِل"۔

۱۰۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء) ملک بہار کا ایک قصبہ منیر آپ کا وطن مبارک ہے۔ پوربی اور ہندی شاعر تھے۔ ان کے کچھ منتر دفع زہر وامراض کے لئے مشہور ہیں۔ خاکسار راقم کے خاندان میں بھی ایک منتر رائج ہے جس کی بڑی لمبی عبارت ہے۔ اس کے آخر میں یہ دُہرا ہے۔

کالا ہنسا نرملے بسے سمندر تیر ۔۔۔ پنکھ پسارے بس ہرے نرمل کرے سریر[۵]

ہمیں تحقیق نہ تھی کہ یہ منتر اور شعر کس کا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب مذکورہ سے معلوم ہوا کہ یہ شعر حضرت یحییٰ منیری کا ہے۔ مولوی صاحب نے حضرت کا ایک یہ دُہرا بھی نقل کیا ہے:۔

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے ۔۔۔ گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء

خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے (جن کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے) اردو میں ایک رسالہ اخلاق وتصوف پر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا۔ نثر اردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سید اشرف صاحب ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر کو (بحساب قمری) پہونچکر ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وفات پائی۔ خالق باری کا سال تصنیف معلوم نہیں۔ لیکن چونکہ امیر خسرو سید اشرف صاحب سے عمر میں ۳۵ سال بڑے ہیں اس لئے خالق باری کو مقدم رکھا گیا ہے ممکن ہے

---

[۵] میں نے یہ شعر اپنے خاندان کی روایت کے مطابق لکھا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق کے منقولہ شعر سے ایک آدھ لفظ میں اختلاف ہے۔

مادری زبان عربی تھی سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۳۳۳ء میں ہندوستان آیا اور عربی زبان میں اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس نے پردہ، پروانہ، بارگہ، سراچہ، ناخدا وغیرہ فارسی الفاظ کے ساتھ بہت سے اُردو کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ٹوٹ، منڈی، ڈولہ، کہار، ککھر، ان الفاظ کے ہندی حروف کو عربی حرف سے بدل لیا ہے۔ بعض جگہ الفاظ میں تغیر بھی کر لیا ہے۔ مثلاً کشری (کھچڑی) جوتری (چودھری) جوکیہ (جوگی) قطارہ (کٹارہ)

۱۴۱۹ء / ۸۲۲ھ (۱) ملا نذر محمد دہلوی معروف بہ "قاضی خان" نے ۱۴۱۹ء میں فارسی زبان کی کتاب لغت ادات الفضلا لکھی۔

۱۴۴۸ء / ۸۵۲ھ (۲) قوام الدین ابراہیم فاروقی نے بنگال میں سلطان رکن الدین باربک حاکم بنگالہ کے زمانے میں ایک لغت فارسی ۱۴۴۸ء میں مرتب کیا۔ اور شرف نامہ اس کا نام رکھا۔

۱۵۱۸ء / ۹۲۴ھ (۳) شیخ لاد دہلوی (متوفی ۱۵۱۹ء / ۹۲۵ھ) نے سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں موید الفضلاء کے نام سے فارسی لغت مدون کیا۔

ان تینوں لغات میں اور خصوصاً موید الفضلاء میں صدہا فارسی الفاظ کے معانی اُردو میں بیان کئے ہیں۔ اس طرح موید الفضلاء میں تقریباً آٹھ سو اُردو کے الفاظ آگئے ہیں۔ اُردو زبان کی اہمیت و ضرورت کی یہ کچھ کم دلیل نہیں ہے۔

۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء / ۸۴۳ھ تا ۹۲۴ھ (۴) کبیر داس بنارس کے مسلمان جولاہے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ کسی برہمن کے لاوارث بچے تھے۔ ایک مسلمان جولاہے اور اس کی بیوی نے بیٹا بنا کر عالم شیرخوارگی سے پرورش کی۔ بڑے ہو کر گرو رامانند کے چیلے ہو گئے اور پھر اپنا الگ مذہب کبیر پنتھ نکالا۔ ان کے پند آمیز دوہے کثرت سے مشہور ہیں۔ جن میں عربی و فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

کبیر شریر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین

کو بج نقارا سانس کا باجت ہے دن رین

کا نکر پاتھر جوڑکے مسجد لئے چُنا ئے

تا چڑھ ملّا بانگ دے، کیا بہرا ہوا خدا ئے

دین گوایو دُنی سے، دُنی نہ آیو ہاتھ　　پیر کہاڑی مار یو گا پھل اپنے ہاتھ

کبیر سے چند غزلیں بھی منسوب ہیں لیکن ان کی تاریخی سند مشتبہ ہے۔ اگر یہ غزلیں کبیر داس کی ہیں تو پھر دکن کی اولیت شعر و غزل کے سب نظریے باطل ہیں۔ ایک غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:۔

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا

رہیں آزاد یا جگ میں، ہمن دنیا سے یاری کیا

کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے

جو چلنا راہ نازک ہے، ہمن کو بوجھ بھاری کیا

۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء
۸۷۴ھ تا ۹۴۵ھ
(۵) گرونانک سکھ مذہب کے بانی کبیر کے ہم عصر تھے کبیر کی تعلیم اور مذہب اور شاعری سے متاثر ہوئے۔ ان کے دوہوں یا ہندی اشعار میں بھی عربی فارسی کی آمیزش اردو کی رفتارِ ترقی و مقبولیت کو ثابت کر رہی ہے۔ مثلاً

سانس ماس سب جیو تمہارا　　تو ہے کھرا پیارا

نانک شاعر یو کہت ہے　　سچے پروردگارا

۱۵۲۶ء
۹۳۲ھ
(۶) تاریخ داؤدی میں منقول ہے کہ جب جنگ پانی پت (۱۵۲۶ء) میں بابر نے سلطان ابراہیم لودی پر فتح پائی اور اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے:۔

نو سے اوپر تھا بتیسا[۳۲]　　پانی پت میں بھارت دیسا

اٹھیس رجب سکر وارا　　بابر جیتا براہیم ہارا

(یعنی ۲۸ رجب ۹۳۲ھ روزِ جمعہ)

(۷) سلطنت مغلیہ کے پہلے بادشاہ بابر نے ۱۵۱۹ء/۹۲۵ھ میں پہلا کامیاب حملہ سندھ پر کیا اور تیسرا حملہ ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ میں کر کے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا بابر صاحب سیف و قلم تھا۔ ترکی اور فارسی زبان کا شاعر تھا۔ دونوں زبانوں کا دیوان یک جا طبع ہو گیا ہے۔ ترکی زبان میں اپنے سوانح حیات ایک ضخیم کتاب تزک بابری میں مرتب کئے ہیں۔ قیام ہندوستان کے دوران میں اُردو زبان سے بھی مناسبت پیدا کی۔ اپنی تصنیف میں کثرت سے اُردو الفاظ لایا ہے۔ مثلاً ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کرونداِ چرونجی، گلہری، مور، دوپہر وغیرہ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک ترکی شعر میں بھی اُردو الفاظ اور اردو فعل استعمال کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

(۱۴۸۳ء تا ۱۵۳۰ء / ۸۸۸ھ تا ۹۳۷ھ)

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی　　فقرا ہلیغہ بس بولغو سید دریانی و روتی

(۸) اُردو کے رواج اور عام بول چال کا ایک عجیب و دلچسپ ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے بادشاہ مالوہ و گجرات بہادر شاہ پر حملہ کیا۔ اس کا سپہ سالار رومی خاں مغلوں سے خفیہ طور پر مل گیا تھا۔ رومی خاں کی غداری و بیوفائی سے بہادر شاہ کو شکست ہو گئی۔ ہمایوں کو اسباب غارت میں بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی ہاتھ آیا۔ طوطا انسانوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ فتح کے بعد ہمایوں کے دربار میں طوطے کا پنجرا رکھا ہوا تھا۔ رومی خاں دربار میں حاضر ہوا تو طوطا اس کو دیکھتے ہی چلاّ اُٹھا:-

(۱۵۳۵ء / ۹۴۲ھ)

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام، پھٹ پاپی نمک حرام"

(۹) تلسی داس مصنف رامائن اکبر و جہانگیر کے زمانے میں تھا۔ رامائن ہندی کی نظم ہے۔ خالص ہندوؤں کے قصص و حکایات، تہذیب و معاشرت رزم و بزم اس کا موضوع ہے۔ لیکن عربی و فارسی الفاظ اس قدر عام و مقبول تھے کہ تلسی داس رامائن میں بھی کہیں کہیں بیساختہ لکھ گیا ہے۔ تلسی داس نے اخلاقی دوہے بھی کہے ہیں ان میں تو کثرت سے عربی فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

(۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۳ء / ۹۳۸ھ تا ۱۰۳۲ھ)

جو بینا میں نا کہے، میٹھی شکر کھائے | جو بکری میں میں کہے سہج ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر | فرزیں شاہ نہ ہو سکے، گت ٹیڑھی تاثیر

(۱۰) سور داس بھی اسی زمانہ کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں بھی عربی فارسی کی کثرت ہے۔ مثلاً

کھیت بہت کا ہے تم تانے، سیں سی آواج (آواز)
دیو نہ جات پار اتر آوے، چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

اسی میں ایک قافیہ گریب نواج (غریب نواز) ہے۔

سنہ ۱۵۵۶ء تا سنہ ۱۶۰۵ء / ۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ

(۱۱) ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کے سامنے کسی اشتعال طبع پر ادہم خاں نے خان اتکہ کو قتل کر دیا تو اکبر نے بیساختہ ادہم خاں سے کہا:۔

اسے بچہ گا ڈی تو کیوں اتکہ مارا ازجان بیجان کر دی[1]

(۱۲) جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر و جہانگیر دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلے تو راجہ نے کہا:۔

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری | ہم باندے غلام رہے

اکبر نے برجستہ جواب دیا:۔

تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی | تم صاحب سردار رہے[2]

سنہ ۱۵۶۷ء تا سنہ ۱۵۹۳ء / ۹۷۵ھ تا ۱۰۰۱ھ

(۱۳) شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف زاد المتقین (مصنفہ سنہ ۹۹۶ھ) میں مذکور ہے کہ ان کے استاد و مرشد شیخ عبدالوہاب متقی متوطن مالوہ دکن سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں سنہ ۱۵۶۷ء سے وقت

---

[1] یہ فقرہ شمس العلما، مولانا محمد عبدالغنی ایم۔اے۔ ایم لٹ، پروفیسر ناگپور یونیورسٹی نے "تاریخ پہلا ونی" قلمی سے اپنی تصنیف تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ جلد سوم میں درج کیا ہے۔

[2] یہ واقعہ بھی پروفیسر محمد عبدالغنی صاحب کی اسی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔

وفات ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲ء تک ۲۶ سال طلبہ کو درس دیتے رہے جس کی صورت یہ تھی کہ عرب طالب علموں کو عربی زبان میں سمجھاتے تھے۔ اہل عجم کو فارسی میں اور ہندوستانیوں کو اُردو میں۔

یہ سب واقعات اُردو زبان کے رواج عام کثرت اشاعت، مقبولیت و اہمیت کے ثبوت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء) کے زمانے سے اُردو مستقل زبان بن کر بول چال، لین دین، کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اگرچہ شاہی زبان، دفتری زبان، کتابی زبان، مدت تک فارسی رہی، لیکن کاروباری زبان اور رعایا کی زبان عام طور پر اُردو ہی تھی۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا دورِ قدیم | اب تک جو نمونے درج کئے گئے وہ بول چال کی اردو کے تھے۔ یا ہندی شاعری میں فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش کے۔ کبیر داس، گرو نانک، تلسی داس، سورداس کے دوہوں میں عربی و فارسی زبانوں کے شامل ہونے سے اُردو زبان کی شان بے شک پیدا ہو گئی اور اس کو یقیناً اُردو شاعری کا سنگ بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اُردو شاعری جس چیز سے عبارت ہے اس میں فارسی بحریں بھی شامل ہیں۔ اس اعتبار سے بھی اُردو شاعری کا آغاز قدیم زمانہ میں ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت امیر خسرو اور کبیر داس کی غزلیں اور امیر خسرو کی خالق باری ہے۔ اگرچہ ان کی سند تاریخی مشتبہ اور مختلف فیہ ہے۔ تاہم ان کا وجود خارج از قیاس نہیں ہے خاص کر جبکہ کبیر داس ہی کے زمانے میں ایسے شاعر اور بھی موجود تھے جنھوں نے اردو فارسی کی مخلوط غزلیں کہی ہیں اور اس کے بعد سے شاعری و غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء | (۱) نوری اعظم پوری اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھا۔ فیضی کا دوست تھا اس کا یہ شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں درج کیا ہے:۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

۱۵۹۳ء / ۱۰۰۲ھ (۲) حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کاکوروی بھی اکبر کے زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اکبر کی زندگی میں ۱۵۹۳ء/۱۰۰۲ھ میں اُن کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی ایک غزل مشہور ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

ہماتین کو دل دیا، تم دل لیا اور دُکھ دیا
ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ بیت ہے

۱۶۲۵ء / ۱۰۳۴ھ (۳) محمد افضل ساکن جھنجھانہ ضلع میرٹھ تلسی داس کا ہم عصر ہے۔ اکبر و جہانگیر کا زمانہ دیکھا ہے۔ کسی ہندو عورت پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اپنی داستان محبت عجیب والہانہ انداز سے نہایت درد انگیز اُردو مثنوی میں بیان کی ہے مثنوی کافی طویل ہے۔ ایک نظم بارہ ماسہ بھی لکھی ہے۔ ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۵۸ء / ۱۰۶۸ھ (۴) ناصر افضلی الہ آبادی شاہجہاں بادشاہ کے زمانے کا شاعر ہے۔ میر نذر علی دَرد کاکوروی کا بیان ہے کہ ناصر افضلی کا مکمل دیوان اُردو غزلیات کا مولوی عبدالحق بی اے دہلوی سکرٹری انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد کے پاس موجود ہے۔ اس دیوان کا وجود اس دعوے کو بھی غلط ثابت کرتا ہے کہ شمالی ہند میں غزل گوئی کا رواج شمس الدین ولی اورنگ آبادی کے دیوان کو دیکھ کر شروع ہوا۔

۱۶۶۲ء / ۱۰۷۳ھ (۵) پنڈت چندر بھان برہمن تخلص بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں عمر گذاری۔ شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں منشی تھے۔ پھر شاہزادہ داراشکوہ کے میر منشی رہے۔ ۱۶۶۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:-

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے، نہ پیالا ہے

پنڈت چندر بھان برہمن کے انتقال کے بعد ولی اورنگ آبادی پیدا ہوئے ہیں

اور تقریباً سنہ ۱۷۰۰ء ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے کلام کی شہرت دہلی میں نہیں ہوئی بلکہ سنہ ۱۷۲۱ء ۱۱۳۳ھ میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا ہے۔

سنہ ۱۶۹۰ء ۱۱۰۱ھ | (۶) معز الدین موسوی خان فطرت مشہد (ایران) کے رہنے والے تھے سنہ ۱۶۷۱ء ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان آئے دربار عالمگیری میں اعزاز پایا۔ فارسی کے شاعر تھے۔ اردو میں شعر گوئی کا چرچا دیکھ کر کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے تھے ایک شعر ان سے یادگار رہ گیا ہے جس میں اردو اور فارسی مخلوط ہیں:-

از زلف سیاہ تو بدل دُوم پری ہے[۵۱]   در گلشن آئینہ گھٹا جوم پری ہے[۵۲]

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اردو شاعری کو رواج ہو چلا تھا۔ حالانکہ ولی اورنگ آبادی کا دیوان ابھی دہلی میں نہیں آیا تھا۔

سنہ ۱۷۲۱ء ۱۱۳۳ھ | (۷) مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ شہزادہ محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیر کی سرکار میں نوکر ہوئے کسی نے شاہزادہ کے سامنے میرزا کی تعریف کی۔ شہزادہ نے کہا ہماری شان میں قصیدہ کہہ کر لائیں تو استعداد دیکھ کر اضافہ منصب و تقرب سے سرفراز کریں گے۔ میرزا نے یہ سنا تو نوکری سے استعفا دیدیا۔ دوستوں نے ہر چند اصرار کیا کہ قصیدۂ مدحیہ لکھیں۔ لیکن انھوں نے انکار کیا۔ گوشہ عزلت اختیار کر لیا اور باقی عمر فقر و توکل میں گذار دی۔ سنہ ۱۷۲۱ء ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔ فارسی کے بڑے اعلیٰ شاعر تھے۔ اردو کے دو شعر قائم و میر وغیرہ کے تذکروں میں ملتے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا

---

[۵۱] یعنی دھوم پڑی ہے۔   [۵۲] یعنی گھٹا جھوم پڑی ہے۔

پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے ہم میں

دیکھو ان اشعار کی زبان کس قدر صاف و صحیح ہے۔ یاد رہے کہ بیدل کے زمانے میں ولی کی شاعری کا چرچا دہلی میں شروع نہ ہوا تھا۔

۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء تا ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء (۸) جعفر زٹلی شاہجہاں کے زمانے میں ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں پیدا ہوا، اور عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں انتقال کیا۔ مشہور مسخرا گزرا ہے۔ بہرحال شاعر تھا اور اس حیثیت میں اپنے ہم عصروں سے کم نہ تھا۔ اس کی ہزلیات میں کہیں کہیں مہذب ظرافت بھی موجود ہے۔ ایک مطبوعہ مجموعۂ کلام اس کی طرف منسوب ہے۔ وہ سب اس کا نہو پھر بھی اس نے بہت کچھ کہا ہے۔ جعفر عمر میں ولی اورنگ آبادی سے بڑا ہے۔ ولی جب دہلی آئے جعفر کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ تھی۔ اس نے ولی کے دہلی آنے سے پہلے شاعری شروع کر دی تھی۔

۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء (۹) میر عبدالجلیل بلگرامی علامۂ جلیل و شاعر بے عدیل گزرے ہیں۔ ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں وفات پائی۔ علامہ مرحوم نے ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں نواب نظام الملک آصف جاہ وزیر فرخ سیر بادشاہ دہلی کی شان میں ایک قصیدہ فارسی لکھا ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تاریخیں کہہ کر شامل کی ہیں۔ اردو کی تاریخ کا شعر یہ ہے:-

ایسیں دیکے کہی ہندوی موں یوں سنبت

"رہے جگت موں اچل باس یہ وزیر سدا"

۱۱۳۴ھ

۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء (۱۰) میرزا عبدالغنی قبول کشمیری دہلی میں سکونت گزیں تھے۔ ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں وفات پائی۔ فارسی کے شاعر تھے اردو کا ایک شعر ان سے یادگار ہے۔

دل یوں خیال زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن　　تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

م ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء (۱۱) میرزا محمد رضا قزلباش خان ہمدانی اُمید تخلص شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ سید حسین علی بد "بادشاہ گر" کے دورِ سیادت میں برہان پور کرناٹک وغیرہ میں ملازم رہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے قزلباش خاں خطاب پایا۔ آخر دہلی میں اقامت اختیار کی اور وہیں ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں رحلت کی۔ ہندوستان آنے کے شروع زمانے میں جو شعر اردو کا کہا اس میں فارسیت بھی غالب ہے اور دکنیت بھی کہتے ہیں:-

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ موں پڑی — غصہ کیا و گالی دیا و دگر لڑی

پھر دہلی میں رہ کر یہ شعر کہے:-

در و دیوار سے اب صحبت ہے — یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

نثر اُردو کا دَورِ اوّل

دکن میں اُردو | یہ بات قابلِ غور ہے کہ پنجاب، دہلی اور تمام شمالی ہند میں اردو زبان کی ابتدا یعنی گیارھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی کے آغاز تک کسی مستقل و مکمل تصنیف نثر یا نظم، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، موجود یا مفقود کا پتہ نہیں ملتا بجز امیر خسرو کی خالق باری اور سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالۂ نثر اور افضل جھنجھانوی کی مثنوی کے۔ یہ کتابیں تبرکات ادبی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کی ایجاد کا سہرا پنجاب کے سر ہے۔ اور شاعری و تصنیف کا طرہ شمالی ہند کے سر ہے۔ لیکن یہ کارنامے امتیاز و اعزاز سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ برخلاف دکن کے، کہ اردو زبان کے رواج میں دکن پنجاب سے تین[۳] سو برس پیچھے ہے، اور دہلی سے تقریباً سوا سو[۱۲۵] برس بعد

اس پر بھی دکن نے اُردو کی اتنی قدر کی کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی تک نظم و نثر کی صدہا کتابیں تیار کر دیں، جن میں شعر و سخن اور علم و فن کی مختلف اصناف شامل ہیں۔

اس کا سبب | ترقی زبان و ادب کے معاملے میں دہلی کی تاخیر اور دکن کی تقدیم کا ایک سبب تو یہ تھا کہ فتح دہلی (بارھویں صدی عیسوی کا آخر) کے وقت سے شاہان دہلی کو برابر انقلاب ملکی و آشوب سیاسی پیش آتے رہے اور اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ حکمران خاندان اس قدر جلد جلد تبدیل ہوتے رہے کہ سلطنت مغلیہ تک کسی خاندان کو حکومت کے لئے ایک صدی بھی میسّر نہیں آئی۔ غوری خاندان (سنہ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء تا سنہ ۶۰۳ھ / ۱۲۰۶ء)، غلام خاندان (سنہ ۶۰۳ھ / ۱۲۰۶ء تا سنہ ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء)، خلجی خاندان (سنہ ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء تا سنہ ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء)، تغلق خاندان (سنہ ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء تا سنہ ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء)، سید خاندان (سنہ ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء تا سنہ ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء)، لودی خاندان (سنہ ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء تا سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء)، سوری خاندان (سنہ ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء تا سنہ ۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء) کے زمانوں میں تقریباً چارسو برس تک حکومت دہلی اندرونی شورشوں اور بیرونی حملوں کا تختۂ مشق بنی رہی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اس عرصے میں شاہان دہلی اہل ہند کے ساتھ حاکم و رعایا اور مخدوم و خادم سے بڑھ کر تعلقات پیدا نہ کر سکے۔

تیسرا سبب یہ کہ اس تمام مدت میں شاہی زبان اور دفتری و عدالتی زبان فارسی رہی۔ مخلوط زبان (اردو) بننے اور بڑھنے لگی تھی لیکن اس کو شاہی سرپرستی حاصل نہ ہوئی۔ اس لئے اس عرصے میں جتنی شاعری اور تصنیف و تالیف ہوئی فارسی زبان میں ہوئی۔ مسلمان اہل قلم نے اردو نوازی کی طرف توجہ نہ کی، ہندو اہل ذوق اَلنَّاسُ[لہ] عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ کے اصول پر فارسی علم و ادب حاصل کرتے رہے۔

[لہ] رعایا بادشاہوں کا طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔

برخلاف دکن کے کہ فتح دکن (۱۳۱۲ء ۷۱۲ھ) کے چند سال بعد حسن بہمنی[۵۱] نے (جو محمد تغلق بادشاہ کا امیر دربار اور دکن میں بادشاہ کی طرف سے متعین تھا) حکومت سے بغاوت کرکے دکن میں شاہی اختیارات غصب کرلئے اور ۱۳۴۷ء ۷۴۸ھ میں سلطنت بہمنیہ قائم کرلی۔ یہ دکن میں پہلی خود مختار سلطنت تھی جو تقریباً دو سو برس (۱۵۲۶ء ۹۳۲ھ) تک قائم رہی۔ اس طویل مدت کے اکثر حصے میں ملک دکن پُرامن رہا۔ حسن بہمنی نے بادشاہ بنتے ہی اہل ملک و ہندوان دکن کو فوج و دربار میں اعلیٰ عہدے دئے۔ ایک برہمن کو وزیر مال بنایا۔ اس کے بعد بھی تمام شاہان بہمنی نے ہندوؤں کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات تمدنی و معیشتی قائم رکھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن بہمنی نے سلطنت کی دفتری و کاروباری زبان کے لئے بجائے فارسی کے ہندی کو پسند کیا۔ اس حُسن انتخاب اور سیاسی تدبُّر نے انتظام سلطنت کی آسانیوں کے ساتھ اردو زبان میں شعر و ادب کی بنیاد بھی ڈال دی۔

---

[۵۱] تاریخ فرشتہ کی غلط بیانی سے عوام میں حسن بہمنی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہوگیا ہے کہ وہ کانگو نام برہمن کا ملازم تھا۔ ایک دن کھیت میں کوئی دفینہ نکلا۔ حسن نے اپنے آقا برہمن کو اطلاع کی۔ وہ اس دیانت داری سے خوش ہوا اور سلطان محمد تغلق سے حسن کی سفارش کرکے اس کو دربار میں نوکر کرادیا۔ حسن نے دکن میں سلطنت قائم کی تو شکر و احسان کے طور پر برہمن کا نام شامل کرکے سلطنت بہمنیہ نام رکھا۔ فرشتہ کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حسن ایران کے بہمن شاہ کی نسل سے تھا اس لئے اپنے آپ کو بہمنی کہتا تھا۔

"منثورات قدیمہ"

۱۳۵۶ء

سلطنت بہمنی

۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء تا ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء

دکن کا سب سے پہلا اردو مصنف شیخ گنج العلم (وفات ۷۹۵ھ ۱۳۹۳ء)

شیخ عین الدین گنج العلم حکومت علاءالدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی ۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء پیدا ہوئے۔ آغاز شباب میں تحصیل علم کے لئے گجرات کا سفر کیا۔ اس عرصے میں حکومت دہلی خلجی خاندان سے تغلق خاندان میں منتقل ہو گئی۔ ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں محمد تغلق تخت دہلی پر بیٹھا اور ۷۲۶ھ ۱۳۲۶ء میں اس نے مرکز حکومت دکن کو منتقل کر کے دیوگیر (دولت آباد) کو پایۂ تخت بنایا اور ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء تک دکن میں اس کی حکومت رہی۔ اسی زمانے میں شیخ گنج العلم دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد آئے۔ وہاں سے بیجاپور آ کر قیام کیا اور بیجاپور ہی میں ۷۹۵ھ ۱۳۹۳ء میں وفات پائی۔ شیخ صاحب کثیر التعداد فارسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دکنی اردو میں بھی چند مختصر رسالے مسائل شرعیہ کے متعلق تصنیف فرمائے۔ دکن میں اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں یہی ہیں۔ لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔

اردو کی سب سے قدیم کتاب جو شائع ہوئی

معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز سب سے قدیم کتاب ہے جو حال میں شائع ہوئی ہے (باستثنائے "خالق باری")۔

خواجہ گیسو دراز ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے فیض باطن اور اجازت و خلافت پائی۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت (۸۱۵ھ ۱۴۱۲ء) میں دہلی سے حسن آباد (گلبرگہ) آئے۔ احمد شاہ اول بہمنی کے زمانے میں ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء میں وصال فرمایا۔ عربی و فارسی کے بڑے اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے۔ اپنے مریدوں اور عام طلبۂ علم کو درس بھی دیا کرتے تھے اور عوام کی آسانی کے لئے کبھی کبھی دکنی اردو میں بھی سمجھاتے تھے۔ آپ کے چند مقولے اور اشعار کتابوں اور بیاضوں میں پائے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) "بھوکوں موے سوں کچھ اپڑ یتا ہے، خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہو رہے"

(۲) او معشوق بے مثال نور نبیؐ نہ پایا اور نور نبی رسولؐ کا میرے جیو میں بھایا

اپس میں اپیں دیکھاونے کیسی آرسی لایا

(۳) گھوڑے کوں بھیتر کھوڑے اس کوں نہ حکمت ہو رہے

ہر دم ذکر سوں توڑ ہے غافل نہ ہو ہشیار توں

کر دسکلا دل گیان کا انعام دے خوش دھیان کا

چارا کھلا ایمان کا رکھ باندا اپنے وار توں

خو گیر شریعت نعل بند زین ہے طریقت زیر بند

حق ہے حقیقت پیش بند تنگ معرفت اختیار توں

تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا

تب عشق جھگڑا پائے گا خد مارلے تروار توں

شہباز حسینی کہے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر

اللہ آپے یک ہوے کر تب پاوے گا دیدار توں

ان کے علاوہ خواجہ صاحب کے بعض رسائل دکنی اردو کے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن میں سے معراج العاشقین کو مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"اے عزیز، اللہ بندہ پنا یہاں پچھان کو جانا، نیں تو شرع جاتا ہے۔ اول اپنی پچھانت بعد از خدا کی پچھانت کرنا۔"

"انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی۔ نفس اس کا امّارہ، یعنی واجب الوجود کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ ترس کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حسد تک سوں بد بوئی نہ لینا سو۔

بنفس کی زبان سوں بدگوئی نکرنا سو۔ کینا کی شہوت کوں غیر جا کا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پچھان دوا دینا۔" [۵۱]

[۵۲] معراج نامہ اور رسالہ سہ بارہ بھی حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف سے دریافت ہوئے ہیں ان کے نمونے یہ ہیں:۔

"بتحقیق خدا کے میانے ستر ہزار پردے او جیلے کے ہور اندھارے کے۔ اگر اس میں تے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں" (معراج نامہ)

سوال۔ ایمان کے جھاڑاں کیا اور ایمان کی ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات کیا اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان کا سر کیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب۔ ایمان کا جیو قرآن۔ ایمان کی جڑ توبہ۔ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی۔ ایمان کی پات پرہیزگاری۔ ایمان کا تخم سو علم۔ ایمان کا پوست سو شرم۔ ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے۔ (رسالہ سہ بارہ)

سلطنت عادل شاہی

۸۹۵ھ ۱۴۹۰ء تا ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۶ء

بہمنی سلطنت کے چودھویں حکمراں محمود شاہ کی غفلت و کمزوری سے سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ تو بیجاپور (جو سلطنت بہمنیہ کا ایک صوبہ تھا) کے گورنر یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ ۱۴۹۰ء میں خودمختاری کا اعلان کر دیا اور بیجاپور میں عادل شاہی حکومت قائم کر دی

---

[۵۱] یہ عبارت اور اشعار مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔
[۵۲] ماخوذ از اردو شہ پارے مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

دو سو سال تک قائم رہی۔ آخر ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجاپور کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

اکثر شاہان بیجاپور خود عالم و شاعر اور قدردان تھے۔ سلاطین بہمنی نے اردو کو دفتری زبان بنا دیا تھا۔ عہد عادل شاہی کے پہلے اور دوسرے بادشاہ نے پھر اردو کی جگہ فارسی کو رواج دیا۔ اور تقریباً پچاس سال تک دفتر پر فارسی کی حکومت رہی۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ھ ۱۵۳۴ء تا ۹۶۵ھ ۱۵۵۷ء) نے مصالح ملکی کے لئے اردو ہی کو موزوں سمجھا اور بجائے فارسی کے دوبارہ اردو کو رائج کر دیا۔ اس کے بعد پھر سلطنت کے ساتھ زبان کی قسمت پلٹی۔ یعنی ابراہیم کے جانشیں علی عادل شاہ نے پھر فارسی کو ترجیح دی۔ لیکن پھر اس کے جانشیں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اردو کو فارسی کی مسند پر بٹھا دیا۔ اس عرصہ میں اردو زبان دکن میں عام ہو گئی تھی۔ لیکن اہل تصانیف میں شعرا کی تعداد زیادہ تھی۔ تاہم مصنفین نثر بھی موجود تھے۔ مثلاً

شمس العشاق شاہ میراں جی | حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے دکن آکر حضرت خواجہ گیسو دراز کے خلیفہ سے بیعت کی۔ بیجاپور میں ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء میں وفات پائی۔ دکن نے شاہ صاحب سے بڑا فیض پایا ہے۔ دکن کے بڑے علما و صوفیا میں ان کا شمار ہے۔ ان کی تمام تصانیف اردو نثر یا نظم میں ہیں۔ تصانیف نثر میں سے شرح مرغوب القلوب۔ جل ترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں۔ پہلے رسالہ کا نمونہ یہ ہے:۔

"خدا کہیا، تحقیق مال اور بنگڑے[۵۱] تمہارے دشمن ہیں۔ چھوڑ دیو دشمناں کوں۔ اے کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا[۵۲] کیا موت کی یاد تھے[۵۳] تجھے بسرا[۵۴] کر۔"

سب رس نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملا وجہی کی سب رس سے پہلے لکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

---

۵۱ بنگڑے = اولاد ۵۲ اندھلا = اندھا ۵۳ تھے = سے ۵۴ بسرا کر = بھلا کر۔

"اول تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اسے پوچھ، توں نہیں سکلاتا سو تجھ پر کھلا ہے۔ اس کا کام اس پر نہیں کھلیا، سو تجھ پر کیا کھلے گا۔ توں کیا سمجھ کر بولیا ہے۔ بھو سکیکا تو ادھر ادھر کیاں چار حکایتاں۔ اس حکایتاں سوں کیا حاصل۔"

شاہ برہان الدین جانم | شاہ میراں جی کے فرزند ہیں۔ اولیا ر کبار میں ہیں۔ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) کے بعد وفات پائی ہے۔ نثر میں ایک رسالہ کلمۃ الحقائق ان کی تصنیف سے ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے طور بیان کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

" یہ تن الادھا دستا۔ ولیکن جیتا بکار، ٹوٹنے نہیں بلکہ ستنتر بکار روپ دستا ہے۔ یک تل قرار نہیں، جیوں مرکٹ روپ "[ا]

دکن میں اردو زبان دہلی سے پونہچی تھی لیکن دکنی زبان کی اس قدر آمیزش ہو گئی کہ سمجھنا دشوار ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ | شاہ برہان الدین جانم کے فرزند و جانشیں ہیں۔ تاریخ وفات "ختم ولی" سے ۱۰۸۶ھ نکلتی ہے (مطابق ۱۶۷۵ء)۔ نثر میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ایک رسالہ گنج مخفی کا نمونہ یہ ہے:-

" اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی، سو اس سے امین دیکھ ہوا، امین شاہد کہتے ہیں، یو دونوں ذات کے دو طور ہیں، ذات نے اپس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

[ا] الادھا = علیحدہ۔ دستا = نظر آتا۔ بکار = متحرک۔ ستنتر = بدلنے والا۔ روپ = بھیس، حالت۔ مرکٹ = بندر۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے "یہ جسم علیحدہ نظر آتا ہے لیکن زندہ متحرک ہے۔ ٹوٹتا نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ متحرک حالت میں نظر آتا ہے۔ ذرا سی دیر کو قرار نہیں۔ گویا بندر ہے۔"

ان کی عبارت ان کے پدر بزرگوار اور جد امجد کی تصانیف کے مقابلے میں صاف و آسان ہے۔

سلطنت قطب شاہی

سنہ ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء تا سنہ ۱۰۹۸ھ ۱۶۸۷ء

گولکنڈہ جو قطب شاہی بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا، بہمنی سلطنت ہی کا صوبہ تھا۔ مرکزی حکومت کے ضعف و زوال کا نتیجہ تھا کہ سلطان قلی قطب الملک نے اعلان خود مختاری کر کے گولکنڈہ کو دارالسلطنت بنایا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ ڈیڑھ سو برس سے زیادہ قائم رہنے کے بعد اس کی تباہی بھی شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

شاہان گولکنڈہ بھی اردو کے بڑے قدردان تھے۔ تین بادشاہ اردو کے شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ (ان کا ذکر حصہ نظم میں آئے گا)۔ اس دور میں نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اور گزشتہ دونوں عہدوں سے بہتر لکھی گئیں۔

شاہ میرانجی خدانما سید میراں حسینی بھی کہلاتے ہیں۔ حیدرآباد وطن تھا، بیجاپور جا کر شاہ امین الدین اعلیٰ سے بیعت کی بادشاہ گولکنڈہ عبداللہ شاہ (سنہ ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۵ء تا سنہ ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء) کے زمانے میں تھے۔ گراہم بیلی نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے ملازم بھی رہے ہیں۔ انہوں نے "تمہیدات عین القضات"، مصنفہ عین القضات ہمدانی کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ جس کا نام شرح تمہید ہمدانی ہے۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ سنہ ۱۰۱۲ھ ۱۶۰۳ء میں لکھا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پاس جو نسخہ ہے اس پر سنہ کتابت سنہ ۱۰۶۷ھ درج ہے۔ گراہم بیلی نے سید صاحب کا سال وفات سنہ ۱۶۵۹ء (مطابق سنہ ۱۰۷۰ھ) لکھا ہے اور مولوی عبدالحق صاحب نے سنہ ۱۰۷۴ھ (مطابق سنہ ۱۶۶۳ء)۔ بہرحال یہ کتاب دکن کی قدیم تصانیف اردو میں ضخیم ہونے کے سبب سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"اے عزیزاں، اسے بات نہیں سنیاں۔ بادشاہ گھوڑا مستعد کئے

باج[1] نہیں سوار ہوتے۔ ہور گھوڑے میں کج[2] کھوڑا تھے[3] تو بھی نہیں قبول کرتے یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوے باج خدا کے عشق میں نا آسک سی ہور[4] دیکھ ناسک سی۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلو تے مہیا کن۔ اس کا معنا، خدا کی پہچان کابل نہیں تو اول اپنی پہچانت کر"

ملا عبداللہ | عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں تھے۔ ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں احکام الصلوٰۃ کے نام سے ایک رسالہ دکنی اردو میں لکھا ہے جس میں فقہ حنفی کے مطابق احکام شریعت بیان کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

"روح قبض ہوا اسی وقت اس کیاں انکھیاں موچنا ہور پاؤں دراز کرنا ہور ہاتھ دراز کرنا دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینے پر نا رکھنا۔ ہور اس کی ٹھڈی ہور سر کوں ملا کر بندنا۔ یو سب سنت ہے۔ ہور مرنے تے اول اس کے سر کوں قطب کی طرف سلانا۔ ہور نوسے بعد از غسل دینا اسی طریق سوں"

ملا وجہی | عہد قطب شاہی کا نہایت ممتاز شاعر و مصنف تھا۔ اس نے چار بادشاہوں ابراہیم قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ایک کتاب سب رس نثر میں لکھی۔ یہ کتاب چند سال ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ اور فرہنگ لغات قدیم کے ساتھ شائع کر دی ہے۔ اصل کتاب ٹائپ کے تین سو صفحوں پر چھپی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب دکن کی قدیم اردو کتابوں میں سب سے بڑی ہے۔ سب رس کا دوسرا نام "قصہ حسن و دل" ہے۔ فرضی قصے کی صورت میں عشق و عقل اور حسن و دل کے معرکے بیان کئے ہیں۔ افراد قصہ کے نام مہر، وفا، ناز، غمزہ، ناموس، زہد، توبہ وغیرہ رکھے ہیں اور اس پیرایہ میں ان جذبات و واردات کے حقائق بیان کئے ہیں۔

---

[1] بغیر۔ [2] کچھ۔ [3] عیب۔ [4] ہو۔ [5] نہیں آسکتا ہے [6] اور۔

اگرچہ وجہی نے اس کتاب میں کہیں اس امر کا اظہار نہیں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اصل قصہ اس کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) نے فارسی نظم میں لکھا تھا۔ اس کا نام دستور عشاق ہے۔ فتاحی نے اسی قصے کو مختصر طور پر فارسی نثر میں بھی لکھا تھا اور اس کا نام حسن و دل رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کو مثنوی دستور عشاق دستیاب نہیں ہوئی بلکہ قصہ نثر "حسن و دل" مل گیا۔ اس میں ادنیٰ سا تصرف کرکے وجہی نے اردو میں لکھ دیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حسن و دل کی فارسی نثر مقفیٰ و مسجع ہے وجہی نے بھی سب رس میں ایسی ہی اردو نثر لکھی ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

(آغاز کتاب) "تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں کھیا ہے کریم۔ سمج دیکھ خاطر لیا آتال، حدیث بھی یوں آئی ہے کہ العلم نقطۃ و کثرھا الجہال، یعنی علم یک نقطہ ہے جاہلاں اسے بڑھاسے جہالت کو اس حد لگن لیاسے۔"

(آغاز داستان) "نقل۔ ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کے ناوں عقل، دین و دنیا کا تمام اس تے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرّا کیں نیں ہلتا۔ اس کے فرمانے پر جنو چلے، ہر دو جہاں میں ہوے بھلے۔ دنیا

۱؎ فتاحی کا یہ قصہ نثر بہت مشہور و مقبول ہوا۔ چار ترکی مصنفوں نے اس کو اپنی زبان میں لکھا لامعی اور آہی نے نثر میں۔ اور روانی و صدقی نے نظم میں۔ دو انگریزوں اور ایک جرمن ڈاکٹر نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اصل کے ساتھ چھاپا۔ ہندوستان میں صلاح الدین صرفی نے اور داؤد المی نے ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں اسکو فارسی مثنوی میں لکھا۔ پھر شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ملا جامی بجود (متوفی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) نے نظم کیا اور خواجہ محمد بیدل نے ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۳ء میں پر تکلف فارسی نثر میں لکھا۔ یہ فتاحی کی تصنیف کی قدر شناسی تھی۔ وجہی کے سب رس کو بھی دکن کے دو شاعروں ذوقی اور مجرمی نے اردو نظم میں لکھا ہے۔

یں خوب کہواے، چار لوگوں میں عزّت پاے"

(ختم داستان) "الحمد للہ دونوکوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال۔ دل کوں لیا جیو کا جانی، یو وصال مبارک یو خوشی ارزانی۔ ایتی جفا دل پڑی، تو یسر ہوئی یو وصال کی گھڑی۔ مرداں نے شفقت سوں امید کے دروازے کھولے ہیں، من طلب شیئاً وجد فوجد کر بولے ہیں۔ یعنی جو کوئی جس کام جد دھریا، ان نے وو کام کریا"

میراں یعقوب | ایک ضخیم کتاب "شمائل الاتقیا" مصنفہ شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کو میراں یعقوب نے ۱۰۷۸ھ؍۱۶۶۷ء کے بعد اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل ہیں۔ مضامین کتاب کو چار قسموں میں بیان کیا ہے ان اقسام کی شروع میں تفصیل کر دی ہے، اس طرح۔

پہلا قسم۔ طریقت کے لوگوں کے افعال ہور سالکاں کے مقاماں ہور مریداں ہور طالباں کے طلباں ہور اس کے عجائبات ہور باریکیاں کی شرح میں بیان کیا گیا ہے۔

سبب ترجمہ۔ اپنی حیات کے وقت منجے[۱] اشارت کئے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے تا یہ کسی کو سمجھا جاوے۔ اس وقت منجے بیانہیں تا کہ یک ہزار ستر پہ آٹھوں سال کوں رحلت کئے پران کے بھانجے عارف حق رسیدے عارفوں کے نور دیدے مصطفےٰ کے سیجے ہو۔ مرتضیٰ کے نیں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زمانے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا۔ جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا۔

---

[۱] منجے = مجھے۔

ذکر معجزہ و کرامت۔ ھور[51] ولیاں کوں کرامت ہے کہ اینو[52] پورا علم دھرتے ہیں وے مغلوب ھور بیخود ہیں۔ جیکچہ[53] اینو سے تھے[54] ظاہر ہوتا ہے سو اسے کرامت کہتے ہیں۔ اما معونت او[55] ہے جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دھرتے ہیں انو[56] سے کچھ خرق عادت یعنی کدھن[57] نہیں ہوتا ہے سو چیز ظاہر ہوتا ہے۔ ھور مند راج استدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگوں کچھ سحر ھور منتر ھور اس وزاں[58] کے چیزاں ظاہر کرتے ہیں[59]۔

دکن بعہدِ مغلیہ

سنہ ۱۶۸۶ء (۱۰۹۸ھ) تا سنہ ۱۷۳۰ء (۱۱۴۲ھ)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے سنہ ۱۶۸۶ء میں بیجاپور پر اور سنہ ۱۶۸۷ء میں گول کنڈہ پر قبضہ کر کے پھر دکن میں مغلیہ سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں بھی دکن میں اردو کی ترقی اور تصانیف نثر و نظم کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر عہد میں نثر کی تصانیف نظم کے مقابلے میں بہت کم ہوئی ہیں۔ اس عہد کا بھی یہی حال ہے۔ تاہم بعض کتابوں کے نام اور بعض کے نمونے ملتے ہیں۔

۱۔ سید شاہ محمد قادری اورنگ زیب کے زمانے میں تھے۔ رائچور کے خاندان "نور دریا" کے بزرگ تھے اور شیخ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ۔ چند رسائل تصوف اردو نثر میں لکھے ہیں۔

۲۔ شاہ ولی اللہ قادری خلف شاہ حبیب اللہ قادری نے سنہ ۱۷۰۴ء (۱۱۱۵ھ) میں "معرفت السلوک" (مصنفہ شیخ محمود) کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا سنہ ۱۷۴۴ء (۱۱۵۷ھ) میں انتقال ہوا۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے۔ نمونہ یہ ہے :-

---

[51] ھور = اور [52] اینو = یہ لوگ۔ [53] جیکچہ = جو کچھ۔ [54] تھے = سے۔ [55] او ہے = وہ ہے۔
[56] انو = اُن [57] کدھن = کبھی [58] وزاں = وضع۔ [59] ماخوذ از دکن میں اردو۔

"بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ہور بارگاہ اعالی عاجز
فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کئے منجکوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب
بزرگ اولیا کے بڑے اتقیا کے، ہور صدر نشیں محمد مصطفےٰ کے، صاحب شریعت ہور
طریقت کے، دربار حقیقت اور معرفت کے وارث محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ
قادری باقی رکھے اللہ انو کوں۔"

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے بیان میں بیان کروں۔ ہور اس کی شرطاں
کی شرح کوں عیاں کروں۔ کیا واسطا کہ سر من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے نکتیں کے تحقیق
کرنا بہوت مشکل ہے۔ کیا واسطا کہ یو کلام صاحب دل کا ہے نہ ہر ایک بے دل کا ہے۔
ہور عارفاں نے اس بات میں بہوت کئی باں کئی ہیں۔"

۳۔ سید شاہ میر بھی اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ قصبہ راجوتی وطن تھا۔ اردو نثر میں ایک
رسالہ "اسرار التوحید" لکھا ہے۔ ایک اور رسالہ حقائق بھی شاہ میر کی تصنیف سے ہے جس کا
ایک نسخہ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء کا لکھا ہوا۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"قل انما انا بشر مثلکم جو خدا ئے تعالیٰ فرمایا یعنی میں معبود نیں[۱] بلکہ تمہارے ساعبد
ہوں خدا کی نسبت۔ ہور[۲] خدا نیں بلکہ بندہ ہوں خدا کا رسول ہوں۔ تمیں[۳] بج سوں ہے۔ ہور
میں خدا سوں ہوں۔ یعنی تمیں میرے نور ہیں ہور میں خدا کا نور ہوں۔ اپس[۴] سوں مجکوں جدا
مت جانو۔ ہور مجھے اپس میں دیکھو۔ ہور سمجھو کہ خدا سے تعالیٰ منت رکھیا[۵] ہے تمنا[۶] پر اس بات
کا کہ لقد منّ اللہ۔"

۴۔ مترجم طوطی نامہ قادری۔ اس شخص کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ طوطی نامہ ان کتابوں
میں سے ہے جو الف لیلہ اور کلیلہ دمنہ کی طرح نہایت مقبول ہوئیں اور بہت سی زبانوں میں
ان کے ترجمے اور خلاصے لکھے گئے۔ کلیلہ دمنہ کی طرح طوطی نامہ بھی دراصل سنسکرت میں

---

۱ نیں: نہیں ۲ ہور: اور ۳ تمیں بج سوں ہے: تم مجھ سے ہو ۴ اپس: آپ۔ خود ۵ رکھیا: رکھا۔ رکھی
۶ [illegible]

لکھا گیا تھا۔ جس میں طوطے کی زبانی ستر کہانیاں کہی گئی تھیں۔ مولانا ضیاء الدین نخشبی بدایونی (متوفی ۷۵۱ھ ۱۳۵۰ء) نے اُن ستر کہانیوں میں سے باون[۵۲] کہانیوں کا انتخاب کرکے ۷۳۰ھ ۱۳۳۰ء میں فارسی میں لکھا اور طوطی نامہ[۵۱] نام رکھا۔ لیکن زبان مشکل تھی۔ عام طور پر اس سے لطف اندوز ہونا دشوار تھا۔ اس لئے مُلا سید محمد قادری نے گیارھویں صدی ہجری میں اُن ۵۲ کہانیوں میں سے ۳۵ کہانیوں کو عمدہ با محاورہ فارسی میں لکھا اور طوطی نامہ ہی نام رکھا۔ ہمارے زیر نظر "محمد قادری" کے اسی طوطی نامہ کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۱۴۲ھ ۱۷۲۹ء میں لکھا گیا ہے اور جس کا مترجم اب تک پردۂ خفا میں ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"پیچھے[۵۲] ہیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کی کیفیت

---

۵۱ نخشبی کے طوطی نامہ کو یہ قبول عام حاصل ہوا کہ فارسی میں ابوالفضل علامی (عہد شہنشاہ اکبر) نے خلاصہ لکھا۔ پھر سید محمد قادری نے خلاصہ کیا۔ ترکی میں عبداللہ صابری نے ترجمہ کیا۔ دکنی اردو میں غواصی نے ۱۰۴۹ھ ۱۶۳۹ء میں اس کو نظم میں لکھا پھر ابن نشاطی نے ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء میں نظم کیا۔ انگریزی میں جیرانس نے ترجمہ کیا مطبوعہ ۱۷۹۲ء۔ مُلا محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ایک ترجمہ اردو میں ۱۷۲۹ء میں ہوا۔ دوسرا ترجمہ اردو حیدر بخش حیدری نے ۱۸۰۱ء میں کیا اور اس کا نام "طوطا کہانی" رکھا۔ انگریزی میں گلیڈون نے ترجمہ کیا۔ جو فارسی کے ساتھ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ میں چھپا۔ جرمنی زبان میں ۱۸۲۲ء میں ترجمہ ہوا۔ ہندی میں حیدر بخش کے اردو ترجمہ کا ترجمہ ۱۸۵۶ء میں ہوا۔

۵۲ یہ عبارت نہایت عجیب و دلچسپ ہے جس نے لوگوں کو دھوکا دے رکھا ہے کہ محمد قادری کو اس کا مترجم قرار دیں یا کسی اور کو۔ مولانا احسن مارہروی بالکل درست استدلال کرتے ہیں کہ "اول تو پرانے طریقۂ بیان میں اپنے نام کے ساتھ مترجم و مؤلف انکسار آمیز الفاظ ضرور لکھتے تھے، دوم یہ کہ اپنے لئے تعظیمی ضمائر جمع کا استعمال نہ ہوتا تھا یہ دونوں پابندیاں اس ترجمے میں نہیں ہیں" اور اس بنا پر فیصلہ کرتے ہیں کہ "یہ ترجمہ محمد قادری کا نہیں ہے"۔ تاہم مولانا اس عبارت کے اس طرح واقع ہونے کے متعلق کوئی قیاس قائم نہیں کرتے اور اس کا مصنف محمد قادری ہی کو مان لیتے ہیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

حقیقت یوں ہے کہ داستان قصہ ہا و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ کوں بیچ طوطی نامے کے ساتھ عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں۔ اس کے تئیں مفصل و بیان وار واسطے معلوم ہونے تمام لوگوں کوں محمد قادری نیک کرے اللہ تعالے مرتبہ اُنو کا بیچ عبارت سلیس اور آسان کے کہ لی ہوئی اور عبارت خطاں کے ہوے دروزہ مرہ جواب وسوال کہ دولت منداں کے تئیں لائق ہوکے لکھے ہیں۔"

۵۔ مترجم طوطی نامۂ ابو الفضل۔ مترجم کا نام اور ترجمہ کا سنہ معلوم نہیں۔ نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ ابو الفضل نے بھی اکبر بادشاہ کے حکم سے کیا تھا۔ اس کا خوشخط قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اور اس کے بین السطور میں اردو ترجمہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن ترجمہ پوری کتاب کا نہیں ہے۔ اگر مترجم ترجمہ کو ختم کر دیتا تو آخر میں اپنا نام اور سنہ ضرور لکھتا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس عبارت کے مفہوم سے یہ خیال ہوتا ہے کہ طوطی نامہ کے مترجم نے (وہ جو کوئی ہو) یہ عبارت بطور دیباچہ کے اپنی طرف سے لکھی ہے، اسی لئے مصنف کا نام تعظیم سے لیا ہے: "محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ اُنو کا" لیکن جب عبارت کے الفاظ پر غور کیا جاتا ہے تو وہ فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں:-

پیچھے سیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کے کیفیت و حقیقت یوں ہے

بعد از گوناگوں صفت و ثنائے خالق زمین و آسمان کیفیت و حقیقت آں است

اور وہ قیاس باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر لکھنے والا اپنی طرف سے لکھتا تو ایسی عبارت نہ لکھتا۔ ڈھائی سو صدی میں زبان بہت کچھ صاف اور باقاعدہ ہو گئی تھی۔ ترجمہ کی یہ حالت البتہ اس کے بعد تک رہی ہے۔ اس لئے یہ عبارت ضرور ترجمہ ہے۔ اب ان مشکلات کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مترجم ترجمہ کرتے کرتے جب نام پر پہونچا تو اس کا جی نہ چاہا کہ محمد قادری نے جس طرح اپنا نام لکھا تھا اس کا بجنسہ ترجمہ کر دیتا اس لئے تعظیمی طریقہ سے نام لکھا۔ نہ یہ کتاب ایسی تھی نہ یہ مقام ایسا کہ اپنی طرف سے کوئی تصرف جائز نہ ہو۔

اب ہم ان معلومات سے محروم ہیں۔ لیکن طرز عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تقریباً اسی زمانے کا ترجمہ ہے جس کا محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری اور مولوی نصیر الدین ہاشمی دونوں نے اس کا قلمی نسخہ لندن میں دیکھا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تالیف (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں ابتدائی چند فقرے ابوالفضل اور مترجم اردو کے درج کئے ہیں:۔

فارسی	اردو
بعد سپاس خداوند زمان و زمیں و ستایش داور جان و تن آفریں کہ طوطیاں باغ قابلیت را شیریں گفتار کرامت فرمودہ و بلبلان چمن کاملیت را عاشق گلشن قدرت خویش گردانیدہ۔	پچھے سیں تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدا ے کی تعریف کے بعد ازاں اور پچھے سیں تعریف صاحب جان اور تن پیدا کرنے ہارے کے وہ صاحب کہ طوطیان باغ قابلیت کتیں یعنی منشیاں کتیں مٹھاس باتوں کی بخشیا یعنی میٹھے باتاں منشیاں کو خدا نے سکایا۔ اور بلبلان چمن کامل پنے کتیں یعنی شاعراں کتیں عاشق باغ قدرت اپے کا کیا یعنی اپنی قدرت دکھا کر عاشق کیا۔

اس سے آگے یہ مضمون آتا ہے:۔

پچھے بارے برے راہ بندگی کو یعنی بندگی رکھنے ہارے کو۔ وہ کون، ابوالفضل بیٹے شیخ مبارک کا اس کے تیں پاک حکم جاری ہونے کے پایا یعنی بادشاہ حکم فرمایا کہ یہ کتاب کتیں یعنی طوطی نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوڑی عبارت سے نقش ترتیب کا دیوے۔ یعنی مختصر عبارت سیں بنادے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری نے اپنی تالیف (اردو شہ پارے) میں اس طوطی نامہ کی طویل

عبارتیں نقل کی ہیں۔ ایک کا مختصر نمونہ یہ ہے :۔

"بڑائی اور سنار اور درزی اور پرہیزگار مسافری کو نکلے۔ اور ایک رات بیچ جنگل دہشت بھرے ہوے کے کہ چیتا باگاں کا ڈر سیں اس جنگل کے پانی ہوتا تھا۔ یکایک اپنا اس جاگا میں پڑا یعنی ہوا۔ وہ چار دیار مصلحت کرے کہ ہم ہر ایک موافق باری کے یک ایک پہر نگہبانی کرے۔ اول بڑائی جاگتا تھا۔ لکڑی یک بیچ نہایت بہتری صورت کے چھیلیا یعنی اچھی صورت بنایا۔ اور پھر دو گھڑی سنار اس صورت کے تیں زیور سیں سنواریا۔ تیسری پہری میں درزی اس کے تیں سات لباس کے زینت دار کیا۔ چوتھی پہری میں زاہد موں عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا۔ دعا کیا اور جان بیچ بدن اس کے پھوکے گیا ہوا۔" [1]

دکن میں عہدِ مغلیہ کے بعد کا دور

۱۔ محمد باقر آگاہ۔ ویلور (صوبہ مدراس) کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۲۰ھ ۱۸۰۵ء میں انتقال کیا۔ انہوں نے ۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء میں اور اس کے بعد متعدد کتابیں عقائد و فقہ کے متعلق اردو میں لکھیں۔ یہ زمانہ دکن میں مغلیہ تسلط کے بعد کا ہے۔ اس زمانہ میں شمالی ہند (دہلی، آگرہ، وغیرہ) میں اردو شاعری اور تصانیفِ نظم کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن اردو نثر کی کوئی مستقل تصنیف

---

[1] فرہنگ۔

پچھے	پیچھے	جاگا	جگہ
سیں	سے	پڑیا	پڑا (زائد کا ترجمہ)
کرنے ہارے	کرنے والے	چھیلیا	چھیلا
کتیں	کو	موں	مُنہ
بڑائی	بڑھئی	پھوکے گیا ہوا	پھونکی گئی
باگاں	باگ (شیر) کی جمع		

نہیں پائی جاتی۔ نفضلی کی دہ مجلس (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کا شمالی ہند کی ملکیت ہونا مشتبہ ہے۔ اور مرزا سودا دہلوی کا دیباچۂ دیوان متفرقات میں شامل ہے۔ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے تراجم قرآن مجید بعد کی چیزیں ہیں۔

باقر آگاہ کی مندرجہ ذیل عبارت ان کے منظوم رسائل کے دیباچہ کا اقتباس[۵] ہے۔

"بعض علمائے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ان سے فائدہ پاویں۔ لیکن اکثر عورتاں اور تمام اُمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے۔ اور ہر رسالہ کے وزن علٰحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے۔ چھ رسالہ اول کے مع رسالہ عقائد سنہ ایک ہزار ایک سو اور اسی اور پانچ میں اور ایک ہزار ویک سو اور اسی اور چھ میں (۱۱۸۵ھ و ۱۱۸۶ھ) بنے ہیں.... اور ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں۔"

اس کے بعد دہلی وغیرہ میں تصانیف نثر کا عام رواج شروع ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑے عرصہ میں اس کثرت سے اور اس قدر اعلیٰ تصانیف پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس کے ساتھ کی دکن کی تصانیف کا پلہ جھک جاتا ہے۔ تاہم دکن میں بھی اردو نثر کی تصانیف جاری رہتی ہیں اور ایسی ہیں کہ تاریخ نثر میں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

۲۔ ارکاٹ کی اسلامی سلطنت کے زمانے میں شرف الملک مولانا محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے جو دربار ارکاٹ کے مدارالمہام اور اپنے زمانہ کے بڑے عالم تھے کیدانی فقہ حنفی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا انتقال ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں ہوا۔ ان کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:۔

---

[۵] و [۶] ماخوذ از (دکن میں اردو)

"بوجھ کے تحقیق بندہ آزمائی جاتی ہے درمیان اس کے کہ بندگی کرے خدا کی اور ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوے ۔ اور آزمائش تعلق رکھتی ہے سات شرعی چیزوں کے کہ کرے اوسے وسات خلاف شرع چیزوں کے کہ چھوڑ دیوے اسے ۔ اس واسطے ضرور ہوا بیان کرنا شرعی چیزوں کا و خلاف شرع چیزوں کا"

اس عبارت کو دیکھ کر اس پر غور کرنا چاہیے کہ شرف الملک باقر آگاہ کے ہم عصر ہیں لیکن انکی نثر آگاہ کی نثر سے زیادہ بے محاورہ ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باقر آگاہ کی اپنی اصلی عبارت ہے اس لئے اس زمانہ کے محاورہ و روزمرہ کے مطابق ہے ۔ لیکن شرف الملک کی عبارت ترجمہ ہے ۔ لفظی ترجمہ کا رواج اس کے بعد تک ہند و دکن دونوں میں رہا ہے

۳ ۔ قاضی بدرالدولہ خلف شرف الملک، ۱۷۹۳ء / ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۳ء / ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا ۔ دربار ارکاٹ میں قاضی تھے ۔ کئی درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ۱۲ کتابیں اردو کی ہیں ۔ فقہ شافعی، سیرت نبی کریمؐ، سیرت صدیق اکبرؓ، سیرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ترجمہ و حواشی حدیث، تفسیر قرآن مجید وغیرہ بڑی ضخیم اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں فوائد بدریہ (سیرت النبیؐ) کے دیباچہ کا اقتباس یہ ہے :-

"دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے ہیں اب کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کرے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں ۔ جن کو ان زبانوں کی معرفت حاصل ہے ان کے لئے بہت سے کتب موجود ہیں اور کسی کو خواہشمند بھی نہیں پایا ۔ تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا تا عوام مومنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال سے واقف ہو کر ان کی پیروی خوبی کے ساتھ کریں ۔"

---

[1] از دکن میں اردو ۔

فیض الکریم (تفسیر قرآن مجید) کا نمونہ یہ ہے:-

"واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسّی سب مل کر۔ اللہ کی رسّی سے مراد اللہ کا دین ہے۔ یعنی دین اسلام اختیار کرو۔ اس کو رسّی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گزرنا چاہے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہووے تو رسّی جس کی دونوں طرف راہ کے دو جانب سے بندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں۔ جس نے دین اسلام مضبوط پکڑا تو بڑے خوف سے نجات پایا۔"

دہلی کے علمائے کرام شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ و تفسیر قرآن بدر الدولہ کی فیض الکریم سے پہلے کے ہیں۔ ان کے نمونے آگے آتے ہیں۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ ان کی عبارتیں فیض الکریم کی عبارت سے زیادہ خلاف محاورہ و قدامت آمیز ہیں۔

اس زمانے میں اور اس کے بعد دکن کا اردو لٹریچر دہلی و شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ ممتاز نہیں ہے

نثر کا دوسرا دور

شمالی ہند میں: ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء تا ۱۲۱۵ھ / ۱۷۹۹ء

شمالی ہند یعنی دہلی اور موجودہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں تصانیف نثر کا اصلی اور مستقل دور محمد شاہ بادشاہ دہلی (زمانۂ حکومت ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے سے قبل جو رفتار تھی اس کا خاکہ پہلے دکھایا جا چکا ہے۔ اس دوسرے دور کی رفتار یہ تھی:-

فضل علی فضلی، فضلی تخلص کے ایک شخص کی اردو تصنیف دہ مجلس یا کربل کتھا (کربلا کی کہانی) کا نام اور پتہ ملتا ہے۔ جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب (روضۃ الشہدا) کا ترجمہ ہے

لیکن فضلی کا نہ صحیح نام دریافت ہوتا ہے نہ پوری کتاب ملتی ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے نام و حالات میں بڑا اختلاف کیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے اپنی بے نظیر تالیف (نمونۂ منثورات) میں (جو اپنی قسم کی اردو میں پہلی کتاب ہے) فضلی کے متعلق تحقیقات کا خلاصہ نتیجہ بیان کر دیا ہے۔[۵]

فضل علی فضلی محمد شاہی عہد میں تھا۔ اس نے یہ کتاب ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۱ء) میں لکھی اور پھر ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں اس کی اصلاح و نظر ثانی کی۔ اس کتاب کا صرف دیباچہ تذکرۂ شعرائے ہند (مؤلفہ و مترجمہ مسٹر فیلن و مولوی کریم الدین) میں منقول ہے۔ اور کافی طول اور نہایت دلچسپ ہے۔ مختلف مقامات سے اس کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"لیکن معنی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پُرسوز و گداز اس کتاب کو، کے سبب لغات فارسی ان کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات جد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ یس کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھا دے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلا دے۔ مجھ احقر نفر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا بہ رنگینی عبارت اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات کیجئے تو بموجب اس کلام بانظام کے من بکیٰ علی الحسین او تبا کا وجبت له الجنة بڑا ثواب لیجئے۔۔۔۔۔۔"

---

[۵] ہم کو مولانا سے یہ اختلاف ہے کہ جب مسٹر فیلن یا مولوی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کو ہم میں سے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی" اور انہوں نے فضل علی نام لکھا ہے تو مولانا نے فضل اللہ نام کو کیوں ترجیح دی۔ دوسرے یہ کہ جب اس فضلی کا شیعہ ہونا ظاہر ہے تو مولانا اس کا حنفی نقشبندی کیوں تسلیم کر لیا۔ تذکرہ محبوب الزمن میں جن بزرگ شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی حنفی نقشبندی کا ذکر ہے وہ یقیناً یہ فضلی نہیں، کوئی اور ہیں۔

"لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا، اور بیان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی گلشن افکار پر اہتزاز میں آ، یہ بات آئینۂ خاطر میں منھ دکھلائی کہ یہ فکر عظیم بغیر امداد ارواح مقدس حسنین علیہما السلام حسب خواہش مجبول کے سرانجام نہ پاوے .... "

یہ رسالہ مسعود زدہ وہر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اس کی تصنیف کی تاریخ یوں لکھی ہے:

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف بہر کسب ثواب و فیض بشر
چاہا تاریخ اس کی ہووے سرِش شیعیوں کی نجات کا "مظہر"
۱۱۴۵ھ

"اور اب نظر ثانی کر کمیت و کیفیت مضامین ہندی اصطلاحات و استعارات رنگین اصلاح دیا۔
اس تاریخ نے صفحۂ دل پر جلوہ دیا۔

"ہر کس از من کند بہ نیکی یاد بجہاں تا کسس ہم بہ نیکی یاد"

اس دیباچہ کی تمام عبارت میں صرف دو فقرے قابل غور ہیں۔ ایک فقرہ اوپر منقول و خط کشیدہ ہے۔ دوسرا فقرہ جو نقل نہیں کیا گیا یہ ہے:۔ "تب آپ زبان اعجاز بیان سے فرماتے" یہ دونوں محاورے خاص دکن کے ہیں۔ اور اس زمانے سے دو سو برس بعد آج بھی دکن میں اسی طرح بولتے ہیں۔ دہلی و شمالی ہند میں یہ انداز بیان نہ جب تھا نہ اب ہے۔ یہ محاورے خصوصاً دوسرا محاورہ (آپ فرماتے) اس طرح کا ہے کہ جس کی بول چال میں شامل ہو اس سے چھوٹ نہیں سکتا جیسا کہ حیدر آباد وغیرہ مقامات دکن کے تعلیم یافتہ صاحب بھی آج تک بولتے ہیں۔ اور جس شخص کا یہ روزمرہ نہو اس کی زبان و قلم سے کبھی نہ نکلے گا۔ اس سے قریب زمانہ کے مصنفین دہلی حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی نثر میں یہ انداز بیان نہیں پایا جاتا۔ اور دکن کی تصانیف میں اس کے بہت بعد تک موجود رہے۔ دکن میں مولوی قادر علی نے[۱] ایک

[۱] دکن میں ریویو۔

کتاب (مصباح الصلوٰۃ) کے نام سے ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۶ء میں ترجمہ کی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں :-

"صاحب مفتاح الصلوٰۃ معتبر کتابوں سے لکھا ہے جو شخص کہ فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا ہے نماز اس کی روا نہیں۔ شیخ ابو حفص کبیر فرماتے کافر ہووے۔ نعوذ باللہ منہا"[1]

اس بنا پر فضلی کا دکنی الاصل ہونا لازم ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضرور ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انہوں نے علم حاصل کیا، انشا پردازی سیکھی اور تصنیف و تالیف کی۔ ان کے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ۔ روزمرہ اور اسلوب بیان نہیں پایا جاتا جبکہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے۔ چنانچہ محمد عثمان مبین کی کتاب (لازم الاسلام) مرتبہ ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۵ء کا ایک فقرہ یہ ہے :-

"پس جان تو پیدا کرنے ہار اسب عالم کا شاید کوئی دوسرا ہے"[2]

اور اسی زمانہ کے مصنف نور الغوثی اپنی تفسیر غوثی میں لکھتے ہیں :-

"اور بعضے کافراں بولتے ہیں کہ حشر برحق ہے کہ ہمارے بتاں حشر کے روز ہم کو چھوڑائیں گے"

اس کے علاوہ فضلی کے دکن میں نہ رہنے کے متعلق مولانا احسن مارہروی کا یہ استدلال بھی بالکل درست ہے کہ فضلی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔ (لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہ ہوا مخترع، اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع)۔ حالانکہ دکن میں فضلی کے زمانہ میں اور اس سے پہلے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ فضلی دکن میں ہوتے تو ان ترجموں کا ان کو ضرور علم ہوتا اور ایسا نہ لکھتے۔

مرزا رفیع سودا دہلوی | مرزا سودا دہلوی ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۱ء میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اردو میں لکھا ہے۔ پیچیدار مقفیٰ عبارت ہے۔ نمونہ یہ ہے :-

انسان کہ جس فن سے آپ کو کما ینبغی ماہر نہ کرے، چاہئے کہ اس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے۔

---

[1] و [2] دکن میں اردو۔

گفتگوے جاہل پہلوے عالم، موردِ انفعال۔ بلکہ خموشی ہے اس کی برابرصد فضل و کمال ۵

بات گر آوے تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک   سو طرح کا ہے سخن پردۂ خاموشی میں

اگر ناآگاہ جس فن کا، آگاہ سے اس فن کے، بولی بولے۔ گویا ہر دو لب اس کے دروازۂ رسوائی کے پاٹ ہیں کہ عمداً اپنے منہ پر کھولے۔ بیت

طرفہ میوہ ہے یہ سخن اے دوست   مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہرِ سخن عاصی زیبِ گوشِ اہلِ ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے۔ اور سدا مرغِ معنی عرش آشیاں گرفتارِ دام رہا ہے۔

قافیہ پیمائی اس زمانے کا عام انداز تھا۔ سودا کی خصوصیت نہیں۔ سو برس بعد تک مقفّٰی نثریں لکھی گئی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے سلیس و با محاورہ مصنفین (میر امن وغیرہ) نے بھی قافیہ آرائی کی ہے۔ اور لکھنؤ کے اہلِ تصنیف (مرزا سرور وغیرہ) نے بھی۔ یہاں تک کہ مرزا غالب دہلوی نے اپنے رقعات کی سہل ممتنع نثر میں بھی جا بجا قافیہ آرائی کی ہے اور منشی امیر مینائی نے اپنی تصنیف انتخابِ یادگار (مصنفہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء) بھی اسی طرز میں لکھی۔ اس کے برخلاف دکن کی تصانیف میں اس زمانہ میں اور اس سے پہلے اور بعد مقفّٰی نثریں شاذ و نادر ہیں۔ طرزِ نگارش کے اس اختلاف کا سبب اصل میں کتابوں کے مضامین و مقاصد کی نوعیت ہے۔ دکن میں سب رس اور طوطی نامہ وغیرہ چند داستانوں کے علاوہ سب کتابیں فقہ، سیرت، تفسیر، اخلاق، تصوف پر لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون کے بیان میں قافیہ پیمائی اور خیال آرائی کا کیا موقع تھا۔ وجہی کی ضخیم داستان سب رس تمام و کمال مقفّٰی ہے۔ فقہ و تصوف کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے۔ اسی طرح شمالی ہند میں بھی تفریحِ طبع کی کتابیں مقفّٰی لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون کی تصانیف سادہ ہیں۔

مولانا شاہ رفیع الدینؒ (ترجمۂ قرآن)

سودا کے دیباچہ تک شمالی ہند کی کوئی مستقل و مکمل تصنیف نثر معلوم و متعارف نہیں ہے۔ اس حساب سے سب سے پہلی نثر کی کتاب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اردو ترجمۂ قرآن ہے۔ شاہ صاحب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے صاحبزادہ تھے۔ ان سے بڑے شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور ان سے چھوٹے دو بھائی تھے:۔ شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ شاہ ولی اللہ صاحب ان خاص الخاص علماء میں تھے جو صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں احکام و اعمال شریعت کے جو اسرار و معارف بیان کئے ہیں وہ دنیائے اسلام میں ان سے پہلے کسی نے نہیں بیان کئے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا مرتبہ امام رازی اور امام غزالی سے بڑھا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے سب صاحبزادے خصوصاً پہلے تین صاحبزادے بھی ایسے ہی عالم فاضل اور ولی کامل تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے علاوہ اور تصانیف کے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں کیا تھا۔ ان کے دوسرے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین صاحب نے اردو کا ترجمہ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء کے قریب مرتب کیا۔ ترجمہ اس قدر لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانے میں کیا اس زمانے میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہ تھی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عربی زبان کی وسعت و بلاغت اور قرآن مجید کی معجزنما عبارت ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور شاہ صاحب جیسے محتاط بزرگ کو آیت آیت اور لفظ لفظ پر یہ خیال تھا کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی کمی و بیشی نہ ہو جائے جس سے مطلب کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس لئے ان کے نزدیک بہترین صورت یہ تھی کہ ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے مطابق اسی موقع پر لکھ دیا جائے۔ خواہ اردو عبارت محاورہ کے خلاف ہو جائے۔ ہم دو مقام سے مختصر نمونے درج کرتے ہیں۔

"اے رب ہمارے مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے۔ اے رب ہمارے
اور مت رکھ اوپر ہمارے بوجھ جیسا رکھا تو نے اس کو اوپر ان لوگوں کے کہ پہلے ہم سے تھے۔
اے رب ہمارے اور مت اٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اس کے۔
اور معاف کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم کو۔ تو ہے دوستدار ہمارا پس مدد دے ہم کو
اوپر قوم کافروں کے۔" (سورہ بقرہ کی آخری آیت دعا)

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے
بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری، اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمہارے
کی سے۔ کہا انہوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے، اور فریب دیا ان کو زندگانی
دنیا کی نے، اور گواہی دی انہوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر۔"
(پارہ ہشتم ولو اننا سورہ انعام رکوع ۱۶)

شاہ عبدالقادر صاحب ترجمۂ قرآن اسی زمانہ میں دو تین سال بعد ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء میں شاہ عبدالقادر صاحب نے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی سلیس و بامحاورہ نہیں ہے۔ تاہم شاہ صاحب نے لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کے مقابلے میں ادائے مفہوم اور وضاحت مطلب کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کا ترجمہ پہلے ترجمہ کی نسبت مختصر اور یہ صاف ہو گیا ہے اسی لئے نہایت مقبول ہوا اور کثرت سے چھپا اور پڑھا گیا۔ ہم ان کے ترجمہ میں سے بھی سورۂ انعام کی انہی آیتوں کا ترجمہ درج کرتے ہیں:-

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے سناتے
تم کو میرے حکم۔ اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور
ان کو بہکایا دنیا کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔"

دیکھو یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے بقدر ایک سطر کے مختصر ہے اور زیادہ صاف و سلیس ہے لیکن

دونوں ترجموں کے الفاظ خط کشیدہ کو دیکھو - پہلا ترجمہ دوسرے سے زیادہ صاف ہے حالانکہ عربی الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے - نہیں پونہچے تھے کی ضرورت نہ تھی - نہ آسئے تھے بالکل صاف تھا منکم کا ترجمہ (تمہارے اندر کے) اس قدر واضح نہیں ہے جتنا (تم میں سے) لیکن اس سے آگے پہلے ترجمہ میں (ملاقات اس دن تمہارے کی سے) بالکل لفظی ترجمہ ہے اور بول چال کے خلاف - اس کے مقابلہ میں شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ (اس دن کے سامنے آنے سے) ایسا صحیح، با محاورہ اور خوبصورت ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اس سے بہتر اسلوب پیدا نہ کر سکے - صرف (دن) کی جگہ (روز) اور (سامنے) کی جگہ (پیش) رکھدیا، یعنی (اس روز کے پیش آنے سے)۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ پر تفسیری حاشیے بھی لکھے اور اس کا نام موضح القرآن رکھا - یہ ان کی اپنی عبارت ہے - اگرچہ الفاظ کی بے ترتیبی اس میں بھی ہے جیسا کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے دیباچہ کی عبارت سے ثابت کیا ہے مثلاً ان فقروں میں :-

"الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کو گویائی کی اپنے نام کر اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر"

لیکن اکثر جگہ اس سے زیادہ صاف بھی ہے - مثلاً پارہ ۲۴ سورہ حٰم سجدہ کے دوسرے رکوع کی تفسیر میں فرماتے ہیں :-

"دو دن میں زمین بنائی اور دو دن میں پہاڑ اور درخت سبزہ جو خلق کی خوراک ہے - پھر آسمان سارا ایک تھا دھواں سا - اس کو بانٹ کر سات کیے اور ہر ایک کا کارخانہ جدا ٹھہرایا - پھر آسمان زمین کو بلایا، خوشی سے آؤ یا زور سے، یعنی ارادہ کیا کہ ان دونوں کے ملاپ سے دنیا بساوے، اپنی طبیعت سے ملیں تو، اور زور سے ملیں تو، وہ دونوں آملے طبیعت سے آسمان کی شعاع سے گرمی پڑے تو بادیں اٹھیں، ان سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھے،

پانی ہو کر برسے، چار عنصر زمین پر جمع ہوں، مخلوقات پیدا ہوں۔ اور پہلے زمین میں رکھیں
تھیں خوراکیں، یعنی اس میں قابلیت تھی ان چیزوں کے نکلنے کی۔ اور ہر آسمان کا حکم
جدا۔ یہ رب کو معلوم ہے کہ وہاں کون خلق بستے ہیں، ان کا کیا اسلوب ہے۔ اتنی زمین میں
ہزاراں ہزار کارخانے ہیں، اس قدر آسمان کب خالی پڑے ہوں گے۔"

شاہ عبدالقادر صاحب کا انتقال ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں ہوا۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں، یعنی ترتیب ولادت کے برعکس۔

میر عطا حسین تحسین (نوطرز مرصع)

ان مقدس ترجموں کے بعد اس زمانے کی مستقل تصنیف نوطرز مرصع ہے، جس میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین ساکن اٹاوہ نے قصہ چہار درویش کو رنگین و دقیق اردو میں لکھا ہے۔ مشہور ہے کہ چہار درویش کا قصہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سنانے کے لیے لکھا تھا۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امیر صاحب کی فہرست تصانیف میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ میر تحسین محمد باقر خاں شوق کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ سالار فوج انگریزی کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب جنرل صاحب ولایت چلے گئے تو تحسین پٹنہ آ گئے اور پھر وہاں سے فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گئے۔ نوطرز مرصع کی تصنیف جنرل اسمتھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع کر دی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ کے دربار میں آ کر ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں ختم کی۔ تحسین خوشنویس بھی تھے اور مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لیے کتاب کے نام میں مرصع کا لفظ طرز عبارت کے علاوہ مصنف کے نام کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ تحسین نے فارسی میں بھی انشائے تحسین، تواریخ فارسی اور ضوابط انگریزی لکھی ہیں۔ نوطرز مرصع میں عربی فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کی اتنی کثرت ہے کہ بعض فقرے دشوار فہم

ہونے کے علاوہ مذاق سلیم کے لئے نہایت ثقیل و مکروہ ہیں۔ مثلاً یہ عبارت :۔

"بعد ایک لمحہ کے وہ ماہ شب چہار دہم رونق افزا حدیقۂ فردوس نما کے ہو کر اوپر مسند زربفت نقرئی کے جلوہ آرا ہوئی واہ جی واہ، جس وقت وہ قمر طلعت داخل باغچۂ نمونۂ جنت کی ہوئی، عطر گلاب رخسارۂ زلیخائے شب مہتاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہوا، یوسف عکس بیاض نگینہ ہائے الماس انجم کا اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمین فلک آئین کے زیب افزا دیدۂ نورانی کا ہوا۔"

آخری دو فقرے فارسی کی مشہور تصنیف شبنم شاداب کو یاد دلاتے ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ نوطرز مرصع تمام کی تمام ایسے ہی فقروں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ اس سے کچھ سہل اور بہتر طرز بھی پایا جاتا ہے مثلاً

"بہ سبب ماندگی و کسل اعضا کمین داران خواب کے اوپر قافلہ بیداری کے تاخت لائے، اور متاع گراں بہائے ہوشیاری کو لوٹ لے گئے۔ بعد ایک لمحہ کے آواز گریہ زاری کی بیچ گوش میرے کے مستمع ہوئی، آنکھ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تن تنہا پلنگ پر لیٹا ہوں و صاحب خانہ سے مکان خالی ہے، آگے دالان کے ایک پنجرہ پڑا ہے۔"

بعض مقامات اس سے بھی صاف و سلیس ہیں، مثلاً

"اور خندان ہمرہ کے تئیں بیچ خدمت گزاری اس نازنین کے تعین کر کے آپ واسطے تحقیقات مکان جراح کے حویلی سے باہر آیا، چنانچہ زبانی ایک شخص کے معلوم ہوا کہ عیسیٰ نامی جراح بکمال کسب طبابت و جراحی کے کہ اگر مردے کو تیں چاہے تو عنایات و فضل الٰہی سے زندہ کرے، فلانے محلے میں رہتا ہے۔ فقیر اس کلمۂ بشارت افزا سے بسان گل کے شگفتہ و خنداں ہو کر پوچھتے پوچھتے اوپر دروازے جراح کے کہ مثال دل بیداردلوں کے کشادہ تھا جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ متبرک ذات خضر صفات بیچ

دہلیز گھر کے رو دن ازو ذہے"

بہرحال ہر جگہ دو چار فقروں کے بعد چند عربی وفارسی ترکیبیں اور صنعتیں ضرور آجاتی ہیں۔ قدیم محاوروں اور متروک لفظوں کے علاوہ کہیں کہیں پرانا غلط املا بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً مردے کے تئیں کی جگہ مردے کو تئیں۔

یوریین مصنفین اُردو

اہل یورپ کے اردو سیکھنے اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کرنے کے حالات سے پہلے ان کے ہندوستان میں آنے اور حکومت کرنے کے اسباب و واقعات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

قدیم اہل یورپ اور ہندوستان یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانے سے قائم تھے۔ ۳۲۷ سال قبل مسیح سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن یہاں اپنی حکومت قائم نہ کر سکا۔ صرف کبھی کبھی تجارت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ تجارتی آمد و رفت بحر احمر کے راستے سے ہوتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اسلام کا آغاز ہوا۔ اور مسلمانوں نے پہلی ہی صدی میں مصر کو فتح کر لیا۔ اس وقت سے بحر احمر کا راستہ یورپ والوں کے لئے بند ہو گیا۔ اور پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک اہل یورپ ہندوستان میں نہ آسکے۔ بلکہ اس عرصے میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے ہوتے رہے اور سلطنتیں قائم ہوتی رہیں۔

اہل یورپ کی آمد (پرتگالی) ۱۴۹۲ء میں اسپین کے ایک شخص کولمبس نے امریکہ کا ملک دریافت کیا، اور اسی سال جب دہلی میں سکندر لودی کی حکومت تھی، پرتگال کا ایک سیاح واسکوڈی گاما ایک نئے اور لمبے راستے سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ میں پونچا۔ یہ شخص تمام افریقہ کا چکر لگاتا ہوا راس امید (کیپ گڈ ہوپ) کی

طرف سے ہوکر موجودہ شہر میسور سے تقریباً ایک سو میل دور ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا۔
پرتگالیوں نے ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کرلئے۔ سمندر کے ساحلوں پر
قلعے بنائے، اور چند سال میں ۱۵۱۵ء تک مشرقی ساحل کے تمام بندرگاہوں پر قبضہ
کرلیا۔ لیکن ۱۵۶۵ء سے ان کی تجارت میں زوال شروع ہوا۔ یورپ میں ہالینڈ اور
انگلستان ان لوگوں کے دشمن ہوگئے اور اہل پرتگال کی تجارت کو نقصان پونہچانے اور
اپنی تجارت قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ۱۵۸۰ء میں اسپین نے پرتگال کو زیر
کرکے اپنا ماتحت بنا لیا۔ اس کے بعد تھوڑے عرصہ میں بجز دو تین مقامات کے سب
مقبوضات اہل پرتگال کے ہاتھ سے نکل گئے۔

انگریز ہندوستان میں اسپین کا زور توڑنے کے لئے انگریزوں نے یورپ میں اسپین والوں
سے جنگ چھیڑ دی۔ ۱۵۸۸ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی جس میں اہل اسپین کو شکست اٹھانی
پڑی۔ لڑائی سے نمٹ کر انگلستان کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبیتھ سے ہندوستان
میں تجارت کرنے کا فرمان حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کردی۔

اہل ہالینڈ ہندوستان میں لیکن یورپ میں انگلستان کا سب سے بڑا مدمقابل ہالینڈ تھا۔
اس نے بھی ۱۶۰۲ء میں تجارتی کمپنی بنالی، اور ڈچ قوم (ہالینڈ کے لوگ) نے بھی
انگریزوں کے پہلو بہ پہلو تجارت کرنی شروع کردی۔ اس زمانے میں ہالینڈ والے یورپ
کے سب ممالک کے مقابلے میں فن جہازرانی وجہازسازی میں بڑے ماہر تھے،
اس لئے انگریزوں کے لئے ان کا مغلوب کرنا آسان نہ تھا۔ ان لوگوں نے چند سال
میں اکثر جزیروں سے اہل پرتگال کو نکال کر مصالحہ کی تجارت پر قبضہ کرلیا۔ لیکن ہالینڈ
والوں کی زیادہ توجہ جزائر کے قبضہ کی جانب اور مصالحہ کی تجارت کی طرف رہی۔ اور
مشرقی حصوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ان کے برخلاف انگریزوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی، اور اندرون

ملک میں تجارت اور اقتدار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنس بندرگاہ سورت میں آیا، اور شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہو کر سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی۔ پھر ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو بادشاہ انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے دربار جہانگیری میں حاضر ہوا اور تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت لے لی۔ سورت کے علاوہ ایک کوٹھی مچھلی پٹن (موسولی پٹم) میں مشرقی ساحل پر ۱۶۳۲ء میں قائم کی۔ پھر ۱۶۴۰ء میں مدراس آباد کر کے وہاں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا۔ انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کے پھانسی پانے کے بعد اس کے جانشین چارلس دوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے اجازت دیدی کہ کمپنی اپنا سکہ جاری کرے۔ حفاظت کے لئے قلعے بنائے، اور غیر عیسائی مذہب والوں سے حسب ضرورت جنگ و صلح جو چاہے کرے۔ ۱۶۶۱ء میں چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی سے ہوئی اور اس کے جہیز میں بمبئی (جو اس وقت گاؤں یا قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا) انگلستان کو ملا۔ بادشاہ نے ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کو دیدیا۔ اس عرصہ میں نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی ساحل پر بالاسور کی کوٹھی اور ہگلی کی نو آبادی قائم کر لی۔ پٹنہ، قاسم بازار، اور وزیگا پٹم میں بھی تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔

انگریزوں کے حکمرانی کے منصوبے

شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں مغلیہ سلطنت کمزور ہوگئی اور مرہٹوں کا زور بڑھ گیا اسی زمانہ میں ۱۶۸۶ء میں جوشیا چائلڈ سورت کی کوٹھی کا پریسیڈنٹ مقرر ہو کر آیا۔ اس نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی، صوبجاتی شورش اور مرکزی سلطنت کی کمزوری کا اندازہ کر کے طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمپنی مغلوں اور مرہٹوں پر قابو پائے اور اپنی حکومت قائم کرے۔ چنانچہ جاب چارنک نے بنگال میں ہگلی کے قریب بغیر شاہی اجازت کے کوٹھی تعمیر کرنے کا

ان کی حمایت شروع کردی۔ کسی کے طرفدار انگریز ہوگئے، کسی کے فرانسیسی۔ اور اس طرح حکومت حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے داؤں لگانے لگے۔ آخر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت نے اہل فرانس کو ہمیشہ کے لئے مایوس اور انگریزوں کو کامیاب بنا دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت بالکل لڑکھڑانے لگی۔ بارہ برس کے عرصہ میں تین بادشاہ تخت نشیں اور معزول ہوئے، محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے عہد میں نادر شاہ (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی (۱۷۴۷ء) کے حملے ہوئے۔ مرہٹے زور پکڑ گئے۔ اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اودھ، بنگال، دکن کے صوبے آزاد ہو گئے۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا۔ کمپنی کی خوش قسمتی سے اس کا ایک معمولی کلرک کلائو (جو ۱۷۴۴ء میں ملازم ہو کر آیا تھا) غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی نکلا۔ ۲۳ سال کے عرصہ میں وہ خود لارڈ اور گورنر اور سپہ سالار بن گیا اور کمپنی کو دہلی و شمالی ہند کا حکمراں بنا دیا۔ اگرچہ شاہان مغلیہ کی اولاد کٹ پتلی کی طرح تخت پر بیٹھتی رہی لیکن حکومت دراصل انگریزوں کی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے کا نعرہ ہی یہ ہو گیا تھا: "ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا"۔

کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر انگلینڈ کی حکومت نے کمپنی کی براہ راست نگرانی شروع کردی۔ اور ۱۷۷۳ء میں اس کے متعلق قانون بنا دیا۔ جس کو ریگولیٹنگ ایکٹ کہتے ہیں۔ بنگال پایۂ تخت مقرر ہوا اور وہاں کا گورنر گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ پہلا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تھا۔ اس کی مدد کے لئے ایک کونسل بنائی گئی۔ کلکتہ میں عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) قائم ہوئی۔ اور تمام انگریزی مقبوضات کا حاکم اعلیٰ گورنر جنرل ہو گیا۔ اور اس کے ماتحت تین پریسیڈنسیاں قائم ہو گئیں:۔

(۱) بنگال پریسیڈنسی۔ بنگال پر انگریزوں کا اثر شروع ہی سے تھا۔ جنگ پلاسی

(۱۷۵۷ء) کے بعد تقریباً تمام بنگال انگریزوں کے زیر اثر آگیا تھا۔ کلکتہ کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم کی بنیاد اس سے پہلے پڑ گئی تھی، لیکن موجودہ قلعہ ۱۷۵۷ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا۔ اور ۱۷۷۳ء میں مکمل ہوگیا۔

(۲) مدراس پریسیڈنسی۔ مدراس کی آبادی بنگال سے بھی پہلے ۱۶۴۰ء میں شروع ہوگئی تھی۔ اور وہاں قلعہ کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد نواب کرناٹک اور نظام حیدرآباد کی ریاستوں کے کچھ اضلاع اس میں شامل کئے گئے۔ پھر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی سلطنت شامل ہو جانے سے یہ پریسیڈنسی بہت وسیع ہوگئی۔

(۳) بمبئی پریسیڈنسی۔ ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کی ملکیت میں شامل ہوگیا تھا۔ گورنر جنرل ہیسٹنگز نے (۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۲ء) اور گورنر جنرل ویلزلی نے (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) اور پھر ہیسٹنگز نے (دوبارہ ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) مرہٹوں سے چار مرتبہ جنگ کرکے اور شکست دیکر ان کا بہت سا ملک بمبئی کے احاطہ میں شامل کرلیا۔ پھر ۱۸۴۳ء میں سندھ اسی خطے میں شامل ہوگیا۔ اور بمبئی پریسیڈنسی میں موجودہ وسعت پیدا ہوگئی۔

انگریزوں کی شہنشاہی

ہندوستان میں یورپ کی متعدد قومیں تجارت کرنے آئیں اور ان میں سے بعض بعض نے حکومت ہند کی باگ بھی ہاتھ میں لینی چاہی، لیکن کسی کو انگریزوں کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت انگلستان اور تمام قوم انگریزی کمپنی کی طرفدار، مددگار، مشیر کار، اور نگراں تھی۔ یہ بات پرتگال اور ہالینڈ والوں کو کیا فرانس والوں کو بھی نصیب نہ تھی۔ سلطنت برطانیہ حسب موقع روپیہ کی امداد بھی دیتی رہی، اور قابل سے قابل حکمرانوں کو بھی بھیجتی رہی، اور نئے نئے فرمان بھی جاری کرتی رہی۔ اس طرح ہندوستان اگرچہ بظاہر کمپنی کے زیر اثر تھا، لیکن حقیقت میں اس کی مالک ومختار خود برٹش گورنمنٹ تھی۔ اسی لئے ۱۸۵۷ء کے غدر عظیم کے بعد انگلستان کو حکومت ہند کی باگ کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لینے میں کوئی

دشواری پیش نہ آئی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے الہ آباد کے دربار میں ہندوستان پر برطانیہ کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ یہ کمپنی کا آخری گورنر جنرل وائسرائے (نائب شاہی) بھی بنا دیا۔ اور اب دونوں عہدے ایک ذات میں جمع ہو گئے۔

گورنمنٹ کی طرف سے اشاعت تعلیم ۱۸۱۳ء سب سے پہلی مرتبہ گورنمنٹ نے ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے منظور کیا۔ ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر نے راجہ رام موہن رائے کی مدد سے کلکتہ ہندو کالج قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند پادریوں نے سیرامپور میں ایک کالج کھولا۔

۱۸۱۸ء میں انہی پادریوں نے سماچار درپن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

۱۸۳۰ء میں الگزینڈر ڈف نے کلکتہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج کھولا۔ ان کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ انگریزی علم و ادب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن ابتک سرکاری طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا نہ گیا تھا۔

۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار دی گئی۔

۱۸۳۶ء میں سرچارلس مٹکاف (سابق گورنر صوبہ آگرہ) نے گورنر جنرل ہونے کے بعد پریس کو آزادی دیدی۔ یعنی اہل ہند بغیر لائسنس کے اخبارات جاری کرنے لگے اور نامہ نگاروں کو آزادانہ واقعات نگاری و رائے زنی کا اختیار مل گیا۔

۱۸۵۴ء میں سرچارلس وڈ نے ولایت سے ہندوستان اپنی تعلیمی رپورٹ بھیجی۔ جس میں حکومت ہند کو مشورہ دیا تھا کہ تمام رعایا کے لئے تعلیم کو عام کر دینا چاہئے۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعلیم قائم کر دیا اور دیہاتی مدرسے جاری کر دئے۔

۱۸۶۱ء میں اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

۱۸۷۷ء میں سرسید احمد خاں نے علیگڈھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج قائم کیا۔

اہلِ دانش پردازی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ خود ان لوگوں نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں، اردو حاصل کی، اردو میں کتابیں لکھیں۔ اردو میں شاعری کی۔

(۸) خصوصاً اہلِ فرانس میں سے بعض بعض پرائیویٹ طور پر ہندوستان میں اقامت پذیر ہو گئے، مختلف شہروں میں جاگیریں لیں، مکانات بنائے، ہندوستانی لباس و معاشرت اختیار کی، چنانچہ آگرہ میں ایک فرانسیسی مسٹر مارٹن کے یادگار مکانات ابتک موجود ہیں اور مارٹن محل کے نام سے مشہور ہیں۔ فرانسیسی اردو شاعروں کی یادگاریں بھی تذکروں میں باقی ہیں۔

(۹) انگریز پرتگالیوں سے سو برس بعد تجارت کرنے آئے لیکن ایسا سودا کیا کہ ہندوستان ہی کو مول لے لیا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم رکھے تین سو برس سے زیادہ ہو گئے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ڈیڑھ سو برس ہوئے (از عہد لارڈ کلائیو)۔ اور انگریزوں کی شہنشاہی کو اسی برس گزر گئے۔ انگریزوں نے اردو زبان کی رفتار ترقی اور قبولِ عام کو دیکھ کر اس کی طرف توجہ کی۔ ان سے پہلے ہالینڈ اور پرتگال والے اردو کی قواعد صرف و نحو پر کتابیں لکھ چکے تھے۔ انگریزوں نے بھی اٹھارہویں صدی میں اردو گرامر اور لغت کی متعدد کتابیں لکھیں، انیسویں صدی میں مشن کے پادریوں نے مذہبی کتابیں اردو زبان میں شائع کیں، اردو اخبار اور رسالے جاری کئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کے لئے اردو زبان کا سیکھنا اور پھر اس میں امتحان پاس کرنا لازم کر دیا۔ ۱۸۳۴ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ قانون کی کتابیں انگریزوں نے لکھیں، انگریزی حکام عدالت کی کارروائیاں اردو میں لکھنے لگے۔ کمپنی کے ملازموں کے لئے ہر قسم کا لٹریچر مہیا کیا گیا۔ مختلف زبانوں سے ترجمے کرائے گئے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ انگریز حکام نے درباروں میں اردو زبان میں تقریریں کیں چنانچہ گارسن دتاسی کا بیان ہے کہ

۵۱ گارسن دتاسی فرانسیسی عالم و مستشرق تھا۔ اس کو اردو زبان سے اس قدر عشق تھا (باقی صفحہ آئندہ پر)

"۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا ۔ لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستانی (اردو) زبان میں حاضرین جلسہ کو مخاطب کیا۔"

"فروری کے مہینے میں لکھنؤ میں چیف کمشنر کے زیرِ صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں اس نے اودھ کے تعلقہ داروں کے روبرو ہندوستانی میں طول طویل تقریر کی۔"

انگریزوں نے اردو زبان میں شاعری کی۔ اور بعض صاحب دیوان ہوئے۔ مثلاً الگزنڈر ہیڈرلے اور جارج پرلس شور ۔ پہلے کا تخلص آزاد تھا، دوسرے کا شور۔ ان کا تذکرہ و نمونۂ کلام اس تاریخ کے حصۂ نظم میں آئے گا۔ (انشاء اللہ) اردو کے بعض مشہور مصنفوں کو ان کی تصانیف کے صلے میں ڈاکٹر کی ڈگری (ایل ایل ڈی) دی: مثلاً سر سید احمد خاں اور مولوی نذیر احمد دہلوی کو۔ ملکہ وکٹوریہ نے اردو زبان سیکھی اور منشی عبدالکریم کو آگرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن بلایا ۔ اردو لکھنے پڑھنے لگیں۔ ملکہ کے اردو میں دستخط بھی شائع ہوئے۔

(۱۰) انگریزی زبان کا اردو پر بڑا اثر پڑا۔ صدہا انگریزی لفظ اردو میں شامل ہو گئے۔ جن میں سے بعض کے تلفظ ہندوستانی لب و لہجہ کے مطابق کر لئے گئے: مثلاً لالٹین، بوتل، رپٹ، سنتری، جرنیل، لاٹ صاحب، انگریزی محاورے، انگریزی اسلوب بیان اردو میں ڈھال لئے گئے، انگریزی کہاوتوں مثلوں کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا۔ انگریزی رموز اوقاف

(بقیہ صفحہ ۱۰۰) کہ فرانس میں بیٹھا بیٹھا اردو زبان کی رفتار و ترقی کا مطالعہ کرتا تھا۔ اپنے دوستوں اور انگریز حکام کی معرفت اردو کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرتا تھا اور ہر سال کے آخر میں پیرس یونیورسٹی میں اردو کی اس سال کی ترقی پر لکچر دیتا تھا۔ جس میں اردو کی ادبیات، شاعری، مصنفین، شعرا، اخبارات وغیرہ سب کا ذکر ہوتا تھا۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹ لکچر دئے۔ جن کا ترجمہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ... صفحوں کی مجلد کتاب میں شائع کر دیا ہے۔ اسی سے یہ اقتباسات ماخوذ ہیں۔ ان لکچروں کے علاوہ گارسن دتاسی نے اردو زبان کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اردو کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور بعض اردو کتابوں کو اپنی ادارت میں شائع کیا ہے۔

(کاما، علامت سوال وغیرہ) کو اردو تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔ اور ان میں سے علامت سوال کا رُخ اردو تحریر کی مناسبت سے داہنی طرف کو پھیر دیا، یعنی انگریزی علامت (?) کو اردو میں (؟) لکھنے لگے۔ اردو تحریروں میں پیراگراف قائم ہونے لگے۔ اردو زبان میں بچوں کے قاعدے اور ریڈریں انگریزی کے اصول پر لکھی گئیں۔ مغربی علوم و فنون کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں۔ اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ مقالات علمی و ادبی، مختصر افسانے، ناول، ڈراما، تنقید، سیرت، تذکرہ، تاریخ، وغیرہ ہر قسم کی انشا پردازی انگریزی کے اصول پر اُردو میں شروع ہوگئی۔ اردو شاعری پر بھی انگریزی کا بہت بڑا اثر ہوا۔ جدید شاعری کی ایک مستقل صنف اردو میں پیدا ہوگئی، جو قدیم اردو شاعری میں خال خال پائی جاتی تھی۔ انگریزی کی تقلید میں مختلف موضوعات، جذبات، مناظر قدرت، معارف و حقائق، اخلاق، سیاست وغیرہ کے متعلق نظمیں لکھی جانے لگیں۔ نظم کی ظاہری صورتوں میں اضافہ ہوگیا، یعنی قدیم مثلث، مخمس وغیرہ کے علاوہ قافیوں اور مصرعوں کی ترتیب انگریزی کے اتباع میں اکثر اور شکلوں سے بھی ہونے لگی۔ غزل کی روش بدل گئی۔ بلند خیالی، مشکل پسندی، باریک بینی، متانت و شائستگی پہلے سے بڑھ گئی۔ لیکن انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب و معاشرت کے اثر سے قصیدہ مفقود ہوگیا۔ مرثیہ متروک ہوگیا، مثنوی ختم ہوگئی۔

ان سب چیزوں کا تفصیلی ذکر تاریخ میں موقع و محل پر کیا جائے گا۔ اس وقت اردو زبان پر انگریزی اور انگریزوں کے اثر کا خاکہ کھینچنا تھا۔

پہلا یورپین مصنف جان جوشوا کیٹلر (ڈچ)

اہل یورپ میں پہلا شخص جس کی اردو زبان کے متعلق کوئی کتاب اور کوئی تحریر ملتی ہے غالباً ہالینڈ کا رہنے والا (ڈچ) جان جوشوا کیٹلر ہے۔ یہ شخص سنہ ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر مقرر ہوا اور تین سال سورت میں رہا۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۷۰۸ء/۱۱۲۰ھ تا ۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ) اور جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء) کے دربار میں بھی

ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا۔ لاہور، دہلی، آگرہ کی سیر کی۔ اس زمانے میں آگرہ میں ڈچ تاجروں
کا ایک کارخانہ سورت کے ماتحت تھا۔ اس شخص نے صرف و نحو ہندوستانی کے نام سے
اردو زبان کی گرامر غالباً ۱۷۱۵ء میں لکھی جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ یہ
کتاب لیٹن (لاطینی) زبان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں
ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسیٰ کی مشہور دعا کا اردو ترجمہ بھی درج ہے۔ اس کو بطور نمونہ
لکھا جاتا ہے:-

"ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے، پاک ہووئے تیرے نام آ وے ہم کوں ملک
تیرا ہووے راج تیرا جوں آسمان تو ہمیں (زمین) میں روٹی ہمارے نہ تھی ہم کو آس دے
اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جوں معاف کرتے ہیں ہمارے (اپنے) قرض داروں کو،
نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں، بلکہ ہم کوں گھس کر اس برائی سے: تیری ہے بھی سواری عالمگیری
حمایت میں آمین"

اس کے بعد مختلف اہل یورپ نے اردو زبان کی کتب لغات لکھیں، قواعد صرف و نحو پر کتابیں
تالیف کیں، بائبل کے اردو میں ترجمے کیے۔ ان میں سے چند کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) پادری بنجمن شلز نے لیٹن زبان میں اردو کی قواعد لکھی جو ۱۷۴۴ء میں طبع ہوئی۔
اس میں اردو کے الفاظ فارسی خط میں لکھے ہیں۔

(۲) اسی شخص نے ۱۷۴۵ء میں بائبل کا اردو میں ترجمہ کیا۔

(۳) مل نے ۱۷۴۴ء میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک مختصر کتاب تصنیف کی۔

(۴) جی اسے فرٹز نے ۱۷۴۸ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اردو کے حروف تہجی کا
دیگر ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا۔

(۵) ملک اٹلی کے ایک پادری کیسیانو بیلی گاٹی نے ۱۷۷۱ء میں حروف تہجی پر ایک
رسالہ الفابیٹم برہمانکم کے نام سے لکھا۔

(۶) ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی گرامر (صرف و نحو) لکھی۔

(۷) پرتگالی زبان میں ایک اردو کی قواعد ۱۷۷۸ء میں گریمٹیکا اندوستانا کے نام سے شائع ہوئی۔

(۸) ڈف نے قیام ہندوستان کے زمانے میں ایک ہندوستانی گرامر لکھی اور لندن میں شائع کی۔ یہ شخص ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا۔ کلکتہ میں اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندوستانی (اردو) زبانیں سیکھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب بی اے کی رائے ہے کہ اس نے اردو قواعد میں بہت غلطیاں کی ہیں۔

(۹) ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی۔

(۱۰) ہندوستانی گرامر ۱۷۹۶ء۔

(۱۱) اورنٹل لنگوسٹ (مشرقی زباندان) مطبوعہ ۱۷۹۸ء

یہ اٹھارویں صدی کی چند کتابیں ہیں۔ انیسویں صدی میں بے شمار اہل یورپ (جرمن فرنچ، انگریزوں) نے علمی و ادبی و قانونی کتابیں اردو زبان میں اور اردو زبان کے متعلق دوسری زبانوں میں لکھیں۔ بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ اہل یورپ میں اردو زبان پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر گلکرائسٹ کا ہے۔ انہوں نے ۱۷۸۳ء سے اردو کی خدمت شروع کی اور بیس برس تک اردو زبان میں اور اردو کے متعلق انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ مقرر ہوئے۔ یہاں ایک محکمہ اردو کے ترجمہ و تالیف کا انہوں نے قائم کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اردو کی کتابیں لغات، قواعد، تاریخ وغیرہ کے متعلق خود بھی لکھیں اور ہندوستان کے لائق اہل قلم مسلمان ہندوؤں کو جمع کرکے ان سے کتابیں اردو

میں ترجمہ و تالیف کرائیں۔ ان کی سرپرستی اور کوشش سے تھوڑے عرصہ میں ایسا اردو لٹریچر پیدا ہو گیا جو آج تک اردو میں اپنی نوعیت کا بے نظیر اور یادگار ہے۔ میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس دہلوی، میر بہادر علی حسینی، سید حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للو لال جی، بینی نرائن، مظہر علی خاں ولا، مرزا علی لطف وغیرہ اہل فن اور ارباب ادب نے ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی سرپرستی میں کام کیا۔ اور باغ و بہار، باغ اردو، آرائش محفل، طوطا کہانی، سنگھاسن بتیسی، گلشن ہند وغیرہ اردو کی کتابیں جو ان لوگوں نے لکھیں ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی اردو نوازی کا نتیجہ ہیں۔ (ان مصنفین و تصانیف کا تذکرہ آگے اپنے موقع پر آئے گا)۔

خود ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تصانیف کی فہرست بھی کافی طویل اور نہایت وقیع و قابل قدر ہے۔ مثلاً

(۱) و (۲) و (۳) کا ذکر اٹھارویں صدی کی کتابوں میں ۵ و ۶ و ۷ پر آچکا ہے۔

(۴) مشرقی زبانداں کا خلاصہ مع اضافۂ جدید مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۰ء

(۵) فارسی فعل کا نظریۂ جدید مع مترادفات ہندوستانی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۱ء

(۶) قصص مشرقی (انگریزی سے اردو میں ترجمہ) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

(۷) رہنمائے زبان اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء

(۸) ہندی عربی کا آئینہ (عربی الفاظ کے نقشے جو اردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں) مطبوعہ ۱۸۰۴ء

(۹) قواعد اردو مطبوعہ ۱۸۰۹ء

(۱۰) اردو رسالہ گلکرائسٹ مطبوعہ ۱۸۲۰ء۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی قواعد اردو کا خلاصہ ہے۔

(۱۱) انگریزی ہندوستانی بول چال مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

ڈاکٹر گلکرائسٹ ۱۸۰۴ء میں ہندوستان سے پنشن لیکر ولایت چلے گئے اور ایڈنبرا میں قیام کیا۔ پھر ۱۸۱۶ء میں لندن آ گئے اور انڈین سول سروس کے امیدواروں کو پرائیویٹ طور پر مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ درسگاہ بند کر دی گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے طور پر لوگوں کو اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس ڈاکٹر صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

گلکرائسٹ کی قواعد اردو (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) کا نمونہ[۱] یہ ہے:-

"یاد رکھنا چاہیے کہ مصدر دلالت کرتا ہے صادر ہونے پر فعل کے فاعل سے۔ یا قائم ہونے پر فعل کے فاعل میں۔ اور اس صدور اور قیام کے بعد ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کیفیت پر جو اسم دلالت کرے وہ حاصل بمصدر ہے۔ پس اکثر مصادر کی علامت کے حذف کرنے سے جس قدر باقی رہے وہ حاصل بالمصدر ہے۔"

گلکرائسٹ کے علاوہ انیسویں صدی کے یورپین مصنفین اردو اور بھی بہت ہیں۔ مثلاً۔

(۱) کپتان جوزف ٹیلر نے اردو انگریزی لغت لکھی، جس میں ڈاکٹر ولیم ہنٹر بھی شریک کار رہے۔ پہلی بار ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۸۲۰ء میں ولیم کارمیکال اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے مختصر اڈیشن شائع کیا۔

(۲) گلڈون نے فارسی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۹ء)

(۳) کپتان ٹامس روبک نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو "ہندوستانی لغت" تیار کرنے میں مدد دی۔ اور خود لغت جہاز رانی لکھی، جس میں جہاز رانی کے متعلق اصطلاحات اردو انگریزی میں جمع کیں۔ اور ایسے الفاظ اور فقرے بھی جمع کر دیے جو میدان جنگ میں اور

---

[۱] ماخوذ از نمونہ منثورات مولفہ مولانا احسن مارہروی۔

فوجی بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں کام آئیں۔ اسی میں اردو قواعد کے متعلق بھی ایک ضمیمہ شامل کردیا۔ یہ کتاب کلکتہ میں ۱۸۱۱ء میں چھپی۔

(۴) کپتان روبک نے ایک اور کتاب "ترجمان ہندوستانی" کے نام سے لکھی۔ جس میں زبان اردو کے قواعد درج ہیں۔ یہ پہلی بار لندن میں ۱۸۲۴ء میں چھپی، پھر ۱۸۴۱ء میں لندن و پیرس دونوں جگہ شائع ہوئی۔

(۵) جان شیکسپیر نے اردو لغت لکھی (مطبوعہ ۱۸۱۳ء)

(۶) ولیم ٹیٹ نے ایک کتاب مقدمہ زبان ہندوستانی لکھی جس کے تین حصے ہیں قواعد، لغت، زباندانی۔ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۷ء)

(۷) ایس ڈبلیو برٹن نے قواعد زبان ہندوستانی لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۳۰ء)

(۸) اسٹیم فورڈ ارناٹ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء) یہ کتاب رومن اور فارسی خط میں لکھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بطور ضمیمہ لغت اور اسباق زباندانی بھی شامل کئے گئے ہیں۔

(۹) اسی مصنف (ارناٹ) کی دوسری کتاب قواعد فارسی عربی اور دیوناگری حروف میں ہے۔ اس پر ڈنکن فاربس نے حواشی کا اضافہ کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء)

(۱۰) جیمس آر بالن ٹائن نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۲ء)

(۱۱) ڈنکن فاربس نے ہندوستانی لغت لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۲) ایف۔ فیلن نے مولوی کریم الدین دہلوی کی شرکت میں شاعروں کا تذکرہ شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا (مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

(۱۳) ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے اردو لغت لکھی (مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء)

(۱۴) ریورنڈ جی اسمال نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

ختم ہوئی اور ۱۸۴۶ء میں مطبع العلوم دہلی میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان مولفوں نے اس تذکرہ میں گارسن دتاسی کے تذکرہ سے بھی مدد لی بلکہ اس کا ترجمہ کر دیا۔ اور دیگر تذکروں سے بھی اس میں اخذ و اقتباس کیا۔ اس لئے یہ فیلن کا تذکرہ ایک نئی تالیف ہے اور زیادہ مفصل و معتبر ہے۔ اس میں فیلن کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

”اگرچہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ بہت تذکرے جمع کرکے اس تذکرے کو فراہم کروں، لیکن مجھ سے پہلے چونکہ ڈی تاسی نے زبان فرنچ میں درمیان ملک فرانس کے ایک تذکرہ ان تذکروں مفصلہ ذیل سے بہت اچھی طرح تالیف کر دیا تھا اس لئے اور دوسرے تذکروں سے جو اس کو دستیاب نہیں ہوئے اور اس تذکرے سے مدد لیکر یہ تذکرہ میں نے فراہم کیا۔“

ولیم میکفرسن
دستور العمل عدالت

۱۸۵۱ء میں ولیم میکفرسن نے ایک قانونی کتاب دستور العمل عدالت دیوانی حکومت فورٹ ولیم کے نام سے مرتب کی۔ اس کی تالیف میں دو اور شخص بھی شریک ہیں یعنی ماسٹر ایکوٹی اور جارج اسمولٹ فیگن مجسٹریٹ کلکتہ۔ مسٹر فیگن نے ”مجموعہ قوانین تعزیرات ہند“ بھی اردو میں مرتب کیا ہے۔ دستور العمل کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

”جس ضلع میں جو زبان مروج ہے اس زبان کے خط و عبارت میں نوشت و خواند و سوال و جواب وہاں کی عدالتوں میں اور ان کے سرشتوں میں کہ جہاں امورات عدالت فہم بند ہوتے ہیں، عمل میں آتے ہیں۔ یعنی دیار مغربی کے اور صوبہ بہار کے محکموں میں بزبان اردو اور اضلاع دیار بنگالے کی عدالتوں میں بنگلہ زبان میں اور ضلع کٹک اور اس کے متعلق پرگنوں کی کچہریوں میں اُڑیا زبان میں نوشت خواند و سوال و جواب کرنا معمول ہے۔“

جان ولیم ییل
”رسالہ آلات طبعی“

مسٹر ییل آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ علم طبعیات

ماخوذ از ”یورپ میں اردو“ مصنفہ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی۔

(فزکس) کے ماہر اور فن کیمیا (کیمسٹری) کے عالم تھے۔ مولوی کریم الدین مدرس اول اردو کی مدد سے آلات طبعی کا نقشہ تیار کیا، اور ان کے استعمال کے متعلق ۱۲۶۹ھ؍۱۸۵۳ء میں ایک رسالہ اردو میں تحریر کیا، جو مطبع مصور آگرہ میں ۱۲۷۱ھ؍۱۸۵۴ء میں طبع ہوا۔ دیباچہ کی عبارت کا نمونہ یہ ہے :-

"یہ کتاب واسطے مبتدان طلبا، کے جو علم طبعی کے لیکچروں یعنی درسوں میں حاضر ہوا کرتے ہیں بموجب حکم جناب معلی القاب جیمس ٹامسن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربیہ کے طیار کی گئی تھی۔ اور چونکہ اس حکم نے ان کی وفات تاسفی کے چند روز پیشتر نفاذ پایا تھا اور یہ طلبا کی ترقی کے بڑے مشتاق رہتے تھے ..."

ان کے علاوہ آگرہ ہی میں ایک اور انگریز جان پارکس لیڈلی تھا۔ سرکاری مترجم کا عہدہ اس کے سپرد تھا۔ اس نے ایک اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ علمی دلچسپی اور اردو زبان کا شوق رکھتا تھا۔ ایک ۹۰ صفحے کا رسالہ علم المعیشت (اکنامکس) انگریزی سے ترجمہ کرکے اردو میں لکھا۔ اور اپنے مطبع میں ۱۲۶۹ھ؍۱۸۵۳ء میں طبع کیا۔

عیسائی مشنری اہل یورپ نے ہندوستان میں تجارت و حکومت کی کوشش کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کا کام بھی بڑے زور شور سے کیا۔ اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں انجیل کے ترجمے کئے۔ اس طرح بالواسطہ اردو زبان کی وسعت اور اردو لٹریچر کی کثرت میں سعی کی۔ اٹھارہویں صدی ہی میں چند ترجمے ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی میں اردو کے ٹائپ اور لیتھو کے چھاپے خانے جاری ہونے سے بائبل کی اشاعت بڑی کثرت سے ہونے لگی۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی تفسیر انجیل میں اور گارساں دتاسی نے اپنے خطبوں میں انجیل کے ترجموں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ہم انیسویں صدی کے ایک ترجمہ کا مختصر اقتباس بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔ اس کا ٹائٹل پیج یہ ہے "کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ، پہلی جلد، جس

میں سب کتابیں پیدائش سے لیکے زبور کی کتاب تک مندرج ہیں، نارتھ انڈیا، بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزاپور کے آرفن اسکول پریس میں ڈاکٹر میتھر صاحب کے اہتمام سے ۱۸۶۷ء میں چھاپی گئی۔" نمونہ یہ ہے:۔

"پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا، اور کہا کہ دیکھو میں نے ایک خواب دیکھا کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا۔ اور اس نے یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بیان کیا تب اس کے باپ نے اسے ڈانٹا اور اس سے کہا کہ یہ کیا خواب ہے جو تو نے دیکھا ہے؟ کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے سجدہ کریں گے؟ اور اس کے بھائیوں کو رشک آیا؛ لیکن اس کے باپ نے اس بات کو یاد رکھا۔"

انیسویں صدی میں یہ سلسلہ جاری رہا کہ انگریز حکام اور اہل قلم اردو زبان میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ چونکہ عدالتی زبان اردو ہوگئی تھی اس لئے شمالی ہند کی کچہریوں کی کارروائیاں اردو میں ہوتی تھیں۔ خود انگریز حکام تجویزیں اور فیصلے اردو میں لکھتے لکھواتے تھے لیکن جب انگریزی تعلیم عام ہوگئی اور حکومت کو انگریزی داں ملازم ملنے لگے تو اردو کی ضرورت نہ رہی اور سرکاری زبان انگریزی ہی ہوگئی۔ اس وقت سے انگریزوں نے بھی اردو کی تصانیف سے توجہ ہٹالی۔ انگریز اب بھی اردو سیکھتے ہیں۔ لیکن بولنے کے لئے زیادہ، پڑھنے کے لئے کم۔ اور لکھنے کے لئے بہت کم۔ بیسویں صدی میں انگریزوں کی اردو تحریروں کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ لیکن اردو زبان سے دلچسپی اور اس کے متعلق تالیفات اب بھی ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں گراہم بیلی نے ایک مختصر تذکرہ ہسٹری آف اردو لٹریچر کے نام سے انگریزی میں لکھا ہے اور لندن سے شائع کیا ہے۔ سو صفحے کی کتاب ہے۔ ابتدائے زبان اردو اور دکن کی تصانیف اردو سے لیکر عصر حاضر تک کے مشہور اور خاص خاص شاعروں اور مصنفوں کا مختصر حال اور ذکر تصانیف درج

ہے۔ نمونہ نثر و نظم کچھ نہیں ہے۔ بعض جگہ غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب واضح و دلچسپ ہے۔ اردو کی رفتار و ترقی کا مجمل اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ مصنف نے بھی تصنیف کے زمانہ (۱۹۳۲ء) کے زندہ و موجود مصنفین نثر میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا۔ عبد الحلیم شرر، خیری اور پریم چند تک کو چھوڑ دیا ہے۔ شاعروں میں سے صرف ڈاکٹر اقبال کو لیا ہے۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کا بھی نام نہیں لیا۔ گراہم بیلی کے مطالعہ شاعری اور نقد و نظر کی ایک دلچسپ مثال درج کی جاتی ہے:۔

اس نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مختلف صورتوں سے اردو شاعروں کے درجے قائم کئے ہیں اور بہتری و برتری کے اعتبار سے ان کے ناموں کو مرتب کیا ہے۔ لکھتا ہے۔

(۱) سب سے بڑے شاعر۔ ان مجموعوں کی ترتیب مرتبہ کے لحاظ سے ہے اور مجموعوں کے اندر ناموں کی ترتیب زمانے کے اعتبار سے۔

(الف) میر۔ غالب۔ انیس۔

(ب) ولی۔ سودا۔ نظیر اکبرآبادی۔ اقبال۔

(ج) درد۔ میر حسن۔ داغ۔ حالی۔ اکبر

(۲) بہترین غزل گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میر۔ ولی۔ درد۔ غالب۔ مصحفی۔ آتش۔ داغ۔ امیر مینائی۔

(۳) بہترین قصیدہ نویس شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) سودا۔ ذوق۔ نصرتی دکنی۔

(۴) بہترین مرثیہ گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) انیس۔ دبیر۔ مونس۔ عشق۔ ضمیر۔ اور دکن کے شعرائے مرثیہ ہاشم علی۔ مرزا

(۵) بہترین مثنوی گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میر حسن۔ اثر۔ میر۔ نسیم۔ مومن۔ اور دکن کے شعرا۔ غواصی۔ نصرتی۔ طبعی۔ وجہی۔

(۶) عام شاعری کے اعلیٰ شعرا (بہ ترتیب زمانہ) قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ۔

نظیر اکبرآبادی - حالی - اکبر - کیفی حیدرآبادی - اقبال -

(۷) گزشتہ ۵۰ برس کے بہترین شعرا (علاوہ مذکورۂ بالا شعرا کے) - آزاد - جلال - تسلیم - اسمٰعیل - شاد -

(۸) گزشتہ ۱۰۰ برس میں بہترین نظم مسدس حالی ہے، بشرطیکہ انیس کے مرثیوں کو ایک نظم نہ مانا جائے۔

ہم کو ان ترتیبوں سے بعض جگہ اختلاف ہے، لیکن یہ رائے گراہم بیلی کے وسیع مطالعہ اور غائر نگاہ کا ثبوت ہے - چونکہ اہل یورپ کی اردو زبان میں انشا پردازی کا سلسلہ ختم ہے اس لئے ہم نے یورپین مصنفین نثر کا ذکر یہیں ختم کر دیا ہے - کہ نثر کے متعلق ان کی کارگذاریاں ایک جگہ نظر آجائیں - یورپین شعرا کا تذکرہ حصہ نظم میں آئے گا -



نثر کا تیسرا دور

(۱) مصنفین فورٹ ولیم کالج

سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۲۰ء

۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء، ذی الحجہ سنہ ۱۲۱۴ھ کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ اس سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول نے دیسی کالج کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا جس میں انگریز ملازم اور ہندوستانی طلبا فارسی پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں اردو یا اور کوئی ملکی زبان نہ پڑھائی جاتی تھی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کمپنی کی طرف سے ہر انگریز ملازم کو تیس روپیہ فی کس دئے جاتے تھے۔ وہ لوگ اردو اپنے طور پر پڑھ لیتے تھے یا انگریز حکام اپنے ماتحتوں کے لئے اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کی زبان فارسی تھی۔ فارسی ہی میں تمام عدالتی و ملکی کاروبار انجام پاتے تھے۔ سلطنت کے اثر سے شمالی ہند میں کثرت سے اور عام طور پر اور کم و بیش تمام ہندوستان میں فارسی تعلیم کا رواج تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا اور بڑا تعلق سلطنت مغلیہ ہی سے پیدا کرنا تھا۔ اس لئے انگریز بھی فارسی کی تحصیل پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ لیکن مغلیہ سلطنت اور فارسی زبان کا تنزل اور اردو زبان کی ترقی اس سرعت کے ساتھ جاری تھی کہ لارڈ ویلزلی نے انگریزوں کے لئے اردو کی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ اور اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام کر دیا۔ اس ضرورت کے ساتھ ہی گورنر جنرل کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جو انگریز کمپنی میں ملازم ہو کر آتے ہیں وہ ولایت سے اعلیٰ تعلیم

حاصل کرکے نہیں آتے اور کاردانی و حکمرانی کے لئے علوم و فنون کی مہارت ضروری ہے۔ اس لئے اس نے یہ چاہا تھا کہ یہ فورٹ ولیم کالج علوم و فنون کی اعلیٰ درسگاہ ہو۔ جس میں علمی زبانیں عربی و فارسی و سنسکرت بھی پڑھائی جائیں، اور ملکی زبانیں اردو، بنگالی، مرہٹی وغیرہ بھی، اور یورپین زبانیں انگریزی، لاطینی، یونانی بھی۔ اور علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جائے جن میں تاریخ عالم، تاریخ ہند، جغرافیہ، اصول قانون، شرع اسلام، دھرم شاستر وغیرہ شامل ہوں۔ لیکن کمپنی نے ایسے عظیم الشان کالج کے مصارف کثیر برداشت کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس لئے کالج کو صرف زباندانی کا کالج بنانا پڑا۔

ڈاکٹر گل کرائسٹ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، اردو کے بڑے حامی و ماہر تھے، اور کئی سال پہلے سے اردو کی خدمت کر رہے تھے۔ کمپنی کے ملازموں کو بھی اپنے طور پر اردو پڑھایا کرتے تھے۔ اب کالج میں باقاعدہ اردو کی تعلیم شروع کر دی۔ اور اپنی مدد کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی مدرس مقرر کیا۔ اس تعلیم کے ساتھ ہی انھوں نے اردو کی تالیف و تصنیف کا محکمہ بھی قائم کر دیا۔ اور ہندوستانی اہل زبان اور ماہران فن سے اردو زبان میں ترجمہ و تصنیف کا کام بھی لینا شروع کیا۔ اور ان کتابوں کے چھاپنے کے لئے اردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم کر دیا۔ یہی ہندوستان میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا۔[1]

---

[1] فورٹ ولیم کے چھاپہ خانہ کے بعد انگریز پادریوں نے سیرامپور میں مطبع قائم کیا۔ پادری مارٹن نے انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ ۱۸۱۴ء میں یونانی زبان سے اردو زبان میں کیا۔ سیرامپور کے مشنریوں نے پوری بائبل کا ترجمہ پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک شائع کیا۔ لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۱۴ء / ۱۲۲۹ھ) کے زمانے میں ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔ اس میں سب سے پہلی کتاب ہفت قلزم (فارسی لغت) طبع ہوئی۔ لیتھو کا سنگی مطبع سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے کانپور میں جاری کیا۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں سنگی مطبع قائم ہوا۔ اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (باقی آیندہ صفحہ پر)

اس وقت تمام ملک میں اردو کی ایک کتاب نثر بھی ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج

(بقیہ صفحہ ۸۶) (مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد) نے دہلی اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اردو زبان کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ نواب نصیرالدین حیدر (سال جلوس ۱۸۳۰ء ۱۲۴۲) نے مسٹر آرچر کو کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کیا جس میں سب سے پہلی کتاب شرح الفیہ چھپی۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہوگیا۔ اس سال کے بعد تمام ہندوستان میں لیتھو کے چھاپے خانے کھلنے لگے۔ اور اخبارات نکلنے لگے۔ آگرہ، میرٹھ، بنارس، بریلی، پنجاب، بمبئی، مدراس وغیرہ میں بڑی کثرت سے مطابع و اخبارات جاری ہوگئے۔ ۱۸۴۹ء میں صرف ممالک مغربی شمالی (یعنی موجودہ یوپی، دہلی اور پنجاب) میں ۲۴ مطبع تھے جن میں سے بارہ مطبع صرف لکھنؤ میں تھے۔ اور ان مقامات پر ۲۳ اخبار اردو کے نکلتے تھے۔ اُس سال تمام ہندوستان کے اردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ اور صرف ممالک مغربی شمالی میں ۱۴۱ کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ غدر کے اگلے سال ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا، اور اسی سال اس مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار آئندہ چل کر روزانہ ہوگیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ اور مطبع نولکشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک مشرقی میں اس سے بڑا مطبع نہ تھا۔ لیکن بعد کو اس مطبع کی مطبوعات میں صحت کتابت اور حسن طباعت کا التزام نہ رہا۔ اس اعتبار سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی کانپور نے نام پیدا کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا۔ اور بیس سال سے زیادہ ملک کی خدمت کرکے اپنے مالک کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کی مطبوعات حسن و خوبی کے لحاظ سے ایشیا بھر میں بے نظیر تھیں۔ قدیم مطابع میں مطبع نولکشور کے علاوہ صوفی قادر ملتان کے مطبع مفید عام آگرہ کو بھی فن طباعت میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں متعدد اعلیٰ مطابع جاری ہوئے، کامیاب رہے اور قائم ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں بلاک کی چھپائی اس قدر عام اور ارزاں ہوگئی ہے کہ تمام سنگی مطابع کی خوشنمائی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ عمومیت اس قدر کہ جنتریاں، دواخانوں کی فہرستیں پوری بلاک سے چھاپی جاتی ہیں اور ارزانی اتنی کہ بلاک کا چھپا ہوا پورا قرآن مجید ایک روپیہ میں اور حمائل شریف آٹھ آنہ میں دستیاب ہوسکتی ہے۔ یہ مطابع کی مختصر تاریخ ہے۔ اسکی تفصیلات موقع بموقع کتاب کے اندر آئیں گی۔

کے نصاب تعلیم میں شامل کیا جاتا۔ مطبوعہ کتاب کا تو اس سے پہلے امکان ہی نہ تھا۔ قلمی کتابوں میں فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا اور شاہ صاحبان دہلوی کے تراجم قرآن مجید مذہبی کتابیں تھیں۔ انگریزوں کے کام کی نہ تھیں۔ تحسین کی نوطرز مرصع مشکل دادق تھی۔ اور جو کتابیں متفرق لوگوں نے لکھیں وہ قلمی ہونے کے سبب سے اور غیر مشہور اشخاص کی تصانیف ہونے کی وجہ سے گمنام تھیں۔ اور اب ان کا پتہ چلا ہے تو مشکل سے کوئی کتاب مذہبی تعلیم سے علیحدہ عام لٹریچر (تاریخ، سیرت، فسانہ وغیرہ) کے متعلق تھی۔ اس لئے ڈاکٹر گل کرائسٹ کا اردو زبان پر کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو کا سب سے پہلا لٹریچر گویا ایجاد کر دیا۔ ہندوستان کے ذی علم و اہل زبان لوگوں کو جمع کیا۔ اور کتابیں لکھوائیں۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ صرف چار سال اس کالج میں رہے لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام جاری رہا۔ ان کے قائم مقام انگریزی پرنسپل اور منتظم اس محکمہ تالیف و تصنیف کی نگرانی و سرپرستی کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد کپتان ٹامس روبک کالج کے پرنسپل ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کی تالیفات میں مدد دی اور خود بھی لغت جہازرانی وغیرہ کتابیں لکھیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر بھی فورٹ ولیم کالج کے اردو پروفیسر تھے۔ ان کی تصنیفات اردو کا ذکر بھی پہلے کیا جا چکا ہے۔ اب کالج کے ہندوستانی مصنفوں کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔

میر امن دہلوی

میر امن کا نام میر امان تھا۔ اور امن تخلص، لیکن میر امن کے نام سے مشہور ہیں۔ میر امن فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں پہلے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے میر بہادر علی حسینی وہاں میر منشی تھے۔ میر امن کے دوست تھے۔ انہی کے ذریعہ سے میر امن ملازم ہوئے۔ میر امن نے کتابیں بھی اوروں سے کم لکھیں یعنی صرف دو، باغ و بہار اور گنج خوبی۔ ان میں سے بھی صرف باغ و بہار ہی مشہور ہے۔ دوسری کا نام بھی کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اکیلی باغ و بہار نے ان کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ دلی کی زبان، اردوے معلّٰی کے روزمرّہ اور محاورے، بیان کی دلکشی، فقروں کی شگفتگی،

مکالموں کی دلفریبی، حسب موقع اختصار و تطویل، مناظر کی تصویر، یہ سب خوبیاں اس زمانے کے کسی مصنف میں ایسے کمال کے ساتھ یکجا نہیں ہیں۔ میرامن کے ذاتی حالات کسی تذکرے میں اتنے بھی نہیں ہیں جتنے انھوں نے خود "باغ و بہار" کے دیباچہ میں لکھ دیئے ہیں۔ ہم انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ان کے نمونۂ تحریر کا بھی کام دیں گے:۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا لاتے رہے، اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیئے فرماتے رہے، جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر مالامال اور نہال کر دیا اور "خانہ زاد موروثی و منصبدار قدیمی" زبان مبارک سے فرمایا، چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں، تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ایسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا، اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے، کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا، کچھ بنی، کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا، اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آپہنچا۔ چندے بیکاری میں گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیئے کہ دن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں، اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش

یاکر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

باغ و بہار کے قصہ کا ماخذ اور طرزِ تحریر بھی خود میر امن کی زبانی یہ ہے :-

"قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو ان کے پیر تھے (اور درگاہ ان کی قلعہ میں تین کوس لال دروازے کے باہر ٹمیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) ان کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان، جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

باغ و بہار ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں ختم کیا۔ ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوا۔ باغ و بہار تاریخی نام ہے (۱۲۱۷ھ نکلتا ہے)۔ میر امن نے فارسی کے قصہ کو اپنی کتاب کی اصل بتایا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب دہلوی سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (حال منتقل شدہ بمقام نئی دہلی) نے اپنے مقدمۂ باغ و بہار میں ثابت کیا ہے کہ میر امن نے باغ و بہار کو چہار درویش سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ تحسین کی نوطرز مرصع کو دیکھ کر لکھا ہے۔ لیکن تحسین کی ثقیل عبارت کو سلیس کر دیا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا ہے، ضروری باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ حسب ضرورت مختصر بیان کو مفصل اور مفصل کو مختصر کر دیا ہے۔ اور بہ حیثیت مجموعی کتاب کو اپنا بنا لیا ہے۔ میر امن نے قواعد زبان کی پابندی سے زیادہ

روزمرّہ اور محاورہ اور بول چال کا خیال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ اردو کے مقابلے میں میر امن کی زبان میں تذکیر و تانیث کا اختلاف، قدیم محاورے، ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اب متروک ہیں۔

اسی قصے کو اسی سال (۱۲۱۸ھ) میں ایک اور شخص محمد عوض زرّیں نے لکھا ہے۔ اس نے "قصہ چار درویش" کو پہلے فارسی میں لکھ کر راجہ رام دین برادر راجہ سیتل پرشاد کو دکھایا، اور راجہ کی فرمائش سے پھر اس کو اردو میں لکھا۔ عجیب بات ہے کہ زرّیں نے تحسین کی کتاب کے دیکھنے کا ذکر نہیں، لیکن نام وہی تحسین والا رکھا ہے یعنی نوطرز مرصع اور عجیب تر یہ کہ زرّیں کو میر امن کی کتاب کی خبر نہیں، لیکن اس نے تاریخ تصنیف وہی میر امن والی نکالی ہے، یعنی باغ و بہار۔ دیباچہ میں لکھتا ہے:۔

بنا کر یہ گلدستۂ روزگار لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

محمد عوض زرّیں نے وہی چار درویشوں کے قصے لکھے ہیں، لیکن بہت مختصر۔ قافیہ پیمائی کی ہے لیکن عبارت بالکل سادہ ہے۔ کوئی لطف اور کوئی خصوصیت اُن دونوں کتابوں کے مقابلے میں نہیں ہے۔ البتہ کتاب کے اندر جا بجا، بلکہ اکثر صفحوں پر کئی کئی جگہ دو دو چار چار شعر لکھے ہیں جو مثنوی کی طرز میں ایک ہی بحر کے ہیں اور بیان داستان کا جزو ہیں۔ یہ نظم نثر سے زیادہ دلچسپ ہے۔

میر امن کی باغ و بہار اس قدر مقبول ہوئی کہ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی زبانوں میں ترجمے ہوئے اردو میں متعدد شاعروں نے نظم کیا۔ میر امن کی زبان و بیان کو ہر ہندوستانی اور یورپین نے سراہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے اپنے خطبات میں بار بار باغ و بہار کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں گنائی ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے:[۱] "اس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ

---

[۱] خطبات گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کار آمد ہوں گی۔" دوسرے خطبہ میں باغ و بہار کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کرتا ہے، اور اس کو اعتراض کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ گارسن دتاسی عیسائی ہے، اس کو اسلام کی اشاعت و تبلیغ پسند نہیں اور اس بات کو قصے میں عجیب سمجھتا ہے۔ لیکن میر امن مسلمان ہیں، قصے کے کسی مسلمان شخص کو مسلمان دکھانا، یا بقول دتاسی اسلام کی تبلیغ کرنا ان کے لئے بالکل درست بلکہ فطری بات ہے۔ ہم گارسن دتاسی کی تنقید درج کرتے ہیں، اور اس نے باغ و بہار کے جن فقروں کا حوالہ دیا ہے ان کو میر امن کے الفاظ میں باریک قلم سے نقل کرتے ہیں۔ یہ مختصر ٹکڑا باغ و بہار کے مکالمات کی بھی چھوٹی سی دلچسپ مثال ہے۔

گارسن دتاسی کہتا ہے۔ "باغ و بہار کی نسبت میں اپنے ۱۸۵۲ء کے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے۔ اور غالی شاعری تصوف، عشق مجازی، اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی۔ قصوں میں اسلامی عقائد اثباتی نوعیت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے۔ مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے کہ اسے کیونکر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے، تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا، و بقبلہ ہوکر پڑھنے لگا۔ وزیر کی لڑکی یہ حرکات و سکنات دیکھ کر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے؟ تاجر جواب دیتا ہے:۔

---

۵ یہ عبارت بھی مع باغ و بہار کے اقتباس کے خطبات گارسن دتاسی سے ماخوذ ہے۔

"جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور زنداں سے خلاص کروایا، اس کی ذات لاشریک ہے، اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا، اور ادائے شکر کیا۔ یہ بات سن کر کہنے لگی، تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا، شکر الحمد للہ۔ بولی میرا دل تمھاری باتوں سے خوش ہوا، میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ۔ میں نے دل میں کہا الحمد للہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔ غرض میں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا، اور اس سے پڑھوایا۔" (باغ وبہار)

باغ وبہار اُس زمانے کے تمدّن و معاشرت کا آئینہ ہے۔ اسلامی عقائد اور ضعیف الاعتقادیاں، رسم ورواج، طعام ولباس، مشاغل ومعمولات، آداب، اخلاق، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ میرامّن شاعر بھی تھے، لیکن پیشہ ور نہیں۔ صرف تفریحی و اتفاقی۔ امّن اور لطف دونوں تخلص تھے۔

میرامّن کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے۔ یہ مُلّا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوارسہیلی) کی اخلاق محسنی کا ترجمہ ہے۔ اس کے متعلق میرامّن خود لکھتے ہیں:۔

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا، اس لئے اس کا مطلب لیکر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا" (گنج خوبی)

یہ کتاب بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے باغ وبہار کے بعد ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں لکھی تھی، لیکن اس کو شہرت و مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو چھپوایا بھی نہیں۔ مدتوں بعد ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ میں مطبع محبوب بمبئی میں چھپی۔ اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مولوی سید محمد صاحب بی اے (عثمانیہ) کو کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں ملا ہے۔ جس سے انھوں نے ایک حکایت بطور نمونہ اپنی تالیف (ارباب نثر اردو) میں نقل کی ہے۔ کتاب کے نادر و نایاب ہونے کے سبب سے ہم بھی اس حکایت کو درج کرتے ہیں کیا ب چیز کا جس قدر حصہ جتنا مشتہر ہو جائے غنیمت ہے:۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پونہچایا، کسو شخص نے انھیں خواب میں دیکھا، اور پوچھا، کہ مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گذری، اور اب کیا حال ہے۔ جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا، ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا، اور سارے گناہ معاف ہوگئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب ہے اور باعث ہے، کچھ تمھیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلہ سے نجات پائی۔ بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تونس ہوا اُس کے سایہ میں آنکر بیٹھا، اس نے کوئی دم آرام پایا، جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا، خوش ہوکر نہایت عاجزی سے بدل دعا کی کہ اے بار الہا، اس مکان کی بنا کرنے والے کے گناہ بخش، اور اس کی روح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وو ہیں اس کی دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر درست بیٹھا۔ میری آمرزش ہوئی، اور جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفے میں رہنے کا حکم ہوا۔ بیت

ہر چند کہ سب کاموں میں مَیں غور کروں ہوں
نیکی ہی بھلی سب میں ہے اور باقی ہے سب پوچ

ید حیدر بخش حیدری

فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں حیدری نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، لیکن نہ سب کی سب شائع ہوئیں، نہ سب کے
ی نسخے ملتے ہیں۔ حیدری کے آبا و اجداد نجف اشرف سے ہندوستان آئے،
ں میں سکونت اختیار کی۔ ان کے والد کا نام سید ابوالحسن ہے۔ معاش سے پریشان ہوکر
کے والد لالہ سکھ دیو رائے کے ساتھ دلی سے بنارس چلے گئے۔ اور وہیں رہنے
۔ بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل (مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم) عدالت کے جج تھے۔

حیدری کی تعلیم و تربیت نواب صاحب کی صحبت میں ہوئی۔ جب فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا اور وہاں ہندوستانی منشیوں کی ضرورت ہوئی تو حیدری نے اردو میں قصۂ مہر و ماہ لکھا اور اس کو لیکر کلکتہ پونہچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے اپنی تصنیف پیش کی۔ انھوں نے بہت پسند کی اور حیدری کو ملازم رکھ لیا۔ حیدری ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ سے پہلے اس ملازمت سے سبکدوش ہوکر بنارس واپس آ گئے۔ اور ۱۸۲۳ء ۱۲۳۸ھ میں انتقال کیا۔ حیدری کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے :۔

(۱) قصہ مہر و ماہ۔ حیدری کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اوائل ۱۲۱۴ھ (وسط ۱۷۹۹ء) میں لکھی۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

(۲) قصہ لیلیٰ و مجنوں۔ امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ و مجنوں کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۰۰ء ۱۲۱۴ھ میں تمام ہوا۔ یہ بھی مفقود ہے۔

(۳) ہفت پیکر، حیدری کی تصنیف منظوم ہے۔ نظامی گنجوی کی اسی نام کی مثنوی کے جواب میں مثنوی ہے۔ ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جوان نے اس کی تاریخ تصنیف کہی تھی :۔ "جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوی" (۱۲۲۰ھ)۔ یہ بھی اب ناپید ہے۔

(۴) تاریخ نادری، فارسی تصنیف تاریخ جہاں کشائے نادری مصنفہ مرزا محمد مہدی استرآبادی کا اردو ترجمہ ہے۔ مہدی نادر شاہ کا مصاحب تھا۔ اپنے آقا کے حالات (تا وفات نادر شاہ ۱۷۴۷ء ۱۱۶۰ھ) لکھے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے۔ یہی نام حیدری نے اپنے ترجمہ کا رکھا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۹ء ۱۲۲۴ھ میں ختم ہوا۔ یہ بھی نایاب ہے۔

لے "تاریخ جہاں کشا" کے نام سے فارسی کی ایک اور تاریخ بھی مشہور ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط نہ کر لیا جائے۔ وہ فارسی تاریخ اس فارسی تاریخ سے پانسو برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن عطا ملک جوینی نے چنگیز و ہلاکو کے حالات ۱۲۶۰ء ۶۵۸ھ میں لکھے ہیں۔ جوینی بھی ہلاکو خاں کا ملازم و مصاحب تھا۔ جیسے مہدی نادر شاہ کا۔

(۵) گلزارِ دانش، شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہارِ دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں ہوئی ہے۔ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں، سچا واقعہ ہے۔ بہرحال حیدری کی گلزارِ دانش بھی اب گم ہے۔

(۶) گلدستۂ حیدری، میں حیدری کی متفرق تالیفات جمع ہیں۔ یعنی مجموعہ مراثی، حکایات ولطائف، دیباچۂ مہر و ماہ، دیباچۂ لیلیٰ مجنوں، غزلیات وقصائد وغیرہ۔ یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی، اور کمیاب ہے۔

(۷) گلشنِ ہند، شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو حیدری نے ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء میں ختم کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ فورٹ ولیم کالج ہی کے ایک اور متوسل میرزا علی لطف نے اسی زمانے میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے اور اس کا نام بھی گلشنِ ہند رکھا ہے۔ لطف کا تذکرہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں تمام ہوا ہے۔ دونوں نے اختتامِ تالیف کی جو تاریخیں نکالی ہیں، ان سے یہی سنہ نکلتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے اپنی تالیف لطف سے ایک سال پہلے پوری کی۔ حیدری نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا ہے:۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں ۔۔۔ زروئے عشق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب ۔۔۔ "اسے کہتا ہے ہر یک گلشنِ ہند"

۱۲۰۶
۸
۱۲۱۴ھ

اور میرزا علی لطف کا قطعہ یہ ہے :۔

ہر ایک گُل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا ۔۔۔ کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پشت[1] ہے

---

[1] پشت۔ ذلیل و زبوں۔

حیران پھرے ہیں بے سروپا بہمن اور دے[۴] تاریخ اس کی جب ہے کہ "رشکِ بہشت" ہے[۵]

۱۲۲۷
۱۲
۱۲۱۵ھ

حیدری کا یہ تذکرہ کمیاب ہے۔ انگلستان میں اس کی دو کاپیاں ہیں۔ ان میں سے برٹش میوزیم کے ناکمل نسخہ سے تھوڑا سا اقتباس ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے مولوی سید محمد صاحب کو بھیجا تھا، جو انھوں نے "ارباب نثر اردو" میں درج کیا ہے۔ اس میں سے صرف مولف (حیدری) کا حال ہم نقل کرتے ہیں:-

"احوال مؤلف۔ اس حقیر نے موافق اپنی محنت و شفقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام معہ اشعار و تخلص کے جمع کیے اور کئی جزو بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ دو جزو حرف شین سے لے کر حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدر سے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے؛ اور یہ مجلد دو چار جزو کی جو کلام و ابیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی کہ وہ دستگیر درماندگان اور حامی بے کساں ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے بحق محمد و آلہ الامجاد۔"

[۵] مؤلفِ "ارباب نثر اردو" کو (جن کی تالیف سے یہ حالات اور اقتباسات ماخوذ ہیں) "رشک بہشت" سے تاریخ نکالنے میں غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "رجب" کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ "رشک بہشت" کے اعداد ۱۲۲۷ ہیں۔ "رجب" کے عدد گھٹائے جائیں گے تو ۱۲۲۲ بچیں گے۔ اس کے علاوہ قطعہ کے چوتھے مصرع میں (جب سے) کا اشارہ جمع کرنے کی طرف ہو سکتا ہے تفریق کی طرف نہیں۔ انھوں نے قطعہ کے تیسرے مصرع پر غور نہیں کیا۔ بہمن اور دے کے بے سروپا ہونے سے یہ مقصد ہے کہ بہمن کا سر (ب) اور دے کا پاؤں (ے) یعنی ان کے ۱۲ عدد تفریق کیے جائیں گے۔ قادری

حیدری نے اپنے تذکرہ میں میر تقی میر علی افسوس کا حال دو سطروں میں لکھا ہے، اور میرزا سودا دہلوی کا ایک سطر میں۔ اس حساب سے بیشک شین سے تی تک دو جز ہوسے ہونگے اور الف سے تین تک بھی دو جزو سے زیادہ کیا ہوں گے۔ گویا پورا تذکرہ چار پانچ جزو کا ہوا۔ حالانکہ لطف کا تذکرہ باوجود پبلشر کی قطع و برید کے ۲۱۰ صفحوں پر طبع ہوا ہے۔ البتہ حیدری کی عبارت سادہ وسلیس ہے اور لطف کی مقفی اور پیچدار (جیساکہ آگے نمونہ سے معلوم ہوگا)۔

(۸) **طوطا کہانی**۔ حیدری کی شہرت ان کی دس تالیفات میں سے دو کتابوں کے سبب سے ہے، جن میں سے ایک "طوطا کہانی" ہے اس کے متعلق خود حیدری کا بیان ہے:-

"بہ موجب فرمایش صاحب موصوف (یعنی گل کرائسٹ) کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوے معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب، الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔"

ہم نے طوطی نامہ اور اس کے تراجم کا ذکر اسی تاریخ اردو کے صفحہ ۳۴۳ و ۳۴۴ پر متن و حاشیہ میں کر دیا ہے۔ حیدری کی طوطا کہانی ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی اور ۱۸۰۴ء میں شائع ہوکر کالج کے نصاب میں شامل کی گئی۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی اور بار بار مختلف مطابع میں چھپی۔ ۱۸۵۲ء میں ڈنکن فاربس نے لندن سے اس کا نہایت خوبصورت ایڈیشن شایع کیا۔ جی اسمال نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ باسینہ پرسوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے موئی جاتی ہوں اور تو ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔ فرد

نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا میں عاشق ہوں مجھ کو نصیحت سے کیا

طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہیئے، کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے اور پشیمانی کھینچتا ہے۔"

(۹) **آرائش محفل**، حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سات سیروں کا فسانہ ہے۔ اس لئے عبد الغفور نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعرا" میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش کے مطابق فارسی کی داستان کو اردو میں لکھا۔ محض ترجمہ نہیں کیا بلکہ کمی و بیشی کر کے نئی اور زیادہ دلچسپ داستان بنا دی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:-

"...... زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نثر میں کیا۔ اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ مگر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے۔"

اسی نام سے ایک کتاب میر شیر علی افسوس نے لکھی ہے۔ وہ بالکل الگ چیز ہے، اور حیدری کی کتاب کے کئی سال بعد ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں لکھی گئی ہے۔ اس زمانے کے لوگوں کی یہ عجیب عادت ہے کہ کسی مشہور کتاب کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھ دیتے ہیں، خواہ کتنا ہی ناموزوں، بے محل اور بے ضرورت ہو۔ محمد عوض زریں نے تحسین کی کتاب نو طرز مرصع کا نام لے لیا، لطف و حیدری دونوں نے اپنے تذکروں کا نام گلشن ہند ہی رکھا، خواہ کسی نے کسی سے لیا ہو۔ افسوس نے بھی حیدری والا نام آرائش محفل ہی پسند کیا۔ حالانکہ افسوس کی کتاب "مملکت ہندوستان کی تاریخ" ہے۔ "آرائش محفل" کا نام تاریخ سے زیادہ قصہ کہانی کے لئے موزوں تھا۔ زریں کی عبارت میں سجع و ترصیع نہیں ہے، پھر اس کو "نو طرز مرصع" کہنے کی کیا ضرورت تھی[۵]۔ گلشن ہند کا لفظ تذکرہ شعرا کا مترادف یا مشعر نہیں ہے کہ خواہ مخواہ یہی نام ذہن میں آئے یا موزوں معلوم ہو۔

---

[۵] اگر مولانا عبد الحق دہلوی کے قیاس کے مطابق محمد عوض زریں نے خود اپنی کتاب کا یہ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۰ پر)

حیدری کی آرائش محفل نہایت دلچسپ، خوبصورت، سلیس روزمرہ میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے بہت مقبول ہوئی اور کثرت سے شائع ہوئی۔ نمونہ یہ ہے :۔

"چندے وزیعہ جب وہ لڑکی شعور دار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہربان، دنیا مانند حباب ہے۔ اس کا ٹٹنا کچھ بڑی بات نہیں۔ اس قدر دولت تنہا لیکر میں کیا کروں گی مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لٹ دوں اور آپ کو آلائش دنیا دی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں، بلکہ یاد خدا میں مصروف رہوں۔ اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں جو مناسب جانو کہو۔ دائی نے کہا: اے جان پدر تو ان سات سوالوں کا اشتہار لکھ کر دروازے پر چپکا دے اور یہ کہہ کہ جو کوئی میرے ساتوں سوال پورے کرے گا میں اس کو قبول کروں گی، اور وہ سوال یہ ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے جو ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پائے گا۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ کوہ ندا کی خبر لاوے۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کی برابر بالفعل موجود ہے اس کی جوڑی پیدا کرے۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ حمام بادگرد کی خبر لاوے۔ حسن بانو نے دائی کی اس بات کو پسند کیا اور خوش ہو کر دل میں کہا دیکھا کون ہے جو ان ساتوں کو بہم پہنچاوے گا"۔

(۱۰) **گل مغفرت**، زمانہ تصنیف کے اعتبار سے حیدری کی کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے لئے نہیں لکھی گئی۔ ملا حسین واعظ کاشفی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نام نہ رکھا بلکہ مطبع نولکشور والوں نے کتاب چھاپتے وقت طرز مرصع نام تجویز کر دیا ہو تو اہل مطبع بھی اسی زمانے کے لوگ ہیں۔ اور ہمارے اعتراض کی زد میں ہیں۔ قادری

(مصنف انوار سہیلی و اخلاق محسنی و تفسیر حسینی) کی تصنیف روضۃ الشہدا نہایت مشہور اور اپنے موضوع کی بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں شہدائے اسلام اور خصوصاً شہدائے کربلا کے حالات ہیں۔ جن کو دس ابواب میں لکھا ہے اس کو دہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب سے اردو میں مختلف ترجمے اور تالیفیں ہوئی ہیں۔ اور وہ بھی اکثر دہ مجلس کے نام سے مشہور ہوئی ہیں۔ فضلی کی کربل کتھا بھی کاشفی کی کتاب سے ماخوذ ہے، اور وہ بھی دہ مجلس کہلائی جاتی ہے۔ حیدری کی گل مغفرت میں بھی روضۃ الشہدا سے شہدائے کربلا کے حالات لئے گئے ہیں۔ جیسے کہ خود حیدری کہتے ہیں:-

"صاحبان دردو غم و مبتلایان رنج و الم پہ ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشن شہیداں سے جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گل گلزار معانی شمع بزم نکتہ دانی، بحر سیادت و امانت، سرو جوئبار گلشن شرافت و نجابت، مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیضدرجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخ دلی و نیاز باطنی ہے اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گل مغفرت رکھا اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے، مقبول خاطر ہووے بحق محمد و آلہ الامجاد۔"

گل مغفرت ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں لکھی گئی۔ اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۱۸۴۵ء میں کسی فرانسیسی نے فرنچ زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ گل مغفرت اب کہیں نہیں ملتی۔ مولف ارباب نثر اردو کو ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء ملا ہے اور انھوں نے اس کا اقتباس درج کیا ہے۔ ہم بھی اس کو اس خیال سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کا اتنا نمونہ بھی اور کہیں دستیاب نہ ہوا۔

"کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اسے اہل بیت رسالت کے ہواخواہو، واسطے آل عبا کے ماتم دارو، ماہ محرم میں گریہ و زاری کرو، خوشی و خرمی کو دل میں راہ نہ دو،

حق تعالیٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجرِ عظیم دے گا، بہشت بریں سا مکان عطا فرمائے گا۔
کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول و دستور تھا کہ جب کوئی
امیر نئی سوار کمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا، ایک گرزِ طلائی سے سرفراز ہوتا۔
ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی۔ ایک سو بیس سردار صاحب گرز شمار کئے گئے
عمرو بن لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تلک رویا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا، ایک وزیر
نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا، اے بادشاہ تجھے کیا ہوگیا، ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا؟ اس نے کہا کہ
اے وزیر نیک تدبیر، یہ فوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا،
اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سید الشہداؑ کے ساتھ کربلا کے معرکے
میں ہوتا تو ان کافروں بدنہادوں کو مارتا، آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام،
وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب
میں دیکھا کہ ایک تاج مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے کارچوبی پٹکا کمر میں باندھے
ہوئے، حور و غلماں اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے اور
بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا کہ اے شخص، پہلے میں غضب الٰہی میں
گرفتار ہوا تھا، بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم و الم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے
کے صدقہ سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا۔ اور آپ کے رنج و الم کو
یاد کرکے روئے گا، یہ گریہ و زاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی، موجب نجات کا ہوگا۔"

حیدری کا طرزِ تحریر بھی سادہ ہے۔ مقفٰی عبارت نہیں، لیکن عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ
استعمال کرتے ہیں، محاورے کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ میر امّن، چھوٹے جملے، ہندی
کے الفاظ، روزمرہ و محاورہ اس طرح برتتے ہیں کہ ان کی عبارت نہایت دلکش ہو جاتی
ہے۔ میر شیر علی افسوس حیدری سے بھی زیادہ عربی و فارسی الفاظ لکھتے ہیں۔ (جیسا کہ
افسوس کے نمونوں سے معلوم ہوگا)۔

میر شیر علی افسوس

ان کے والد کا نام سید علی مظفر خاں ہے۔ آباواجداد ہندوستان آئے اور قصبۂ نارنول (صوبۂ آگرہ) میں سکونت اختیار کی۔ افسوس کے دادا محمد شاہ بادشاہ کے زمانے (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) میں دہلی آئے۔ یہیں افسوس پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد نواب عمدۃ الملک کے ملازم تھے۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ افسوس کے چچا سید غلام علی خاں الہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ محمد شاہ کے بعد سلطنت کا نظام ابتر ہو گیا، اور غلام علی خاں نے بھی وفات پائی۔ تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے اور میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغۂ توپ خانہ ہو گئے۔ میر قاسم کے بعد اس کے بیٹے میر جعفر کے ہاں ۱۷۷۶ء تک ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے اور نواب شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کے ہاں تین سو روپیہ پر ملازم ہو گئے۔ افسوس بنگال میں باپ کے ساتھ تھے اور لڑکپن کا زمانہ تھا۔ گیارہ برس کا سن تھا۔ اسی وقت سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ لکھنؤ آئے تو یہاں میر و سودا، جرأت و انشا کی سخن سنجیوں کی دھوم تھی۔ افسوس نے بھی شاعری کی مشق کی اور اساتذہ سے داد سخن لی۔ میر حیدر علی حیران دہلوی کے شاگرد تھے۔ شہزادہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ (ولی عہد سلطنت مغلیہ) اس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ انھوں نے افسوس کا کلام پسند کیا اور اپنا مصاحب و شاعر بنا لیا۔ شہزادے کے لکھنؤ سے واپس دہلی جانے کے بعد بھی افسوس لکھنؤ میں رہے۔ سرفراز الدولہ ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت ہوئی تو سرفراز الدولہ نے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے افسوس کی سفارش کر کے کلکتہ بھجوا دیا۔ وہاں ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۸۰۹ء میں افسوس نے انتقال کیا۔

باغ اردو: افسوس نے فورٹ ولیم پہنچ کر پہلی کتاب باغ اردو مرتب کی۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"لیکن تعلق میرا جو مدرسہ ہندی (یعنی فورٹ ولیم کالج) سے ہوا، بنا براس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطنت، مدرس ہندی، مسٹر جان گل کرائسٹ صاحب دام ثروتہ کے، کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں، حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر، میں نے دمیان کیا کہ عبارت اس کی بظاہر صاف و باطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور ابتدا میں قوت تالیف اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ مصرع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

..... باسے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام ہوئی، نام اس کا باغِ اردو رکھا، چنانچہ اس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں لکھی ہے۔ قطعہ

میں تاریخ اس کی جو چاہی مع نام — کھول دل کھول با آئین نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا — کہ ہے آغازِ عطا اردی باغ اردو

۱۲۱۴
۱
۱۲۱۵

کتاب کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:۔

سن ہجری بارہ سے سولہ (۱۲۱۶ھ) اور عیسوی اٹھارہ سے دو (۱۸۰۲ء) میں ترجمہ کر مسمّیٰ بہ باغِ اردو سے تمام ہوا۔

قطعہ

عون توفیق رب سبحان سے — ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے بیز عقل ہر کی — میں نے تاریخ عیسوی د طلب

ابتدائے بہار[۲] سے یہ کہا "باغ اردو ہوئی گلستاں اب"[۱]

۱۷۹۹
۲
۱۸۰۱

افسوس نے باغ اردو کے دیباچہ میں جو حمد و نعت لکھی ہے اس کی عبارت رنگین و مقفیٰ ہے، لکھتے ہیں:۔

۱؎ اس مصرع تاریخ میں ۱۷۹۹ء نکلتے ہیں اور لفظ بہار کی ابتداء ب کے دو عدد بڑھانے سے ۱۸۰۱ء ہوتے ہیں۔ حالانکہ قطعہ کے اوپر افسوس نے سن ہجری و عیسوی دونوں لفظوں میں لکھے ہیں۔ اور ختم کتاب کا سال ۱۸۰۲ء بتایا ہے۔ اس لئے تطابق مشکل ہوگیا۔ اسی طرح کی الجھن افسوس کے کلکتہ جانے کے زمانے کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ سیر المصنفین میں افسوس کے پہلے دیباچہ کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں یہ فقرہ ہے "ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کہ وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے پندرہ تھے اور ۱۸۰۰ء کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا، بعد الطاف نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی بہادر دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا۔ بدل جمعی تمام کلکتہ کو روانہ ہو کر صاحب عالی شان دام ظلہم زبان اردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا چاہتے ہیں، بنا بر اس کے تجھے طلب کیا ہے۔" حالانکہ سیر المصنفین کے مولف نے اس سے اوپر افسوس کے حالات میں لکھا ہے کہ "آپ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے۔" ارباب نثر اردو میں غالباً افسوس کے اس بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ "اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ سے افسوس کا تعارف کرایا۔" اب دشواری یہ ہے کہ اکتوبر ۱۸۰۱ء ۱۲۱۶ھ میں واقع ہوتا ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ۱۲۱۶ھ ہجری آغاز محرم سے آخر ذی الحجہ تک ۱۴ رمئی ۱۸۰۱ء تا ۲ رمئی ۱۸۰۲ء کے مطابق ہے۔ اس لئے افسوس کے کلکتہ پہنچنے کا عیسوی سن (۱۸۰۱) غلط معلوم ہوتا ہے۔ ہجری سن (۱۲۱۵) صحیح ہے۔ اسی ہجری سال میں اکتوبر ۱۸۰۰ء واقع ہوگا۔ لہذا ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ میں افسوس کلکتہ گئے۔ اسی سال باغ اردو لکھنی شروع کی۔ اور اگلے سال ۱۸۰۱ء ۱۲۱۶ھ میں تمام کی۔ اس طرح آغاز کتاب کی تاریخ ۱۲۱۵ھ اور اختتام کتاب کی تاریخ ۱۸۰۱ء درست ہو جائے گی۔ قادری۔

موجودہ تواریخ سے مدد لی تھی اور ان سب کا خلاصہ کر دیا تھا۔ اسی لئے اس کا نام خلاصۃ التواریخ رکھا تھا۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے فورٹ ولیم سے جانے کے بعد افسوس نے ۱۸۰۴ء ۱۲۱۹ھ میں مسٹر جے۔ ایچ۔ ہارنگٹن کی فرمائش سے اس فارسی تاریخ کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں عہد ہنود کی تاریخ تمام کر کے آرائش محفل نام رکھا۔ جو ۱۸۰۸ء ۱۲۲۳ھ میں شائع ہوئی اور انگریزوں کے امتحان اردو کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئی۔ اس کے بعد کلکتہ، لکھنؤ، لاہور کے مطابع سے چند بار شائع ہوئی۔ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ جان شیکسپیر نے اس کے دس باب کا انگریزی ترجمہ کر کے اپنی کتاب منتخبات ہندی میں شامل کیا۔

آرائش محفل کی عبارت مقفیٰ ہے، لیکن قافیہ پیمائی سے روانی و بے تکلفی میں فرق نہیں آیا۔ نمونہ یہ ہے:۔

"جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ، لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے۔ کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی، اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی۔ یہاں کی ہر ایک بستی میں گھما گھم۔ جابجا ایک نئی طرح کا عالم۔ ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے بچھونے اور تمام کی غذائیں۔ اکثر بیسیوں مسجدیں خانقاہیں مدرسے، باغات۔ غریبوں بے کسوں مسافروں کے لئے متعدد مکانات۔ قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بسیں، اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں۔ ندی نالے تالاب کوئیں لطیف و پاکیزہ ہزارہا۔ پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا۔ بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے بجرے وغیرہ بے شمار۔ شاہ راہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں پر پل بندھے ہوئے تیار۔ اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار۔ ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار۔ ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا۔ سودے والوں کی دکانیں جابجا۔ مسافر خوش و خرم کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے

جاتے ہیں، اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں۔

جہاں دیکھئے خیر ہی خیر ہے سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے"

افسوس نے ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی نثر کی کتاب تالیف نہیں کی۔ اپنا دیوان البتہ مرتب کیا۔ اس کا ذکر اور نمونہ حصہ نظم میں آئے گا۔ فورٹ ولیم کے لئے مرزا سودا دہلوی کے دیوان کا افسوس نے انتخاب کیا۔ جس میں سودا کے قصائد و غزلیات، مثنوی و مرثیہ کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی حسینی کی کتاب نثر بے نظیر کی نظر ثانی کی، اور نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کی تصحیح کی۔

میرزا علی لطف

یہ بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں ہیں، لیکن صرف ایک کتاب تذکرۂ گلشن ہند لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے وہاں مستقل ملازم نہ تھے۔ تھوڑے دنوں رہے۔ میرزا علی نام تھا، لطف تخلص، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآبادی ۱۱۵۲ھ؍۱۷۴۰ء میں نادرشاہ کے ساتھ دہلی آئے، ابوالمنصور خاں صفدر جنگ (نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا) کے ذریعہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے تعلق ہوا۔ ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی کے شاعر تھے۔ میرزا علی لطف فارسی میں باپ کے شاگرد تھے۔ دہلی میں پرورش ہوئی، یہیں تعلیم پائی اور فارسی اور اردو دونوں میں شاعری شروع کی۔ مختلف تذکروں میں لطف کو میر تقی اور مرزا سودا کا شاگرد بتایا ہے، لیکن لطف اس تذکرہ میں اپنے حال میں لکھتے ہیں کہ

"مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔"

دہلی کی تباہی کے بعد میرزا لطف باہر نکلے، اور حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا، اول لکھنؤ پہنچے۔ وہاں استادوں کا مجمع تھا۔ شہزادہ مرزا جواں بخت لکھنؤ میں مقیم تھے اور شعرا کے قدرداں تھے۔ انھوں نے لطف کا کلام بھی سنا اور پسند کیا۔ لیکن لطف کو اساتذۂ سخن کے مقابلے میں اپنے نباہ کی صورت لکھنؤ میں نظر نہ آئی۔ پٹنہ پہنچے، وہاں سے کلکتہ کی سیر کرکے دکن کا قصد تھا کہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے لطف

سے یہ تذکرہ لکھنے کی فرمایش کی۔ لطف نے دیباچہ میں اسی تذکرہ کا ماخذ اور تالیف کا حال اور زمانۂ تالیف بیان کیا ہے۔ ہم درمیان میں سے کچھ حذف کرکے لطف ہی کے بیان کو مسلسل کیے دیتے ہیں۔ یہی نمونہ کتاب کا کام دے گا۔ لکھتے ہیں:۔

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سرحلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفل معانی، سخن کی جان، اور سخندانوں کے قدردان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا، از بسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جاسے تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھاے تو نہایت طبع کے مرغوب ہو، بتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیرخواہ خفی وجلی، میرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے، نہایت محبت اور اخلاق سے فرمایا کہ تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں، اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیاں کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سر مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔۔۔۔

الحمدللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں ۔۔۔۔۔۔ موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمداں نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا۔"

یہ طرزِ تحریر دیباچہ سے مخصوص نہیں ہے، تمام تذکرہ کی عبارت اسی نمونہ کی ہے، یہی قافیہ پیمائی یہی خیال آرائی، جابجا عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔ مقفیٰ عبارت کے شوق میں تعقید کی بھی پروا نہیں کی۔ مثلاً میر تقی میر کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"ناقدر دانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوا سے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے۔"

حیران کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہجہاں آباد کے، شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص استاد کے۔"

دوسرے فقرے پر مولانا شبلی نے نوٹ لکھا ہے، تعقید کی شکایت کرتے ہیں: "اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو استاد فن ہیں، حیران ان کے شاگرد ہیں۔"

لطف اس تذکرہ کی ترتیب کے بعد حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں اعظم الامرا ارسطو جاہ مدار المہام تھے۔ انہوں نے قدر دانی کی اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ لطف کے دو بھائی اور بھی ان کے ساتھ تھے اور شہر میں سوز خوانی کیا کرتے تھے۔ لطف نے ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۲ء میں وہیں انتقال کیا۔

تذکرۂ گلشن ہند نایاب و نابید تھا۔ اتفاق سے ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں عظیم الشان سیلاب آیا، صدہا گھر ویران ہو گئے اور اسباب بہہ گیا۔ اسی میں یہ تذکرہ کسی کے ہاتھ آ گیا۔ مولانا شبلی حیدرآباد میں تھے، ان کو دکھایا، انہوں نے بہت پسند کیا، اور خود اس پر تشریحی حواشی لکھے۔ مولوی عبدالحق صاحب دہلوی سکرٹری انجمن ترقی اردو نے مفصل

عالمانہ مقدمہ لکھا۔ اور ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اب دوبارہ انجمن نے اپنی طرف سے گلشن ہند اور اس کے مانند داصل گلزار ابراہیم دونوں کو یک جا شائع کر دیا ہے۔

میر بہادر علی حسینی | ان کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم ہے۔ دہلی میں قیام تھا، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اردو ترجمہ قرآن مجید حسینی کے والد کے اہتمام سے پہلی مرتبہ دہلی میں چھپا تھا۔ میر امن حسینی کے خاص دوست تھے۔ حسینی پہلے فورٹ ولیم کالج میں پہنچ گئے تھے، اور وہاں میر منشی تھے۔ انہی کی سفارش سے میر امن کا تقرر ہوا تھا۔ حسینی نے چار کتابیں مرتب کیں:-

(۱) **نثر بے نظیر**۔ اس کا سبب تالیف اور طرز تحریر خود حسینی بیان کرتے ہیں:-

"قصہ بے نظیر و بدر منیر کہ نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا، ادا بند یکتا، رونق بزم سخن، میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک دہلوی کا تھا، فی الواقع ہر ایک مصرع اس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر۔ جو سخندان منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں، وہی اس کی طرز خوبی پہچانتے ہیں۔ مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے، بلکہ کوئی رمزوں کو پا تو سکے؛ قاصر ہے زبان اس کی توصیف میں، ہر کہ و مہ مشغول ہے اس کی تعریف میں۔ اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر --- مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے، حکم سے صاحب خداوند نعمت .... جان گل کرائسٹ صاحب بہادر دام حشمتہ کے، عاصی میر بہادر علی حسینی نے شروع قصہ سے موافق محاورۂ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بطرز سہل واسطے صاحبان نوآموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان شیریں کو (کہ فی الحقیقت قصۂ شیریں سے شیریں تر ہے) اس روبہ سے نثر کروں کہ ہر ایک بانی دان شاعر اس کو سن کر عش عش کرے، اور اس ہیچداں کی ایک یادگاری اس دنیا میں رہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس تالیف کا یہ دیباچہ ہے اس سے پہلے کالج کے نوآموز انگریزوں "صاحبانِ نوآموز" کے واسطے "اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بطرزِ سہل" تحریر کر چکے تھے۔ پھر دوبارہ یہ تالیف کی جو اس وقت زیرِ نظر ہے۔

حسینی کی یہ نثر اصل مثنوی کے سامنے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی لیکن حسینی نے اس کو دلچسپ بنانے کی یہ تدبیر کی ہے کہ اپنی نثر کے درمیان میں موقع بموقع مثنوی کے اشعار لکھ دیئے ہیں۔ مثنوی میر حسن فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل تھی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے نثر بے نظیر کو بھی مثنوی کے ساتھ چھپوا دیا۔ دوسری طباعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے اس پر نظرِ ثانی کی۔ متعدد بار مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ۱۸۷۱ء میں ایم ایچ کورٹ نے شائع کیا۔ اب اس کے نسخے نہیں ملتے۔ مولف ارباب نثر اردو کو بڑی سعی و تلاش کے بعد ایک نسخہ حاصل ہوا ہے۔ "یہ کالج پریس کا مطبوعہ ۱۸۰۳ء ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۷ صفحات پر مشتمل اور ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔" اس میں سے "داستان سواری کی تیاری" کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

جب گیارہ برس خیریت سے گزرے، بارھواں برس آیا، الحمد للہ جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف بج گئی، مبارک بادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کہ میں شہزادے کو لیکر سوار ہوں گا تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو اور بستی ان کے دل کی بھی آباد۔ تم نقیبوں کو تقید کرو گھر گھر یہ حکم پہنچا دیں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگا ہو۔ خبردار ایک سوار پیادہ اور ایک گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے۔ یہاں تک کس وقت

اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ ما بدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔ نظم

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند ۔۔۔ سواری کا ہو نور جس سے دو چند

اتنے میں شام پڑی، آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا، مہتاب سورۂ نور پڑھتا ہوا نکلا، حضرت محل میں تشریف لے گئے۔ تمام رات ناچ راگ رہا، مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔ نظم

عجب شب تھی وہ چوں سحر رو سفید ۔۔۔ عجب روز تھا مثل روز امید

القصہ رات آخر ہوئی، چاند نے بالین استراحت پر اپنا سر رکھا، اور سورج بڑی جھپک سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ نظم

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو ۔۔۔ کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

(۲) **اخلاق ہندی**۔ میر بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ہے، اور پہلی سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ اخلاقی کہانیاں پہلے سنسکرت میں لکھی گئی تھیں۔ سنسکرت سے اس کے دو ترجمے فارسی میں ہوئے نگار دانش اور مفرح القلوب۔ مفرح القلوب کا سبب تالیف حسینی نے اخلاق ہندی کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے:۔

"یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جس کی تخت گاہ صوبۂ بہار تھی، پونہچی، جب انھوں نے سنا، اس میں قصے از بسکہ دلچسپ ہیں، اور نصیحت میں نہایت مرغوب، اور باتیں خوب، اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں، اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں، تب ان میں سے ایک شخص (مفتی تاج الدین) حکم بجا لایا اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا"

اس مفرح القلوب کا حسینی نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش سے ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں ترجمہ کیا،

اور اخلاق ہندی نام رکھا۔ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی ایڈیشن نکلے۔ اس کی عبارت سادہ و سلیس ہے، لیکن کوئی خاص دلکشی نہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

"سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا، اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا اے بادشاہ آج میں کیا کھاؤں، مجھے بھوک لگی ہے۔ مینڈک نے کہا اے سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے۔ تب اس نے کہا تمہارے لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے، بادشاہ کا لشکر سے جدا رہنا خوب نہیں، اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاؤنی میں داخل ہوں تو بہتر ہے۔ تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہسوار کو زمین پر پٹک کر کوڑے دم کے مارے اور کھا گیا، جیسا کہ کسو شاعر نے کہا ہے۔ فرد

گردن بندگی نت خم ہے در فرماں پر ۔۔۔ گو سرا پا فدا کیوں نہ کرے چوگاں پر

---

(۳) تاریخ آسام۔ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد نے فارسی میں تاریخ آسام لکھی تھی جس میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سپہ سالار میر جملہ کی مہم آسام (۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء) کا حال لکھا تھا۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ منشی کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں ذکر کیا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں ختم ہوا۔ اور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن حسینی کا ترجمہ نایاب ہے۔

(۴) رسالہ گل کرسٹ۔ حسینی کی یہ چوتھی تالیف ہے، جو اصل میں حسینی کے دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی مفصل کتاب صرف و نحو ہندوستانی کا خلاصہ ہے۔ اصل کتاب ضخیم تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے انگریز طالب علموں کو امتحان کے لئے اس کے تیار کرنے میں دشواری ہوتی تھی، اس لئے حسینی نے اس کو مختصر کر دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۱۶ء

میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں چھپا لیکن زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ اور اب کمیاب ہے۔

مظہر علی خاں وِلا

دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مرزا لطف علی تھا لیکن مظہر علیخاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد سلیمان علی خاں وداد فارسی کے شاعر تھے، اور دادا محمد حسین علی قلی خاں کے خطاب سے مشہور تھے۔ مظہر علی خاں ولا فارسی، سنسکرت، ہندی کے اچھے عالم تھے۔ شاعری میں ممنون، مصحفی اور طپش سے مشورہ کیا ہے۔ لیکن ولا کا دیوان مفقود ہے۔ بعض تذکروں میں دو ایک شعر ملتے ہیں۔ ولا نے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۵ء تک فورٹ ولیم کالج میں چند کتابیں لکھیں۔ ان کے ہم عمر و ہم پیشہ منشی بینی نراین جہاں نے اپنے تذکرۂ شعرا دیوان جہاں میں جو ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء میں مرتب ہوا ہے، ان کو بقید حیات اور کلکتہ میں مقیم بتایا ہے۔ اس سے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

ولا کی تالیفات یہ ہیں۔ (۱) مادھونل اور کام کندلا۔ (۲) ترجمہ کریما۔ (۳) ہفت گلشن۔ (۴) اتالیق ہندی۔ (۵) بیتال پچیسی۔ (۶) تاریخ شیر شاہی۔ ان میں سے شیخ سعدی کے کریما کا ترجمہ نظم میں ہے اس لیے اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس داستان تاریخ اردو کے حصۂ نظم میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور اتالیق ہندی فارسی کی کتاب ہے۔ اس کا تذکرہ بھی ترک کیا جاتا ہے۔

(۱) **مادھونل اور کام کندلا**۔ قدیم ہندی زبان کے قصہ (مصنفہ موتی رام کبیشر) کا اردو ترجمہ ہے۔ ولا نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں مرتب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے انتخاب بیاض ہندی میں اس کا ایک حصہ چھاپا تھا۔ پوری کتاب نہیں چھپی۔ صرف برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ ارباب نثر اردو

سے معلوم ہوا کہ وِلاؔ نے اس کتاب کے آخر میں دو قطعۂ تاریخ لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے، دوسرے سے ۱۸۰۲ء نکلتا ہے۔[5] اسی تذکرہ سے وِلاؔ کی کتاب کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

---

[5] یہ دونوں سال ہجری و عیسوی باہم مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے ہجری سال آغاز تالیف کا ہوگا اور عیسوی اختتام کا۔ اسی طرح اس سے اوپر تذکرہ "دیوان جہاں" کے جو سال ترتیب درج کئے گئے ہیں۔ وہ "ارباب نثر اردو" میں ۱۸۱۴ء مطابق ۱۲۲۷ھ بتائے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کسی سال کا کوئی حصہ دوسرے سال میں واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے سال عیسوی کو درست مان کر سال ہجری بجائے ۱۲۲۷ھ کے ۱۲۲۹ھ کر دیا ہے۔ اسی طرح کے عدم مطابقت کا ذکر میر شیر علی افسوس کے ذکر میں حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ یہ عدم تطابق کا مسئلہ نہایت عجیب ہے۔ قدیم مصنفین اپنے زمانے کے ہجری و عیسوی سن لکھنے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ یقیناً ناقلان کتب کی بے پروائی سے یا بعد کے مولفین تذکرہ و تاریخ کی بے احتیاطی سے یا مطابع کی غلطیوں سے ہم تک پہنچتے پہنچتے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت مطابقت ہجری و عیسوی کی دو فہرستیں ہیں (ان دونوں سے سنین مذکورہ کی مطابقت نہیں ہوتی) ایک[1] موجودہ زمانے کی مطبوعۂ ایران ہے۔ دوسری[2] سر سید احمد خاں نے اپنی تالیف "تبئین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام" حصہ اول مطبوعہ ۱۸۶۲ء ۱۲۷۸ھ کے آخر میں درج کی ہے۔ سر سید نے اپنی فہرست میں ۱۵۸۲ء کے بعد سے مطابقت کی دو جدولیں قائم کی ہیں: (۱) بموجب نئے حساب کے، اور (۲) بموجب قدیم حساب کے۔ ایرانی فہرست اس قدیم حساب کے مطابق ہے۔ قدیم و جدید حساب میں گیارہ دن کا فرق ہے۔ مثلاً یکم محرم ۹۹۰ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۵۸۲ء تھی تو یکم محرم ۹۹۱ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۵۸۳ء ہونی چاہیئے لیکن اسکو ۱۲ جنوری ۱۵۸۳ء کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ یعنی گیارہ دن چھوڑ دیئے گئے۔ اس انقلاب تقویم کی تاریخ یہ ہے:۔

تاریخ ترمیم تقویم۔ ۱۵۸۲ء میں پوپ گرگری نے مشہور ہیئت داں کلیویس کے مشورہ سے حکم دیا کہ ۴ اکتوبر ۱۵۸۲ء کو ۱۵ اکتوبر مانا جائے۔ اور صدی کے وہ سال سال کبیسہ رہا (باقی برصفحہ آئندہ)

"بلند بلند مکانوں کے بالاخانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا، نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسیوں کے چمکنے سے عجیب اُجالا، صاحب علم و ہنر، نیک افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے۔ وہ پہہ یا دُنی نگری مشہور تھی، اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال، خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم و حیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب خلق طالب و مطلوب، دوست اس کے لطف سے شاد، دشمن اس کے قہر سے برباد، جابجا اس کی دعا کے، غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا۔"

(۲) ہفت گلشن۔ ناصر علی خاں واسطی بلگرامی نے کوئی اخلاقی کتاب فارسی میں تصنیف کی تھی، اس کا مظہر علی ولا نے یہ اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش سے ۱۸۰۲ء ۱۲۱۶ھ میں مرتب ہوئی۔ اس میں اخلاقی مضامین کو جابجا حکایتوں سے دلچسپ و موثر بنایا ہے۔ اس کا بھی قلمی نسخہ برٹش میوزیم ہی میں پایا جاتا ہے، اور ہم اس کا نمونہ بھی ارباب نثر اردو ہی سے درج کرتے ہیں:-

"حکایت چوتھی مرغی اور مورکی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور

(بقیہ صفحہ ۱۱۷): مانے جائیں جو ۴۰۰ پر پورے تقسیم ہو جائیں۔ یہ ترمیم تمام کیتھولک ممالک میں اختیار کر لی گئی۔ لیکن کلیسائے یونان اور اکثر پروٹسٹنٹ اقوام نے پوپ کی تعمیل حکم سے انکار کیا۔ پھر تقریباً دو صدی بعد ۱۷۵۱ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے اس ترمیم کو تسلیم کیا اور حکم جاری کر دیا کہ ۳ ستمبر ۱۷۵۲ء کو ۱۴ ستمبر مانا جائے یعنی گیارہ دن چھوڑ دیئے جائیں، اور آئندہ یہی حساب جاری رہے۔ یہ حساب قدیم کہلاتا ہے۔ ہر چوتھے سال کو، جو چار پر پورا تقسیم ہو جائے، سال کبیسہ ماننا اور اس کے ایک مہینہ (فروری) میں ایک دن کا اضافہ کرنا، ۴۶ قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جاری کیا تھا۔ ان سالہائے کبیسہ میں سے ایسے سال کو خارج رکھنا جو ۴۰۰ پر تقسیم نہ ہوں (مثلاً ۱۷۰۰-۱۸۰۰-۱۹۰۰)، گریگری کی ترمیم تھی۔

ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ کے پائے،
تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے
اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی ....."

(۳) بیتال پچیسی - یہ اصل میں سنسکرت زبان کی کتاب تھی، اس میں بیتال نامی ایک شخص کی کہی ہوئی ۲۵ کہانیاں ہیں۔ محمد شاہ کے زمانے میں اس کا ترجمہ "برج بھاشا" میں ہوا۔ اس ترجمہ سے وِلا نے ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۳ء میں اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اس کی تیاری میں فورٹ ولیم کے ایک اور منشی للو لال جی نے وِلا کو مدد دی۔ بیتال پچیسی کلکتہ میں اور ہندوستان کے مختلف مطابع میں متعدد بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس میں جا بجا برج بھاشا کے الفاظ بجنسہ استعمال کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

"اسی عرصہ میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لئے ہوئے اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی، سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ لے درختوں کی چھانو میں ٹہلنے لگی۔ اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا، اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔ دیکھتے ہی اس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا، اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے۔ اور اس راج پتری نے اس کنور کو دیکھ سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے، کان سے لگا، دانت سے کتر، پاؤں تلے دیا، پھر اٹھا چھاتی سے لگا لیا، اور سہیلیوں کو ساتھ لے، سوار ہو، اپنے مکان کو گئی، اور یہ راج پتر نہایت نراس ہو برہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا۔"

(۴) تاریخ شیر شاہی - اکبر بادشاہ کے حکم سے عباس خاں شروانی نے شیر شاہ سوری بادشاہ دہلی کے عہد کی تاریخ فارسی میں لکھی تھی۔ اس کو وِلا نے کپتان جیمس مونٹ کے حکم سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں ترجمہ ختم ہوا لیکن کہیں

شائع نہیں ہوا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ ولا کا ترجمہ قلمی صورت میں انڈیا آفس لندن میں ہے۔ ارباب نثر اردو سے اس کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خاں کے پاس بھیجے تا وہ اس سے یہ قرارداد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اس کی ناک اور کان کاٹے گا اوروں کو کان ہوں۔ تب میرداد شیر خاں کے پاس گیا۔ اس سے بہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاد ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کروں گا۔ اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجا لایا، کوئی فروگذاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت واخلاص حد سے زیادہ کیا، اور کہا کہ اگر لاد ملکہ میرے تین قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اب مجھ کا موں سے ہے۔"

(۵) جہانگیر نامہ۔ ولا کی اس تالیف کا حال بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ مظہر علی خاں ولا نے کیا تھا۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

مرزا کاظم علی جوان

دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے شکنتلا ڈراما کا ترجمہ کیا۔ یہ ڈراما کالیداس نے سنسکرت میں لکھا تھا، اس کو نواز کبیشر نے برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ہندی کے ترجمے سے جوان نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے دیباچہ میں یہ حال لکھا ہے:۔

"دوسرے ہی دن انھوں نے (ڈاکٹر گل کرائسٹ نے) نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکنتولا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر، اور للو لال جی کب کو حکم کیا کہ بلا ناغہ لکھا کرے، اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا، بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء ہیں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمہ کا محاورہ درست کرتا ہے، صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو چھپوا دیں، نظر ثانی لازم ہے اور اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے، چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔"

اس کے بعد یہ کتاب لندن، بمبئی اور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ نواز کبیشر نے یہ قصہ کبت اور دوہروں میں لکھا تھا۔ کاظم علی نے نثر میں لکھا اور موقع موقع پر ہندی اشعار کی جگہ اپنے اردو کے شعر لکھ دیئے۔ اگرچہ شاعری کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، تاہم ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ ہندی کے الفاظ بھی جابجا استعمال کئے ہیں، اور وہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ عبارت مقفیٰ لکھی ہے لیکن صاف و سلیس ہے اس لئے للو کی تحریر کی طرح بے لطف نہیں ہے۔ ارباب نثر اردو سے اس کا مختصر نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

غرض اس تپشوی کا یہی حال تھا، آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا، جو چونسٹھ برس تلک وہ بیاباں نورد تھا، سر سے لگا کر پاؤں تلک گرد گرد تھا، بناس پتی کھاتا رہتا، بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا اور روبہ آفتاب ہو کر

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ　　بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر
اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا　　جپ کیا کرتا تھا ذوق دل سے ہر شام و سحر

ایسی باتیں سن کر راجہ اندر کو بہت سوچ پڑا، ڈر دل میں ہوا۔ اس کے اس جوگ کو توڑنے کے لئے منوکا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی، اور یہ احوال ظاہر کیا۔ وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی اور اس مطلب کے سنتے ہی یوں بولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برھما بشنو مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جاویں

جو دسے ہوویں وحشی تو کر لوں میں رام | مری یاد میں بھولیں سب اپنے کام
یہ ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں | رہے دیکھ کر ان کو سدھ بدھ کہاں
یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو | رکھوں پاک دامن میں کب اور کو

دسوا متر کو ایک پل میں اپنے پہ دیوانہ کر لوں، تمام عمر کو تشقہ کی جاگہہ یہ کلنگ کا ٹیکا ماتھے پر دھر دوں ......

وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا، تس پر سولہ سنگار بارہ ابھرن جو اس نے سر سے پاؤں تلک کئے دن کو سورج اس کا جلوہ دیکھ کر رشک کی آگ سے جلا، اور رات کو چاند غیرت سے داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹا۔"

کاظم علی جواں کی یہ شکنتلا اردو میں پہلا ناٹک یا ڈراما ہے۔ یہ صنف ادب بھی لٹریچر کا ضروری جزو ہے۔ اور اس کے آغاز کا بھی اسی کالج کے سر سہرا ہے۔

شکنتلا ناٹک کے علاوہ جوان نے ایک طویل نظم بارہ ماسہ یا "دستور ہند" لکھی جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کی تفصیل بیان کی۔ اور تاریخ فرشتہ کے ایک حصہ کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، لیکن یہ دونوں کتابیں اب نایید ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ جوان نے للو لال جی کو سنگھاسن بتیسی لکھنے میں مدد دی، قرآن مجید کے اردو ترجمہ کو درست کیا اور شعرا کے کلیات کے انتخاب میں اعانت کی۔ مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز کی ۱۸۱۵ء میں نظر ثانی کی۔

مولوی امانت اللہ شیدا

ان کا وطن، حالات، سنین ولادت و وفات وغیرہ بالکل نامعلوم ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کے اچھے عالم تھے۔ کالج میں کام کرنے سے پہلے بطور خود انھوں نے فقہ اسلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں ہدایت الاسلام کے نام سے لکھی تھی۔ پھر اس کے فائدے کو عام اور وسیع کرنے کے خیال سے اسی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور وہی نام رکھا۔ پہلی جلد ترجمہ کر کے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کی۔ ڈاکٹر پر ان کے فضل و کمال کا بڑا اثر ہوا، اور ان کو عربی و فارسی کی مشکل کتابوں کے ترجمہ کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ان کی تالیفات یہ ہیں:۔

(۱) اردو ترجمہ ہدایت الاسلام دو جلدوں میں۔ (۲) اردو ترجمہ اخلاق جلالی۔ (۳) اردو ترجمہ قرآن مجید۔ (۴) صرف اردو منظوم۔

(۱) ہدایت الاسلام کی پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی اور ڈاکٹر گل کرائسٹ نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا۔ نمونہ یہ ہے:۔

"نفل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا منہ امام کے منہ کی طرف ہو، اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوتی ہے۔ اور کعبہ کے اوپر مکروہ ہے۔ اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اس کی طرف نزدیک ہوں صحیح ہے، پر امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو تو اس کی نماز درست نہیں کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جاوے گا، اور مقتدی کو اس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔"

(۲) ترجمہ قرآن مجید۔ ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کا ترجمہ ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر گل کرائسٹ کے حکم کے مطابق میر بہادر علی حسینی کے ساتھ مل کر قرآن مجید کا ترجمہ

(۴) **صرف اردو منظوم**۔ مولوی امانت اللہ نے صرف اردو کے قواعد مثنوی کی صورت نظم کئے ہیں۔ اس کا نمونہ اس تاریخ کے حصہ نظم میں دکھایا جائے گا۔

شیخ حفیظ الدین ان کے اسلاف خاندان عرب سے دکن آئے، اور پھر دکن سے بنگال چلے گئے۔ جب کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ایک مدرسہ (جس کو مینڈو کالج کہتے تھے) قائم کیا، تو اس میں شیخ حفیظ الدین احمد کے والد شیخ جلال الدین مدرس مقرر ہوئے۔ شیخ حفیظ الدین نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ پھر جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ان کو مدرس مقرر کرلیا۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی کی فرمائش سے تصنیف و ترجمہ کا کام بھی کیا۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ریزیڈنٹ دہلی کے میر منشی ہو گئے۔ ان کے علمی کارنامے یہ ہیں:۔

خرد افروز۔ شیخ ابو الفضل علامی کی کتاب عیار دانش کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ وہی کلیلہ دمنہ کی داستان ہے جس کا شمار دنیا کے مشہور فسانوں میں ہے۔ اصل میں یہ سنسکرت زبان میں تصنیف ہوا تھا۔ ہندوستان سے ایران پونہچا۔ قدیم فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا، فارسی سے عربی میں لکھا گیا۔ اسی کا بہترین پیرایہ انوار سہیلی ہے جس سے ملا حسین واعظ کاشفی کا نام روشن ہے۔ اسی کو ابو الفضل نے عیار دانش کے نام سے مرتب کیا، لیکن علامی کی تالیف کاشفی کا چربہ نہیں ہے۔ دونوں میں اختلاف ہے۔ اردو میں یہ قصہ پہلی مرتبہ حفیظ الدین نے عیار دانش سے لکھا ہے۔ ان کے بعد اوروں نے بھی اردو میں لکھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک کم سے کم سات مختلف لوگوں کے اردو قصوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے جان بہاری لال راضی کا فسانہ ارژنگ راضی منظوم ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اور سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا کا بستان حکمت ہے جو ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء میں مرتب ہوا۔ (اس کا ذکر و نمونہ آگے درج کیا جائے گا)۔

حفیظ الدین احمد نے اپنے والد کی مدد سے عیار دانش کا ترجمہ کرکے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اس کے طرز بیان کو بہت پسند کیا۔ عبارت صاف و سادہ ہے۔ اگرچہ میر امن کی سی شگفتگی نہیں ہے، لیکن باقاعدہ و بامحاورہ نثر ہے، تکلفات سے خالی ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے اکثر مصنفین سے بہتر ہے۔ اس لئے مترجم اور کالج دونوں کی طرف سے اردو زبان کی قابل قدر خدمت ہے۔ اسی لئے بہت مقبول ہوئی۔

خرد افروز کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کی ترک ملازمت کے بعد، کپتان ٹامس روبک نے میر کاظم علی جوان وغیرہ سے نظر ثانی کرانے کے بعد شائع کی۔ پھر ۱۸۵۷ء میں انگلستان سے اس کا نہایت عمدہ اڈیشن نکلا۔ انگریزی میں بھی خرد افروز کا پورا ترجمہ شائع ہوا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔ دور دراز منزل کو طے کرکے شہر نسطور میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اترے، کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے کہا، اب وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلاوے اور زور بازو سے کچھ بہم پہنچا دے، تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں۔ بادشاہ زادے نے کہا، سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں، آدمی کی کوشش سے سرانجام نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں اس کی تلاش میں نہیں دوڑتے۔ خوبصورت نوجوان نے کہا، حسن دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے، جہاں اس کی نمود ہو دولت تابع ہوگی۔ سوداگر بچہ نے بھی حال اپنا ظاہر کرکے کہا کہ حسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک متاع بے بہا ہے اور تھوڑے عرصہ میں اس سے کچھ منفعت نہیں ہوتی ہے۔ رائے صواب و تدبیر درست اور کار دانی و معاملہ فہمی کا فائدہ سب چیزوں سے زیادہ ہے،

جو بے سامان اس کو اختیار کر کے جلد اپنے مطلب کو پہنچے۔ دہقان بچے نے کہا کہ معاملہ فہمی وکار دانی سب وقت کام نہیں آتی ہے۔ اکثر میں نے دانا کو حیران اور نادان کو کامیاب دیکھا ہے۔ بہت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب و متصدو رہا تی ہیں۔ اور ہنر و حرفہ عقلمند کے سامان و دولت کا وسیلہ ہوتا ہے۔"

خلیل علی خاں اشک

ان کے ذاتی حالات دریافت نہیں ہوئے۔ ۱۸۰۱ء (۱۲۱۵ھ) میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے داستان امیر حمزہ اردو میں لکھی۔ اس کے متعلق اشک کا بیان یہ ہے:۔

"مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے، اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور دل بہلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے انعام واکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علیخاں نے جو تخلص بہ اشک ہے، حسب فرمائش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا بر آموزان زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلیٰ میں لکھا تاکہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔"

خلیل علی خاں کے بعد داستان امیر حمزہ کو منشی نول کشور نے حافظ سید عبداللہ بلگرامی سے مرتب کرا کے شائع کیا۔ پھر مطبع نول کشور کے مشہور مصنف و مصحح سید تصدق حسین نے اس کو اپنے طرز پر لکھا۔ اس زمانے میں فسانۂ عجائب کی بڑی دھوم تھی، اور اس کی رنگین عبارت آرائی نہایت مقبول تھی۔ سید تصدق حسین نے قصہ امیر حمزہ کو شاعرانہ صنعت گری

کا عجائب خانہ بنا دیا اور اپنے نزدیک فسانۂ عجائب کا جواب لکھ دیا۔ اس کے مقابلے میں خلیل علی خاں کا طرزِ بیان سادہ و سلیس ہے۔ انھوں نے بھی کہیں کہیں رنگین و مقفیٰ فقرے لکھے ہیں اور خیال آرائی کی ہے لیکن اس قدر نہیں کہ ناظرین پر بار گزرے۔ صنائع و استعارات و تشبیہات بھی معتدل ہیں۔ فارسی ترکیبیں بھی معقول حد تک ہیں۔ خلیل علی خاں نے اگرچہ فارسی زبان کے قصہ سے اپنی داستان مرتب کی ہے لیکن اس میں ہندوستانی رسم و رواج اور مناظر کو داخل کر کے ہندوستانی مذاق کے مطابق بنا دیا ہے۔

بعد کے لوگوں نے اسی ایک قصہ کو طول دیکر بڑی ضخیم کتابیں طلسم ہوش ربا و طلسم ہفت پیکر وغیرہ تیار کر دیں۔ سید تصدق حسین اپنی تالیف میں ایک قصہ کو اس طرح شروع کرتے ہیں:-

"نخل بندان بوستان اخبار، چمن پیرایان گلستان اظہار، تختۂ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع بموقع نصب فرماتے ہیں، صحن شفاف قرطاس کو گل و ریاحین مضامین زنگار رنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیدا د تیار ہوا نمونۂ بہشت شداد نمودار ہوا۔ النقش خوشی سے پھول گیا، نگرداریں بھول گیا"

خلیل علی خاں اسی داستان کو اس طرح لکھتے ہیں:-

یہاں سے دو کلمہ داستان ملک النقش کے ملاحظہ فرمایئے، جبکہ وہ باغ تیار ہوا۔ ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت از دیاد خانہ زاد ہے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اس کے علاوہ خلیل علی خاں نے کپتان ولیم ٹیلر کی فرمایش سے ابوالفضل کے

اکبر نامہ کا ۱۸۰۹ء میں ترجمہ کیا اور واقعات اکبر نام رکھا۔ لیکن شائع نہیں ہوا۔

اکرام علی ان کے حالات بھی معلوم نہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں رہ کر صرف ایک کتاب اخوان الصفا ہندی لکھی ہے۔ اخوان الصفا کے نام سے بصرہ میں ایک انجمن تھی۔ اس کے اراکین نے متعدد رسالے مختلف علمی مباحث کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ "رسائل اخوان الصفا" عربی زبان کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ ان میں سے پہلے رسالے میں مخلوقات کی افضلیت کے دعوے پر انسان اور حیوانات میں مباحثہ ہے، جنوں کا بادشاہ ان کا حَکَم و منصف ہے۔ آخر میں انسان کا فضل و شرف اس بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جملہ مخلوقات میں صرف انسان خلافت الٰہی کا اہل اور بار امانت کا حامل ہے۔ اس رسالہ کو مولوی اکرام علی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جب میں بہ موجب حسن ایمائے جناب صاحب نامدار .... خداوند نعمت مسٹر ابراہم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے اور موافق طلب اخی واستاذی جناب بھائی صاحب مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتہ میں آیا، اور رہنمونی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد عنایت و مرحمت ہوا۔ ازبسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی، سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا۔ بعد چند روز کے باستصواب جناب عالی شان .... مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو دیں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں، قلم انداز کر۔ صرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا ہونا چاہیے۔ راقم نے بہ موجب فرمانے کے نقط حاصل مطلب کو محاورۂ اردو میں لکھا، خطبوں کو

نکال ڈالا، اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرہ سے ان کو علاقہ نہ تھا ترک کیں، مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہندسی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے۔"

یہ رسالہ ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ میں اکرام علی نے لکھا۔ ۱۸۱۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس کے بعد بمبئی وغیرہ میں چھپا۔ انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ نمونہ یہ ہے :-

بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی انسان کو ہم نے نہایت سڈول بنایا ہے اس کا کیا جواب دیتے ہو۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ، کلام ربانی میں ظاہری معنوں کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا۔ تفسیر اس کی عالموں سے پوچھا چاہیے۔ چنانچہ ایک حکیم دانشمند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت کا یوں ظاہر کیا، جس دن اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، سبھ گھڑی، نیک ساعت تھی۔ ستارے اپنے اپنے برج شرف میں جلوہ گر اور ہیولیٰ عناصر کے، واسطے قبول کرنے صورتوں کے آمادہ مستعد تر تھے۔ اس لئے صورتیں اچھی، قد سیدھے، ہاتھ پاؤں درست بنے، اور احسن تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں، فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو حد اعتدال پر پیدا کیا ہے، نہ بہت لنبا بنایا، نہ چھوٹا۔ بادشاہ نے کہا اس قدر اعتدال اور مناسبت اعضا کی واسطے فضیلت کے کفایت کرتی ہے۔ حیوانوں نے عرض کیا کہ ہمارا بھی یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھی ساتھ اعتدال کے جو مناسب تھا ہر ایک عضو بخشا۔ اس فضیلت میں ہم اور وے برابر ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ تمھارے لئے مناسبت اعضا کی کہاں ہے، صورتیں نپٹ مکروہ، قد بے موقع، ہاتھ پاؤں بھدے سے، کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ ڈیل بڑا، گردن لنبی، دم چھوٹی۔ اور ہاتھی ہے جس کا ڈیل ڈول بہت بڑا اور بھاری، دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے۔ کان چوڑے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔"

ایک اور فصل کا اقتباس یہ ہے :۔

"بادشاہ نے کہا جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں، جو کہ نیک ہیں وہ اپنے رئیس کی اطاعت و فرماں برداری اس قدر کرتے ہیں کہ آدمیوں سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اطاعت و فرماں برداری جنات کی مثل ستاروں کے ہے۔ آفتاب ان میں بمنزلۂ بادشاہ ہے اور سب ستارے بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ مریخ سپہ سالار، مشتری قاضی، زحل خزانچی، عطارد وزیر، زہرہ حرم، ماہتاب ولی عہد ہے، اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں۔ اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں، اسی کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ جو ٹھہر رہتا ہے، سب متوقف ہو جاتے ہیں، اپنے معمول و حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے یہ خوبی اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل کی۔ بادشاہ نے کہا یہ فیض ان کو فرشتوں سے حاصل ہے۔ کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں، اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔"

تمام کتاب میں اس طرح کے مکالمات اور مباحثات نہایت دلچسپ ہیں۔ مختلف مسائل و موضوعات کے متعلق معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ مولوی اکرام علی نے نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ متروک الفاظ، قدیم محاورے، قواعد زبان سے اختلاف بہت کم ہے۔ تمثیل نگاری کا (جس کو انگریزی میں "ایلیگری" کہتے ہیں) نہایت نادر نمونہ ہے۔ انوار سہیلی پر فسانہ کا رنگ غالب ہے، اخوان الصفا میں علمی شان بھی ہے۔ اور دلچسپی بھی ہر جگہ قائم رہتی ہے۔

نہال چند لاہوری | دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے پنجاب چلے گئے، لاہور کو وطن بنا لیا اور لاہوری مشہور ہوئے۔ ایک انگریز

کپتان ولورٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے، اور ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں گل بکاؤلی کا قصہ فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ فارسی میں عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ نہال چند نے مذہب عشق تاریخی نام رکھا۔ کتاب کے آخر میں ہجری و عیسوی تاریخیں نکالی ہیں۔ لکھتے ہیں:-

غرض جس طرح سے کیا ان کو شاد — ہماری بھی دے یا الٰہی مراد
یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام — تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سنی میں نے آواز غیب — کہ ہے "مذہب عشق" تاریخ و نام
۱۲۱۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلک زباں — کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتف غیب نے دی ندا — کہ اس "مذہب عشق" میں کوئی آ
کرے "مشرب جام" اگر اختیار — تو راز نہال اس پہ ہو آشکار
۱۲۱۷ھ

یعنی مذہب عشق میں مشرب جام (۵۸۶) کو ملایا جائے تو ۱۸۰۳ء حاصل ہو جائیں گے۔

لالہ نہال چند نے نہایت سلیس، صحیح، بامحاورہ، باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ متروک الفاظ اور محاورے خال خال ہیں۔ پہلی مرتبہ مذہب عشق ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ اشاعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی۔ اس کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف مطابع میں بار بار شائع ہوا۔ اسی قصہ کو پنڈت دیا شنکر نسیم نے نظم کر کے گلزار نسیم نام رکھا۔ ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ اس نظم کی خوبی و لطف نے نہال چند کے قصہ کی شہرت و مقبولیت کو کم کر دیا۔ مذہب عشق کا نمونہ یہ ہے:-

"اس نے کہا کہ آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانہ میں لے چلو، دولت خانہ اس کا نزدیک ہے، اس نے اس ویرانہ میں ایک شہر آباد کیا ہے، واجبی قیمت ملے گی، بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کہیں اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ گے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام

میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لیجاتے گزری ہے، لیکن آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا نہ سُنا۔ ساعد نے کہا ذرا تم آگے بڑھ کر دیکھو، اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر، نہیں تو تمہارے پھر آنے کا کوئی مانع نہو گا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہوئے، پھر تھوڑی دور جا کر سب ایکبارگی پکار اُٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم! اسے میاں، تم ہمیں آگ میں جھونکنے کو لئے جاتے ہو، جو ملے میں جائے انعام اور بھاڑ میں بڑے اکرام، بس ہمیں معاف کرو، ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلۂ آتش نہیں، حویلی کے جواہرات چمک رہے ہیں۔ تم ہرگز اندیشہ نہ کرو اور میرے ساتھ چلے آؤ۔ وہ اس کے کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے، آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی، سب نے اس کی بات سچی پائی، قدم اُٹھائے بید ھڑک چلے۔"

بینی نراین جہاں

لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد مہاراجہ لکشمی نراین بڑے رئیس تھے۔ ان کے بھائی رائے کھم نراین عالم وشاعر تھے، زند تخلص کرتے تھے۔ بینی نراین گردش روزگار سے تباہ ہو کر کلکتہ پہنچے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر گل کرائسٹ فورٹ ولیم کالج سے رخصت ہو کر ولایت چلے گئے تھے۔ بینی نراین ایک عرصہ تک کلکتہ میں بیکار اور پریشان رہے پھر حیدر بخش حیدری کے وسیلہ سے کالج میں ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔ (۱) چار گلشن۔ (۲) دیوان جہاں۔ (۳) ترجمہ تنبیہ الغافلین۔ یہ کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ان کے مسودے محفوظ ہیں۔ "ارباب نثر اردو" سے ان کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) چار گلشن عشقیہ قصہ ہے۔ بینی نراین نے ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۱ء میں یہ قصہ امام بخش صہبائی کو زبانی سنایا تھا۔ انہوں نے پسند کیا اور لکھنے کی رائے دی۔ ان کے مشورے کے مطابق بینی نراین نے لکھا تھا۔ کلکتہ میں کپتان روبک اور کپتان ٹیلر کے سامنے پیش کیا۔ دونوں نے

پسند کیا۔ اور معقول صلہ دیا۔ نمونہ یہ ہے :۔

زمانہ گزشتہ کے نقل بیان کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتۂ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ، نہایت عالیشان والا دودمان تھا حق سبحانہٗ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانے میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب و رعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا بیت

فلک مرتبت تھا وہ کیوان شاہ دو مشعل فروزاس کے تھے مہر و ماہ

(۲) دیوانِ جہاں۔ یہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو بینی نراین جہاں نے کپتان روبک کی فرمایش سے ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء میں مرتب کیا۔ اس میں ۱۲۵ شاعروں کا مختصر حال ہے۔ جن میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بینی نراین نے اپنا کلام تقریباً سب کا سب درج کر دیا ہے، گویا یہی تذکرہ "دیوانِ جہاں" بھی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ہر سال ۲۵ جولائی کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا، جس میں کالج و بیرونِ کالج کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ دیوانِ جہاں میں ایک مشاعرہ کی غزلیں بھی آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ تذکرہ کا نمونہ یہ ہے :۔

"محبت تخلص، نام نواب محبت خاں، نواب حافظ رحمت خاں کے بیٹے، بریلی کے رہنے والے۔ اس نحیف پر نہایت مہربانی فرماتے تھے، اور ہفتہ میں ایک بار چہارشنبہ کے دن اس خاکسار کے غریب خانہ میں تشریف لاتے تھے۔"

(۳) تنبیہ الغافلین۔ اس نام سے ایک کتاب مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (مترجم قرآن مجید) نے مولوی سید احمد بریلوی کی فرمایش سے فارسی میں

لکھی تھی۔ بینی نراین جہاں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاں کے مسلمان ہو جانے اور مولوی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اطلاع کا ذمہ دار فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی ہے۔ اس نے اپنے تذکرۂ شعرا میں بھی جہاں کا حال لکھا ہے، اور اپنے پانچویں خطبہ (۱۸۵۴ء) میں جہاں کی تصانیف کے سلسلے میں لکھتا ہے:-

"تیسری ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک مذہبی کتاب ہے، جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور فرقۂ وہابی کے بانی سید احمد کی فرمایش تالیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اور ترجمے بھی ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں فرقۂ وہابی سے تعلق رکھتا تھا، یا کم سے کم مسلمان ہو گیا تھا، کیونکہ وہ اس کتاب کے دیباچہ میں اس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان تھا۔"

خطبات گارسن دتاسی صنہ وصلا مطبوعہ انجمن ترقی اردو

تنبیہ الغافلین کے جو ترجمے مطبوعہ ملتے ہیں وہ بینی نراین کے نہیں ہیں، دوسرے مصنفوں کے ہیں۔ ان میں ۲۵ باب ہیں۔ اور بینی نراین کے ترجمہ میں (جو مسودے کی صورت میں انڈیا آفس میں موجود ہے) ۲۰ باب کا ترجمہ ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:-

بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے، ان میں ایک بڑا دانا تھا، اس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو، ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لاویں، بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی، تم دونوں ہی بانٹ لیجیو۔ یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے، اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے، یہ دونو بھائی ورثہ ان کا پا کر خوش گذران کرنے لگے، اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا۔ اے بھائیو، جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو، میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی رنڈی یہ بات سن کے قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس

بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ فلانی جگہ سَو دینار سونے کے
گڑے ہیں تو نکال لے۔ اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا
کیا، بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔"

للّو لال جی گجرات کے برہمن تھے، لیکن اوائل عمر میں شمالی ہند میں آ بسے تھے۔
یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں شروع زمانہ ہی میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس
کالج میں اردو کے ساتھ ہندی کی تصنیف و ترجمہ کا کام بھی جاری کیا گیا تھا۔ ہندی میں سب
سے زیادہ کارنامہ للّو لال کا ہے، اور ان کے بعد ان کے رفیق کار سدل مسرا کا۔ مسرا جی
نے صرف ایک قصہ ہندی زبان میں لکھا ہے۔ للّو لال نے سب سے پہلے پریم ساگر
لکھی جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ اس سے
پہلے ایک اور شخص پنڈت چتر بھوج مسرا نے اس کو برج بھاشا میں لکھا تھا۔ لیکن اس زمانے
کی دیگر تصانیف کی طرح اس میں کثرت سے سنسکرت الفاظ، تراکیب، محاورات تھے، گویا
برج بھاشا سے زیادہ سنسکرت کی کتاب تھی، اس لئے عام فہم نہ تھی۔ للّو لال نے سنسکرت
زبان کا عنصر کم کر کے آسان زبان میں ترتیب دی۔ اس کی عبارت مقفٰی ہے اور جا بجا اشعار
بھی حسب موقع ہیں۔ یہ پریم ساگر موجودہ ہندی لٹریچر کا سنگ بنیاد ہے اس سے پہلے

---

[1] **ہندی زبان کی تاریخ** اردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک ہی پراکرت یعنی "برج بھاشا"
کی دو صورتیں ہیں، اور اپنی تقویم و ترقی میں ایک دوسری سے
متاثر ہیں، نیز اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ سے ہندی زبان کی موجودہ ادبیات کا آغاز ہوا ہے،
اس لئے ادبیات ہندی کی مختصر تاریخ ناظرینِ تاریخ اردو کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگی۔ ہندوستان
کی تمام زبانیں انڈو آرین زبان کی شاخیں ہیں۔ اس زبان کی علمی صورت سنسکرت ہے۔ سنسکرت
نہایت مکمل، وسیع، باقاعدہ زبان ہے، لیکن صرف علمی و کتابی زبان ہے۔ (بقیہ صفحہ آیندہ پر)

اس سے زیادہ صاف کھڑی بولی اور عام فہم شمالی ہند کی بھاشا میں کوئی نثر ہندی کی کتاب موجود نہیں ہے۔

پریم ساگر کے علاوہ للو لال نے راج نیتی ہندی میں لکھی، اس میں کہانیوں کے ذریعہ سے اخلاق و حکومت کے آداب بتلائے ہیں۔ ایک مجموعہ ہندوستانی لطیفوں کا لطائف ہندی کے نام سے لکھا۔ ایک منظوم فسانہ مہادیو بلاس مرتب کیا، سبھا بلاس کے نام سے ہندی کی دلچسپ نظموں کا انتخاب تیار کیا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پہلے بھی سنسکرت کبھی عام بول چال میں داخل نہیں ہوئی۔ عام بول چال کی زبان کو سنسکرت کے مقابلے میں پراکرت کہتے ہیں۔ اس کی صورتیں صوبے صوبے میں مختلف ہیں۔ کہیں زیادہ فرق ہے کہیں کم۔ ہندوستان کے نصف شمالی کی پراکرتوں کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے:۔

(۱) راجستھانی: اس میں میواتی، مارواڑی، جیپوری اور مالوی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے مارواڑی علمی زبان ہے۔ اس حصہ ملک میں برج بھاشا بھی شاعری کے لئے مستعمل ہے۔ (۲) پچھمی بھاشا، اس میں پنجابی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی زبانیں شامل ہیں۔ (۳) پوربی بھاشا اس میں بگھیلی، چھتیس گڑھی، بیسواڑی (اجودھیا کی زبان) شامل ہیں۔ ان میں سے اودھ یعنی اجودھیا کی زبان علمی شان رکھتی ہے۔ (۴) بہاری جو بنگالی کی ایک صورت خاص ہے۔

ان بولیوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ باوجودیکہ پنجاب، بہار، اودھ راجپوتانہ وغیرہ میں الگ الگ بولیاں موجود تھیں، لیکن شاعری کی زبان کے لئے برج بھاشا سب سے زیادہ موزوں سمجھی گئی تھی۔ اسی برج بھاشا سے آگے چل کر دو صورتیں دو رسم خط میں اردو اور ہندی کے نام سے رائج ہوئیں۔ یہ فرق اور یہ نام مسلمانوں کے تسخیر دہلی کے بعد پیدا ہوا۔ اس سے پہلے برج بھاشا کی علمی و ادبی شان صرف شاعری میں محدود تھی۔ اردو زبان کی ساخت اور رواج سے دو سو برس تک برج بھاشا میں کوئی نثر کی کتاب موجود نہ تھی۔ نظم کا لکھنا اس قدر آسان اور پسندیدہ تھا کہ فن عروض، قواعد صرف و نحو، علم نجوم، شرح و تفسیر، فسانہ و ڈراما جس (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

یہ سب ہندی کی کتابیں ہیں، لیکن ایک کتاب سنگھاسن بتیسی للولال نے اردو میں بھی لکھی ہے۔ اس میں ہندی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں عربی فارسی کے الفاظ بھی ہیں اور طرزِ ادا، اور اسلوب بیان بھی اردو کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں شائع ہوئی، بار بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ نمونہ یہ ہے:-

"برہمن کہنے لگا، جب تلک لگن آوے جو اس میں منہ اٹھاوے، جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے، اور جب تلک لگن ہو چکے تب اس کا کام موقوف کر دے،

(بقیہ صفحہ ۱۳۸) جس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں سب نظم میں لکھی گئیں۔ پھر بھی بعض نثر کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ نثر ہندی کی ایک تصنیف گورکھ ناتھ سے منسوب ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں تھا۔ اس کتاب کی اس مصنف سے نسبت مشتبہ ہے، لیکن اگر درست ہو تو یہ سب سے پہلی تصنیف نثر ہے۔ اس سے قبل کسی کتاب کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد سولہویں صدی میں وٹھل ناتھ کی کتاب منڈن اور گوکل ناتھ کی تصنیف چوراسی وارتا ہیں۔ پھر سترھویں صدی میں دامودر داس نے مارکنڈے پران کا ترجمہ نثر میں کیا۔ اس کے بعد بھی تھوڑا بہت نثر کا لٹریچر پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں چتربھوج مسرا نے بھگوت گیتا کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا، جس کو للولال نے پریم ساگر کے نام سے سہل تر زبان میں لکھا۔ چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک تمام تصانیف نثر کا یہ طرز ہے کہ سنسکرت کا غلبہ ہے لیکن جملوں کی ساخت برج بھاشا کے قواعد کے مطابق ہے، افعال و ضمائر برج بھاشا کے ہیں اس لئے یہ زبان سنسکرت سے آسان ہے، تاہم عام فہم نہیں ہے۔ للولال پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی تصانیف میں روزمرہ کی بول چال اور اسلوب بیان اختیار کیا اور سنسکرت کے نامانوس و مشکل الفاظ کی جگہ برج بھاشا کے سہل تر الفاظ استعمال کئے۔ للولال کی عبارت چند الفاظ بدلنے سے اردو کی متعارف عبارت بن جاتی ہے۔ مثلاً للولال کی پریم ساگر سے چند سطریں ناگری رسم خط سے اردو میں لکھی جاتی ہیں:-

"یہ سنتے ہی کنس ڈر کر کانپ اٹھا اور کرودھ کر (غصہ ہو کر) دیوکی کو جھونٹے پکڑ کر رتھ سے

(باقی آئندہ صفحہ پر)

اسی طرح تلالگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پر لادے، اس کا آؤٹ بھنڈارہ ہو۔ اور کبھی اس کے یہاں سے کبھی نہ جاوے۔ یہ بات سن کر راجہ من میں خوش ہوا، دیوان کو بلایا اور مندر اٹھانے کی اجازت دی کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈھ کر محل بناؤ۔ اتنے میں تلالگن بھی آن پہنچی، اس مندر کی نیو دی۔ دیس دیس میں یہ آوازہ ہوئی کہ راجہ تلالگن میں محل بنواتا ہے جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے، وے اٹھ کر تلالگن میں بناتے تھے۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا۔"

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نیچے کھینچ لایا، کھڑگ (تلوار) ہاتھ میں لے، دانت پیس پیس، لگا کہنے: جس پیڑ کو جڑ ہی سے اکھاڑئے تس میں پھول پھل کاہے کو لگے گا، اب اسی کو مار دوں تو زور سے (بے فکر) راج کروں، یہ دیکھ سن، باس دیو من میں کہنے لگے۔ اس مورکھ (بے وقوف) نے دیا سنتاپ (رنج) جانتا نہیں ہے پُن اور پاپ، جو میں اب کرودھ (غصہ) کرتا ہوں تو کاج بگڑے گا، تس سے اس سمے (وقت) چھما (درگذر) کرنی یوگ (بھلی) ہے۔"

فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا آسان لٹریچر پیدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں کہ ان سے علٰحدہ بلکہ ان سے پہلے، ایک اردو کے شاعر سید انشاء اللہ خاں دہلوی (متوفی ۱۸۱۷ء) کو لکھنؤ میں "ایک انوکھی بات" سوجھی اور انھوں نے ایک طویل کہانی ایسی روزمرہ کی بول چال میں لکھ دی جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ یہ کہانی ناگری حروف میں چھپ کر ہندی کتابوں میں شامل ہے اور فارسی خط میں چھپی ہوئی اردو کے کتب خانہ میں داخل ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ آئندہ صفحات میں عنقریب آتا ہے۔ یہاں اس کی چند سطریں ہندی تحریر کی مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں:-

"ہم اچھی گھڑی شبھ مہورت سوچ کے تمہارے سسرال میں کسی بامھن کو بھیجتے ہیں جو بات چیت چاہی ٹھیک کر لاوے۔ بامھن جو شبھ گھڑی دیکھ کر ہڑبڑی سے گیا تھا، اس پر کڑی پڑی۔ سنتے ہی رانی کیتکی کے باپ نے کہا ان کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا، ان کے باپ دادے ہمارے باپ دادوں کے آگے سدا ہاتھ جوڑ کے

(بقیہ صفحہ آئندہ)

ان تصنیفات کے علاوہ للولال نے مظہر علی ولا کو بیتال پچیسی ترجمہ کرنے میں مدد دی۔
فورٹ ولیم کالج میں مذکورۂ بالا منشیوں اور مصنفوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ملازم و
متوسل تھے۔ لیکن ان کے ادبی کارنامے نہ زیادہ ہیں، نہ اعلیٰ؛ نہ مشہور ہوا اس لئے یہ
اہل قلم بھی شہرت نہ پا سکے۔ مثلاً حمید الدین بہاری نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش
سے کھانے اور مٹھائیاں تیار کرنے کی ترکیبیں لکھیں اور اس کتاب کا نام خوان الوان
رکھا۔ مرزا محمد فطرت نے انجیل کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا۔ محی الدین فیض نے

(بقیہ صفحہ ۱۴۰) باتیں کرتے تھے اور جو تک تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے
کیا ہوا جواب وے بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے۔ جس کے ماتھے ہم بائیں پاؤں
کے انگوٹھے سے ٹیکا لگا دیں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جائے۔ کس کا منہ جو یہ بات ہمارے
منہ پر لا وے۔"

فورٹ ولیم کالج میں ہندی تصانیف کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کالج کے بعد اور کالج سے باہر بھی جاری
رہا۔ تمام علوم و فنون کی کتابیں ہندی میں ترجمہ و تالیف ہونے لگیں اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔
اور ہندی تحریر کے مختلف اسلوب پیدا ہو گئے۔

۱۸۳۷ء میں لیتھو کا ہندی مطبع دہلی میں قائم ہوا۔ ہندی کا سب سے پہلا اخبار گوبند رگھوناتھ کی
اڈیٹری میں بنارس اخبار کے نام سے ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا۔ لیتھو میں چھپتا تھا (یہی اخبار اسی
نام سے اردو میں بھی شائع ہوتا تھا، لیکن اردو کا پہلا اخبار نہ تھا۔ اس سے پہلے اردو کے اور اخبار
نکل رہے تھے)۔ دوسرا ہندی کا اخبار بنارس ہی سے سدھاکر کے نام سے تارا موہن مترا کی
اڈیٹری میں ۱۸۴۹ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ پہلے اردو میں نکلا تھا، پھر اردو کی جگہ ہندی میں چھپنے لگا۔
ہندی کا سب سے پہلا ڈراما گوپال چند نے نہوسا کے نام سے ۱۸۰۰ء میں مرتب کیا۔
مقالہ نگاری سب سے پہلے بال کرشن بھٹ نے ۱۸۴۵ء میں شروع کی۔ ہندی لکھنے
والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اردو نہیں جانتے تھے، صرف ہندی میں (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

پند نامہ عطار کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان میں سے ایک مصنف البتہ امتیاز کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مرزا جان طپش ان کا نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے۔ مرزا جان کے لقب سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ لڑکپن سے شاعری کا شوق ہوا۔ خواجہ میر درد دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ وہاں سے بنگال چلے گئے، اور ڈھاکہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) لکھتے تھے ان لوگوں نے اپنی تحریر میں سنسکرت کا عنصر بڑھا دیا اور عربی و فارسی کے مانوس و مروج الفاظ سے پرہیز کیا۔ ایسے مصنفوں میں پنڈت شیام سندر داس بہت ممتاز ہیں۔ ان کی نسبتہً سادہ تحریر کا نمونہ یہ ہے:۔

"آج کل کی سبھتا (زمانہ) میں دن پر دن اب بیئے (فضول خرچی) کرنے کا دوش بڑھتا جاتا ہے، کیوں بڑے بڑے رئیس اور دھن وان (دولت مند) ہی اب بیائی (فضول خرچ) نہیں ہوتے بلکہ مدھم اور انتم سریں (متوسط و ادنیٰ درجہ) کے لوگ بھی خرچ کرنے میں بڑی اُدارتا (شان) دکھلاتے ہیں، اس کا کارن (نتیجہ) یہی ہے کہ لوگ اپنی باستک دشا (اصلی حالت) کو چھپاتے اور لوگوں کو اپنی جھوٹی سمپنتا دکھانے کے لئے اوپری ترک بھڑک اور ٹھاٹ رکھتے ہیں"

لیکن ان میں جو لوگ اردو ہندی دونوں میں لکھتے ہیں۔ وہ زیادہ عام فہم لکھتے، اور عربی و فارسی کے آسان الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان میں منشی پریم چند کا خاص درجہ ہے۔ انھوں نے بعض فسانے اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھے ہیں۔ ان کا فرق ذیل کے نمونوں سے واضح ہوگا۔ ایک فسانہ (بڑے گھر کی بیٹی) ہندی میں اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"بینی مادھو سنگھ گوری پور گاؤں میں زمیندار اور نمبردار تھے، ان کے پتا مہا کسی سمے بڑے دھن دھانیہ سمپن تھے۔ گاؤں کا پکا تالاب اور مندر جن کی اب مرمت بھی مشکل

(بقیہ بصفحہ آئندہ)

میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خاں کے دربار میں توسل اختیار کیا۔ نواب صاحب کے حکم سے اردو محاورات کی لغت لکھی اور اس کا نام نواب صاحب کے خطاب کی مناسبت سے شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان رکھا۔ یہ لغت ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء میں مرتب ہوا ہے، اور فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی تصنیف ہے اس لئے فورٹ ولیم کالج سے باہر کے تصانیف میں اس کا ذکر موزوں تھا، لیکن چونکہ مرزا جان طپش بعد کو کالج میں چلے گئے تھے، اور وہاں اگرچہ خود کوئی تصنیف نہیں کی، تاہم دوسروں کو مدد دی، اس لئے

(بقیہ صفحہ گذشتہ

تھی انھیں کی کیت استم تھے، کہتے ہیں اس دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب اس کی جگہ ایک بوڑھی بھینس تھی، جس کے شریر میں است پنجر کے سوا اور کچھ شیش نہ رہا تھا، پر دودھ شاید بہت دیتی تھی، کیونکہ ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار ہی رہتا تھا"

اسی قصہ کو اردو میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے، ان کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی، کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا، اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار رہتا تھا"

علمی مضامین اور تصانیف کی زبان اور اسلوب بیان تو دشوار ہونا ہی چاہیئے لیکن عام لٹریچر، اخبار، رسائل، فسانہ، تاریخ وغیرہ میں بھی یہ اختلاف تھا کہ کسی کی زبان آسان، کسی کی مشکل ہوتی تھی، یعنی کوئی شخص سنسکرت اور برج بھاشا کے نامانوس الفاظ زیادہ استعمال کرتا تھا، کوئی فارسی عربی کے عام فہم الفاظ لکھتا تھا۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے ہندی زبان کے مقرر، نامہ نگار، مصنف (باقی بصفحہ آئندہ)

کالج ہی کے سلسلے میں اس لُغت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک مرتبہ مرشد آباد سے ۱۸۴۹ء ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اردو محاوروں کے معنی فارسی زبان میں لکھے ہیں، لیکن ان کی مثالیں شعرائے اردو کے کلام سے درج کی ہیں۔ اُس زمانے کی تصانیف کی اکثر یہی روش ہے کہ اردو زبان کے متعلق کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ جیسے انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت، کہ اس کا موضوع اردو زبان کے قواعد و متعلقات شعر و ادب ہیں لیکن فارسی عبارت میں تصنیف کی گئی ہے۔ (اس کا ذکر آئندہ آتا ہے)۔ شمس البیان کا نمونہ یہ ہے:-

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کھڑی بولی اور عام فہم بھاشا کو دقیق و دشوار اور سنسکرت سے مشابہ بنانے لگے ہیں اس مقصد کے لئے ایک یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ تو استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سنسکرت اور بھاشا کے مشکل اور غیر متعارف الفاظ بھی برتے جاتے ہیں۔ مثلاً

"بچوں کے سبھاؤ سے ماتائیں ادھک پرچت ہوتی ہیں، بچے ماؤں سے ادھک پریم کرتے ہیں۔ پریم پورک کہی ہوئی باتوں کا دل پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔"

نیز مشہور و مروّج الفاظ، مدرسہ، استاد، استانی، کتاب، امتحان وغیرہ کو صرف ادبی تصانیف سے نہیں بلکہ عام بول چال سے بھی خارج کر کے ان کی جگہ سنسکرت اور بھاشا کی دشوار اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً اسمبلی کا ایک ریزولیوشن ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:-

"یہ اسمبلی سرکار سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈوں تتھا میونسپل بورڈوں کو ادیش کرے کہ وہ لور پرائمری تتھا پرائمری میں اب سے بجائے پرش ادھیاپکوں کے استری ادھیاپکائیں نیوکت کریں، پرنتو یدی ونمان سمے میں ضرورت کے مطابق استری ادھیاپکائیں نہ ملیں تو عارضی طور سے پرش ادھیاپک رکھ لئے جائیں، لیکن جیسے ہی یوگیہ ادھیاپک ملیں فوراً عارضی ادھیاپکوں کو ہٹا کر استری ادھیاپکائیں مقرر کی جائیں۔"

(باقی بصفحہ ۱۴۵)

انگاروں پر لوٹنا، کنایہ از بیقراری کہ در عالم رشک لاحق گردد - ولی دکنی گوید ؎

شعلہ خوجب سے نظر آتا نہیں   تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

رفو چکر میں آنا، حیراں ماندن بہ مشاہدہ امر عجیب و عوام[۵] بازاری استعمال کنند، سراج الدین سراج دکنی گوید ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے

اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

فورٹ ولیم کالج میں رہکر طپش نے ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور بہار دانش نام رکھا۔ اپنا دیوان بھی مرتب کیا اور کالج نے اس کو خرید کر شائع کیا۔ ان دونوں کے نمونے حصۂ نظم میں درج کئے جائیں گے۔

---

[۵] اس محاورہ (رفو چکر میں آنا) کو عوام بازاری کا محاورہ اس لئے کہا گیا ہے کہ رفو چکر ہونا اور چکر میں آنا دو الگ الگ محاورے ہیں - مثلاً

جس طرف دیکھتی تھی بھر کے نظر   ہوش ہوجاتے تھے رفو چکر

قیامت تک یہی گردش رہے گی رات دن ان کو

مہ و خورشید حسن یار سے آئے ہیں چکر میں

جاہل آدمیوں نے دوسرے محاورے میں رفو کا لفظ بھی ملا لیا، اور حیران ہونے کے لئے رفو چکر میں آنا بولنے لگے۔ لیکن پرانے زمانے کے لوگ بولتے ہوں گے - اب سننے میں نہیں آتا -

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

ڈاکٹر تاراچند سکرٹری ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ہندی کے مشہور ادیب ہیں - سہ ماہی رسالہ ہندستانی (ہندی اڈیشن) بابت جولائی ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے نام سمبندھی غلط فہمیاں (نام کے متعلق غلط فہمیاں)- (باقی صفحہ آئندہ پر)

فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ

(۱) فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے پہلے اور جاری رہنے کے زمانے میں کالج و کلکتہ سے باہر بھی اردو تصانیف نثر کا سلسلہ جاری تھا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اور آیندہ لکھا جائے گا، لیکن کوئی باقاعدہ اور متحدہ کوشش نہ تھی، بلکہ متفرق طور پر

(بقیہ صفحہ ۱۴۵) اس کے چند فقرے یہ ہیں :-

"پرشن کے کیش پکش میں بچار کرنے اور دونوں ورودھی دلوں کے پرتھک
مسئلہ، دونوں رخ، غور، مخالف گروہوں، الگ

پرتھک درشٹی کون کو سمجھنے کے پہلے مجھے یہ آوشیک معلوم ہوتا ہے کہ جن ناموں کا ہم
الگ، زاویہ نگاہ، ضروری

پریوگ کریں، ان کی ٹھیک ٹھیک پریبھاشا دیں، کیونکہ اس سمبندھ میں بہت کچھ غلط فہمی
استعمال، تعریف، تعلق

اس کارن ہوتی ہے کہ ان ناموں کے ارتھ کے بارے میں لوگوں کو بھرم ہے۔ اس
سبب، مفہوم، دھوکا

وشے میں بہت سے ناموں کا پریوگ ہوا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں :- بھاشا، ہندوی
بارے، استعمال

ہندوستانی، زبان ہندوستان، دہلوی، کھڑی بولی، مدھیا دیس کی بولی، ریختہ، زبان
صوبجات متوسط

اردوئے معلیٰ، اردو۔ ان سب ناموں میں ہندی، ہندوستانی اور اردو کا پریوگ
استعمال

(بقیہ بصفحہ آیندہ)

لوگ کچھ کچھ لکھ رہے تھے۔ کالج کے منتظموں نے سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کر کے کام شروع کیا۔ یہ گویا پہلا علمی اور ادبی ادارہ پائندہ تھا۔

(۲) اردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا، اور بعض کتابیں خاص حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں۔

(۳) کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس برس جاری رہیں۔ اس عرصہ میں اٹھارہ مصنفوں نے پچاس کتابیں اردو میں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ اس زمانے میں

بقیہ صفحہ ۱۴۶

ادھک ہوتا ہے، اور واستب میں واد دواد بھی اب ان تین ناموں کے پریوگ
بہت — حقیقت — مباحثہ — استعمال

کے ہی سمبندھ میں ہے"
تعلق

یہ ہندی کے مختلف اسالیب بیان کی مثالیں تحریر و تقریر کی پیش کی گئی ہیں۔ بہرحال ہندی لٹریچر نے ان سوا سو (۱۲۵) برس میں نہایت کثرت و وسعت پیدا کر لی ہے۔ تمام علوم و ادبیات میں اعلیٰ پایہ کی تصانیف ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل، مطابع و ادارات ہندی زبان و ادب کی وسعت و اشاعت میں بہتر سے بہتر کوشش کر رہے ہیں۔

ہندی شاعری کی تاریخ نثر کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ ہے، اور زیادہ قدیم بھی، اس لئے کہ برج بھاشا اصل میں شاعری ہی کی زبان ہے۔ اور اس زبان کا آغاز ہی شاعری کے ساتھ ہے۔

نثر ہندی کی تصنیف جو دسویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتی، لیکن نظم ہندی کا وجود بارہویں صدی سے بھی پہلے پایا جاتا ہے۔ نثر ہندی میں کوئی عجیب خصوصیت نثر اردو کے مقابلے میں نہیں ہے لیکن نظم ہندی دنیا بھر کی شاعری سے نرالی ادا رکھتی ہے۔ اور ایسی انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں کوئی ملک اور کوئی زبان اور کوئی شاعری شریک نہیں۔ ہندی شاعری کے مختلف

(باقی بصفحہ ۱۴۸)

(سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۲۰ء تک) فورٹ ولیم کالج سے باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اردو کی مشکل سے لکھی گئی ہوں گی۔ اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

(۴) بیرونِ کالج کی کوئی تصنیف زبان و محاورہ کی سلاست اور اسلوب بیان کی دلکشی میں میر امن، حیدری، اکرام علی وغیرہ کی کتابوں سے بہتر، اور داستان امیر حمزہ و اخوان الصفا سے زیادہ ضخیم نہیں ہے۔

(۵) کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع کی کتابیں شامل ہیں، یعنی فسانہ، تذکرہ، صرف و نحو، تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، ترجمہ قرآن مجید، ترجمہ انجیل مقدس۔

(۶) سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نثر نگاری کی شاہراہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) موضوعات و اجزاء و عناصر پر اردو میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں۔ غالباً سب سے پہلے جناب نیاز فتحپوری نے جذبات بھاشا کے نام سے نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے رسالہ نگار لکھنو کی ایک اشاعت (جنوری سنہ ۱۹۳۶ء) ہندی شاعری کے لئے مخصوص کردی تھی، اس میں نیاز صاحب نے ایک انگریز مصنف مسٹر ایف ای کی کی تاریخ ادب ہندی کا ترجمہ شائع کردیا ہے۔ لیکن اصل کتاب اور ترجمہ دونوں میں نمونے نہیں ہیں، نمونے اسی رسالے کے دوسرے مضامین میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ نے بھی ہندی شاعری پر کتابیں لکھیں ہیں ہم بھی اس تاریخ اردو کے حصہ نظم میں انشاء اللہ ضمنی طور پر مختصر تاریخ نظم ہندی بیان کریں گے۔

اس حاشیہ میں زبان ہندی کی تقسیمیں اور بعض معلومات اسی انگریز مصنف کی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ نمونے اس کتاب میں نثر کے بھی نہیں ہیں۔

قائم کر دی۔ اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوتا تو بھی اربابِ علم و ادب اس رستے پر آتے، لیکن دیر لگتی۔ ان کتابوں کا نمونہ موجود ہونے پر بھی لوگوں نے اس طرف کم توجہ کی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے

(۲) مصنفین بیرونِ کالج

۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۰ء
۱۲۱۵ھ تا ۱۲۴۶ھ

اسی زمانے میں جبکہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا محکمہ جاری تھا، ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اصحابِ علم و ادب انفرادی طور پر نثر اردو کی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے۔ دکن کے اسی عہد کے بعض مصنفین نثر (شرف الدولہ، بدر الدولہ وغیرہ) کا ذکر "دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کے دور" میں آچکا ہے، دلی، لکھنؤ، آگرہ وغیرہ مقامات میں بھی اربابِ قلم رفتارِ اردو کی ترقی میں سعی بہیم کر رہے تھے۔ لیکن کالج سے باہر کے مصنفوں کو مطبع و اشاعت کی آسانیاں میسر نہ تھیں۔ کالج میں دار الترجمہ کے ساتھ مطبع قائم ہوگیا، اور ۱۸۰۲ء سے کتابیں چھپنی شروع ہوگئیں۔ لیکن فورٹ ولیم کالج سے باہر ۱۸۳۷ء میں دلی میں مطبع کھلا۔ اس کے بعد کتابوں کو طباعت و اشاعت نصیب ہوئی۔ اس سبب سے دلی، لکھنؤ وغیرہ میں قیامِ کالج سے پہلے، اور زمانہ کالج، بلکہ اس سے کچھ عرصہ بعد تک جو کتابیں لکھی گئیں وہ مشہور و عام نہ ہوسکیں۔ یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ ترقی اردو انیسویں صدی کے شروع میں بھی تنہا فورٹ ولیم کالج ہی کی احسان مند نہیں ہے، بلکہ بیرونِ کالج بھی اردو کی رفتار کو تیز کرنے کی کوششیں جاری تھیں، چند نام اٹھارویں اور انیسویں صدی کے گنائے جاتے ہیں[۱]:-

---

[۱] یہ فہرست منشی انعام اللہ صاحب صدیقی اکبر آبادی کی تصنیف یو پی میں اردو سے ماخوذ ہے، اور ان میں سے چند مصنفوں کے حالات اور نمونے بھی ہم آگے لکھتے ہیں۔

(۱) ہری ہر پرشاد سنبھلی مصنف بدائع الفنون (۱۷۳۳ء۔ ۱۱۴۶ھ)

(۲) بندرابن متھرادی (متوفی ۱۷۵۷ء۔ ۱۱۷۰ھ) مصنف تذکرۂ معاصرین

(۳) محمد حسین کلیم دہلوی (۱۷۵۴ء۔ ۱۱۶۷ھ میں زندہ تھے) مترجم فصوص الحکم

(۴) نادر علی شاہ قادری مصنف رسالہ تصوف (۱۷۷۶ء۔ ۱۱۹۰ھ)

(۵) مولوی قدر عالم بن مولوی بدر عالم مصنف فقہ محفوظ خانی (۱۷۸۵ء۔ ۱۱۹۹ھ)

(۶) حکیم محمد شریف خاں دہلوی (متوفی ۱۸۰۷ء۔ ۱۲۲۲ھ) مترجم قرآن مجید

(۷) محمد جعفر مصنف روح الایمان و اسلام (۱۷۸۹ء۔ ۱۲۰۳ھ)

(۸) مولوی کریم الدین دہلوی مترجم تاریخ ابی الفداء (۱۸۰۰ء۔ ۱۲۱۵ھ)

(۹) مولوی حافظ احمد مصنف سراج ایمان (۱۸۰۰ء۔ ۱۲۱۵ھ)

(۱۰) مولوی محمد صفا مصنف زاد آخرت (۱۸۰۲ء۔ ۱۲۱۷ھ)

(۱۱) مولوی حافظ محمد علی مصنف راہ نجات (۱۸۰۳ء۔ ۱۲۱۸ھ)

(۱۲) مولوی محمد حیات مصنف سراج الحیات (۱۸۰۶ء۔ ۱۲۲۱ھ)

(۱۳) مولوی عبدالقادر مصنف گلشن دیں (۱۸۱۲ء۔ ۱۲۲۷ھ)

(۱۴) مولوی محمد خالق اکبرآبادی مصنف مخزن القواعد (۱۸۱۳ء۔ ۱۲۲۸ھ)

(۱۵) مولوی ولی محمد مصنف میخانۂ وحدت (۱۸۲۰ء۔ ۱۲۳۶ھ)۔

(۱۶) مولوی قادر بخش پانی پتی مصنف مختصر التجوید (۱۸۲۶ء۔ ۱۲۴۲ھ)

یہ سب فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور ساتھ کے مصنفین ہیں۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں اور ان سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض متقدمین کے حالات اور نمونۂ تصانیف درج کئے جاتے ہیں۔

محمد حسین کلیم دہلوی

شاعر و مصنف دونوں تھے۔ میر حسن دہلوی (مصنف مثنوی سحر البیان) نے اپنے تذکرۂ شعرا میں کلیم کے متعلق لکھا ہے

کہ انھوں نے خصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میر حسن کے الفاظ یہ ہیں:- "در ہندی نثر کتابے ایجاد کردہ"۔ اس "ایجاد کردہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کو اس سے پہلے کی کسی اردو کتاب کا علم نہ تھا، اور اس کا کچھ تعجب نہیں۔ دکن کی اردو تصانیف کا شمالی ہند دہلی میں پہنچنا اور مشہور ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔ میر حسن اور محمد حسین کلیم ہم عصر تھے۔ میر حسن کا انتقال ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں ہوا ہے، اور کلیم ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں زندہ تھے جس سال احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ اس عہد کی صرف ایک کتاب فضلی کی کربل کتھا ہے جو ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۱ء میں لکھی گئی اور ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۷ء میں مصنف نے اس پر نظر ثانی کی (جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے)۔ اس زمانے میں کلیم و میر حسن دونوں زندہ تھے۔ اگر فضلی کی کتاب شمالی ہند یا دہلی کی ہوتو میر حسن کو اگرچہ اس کا علم ہونا لازم نہ تھا، لیکن ممکن و متوقع ضرور تھا۔ اس لئے کہ یہ کربل کتھا یادہ مجلس مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی، اور میر حسن شیعہ تھے۔

یہ قیاسات میر حسن کے فقرے کے لفظ "ایجاد" پر قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن اگر میر حسن کی مراد (ایجاد کرد) سے (بوجود آورد) ہو، یعنی "تصنیف کی"، تو بات صاف ہے۔ میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین "آب حیات" و "سیر المصنفین" و "یوپی میں اردو" وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے۔ ہم بھی اسی کا لہو لگا کر شہیدوں میں مل جاتے ہیں۔ کلیم کا فقرہ یہ ہے:-

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر، آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر[1]،
ایسی دولت سے زنہار زنہار، فاعتبروا یا اولی الابصار"

---

[1] یہ محاورہ کی بوالعجبی ہے کہ بصیر کے معنی 'دیکھنے والے' کے ہیں لیکن پاس خاطر و دلجوئی کے لئے اندھے کو بھی بصیر کہہ دیتے ہیں۔ گویا چشم ظاہر بند ہے تو کیا، دیدۂ باطن کھلا ہوا ہے۔ اسی غرض سے اندھے کو حافظ کہتے ہیں چاہے اس کو الحمد اور قل ہو اللہ بھی یاد نہو۔ اسی طرح سقے کو بہشتی، حجام کو خلیفہ، خاکروب کو مہتر کہتے ہیں۔

کلیم کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری نثر میں ایسی ہی قافیہ پیمائی ہوگی جیسی اس زمانے کی کربل کتھا اور نوطرز مرصع میں ہے۔

حکیم شریف خاں دہلوی

حکیم محمد شریف خاں، مُلّا علی داؤد برادر مُلّا علی قاری کی اولاد سے تھے، اس لئے سلسلہ نسب حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کے اجداد میں سے ایک بزرگ بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اور حیدر آباد میں قیام کیا۔ حکیم شریف خاں کے دادا حکیم محمد واصل خاں آگرہ آکر سکونت پذیر ہوئے۔ پھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ حکیم واصل خاں شاہ علم اللہ کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کے بیٹے حکیم محمد اکمل خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی (عہد سلطنت ۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ) کے طبیب خاص ہوئے، اور "حاذق الملک" خطاب پایا۔ ان کے بیٹے حکیم شریف خاں تھے جو ۱۷۲۲ء / ۱۱۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علوم کی۔ بڑے مشہور و مستند عالم تھے، فن طب میں "ثانی بوعلی سینا" کہے جاتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۷۵۹ء / ۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ) کے عہد میں شاہی طبیب تھے، "اشرف الحکماء" خطاب تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ۱۷۷۵ء / ۱۱۹۲ھ میں حدیث شریف کی کتاب مشکوٰۃ کا فارسی ترجمہ کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا۔ حاشیہ نفیسی، حاشیہ شرح اسباب، آثار نبوت، شرح حمد اللہ وغیرہ متعدد عربی و فارسی کی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۸۰۷ء / ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا۔ رفتار اردو کے سلسلے میں حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے، جو حضرت شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ اردو سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے۔ لیکن آج تک قلمی و گمنام ہے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا، اور مفتی

انعام اللہ صاحب صدیقی اکبر آبادی نے دیکھا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی تالیف (یوپی میں اردو) میں اس ترجمہ میں سے سورۂ فاتحہ کی صرف پہلی آیت کا ترجمہ نقل کیا ہے، وہ یہ ہے:۔

"جو تعریف کہ اول سے آخر تلک موجود ہے، لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کا بخشنے والا وجود کا آخرت میں۔"

یہ صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ترجمہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے باوجود ترتیب لفظی کے تشریحی ترجمہ کیا ہے۔ لفظ الحمد کا ترجمہ اور مترجم "سب تعریف" یا "تمام تعریفیں" کرتے ہیں، لیکن حکیم صاحب نے لکھا ہے:۔ "جو تعریف کہ اول سے آخر تلک موجود ہے۔" اسی طرح رب العلمین کے ترجمہ میں "پالنے والا" کے آگے "بخشنے والا وجود کا آخرت میں" بھی بڑھا دیا ہے تاکہ رب کا مفہوم واضح ہو جائے، یعنی اس عالم میں روح کی تکمیل تربیت کے بعد آخرت میں باقی مراتب روحانی کا طے کرانا بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شامل ہے۔

اب زمانۂ فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اور بعد کے بعض مشہور مصنفوں کا ذکر لکھا جاتا ہے۔

سید انشاء اللہ خاں دہلوی

ان لوگوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کا کارنامہ کثیر و ضخیم نہیں، لیکن نوعیت میں طرفہ و عجیب ہے۔ ان کے والد کا نام حکیم ماشاء اللہ خاں ہے۔ آبا و اجداد ایران سے کشمیر آئے۔ وہاں سے دہلی میں آ بسے۔ حکیم ماشاء اللہ خاں شاہی طبیب تھے، دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد چلے گئے، وہیں انشاء اللہ خاں پیدا ہوئے، جوان ہو کر تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی آئے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار کا وسیلہ پکڑا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لکھنؤ چلے گئے اور نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہو گئے۔ انشا عالم، شاعر، زباندان، نکتہ سنج، لطیفہ گو، مسخرے، نقال سبھی کچھ تھے۔ نواب کی ناک کا بال ہو گئے لیکن کچھ زمانے کے بعد بگڑ گئی تو نواب نے آٹے کے بال کی طرح نکال کر پھینک دیا۔

لکھنؤ میں ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔ (ان کے حالات آبِ حیات میں پڑھنے کے قابل ہیں)۔ ان کے کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویات، قطعات، رباعیات، ریختی، چیستاں، پہیلیاں، سبھی کچھ ہے۔ ان کا ذکر موقع و محل پر آئے گا۔ نثر کی تصانیف کا انشا کے گرد و پیش کوئی رواج نہ تھا، لیکن انھوں نے زبان اردو اور نثر اردو کی دو عجیب خدمتیں کی ہیں۔

(۱) رانی[5] کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی

یہ انشا کی ذہانت کی عجیب و نادر کارستانی ہے، ایک داستان لکھی ہے جس میں عربی فارسی وغیرہ کسی ہندوستان باہر

---

[5] آج کل کچھ نئے پرانے، لکھے پڑھے لوگوں کے جی میں آئی ہے اور اس دیس کی بھلائی اس میں سوچی ہے کہ اپنی بول چال، لکھت پڑھت، چٹھی پتر سب میں ایسا ڈھنگ برتیں جس میں دیسی بولی ہی کے سارے بول اور سب ڈھب رہیں، پرائے دیسوں اور سمندر پار کی بولیوں کا کوئی بول نہ آنے پائے۔ ہمارے بھائیوں کو جو یہ لو لگی اور دھن بندھی ہے، اور ایسی جو اُپج کی لی ہے، یہ ہونی انہونی بھلی بری جیسی ہوگی ہو رہے گی اور دیکھی جائے گی۔ کہنے سننے کی بات ہے یہ اچنبھا جو یہ لکھنے والا لکھ کر چھوڑ گیا ہے۔ اس بولیوں کے کھیل کے کھلاڑی اور باتوں کے اکھاڑے کے کرتبی کو اب سے سوا سو برس پہلے یہی بات سوجھی تھی، اور اس نے ایک انوکھی کہانی کا نرالے ڈھنگ سے ڈول ڈالا تھا۔ اس نے ایک کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی لکھی ہے جس میں اسی دیس کی ساری بولی ہے، کسی اور دیس کی بولی کا میل نہیں ہے۔ پھر کچھ یہ بات نہیں جو ادھر ادھر کی انمل باتیں جوڑ دی ہوں، کوئی چھوٹی موٹی کہانی گھڑ دی ہو، نہیں، دیکھئے تو اس سرے سے اس سرے تک پوری سڈول گھڑی گھڑائی بنی بنائی اچھی بڑی کہانی ہے، جس میں نئے نئے سماں باندھے ہیں، ڈھنگ ڈھنگ کی بات چیت لکھی ہے۔ کہیں جادو پیار کی باتیں ہیں، کہیں جھیڑ جھاڑ کی گھاتیں، نئے روپ نرالے بہروپ، لگاوٹ کی چاندنی لاگ کی دھوپ، راج نیت اور راج ہٹ، تریا ہٹ اور کایا پلٹ، جوگ بروگ، جنتر منتر، لڑائی بھڑائی، میل ملاپ، سبھی کچھ ہے، اور ساری (باقی بصفحہ آئندہ)

کی زبان کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ کوئی چھوٹی سی حکایت نہیں، پچاس صفحوں کی مکمل داستان ہے۔ قصہ بھی دلچسپ اور انداز بیان بھی دلکش۔ جا بجا رباعیاں ہیں، ان کو "چونکا" لکھا ہے، اشعار کو دوہے اور کبت لکھا ہے، بعض اشعار ہندی اسلوب میں لکھے ہیں، مثنوی کے طرز پر چھوٹی بحریں جو شعر لکھے ہیں ان میں عجیب روانی اور لطافت ہے۔ انشا بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج تھے۔ اس کہانی کی ایجاد ہی ان کی شوخی طبیعت کی دلیل ہے، سارے قصے میں یہی شوخی جلوہ گر ہے۔ شروع میں سببِ تالیف بیان کرتے ہیں:۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۴) کہانی کے بول ایسے میٹھے جن کو پڑھ کر بول بول پر ہونٹ چاٹیے، اور باتیں ایسی نرالی جن کو سن کر بات بات پر اچنبھے میں آجائیے۔

اس کہانی کے پڑھنے سے پہلے یوں ہی جی میں سوچیں تو ٹھیک بھید نہیں کھلتا، اور ایسا کچھ سمجھ میں آتا ہے جیسے اس ڈھب سے کہانی بنا لینی کچھ کٹھن نہ ہوگا۔ ایسا کہنے اور سمجھنے والے آپ لکھ کر دیکھیں تو تارے دکھائی دینے لگیں۔ ان دنوں جو ایسی بولی کی سوجھی ہے جس میں بدیسی کھوٹ اور برا یا میل نہ ہو تو اس کے لئے کرتے کیا ہیں؟ بدیسی بولیوں کے ہلکے پھلکے، میٹھے پیارے، جانے پہچانے، بول چال میں کھپے کھپائے بول نکال دیتے ہیں، اور ان کی جگہ سنسکرت اور برج بھاشا کے موٹے بھدے، بھاری بھرکم بول رکھ دیتے ہیں جن سے بات سلجھنے کی جگہ اور الجھ جاتی ہے اور بولی سمجھ میں تو کیا آتی ایک اچنبھا اور گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتی ہے۔ رانی کیتکی والی کہانی میں یہ بات نہیں ہے۔ اتنا تو ہے، اور نہ کیوں ہوتا، اگلے لوگوں کی لکھی ہوئی جو ٹھہری، سو برس پہلے کی بولی جو ہوئی، پرانے لوگوں کی بات چیت اور لکھنے پڑھنے کا جو ڈھنگ تھا، جو اور جیسے بول وہ بولتے لکھتے تھے، اور اب وہ بہت دنوں سے چھوٹ گئے ہیں اور ان کو سن کر اب ہمارے کان کھڑے ہوتے ہیں، وہ تو جگہ جگہ اس کہانی میں بھی ملتے ہیں۔ سو یہ بات کچھ اس کہانی اور اس کے لکھنے والے کی برائی نہیں کہی جا سکتی۔ جب کا کون سا لکھنے والا ہے جس نے کچھ نہ کچھ ایسا نہ لکھا ہو۔ اس بات کو چھوڑ دیجئے اور بھول جائے تو ویسے یہ رانی کی کہانی، کہانی کی رانی ہے۔ (باقی بصفحہ آئندہ)

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے پُٹ نہ ملے، تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے، سر ہلا کر منہ بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر لگے کہنے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھوس جائے، جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی ڈول رہے، اور چھانو کسی کی نہ پڑے، یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجلا کر کہا، میں کچھ ایسا بڑبولا نہیں، جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں، اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں سجاؤں، جو مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا، جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) دھیان میں نہیں آسکتا جو ایسے ہی ڈھب سے لکھنے کی ٹھہرے تو اس سے اچھی کیونکر لکھی جا سکتی ہے۔

اس کہانی کو پڑھ کر ہمارے جی میں بھی آیا کہ اس پر ہم جو کچھ لکھیں اس میں بھی یہی بات ہو اکیلی دیسی بولی ہی میں پوری بات کہدیں، اور بولیاں نہ ملنے دیں۔ پہلے تو سوچا، ان باتوں کو اوپر ہی جہاں اس کی ٹھیک جگہ ہے لکھدیں، پھر یہ بات کچھ ڈھنگ کی نہ دکھائی دی ہم نے اب تک لکھنے کا جو ڈھنگ رکھا ہے، جس میں اتنا بہت سا اس سے پہلے لکھ آئے ہیں، وہ کچھ اور ہے اور یہ کچھ اور۔ پڑھنے والے اس کو پڑھتے پڑھتے جب اس تک آئیں گے تو اچانک اٹک جائیں گے اور جی میں کہیں گے، لکھنے والا گرگٹ کے سے روپ بھرتا ہے، کیا سے کیا لکھنے لگا۔ اس لئے ہم نے اس کو یہاں نیچے لکھ دیا ہے۔

ہیں کہہ سنا تا ہے۔ دھنا ہاتھ منھ پر پھیر کر آپ کو جتا تا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ
تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے
دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل، اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے،
اپنی چوکڑی بھول جائے [۵]

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں — کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی — کہتا جو کچھ ہوں، کر دکھاتا ہوں میں

آگے کہانی کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کے یہ
پوچھا، گرو جی گسائیں مہندر گر نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا، وہ کہاں رکھا ہے اور اس
سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی
کہنے لگی، آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور
چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا، وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے،
ایسے سنگھے کسی بُرے دن کے سمہال لینے کو ڈال رکھتے ہیں، کیا جانے کوئی گھڑی
کیسی ہے، کیسی نہیں، رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منھ تھتھا کے اٹھ گئی
اور دن بھر بن کھائے پیے پڑی رہی۔ مہاراج نے بلایا تو کہا، مجھے رُچ نہیں ہے۔
تب رانی کام لتا بول اٹھیں، اجی کچھ تم نے سنا بھی، بیٹی تمہاری آنکھ مچولی کھیلنے کے
لئے وہ بھبوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی، میں نے نہ دیا اور کہا، بیٹی یہ لڑکپن کی باتیں
اچھی نہیں، کسی بُرے دن کے لئے گرو جی دے گئے ہیں، اسی پر مجھ سے روٹھی
ہے، بہتیرا بہلاتی پھسلاتی ہوں، مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا، بھبوت تو کیا،
مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کی ایک گھڑی بھر کے بہل جانے

---

[۵] بھول۔

پر ایک جی تو کیا، لاکھ جی ہوں تو دے ڈالئے، رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا۔ کئی دن تلک آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی۔ سب کو ہنساتی رہتی، جو سو سو تھال موتیوں کے نچھاور ہوا کئے، کیا کہوں ایک چہل تھی جو کہئے تو کروڑوں پوتھیوں میں جیوں کی تیوں نہ آسکے۔"

(۲) **دریائے لطافت** ۔ یہ تصنیف اردو زبان و قواعد ادب کے متعلق سید انشا کا نہایت قابل قدر کارنامہ اور غیر فانی یادگار ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے، لیکن مضمون و موضوع اردو زبان ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اردو کی قواعد و محاورہ کے متعلق ہے اور انشا کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ منطق و معانی و عروض پر ہے اور محمد حسن قتیل کی تصنیف ہے۔ دریائے لطافت ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء میں مرتب ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۲ء میں مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد میں چھپی اس کے بعد مولانا عبدالحق دہلوی نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے مع اپنے عالمانہ مقدمہ کے ۱۹۱۶ء میں شائع کی، اس جدید اشاعت میں کچھ اختصار و ترمیم بھی کی گئی ہے۔ انشا نے جابجا فحش کلمات بے تکلف استعمال کئے تھے ان کو خارج کر دیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحق اس کتاب کی خوبیاں بیان کرتے ہیں:۔ "کتاب کی جان پہلا ہی حصہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد پر لکھی تھیں، لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے، اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، یا اس کی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔"

سید انشا نے الگ الگ باب باندھ کر حروف تہجی کی بحث، دہلی کے مختلف محلوں کی زبان کا فرق۔ بعض شعرا و فصحا کا ذکر، دہلی و لکھنؤ کی فصاحت و فوقیت کا موازنہ، دہلی کی اصطلاحیں، عورتوں کی خاص گفتگو اور اصلاحات، صرف و نحو کے مجتہدانہ اصول بیان کئے ہیں۔ اور ہر جگہ عجیب ظرافت سے کام لیا ہے۔

دریائے لطافت کے تیسرے باب کے متعلق مولانا عبدالحق لکھتے ہیں:۔

"اسی باب میں نواب عمادالملک، بھانڈ اِل، مرزا صدرالدین صفاہانی اور ملا عبدالغرق کی دلچسپ تقریریں ہیں، خاص کر بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں نہایت پر لطف ہیں۔ بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں ایسی پاک صاف شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سید انشا کی زباندانی اور فصاحت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے، اور زبان کے منجھنے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں، اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں۔ بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا، اور اس میں شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے وہ بہت ظریفانہ ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔"

ہم اسی کا نمونہ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

کلام بی نورن کسبی باشندۂ کوچۂ بلاقی بیگم با میر غفر غینی دیوانی:۔

اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلی میں آتے تھے، دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے، لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجو، کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو، تمھیں علی کی قسم، آٹھوں میں ضرور چلیو[۵۱]۔

---

۵۱ آٹھوں کا میلا لکھنؤ کا مشہور تہوار ہے۔

جواب از میر غفر غینی دیابی[1]۔

اجی بی نورن، یہ کیا بات فرماتی ہو، تم تو اپنے جوڑے کی چین ہو، پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے، اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سنئے، ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے، ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی، پھر میاں آبرو اور میاں تاجی اور میاں حاتم، پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب، پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب بردا اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے، وہ لوگ تو سب مر گئے، اور ان کی قدر دانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں، اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے، تخم تاثیر صحبت کا اثر، سبحان اللہ! یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تھی رباعی کس وزن شعر کہتا تھا؟ اور رضا بہادر کا کون کلام ہے؟ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے، اگر پوچھئے کہ ضرب زید عمرو کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لیکر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انار چھوڑ کے شاعری میں آگے قدم رکھا ہے، اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے، آگے بڑے زادے تھے، ہم بھی گھورنے کو جانتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں، مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں، اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا

---

[1] میر غفر کو غینی دیابی اس لئے کہا ہے کہ میر صاحب لام اور ت کو اکثر غین اور کمتر ری بولتے ہیں۔ انشا نے ان کی ساری تقریر غین اور ی کے ساتھ لکھی ہے، جس کو مولانا عبدالحق نے دریائے لطافت کے حاشیہ میں درست کرکے لکھدیا ہے۔ یہ بھی انشا کی لاجواب ظرافت تھی۔

انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے، رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے، اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے، رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس شعر کو کیونکر کہیے۔ سارے دلی لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں سے

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے، کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم، لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغ کا چلانے والا تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا، اور گراہی پن (یا کلاہی پن) جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے، اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں، اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے کہ

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو[۱]

اور نچوڑی انگیا، اور نگوڑی انگیا، اور مرودڑی انگیا۔ اور مرد ہو کے یوں کہے ع

لیکن ایسا نہو کمبخت میں ماری جاؤں

---

[۱] ریختی شاعری کی ایک قسم نکالی گئی ہے جس میں عورت کی زبان سے بے حیائی کے عشقیہ جذبات و معاملات بیان کرتے ہیں۔ ریختی سعادت یار خاں رنگین کی ایجاد نہیں ہے جیسا انشا نے بیان کیا، بلکہ رنگین سے بہت پہلے ہاشمی دکنی نے سب سے پہلے ریختی کہی ہے۔ رنگین کی اس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:۔

جو ہونی تھی وہ بات ہولی کہارو چلو لے چلو میری ڈولی کہارو
ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اور ایک کتاب بنائی ہے، اس میں رنڈیوں[1] کی بولی لکھی ہے۔ اوپر والیاں چھلیں۔ اوپر والا، چاند۔ اجلی، دھوبن۔ اندر والا، دل۔ اور سے گانا، دوگانا، یگانا، زنانخی، الایچی (یعنی) دوست۔

مرزا قتیل فرید آباد (دہلی) کے رہنے والے، قوم کے کھتری تھے۔ دیوالی سنگھ نام تھا۔ مسلمان ہوگئے، محمد حسن نام رکھا گیا۔ مرزا قتیل کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔ فارسی کے شاعر و ادیب تھے، مولوی غلام شہید آپ کے شاگرد ہیں۔ دربار اودھ کے متوسل تھے۔ نہر الفصاحت، چار شربت، دیوان وغیرہ فارسی کی تصنیفات ان سے یادگار ہیں۔ سید انشا سے بڑا یارانہ تھا۔ قتیل کا اردو زبان کے متعلق یہی کارنامہ ہے کہ دریائے لطافت انشا کی شرکت میں مرتب کی۔ اس کا دوسرا حصہ، جیسا کہ پہلے لکھا گیا، منطق، عروض، قافیہ، معانی، بیان کے متعلق قتیل نے لکھا ہے۔ قتیل نے بھی انشا کی طرح ظرافت سے کام لیا ہے، لیکن ان سے بڑھے نہیں۔ مثلاً فن عروض میں اوزانِ بحر کے مشہور الفاظ کی جگہ نئے الفاظ تراشتے ہیں، جیسے

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بی جان پری خانم بی جان پری خانم

فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کی جگہ چھت لگن پری خانم چھت لگن پری خانم

منطق میں بھی ایک جدت پیدا کی۔ اپنے نزدیک تو اس میں ظرافت و شوخی کا پہلو نکالا ہے، لیکن وہ ایک علمی تجویز بھی ہے جو وضع اصطلاحات اور ترجمۂ علوم و فنون کے ماہرین کے لئے قابلِ غور ہے۔ یعنی منطق کی اصطلاحوں کے لئے اردو کے الفاظ تلاش کئے ہیں، مثلاً

---

[1] رنڈی لکھنؤ میں عورت کے لئے بولا جاتا تھا۔ طوائف کے معنوں میں بعد کو استعمال ہوا ہے۔ اُس زمانے میں طوائف کو کسبی کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔

تصور	دھیان	تصدیق	جوں کا توں
موضوع	بول	دَوْر	ہیر پھیر
محمول	بھرپور	مطابقت	ٹھیک ٹھیک
نسبت	ملاپ	التزامی	اوپری لگاؤ
قضیہ	بات	مثلث	تکونا
تسلسل	اُلجھا سوت	مربع	چوکونا

مرزا قتیل نے علم بیان و بدیع کا حصہ بھی خوب لکھا ہے۔ یہ علوم اردو میں غالباً سب سے پہلے اسی کتاب میں مرزا قتیل کے قلم سے مرتب ہوئے ہیں۔ امام بخش صہبائی کا ترجمۂ حدائق البلاغت اس سے بعد کا ہے۔ قتیل نے تمام صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں اپنی طبع زاد نظم یا نثر میں لکھی ہیں۔ مشہور و معروف صنعتوں کے علاوہ اور نئی نئی کاریگریاں نکالی ہیں۔ تعریف و تشریح فارسی زبان میں ہے اور مثالیں اردو میں لکھی ہیں۔ تحریر کا نمونہ یہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

سوائے ضلع مناسبت درمیان دو چیز مخالف یکدیگر بہ یک لفظ بیان کنند وآں را نسبت نام نہند، مثلاً اگر کسے بپرسد کہ کنوئے اور آتشبازی میں کیا نسبت ہے؟ باید گفت کہ "چرخی"۔ یا بپرسد کہ بندوق اور مہاجن اور فرنگی میں کیا نسبت؟ باید گفت کہ "کوٹھی"۔ یا ایں کہ شمشیر و دشمن باہم چہ نسبت دارند؟ باید گفت "باڑھ"۔ یا میانۂ چوپڑ و دو پٹہ چہ نسبت است؟ باید گفت کہ "گوٹ"۔

ضلع کی مثال میں دریا کے مناسب چیزیں بیان کرنے کے لئے دو صفحے میں اردو عبارتیں لکھی ہیں۔ جن میں پانی کے اقسام، دریاؤں کے نام، دریائی جانور، کشتی اور تیرنے کے الفاظ ضلع یا ایہام کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ شروع کے فقرے یہ ہیں:-

"آپ کا بجرہ کچھ آج کھل گیا ہے، واللہ تمہاری بات پانی بہت مشکل ہے، نہیں۔

کل سوتا چھوڑ گئے"، ہر چند ضعف نالی کی تو بھی رتھ میں جگہ ندی، ایک باؤلی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھا دی۔"

ایک عبارت مرتب کی ہے جس میں حرف نون کہیں نہیں آنے دیا۔ لکھتے ہیں:۔

جس کا جی چاہے ہمارے پاس آئے، اگر بے اس کا، اور جو کوئی آتا آتا یکبارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض، اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے، اس واسطے کہ عاصی پُر از معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشہ ہی کے بیچ اسی طرح جما رہے کہ اگر ہزار بار دورہ کامل فلک ہشتم کا کہ جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر گزر جائے تو بھی اس جگہ سے اٹھ کر جو بہت جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہیے" یہ بھی اس وقت کا ایک ذٹل قافیہ ہے۔

ایک عبارت موصل دو حرفی کی صنعت میں لکھی ہے، یعنی دو دو حرف ملے ہوئے ہیں، نہ کوئی حرف الگ ہے نہ دو سے زیادہ ملے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"چھوٹی کو کاجی کی لڑکی کی گویا کالی ناگن ہے، پرجب جی چاہے تب کاٹے ہے، جو جو خوبی حق نے کو کا صاحب کی لڑکی کو دی ہے، شاید نوشابہ کو دی ہو تو دی ہو۔"

اس عبارت کے ضمن میں اُس زمانے کی سوسائٹی کے اخلاق بھی قابل ذکر و توجہ ہیں۔ انشا، قتیل اور رنگین تینوں گہرے اور بے تکلف دوست ہیں، تینوں کو کسبی عورتوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ انشا کی زبانی بی نوارن کا ذکر بیان کیا جا چکا ہے۔ انشا نے رنگین کی بھی اُس دلچسپی کا ذکر کیا ہے، قتیل نے ان دونوں سے کم اپنی دلچسپی و وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے حصہ تالیف میں صنعتی مثالیں دی ہیں، اکثر میں رنڈیوں اور کسبیوں کا ذکر ہے۔ صنعت توشیح میں انہی عورتوں کے نام نکالے ہیں۔ معمے انہی کے نام کے بنائے ہیں۔ اشعار اور عبارتوں میں

انھی کا ذکر ہے۔ اور اوزان بحر میں انھی کے نام رکھے ہیں۔ شاید اُس زمانے کے لکھنؤ کی سبھی رنڈیوں اور کنچنیوں کے نام لکھ دیے ہیں۔ اُس عہد کے لکھنؤ پر عیش و عشرت کے بادل چھائے ہوئے تھے، تاہم یہ بات قابلِ داد ہے کہ وہ بزرگ بیباکی یا بے تکلفی و متانت دلی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے، بلکہ یقین ہے کہ اُس زمانے میں یہ ذکر اذکار سب کرتے تھے، حال و کردار سب کے ایسے نہ تھے۔ لیکن ہمارے زمانے میں حال وہی ہے، قال وہ نہیں۔

دریائے لطافت کے علاوہ مرزا قتیل کی اردو نثر کی تحریر مرزا کے مجموعہ مکتوبات میں بھی پائی جاتی ہے۔ مرزا کے شاگرد خواجہ امداد الدین نے اُن کے خطوط جمع کرکے ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں معدن الفوائد کے نام سے شائع کیے تھے۔ اس میں مرزا قتیل نے حمد و نعت عربی، فارسی، ترکی، اردو میں لکھی ہے۔ اردو کا نمونہ یہ ہے۔

> ”بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا، اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اُس کی اُمت کیا، سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھلانے والا ہے، اور سعادت کی منزل کا خضر ہے۔“

اس عبارت کے اسلوب پر فارسی کا اثر ہے۔ دریائے لطافت کے اقتباسات سلیس و فصیح روزمرہ میں ہیں۔ بہرحال مرزا قتیل بھی ترقی اردو کے کارپردازوں میں شامل ہیں۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی

شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے پوتے تھے۔ ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ ان کے چچا شاہ عبدالعزیز صاحب

نے تربیت کی، آغاز جوانی میں علوم معقول و منقول کی تحصیل سے فارغ ہوگئے۔ جوان ہوکر مولوی سید احمد بریلوی کے مرید ہوگئے جو ہندوستان میں فرقہ وہابیہ کے بانی ہوئے ہیں۔ مولوی سید احمد ۱۷۸۲ء/۱۱۹۶ھ میں پیدا ہوئے تھے، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم پائی تھی، لیکن بعد کو وہابیت کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ نہایت خوش بیان مقرر تھے اس لئے لوگ کثرت سے ان کے معتقد و مرید ہو جاتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے عقائد کی اشاعت کرنے کے بعد ۱۸۲۲ء/۱۲۳۷ھ میں حج کو گئے۔ مکہ معظمہ سے قسطنطنیہ گئے، چھ سال تک ترکی اور ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کرکے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہے۔ پھر دہلی واپس آکر پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اشاعت عقائد شروع کر دی، اور آخر انتہائے جوش میں سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۲۸ء/۱۲۴۳ھ میں مولوی اسمٰعیل کو ساتھ لیکر عظیم الشان لشکر کی قیادت کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کرنے کے لئے پشاور کو روانہ ہوگئے۔ ان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے مشاہیر ملک اور اہل دولت ان کے معاون و مددگار تھے۔ ۱۸۲۹ء/۱۲۴۵ھ میں انھوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا، لیکن ان کے عقائد و اصول کی سخت گیری سے تنگ آکر سرحدی افغانوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ پشاور چھوڑ کر دریائے اٹک کے پار پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ آخر ۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے مولوی سید احمد و مولوی اسمٰعیل دونوں نے اثنائے سفر پنجاب میں سفر آخرت اختیار کیا اور شہید مشہور ہوئے۔

جب اس شکست کی خبر دہلی پونہچی تو مشہور شاعر شاہ نصیر نے ظرافت و تمسخر کے انداز میں طویل قصیدہ کہا؛ اس کے دو شعر یہ ہیں:-

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نصِ قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے اگرچہ تھے دمِ شملہ سے وہ شیر نیستانی

یہ قصیدہ دہلی میں مشہور ہوا تو ان کے مرید پیر کی یہ توقیر سن کر برافروختہ ہو گئے، اور کثیر تعداد میں شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ آئے۔ قریب تھا کہ شاہ صاحب دشمنوں کی زد میں آجائیں لیکن کوتوال شہر میرزا خانی کو اطلاع مل گئی، وہ موقع پر پہنچ گئے اور شاہ نصیر کی جان بچالی۔ شاہ صاحب نے قصیدہ میں شکریہ کا اضافہ کیا اور یہ شعر بھی کہا۔

نصیر الدین بچارہ تو رستہ طوس[۵] کا لیتا   نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

مولوی سید احمد بریلوی نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ فارسی میں تنبیہ الغافلین لکھی ہے جس کا اردو میں ترجمہ مولوی عبداللہ نے ۱۸۳۰ء میں ہگلی (کلکتہ) سے شائع کیا تھا۔ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کئی کتابیں اپنے عقائد کے متعلق اردو میں لکھیں جن میں سے تقویت الایمان بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں مولوی سید احمد کے اور مریدوں نے بھی بہت سی کتابیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے لکھیں مثلاً ترغیب جہاد ہدایۃ المومنین، نصیحۃ المومنین وغیرہ۔ یہ کتابیں بھی اردو کی ترقی کے سلسلے میں شامل ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی تقویت الایمان بہت صاف و سلیس زبان میں ہے۔ صرف کہیں کہیں ترتیب الفاظ اور انداز بیان میں قدامت ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

"ہر خاص و عام کو چاہیے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں، اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سننا چاہیے کہ ایمان کے دو جز ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا، اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کا رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک، اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں اور اس کے

---

[۵] طوس کے لفظ سے شاہ نصیر نے اپنے ہمنام خواجہ نصیر الدین طوسی کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ رستہ تو ملک عدم کا لیتے۔

خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہیے کہ توحید اور اتباع سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے، کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں۔"

تقویت الایمان کثرت سے شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصہ کا انگریزی ترجمہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔

سید اعظم علی اکبرآبادی

آگرہ کے رہنے والے، مولوی بہر علی کے بیٹے تھے۔ ان کے نانا آگرہ کے مشہور بے نظیر عالم و مناظر بزرگ مولوی ولی محمد (شارح مثنوی مولانا روم) تھے۔ ان کے سایہ میں مولوی اعظم علی نے پرورش پائی تھی۔ تحصیل علوم کے بعد مین پوری میں محصل لگان رہے۔ پھر آگرہ کالج میں فارسی کے مدرس ہوگئے۔ علمی مذاق رکھتے تھے۔ صاحب تصانیف ہیں۔ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں سکندر نامہ کا ترجمہ کیا۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں فسانہ سرور افزا اردو میں لکھا۔ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ایک فارسی مثنوی "اکسیر اعظم" لکھی۔ یہ آخری تصنیف ہے۔ مرزا غالب سے مولوی اعظم علی کے مراسم خط و کتابت تھے۔ غالب کے پنج آہنگ میں مولوی صاحب کے نام بھی ایک فارسی کا رقعہ ہے۔ فسانۂ سرور افزا کا نمونہ یہ ہے۔ حمد باری تعالیٰ لکھتے ہیں:۔

احسان ایسے بادشاہ عادل اور شہنشاہ باذل کا کہ جس نے واسطے عبادت و معرفت اپنی ذات کے انسان ضعیف بنیان کے تئیں تہ خانہ ظلمات عدم سے نکال کر خلعت جواہر نگار حیات ابدی کا عنایت فرمایا، مقدور کس بشر کا ہے کہ زبان بیان سے ادا کر سکے، اور شکر ایسے ہادی برحق و کریم مطلق کا کہ ایسے مشت خاک سراسر ناپاک کے تئیں تمامی مخلوقات و موجودات سے ممتاز و سرفراز کر کے نور عقل و شمع ایمان سے منور کیا، طاقت کس کی ہے جو ایک حرف اس

دفتر بے پایاں سے بیان کرے۔ ایسا خداوند حقیقی ہے کہ ہر ذی حیات کو بے رعایت
سلسلۂ طاعت و عبادت کے، شام و صباح وظیفہ خوار نعمتوں بے قیاس کا رکھتا ہے،
اور عجب رزاق مطلق ہے کہ مورسے مار تلک کسی جاندار کو اپنے مائدۂ فضل و نوال
سے محروم و مایوس نہیں کرتا ہے۔

یہ عبارت ترجمہ نہیں ہے۔ مصنف کی طبع زاد تحریر ہے، لیکن اسلوب ترجمہ کا سا معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں فارسی پڑھنے لکھنے کے سبب سے درسیات وادبیات فارسی کا طرز بیان ذہن نشیں ہوتا تھا۔ وہی انداز اپنی آزادانہ نگارش میں بھی پیدا ہوجاتا تھا۔ اس کو بدلنا اور سلاست و روانی پیدا کرنا اپنی اپنی افتادِ طبیعت اور اقتضائے حال کے مطابق ہوسکتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کا مقصد ہی سادہ و آسان اردو لکھنا تھا۔ اس لئے اکثر ایسی ہی لکھی گئیں، پھر بھی سب کا طرز ایک سا نہیں ہے۔ میر امن اور حیدری نے ترجموں کو بھی اپنا کرلیا ہے، افسوس پورے کامیاب نہ ہوسکے، امانت انشا بالکل ناکام رہے۔ لطف نے سلاست و سادگی کے جھگڑے ہی میں پڑنا پسند نہ کیا۔ اپنی وہی قدامت کی آن قائم رکھی۔ جب کالج کے متعین مقصد اور متحدہ کوشش کا یہ حال ہے، تو کالج سے باہر تو کوئی پابندی تھی ہی نہیں۔ انشا اور قتیل ذہین، طباع، جدت پسند تھے، بہتر سے بہتر اردو لکھ گئے، اور لوگ اپنی اپنی روش پر چلتے رہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنفِ نثر ہیں۔ مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے ہیں۔ غالباً ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے (مرزا غالب سے دس برس پہلے)۔ فن خوشنویسی کے بڑے ماہر و استاد تھے۔ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم بھی کافی پائی تھی۔ شاعری میں آغا نوازش حسین کے شاگرد تھے۔ نہایت ظریف، زندہ دل،

خوش رو، خوش خو آدمی تھے۔ نواب غازی الدین حیدر شاہِ اودھ[51] (عہد وزارت و سلطنت ۱۸۱۴ء / ۱۲۲۹ھ تا ۱۸۲۷ء / ۱۲۴۳ھ) کے حکم سے جلا وطن ہو کر لکھنؤ سے کانپور چلے گئے، کانپور میں حکیم سید اسد علی کے مشورے سے اپنی مشہور تصنیف فسانۂ عجائب لکھنی شروع کی۔ جب ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۳ھ میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے سرور کو درباری شاعر مقرر کیا، اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی۔ ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ختم ہو گئی اور بادشاہ معزول ہو گئے، پھر ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں غدر کی تباہی آئی۔ سرور اسی عرصہ میں

[51] **مختصر تاریخ وزارت و شاہی اودھ** (۱) شاہان اودھ کا مورث اعلیٰ خراسان کا تاجر محمد امین تھا جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اس کا باپ محمد نصیر بہادر شاہ (بن اورنگ زیب عالمگیر) بادشاہ دہلی (۱۷۰۷ء / ۱۱۱۹ھ تا ۱۷۱۲ء / ۱۱۲۴ھ) کے عہد سلطنت میں ہندوستان آیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد محمد امین ہندوستان میں آیا اور نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات کے دربار میں ملازم ہوا۔ پھر صوبہ دار سے ناراض ہو کر دہلی آ گیا، اور فرخ سیر بادشاہ دہلی (۱۷۱۳ء / ۱۱۲۵ھ تا ۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ) اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں ہنڈون و بیانہ کا فوجدار رہا۔ ایک موقع پر سادات بارہہ کے مقابلے میں محمد شاہ کی مدد کی۔ بادشاہ نے سعادت خاں بہادر کا خطاب دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور برہان الملک کا خطاب عنایت کیا۔ جب ۱۷۳۹ء / ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کابل و پشاور و پنجاب فتح کرتا ہوا حملۂ دہلی کے ارادے سے پانی پت تک آ گیا تو برہان الملک سعادت خاں نے اودھ سے آ کر محمد شاہ کی مدد کی اور پانی پت پر بادشاہ کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ کی۔ اتفاق سے برہان الملک اور نظام الملک آصف جاہ دونوں نادر شاہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کو بھی بارادۂ صلح اپنے خیمہ میں بلا لیا اور جنگ ختم کر کے ان سب کو ساتھ لیکر نادر شاہ دہلی آ گیا، نظام الملک برہان الملک کا دشمن تھا اور اس کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ جس صبح کو نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کیا اس سے پہلی رات کو نظام الملک برہان الملک

(باقی بصفحہ آیندہ)

سخت پریشان رہے۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بلالیا، پھر مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے بھی مہمان بلالیا، مہاراجہ پٹیالہ نے طلائی کڑے نذر کئے۔ سرور نے ایک خط میں اپنے سفر دہلی و میرٹھ و راجپوتانہ کے مصائب کا حال لکھا ہے۔ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے اور واجد علی شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ وہاں سے واپس آکر بنارس چلے گئے اور وہیں ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ سرور کی تصنیفات یہ ہیں:-

---

(بقیہ صفحہ ۱۷۰) کے پاس آیا اور کہا کہ نادر شاہ کہتا ہے اگر پچاس کروڑ روپیہ مجھے دیدو تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ اتنا روپیہ کہاں ہے۔ لیکن یہ دن آج میرے لئے ہے کل تمہارے لئے اس بے آبروئی سے موت بہتر، اس لئے ہم تم دونوں زہر کے پیالے پی کر اپنا کام آپ تمام کریں۔ برہان الملک سادہ دل آدمی تھا۔ کہنے میں آگیا۔ اور زہر پی کر جان دیدی۔ نظام الملک آرام سے اپنے گھر آکر سو رہا۔ برہان الملک کے بعد محمد شاہ نے اس کے بھانجے صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ دار بنا دیا۔

(۲) **منصور علی خاں صفدر جنگ** (۱۷۳۹ء / ۱۱۵۱ھ تا ۱۷۵۴ء / ۱۱۶۷ھ) اس عہد میں روہیلہ افغانوں نے اودھ پر حملہ کیا اور صفدر جنگ نے ان کو شکست دی۔ مقبرۂ صفدر جنگ دہلی کی مشہور عمارت ہے جس سے روضہ تاج آگرہ کا نقشہ لیا گیا ہے۔ صفدر جنگ کا باپ جعفر خاں جس سے سعادت خاں کی بہن منسوب تھی سادات میں سے نہ تھا بلکہ آرمینیا کی مشہور ترکمان قوم قراقویونلو سے تھا۔ صفدر جنگ کی ماں سیدانی تھی۔

(۳) **شجاع الدولہ** (۱۷۵۴ء / ۱۱۶۷ھ تا ۱۷۷۵ء / ۱۱۸۸ھ) صفدر جنگ کا بیٹا تھا۔ تاریخ ہندوستان کا بڑا نامور اور ہنگامہ پرور آدمی ہے۔ انگریزوں سے جنگ کی شکست کھائی اور صلح کر لی۔ روہیلوں سے لڑا اور کامیابی پائی۔ اسی کے زمانے میں روہیلہ پٹھانوں کی ریاست رام پور کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پانی پت کی تیسری مشہور جنگ ہوئی (۱۷۶۱ء / ۱۱۷۵ھ)۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

(۱) فسانہ عجائب۔ ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ میں لکھی۔ (۲) سرورِ سلطانی ترجمہ شمشیر خانی، ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے حکم سے مرتب کی۔ کسی نے شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ نثر فارسی میں شمشیر خانی کے نام سے لکھا تھا۔ سرور نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ (۳) شرر عشق ۱۸۵۶ء میں نواب سکندر جہاں بیگم ریاست بھوپال کے حکم سے لکھا، یہ بھوپال کے جنگل کے پرندوں کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ (۴) شگوفۂ محبت بھی اسی سال ۱۸۵۶ء میں لکھا۔ یہ قصہ پہلے مہر چند کھتری نے لکھا تھا۔ اسی کو سرور نے اپنے

(بقیہ صفحہ ۱۷۱)

---

(۴) آصف الدولہ (۱۷۷۵ء/۱۱۸۸ھ تا ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ) بن شجاع الدولہ، بڑے شان و شوکت کا نواب تھا۔ اس کا زمانہ نسبتہً پُرامن رہا۔ شجاع الدولہ تک نوابانِ اودھ کا مرکزِ حکومت فیض آباد رہا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دار الحکومت بنایا۔ مقبرۂ آصف الدولہ ہندوستان کی بے نظیر عمارتوں میں شامل ہے۔ سلطنت مغلیہ کی بربادی کے سبب سے دہلی کے شعرا و اہلِ کمال شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے زمانے میں اودھ آئے۔ مرزا سودا، میر تقی میر، میر حسن، میر سوز انہی زمانوں میں لکھنؤ آئے۔ اور ان کے آنے سے لکھنؤ میں شعر و سخن کی رونق ہوئی۔ آصف الدولہ خود بھی شاعر تھا۔ اچھا کہتا تھا۔

(۵) وزیر علی خاں (۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ میں صرف چار مہینے حکومت کی) آصف الدولہ کا فرزندِ اکبر تھا، لیکن اس کی بدکرداری کے سبب سے خود اس کی دادی بہو بیگم والدۂ آصف الدولہ اور چند امرا و اعیانِ سلطنت مخالف ہوگئے اور انگریزوں کی مدد سے معزول کرا دیا۔ رعایا وزیر علی خاں کی طرفدار تھی لیکن ان کی کچھ نہ چلی۔ وزیر فورٹ ولیم کلکتہ میں مقید رہا اور وہیں ۱۸۱۶ء/۱۲۳۲ھ میں انتقال کیا۔

(۶) سعادت علی خاں۔ (۱۷۹۸ء/۱۲۱۲ھ تا ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ) آصف الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ بھائیوں میں نباہ نہ ہو سکتا تھا اس لئے سعادت علی خاں لکھنؤ سے باہر بریلی، آگرہ، ڈیگ (بھرتپور) وغیرہ میں اقامت گزیں رہا۔ لیکن انگریزوں سے برابر خط و کتابت کرتا رہا کہ آصف الدولہ کے بعد اسی کو حکومت دی جائے۔ جب وزیر علی خاں کو انگریزوں نے معزول کیا تو (باقی صفحہ آیندہ)

رنگ میں لکھا۔ (۵) گلزار سرور، ترجمہ حدائق العشاق فارسی۔ یہ مذہبی کتاب ہے جس میں روح و عشق کا مناظرہ دکھایا ہے۔ سرور نے اپنے مخصوص طرز رنگین و مقفیٰ میں لکھا ہے۔ مرزا غالب نے اسی طرز میں اس پر تقریظ لکھی ہے۔ (۶) شبستانِ سرور اس میں الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ ہے۔ (۷) انشائے سرور، مرزا سرور کے خطوط کا مجموعہ جو ان کے بعد مرتب و شائع ہوا۔ ان میں سے بعض کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سعادت علی خاں سے یہ شرط کی کہ اگر تم نصف ملک ہمیں دیدو اور نصف اپنی حکومت رکھو تو تم کو حکمراں بنائے دیتے ہیں۔ سعادت علی خاں نے منظور کرلیا۔ اور معاہدہ پر دستخط کردئے۔ اس طرح کوڑہ، کٹرہ، فرخ آباد، الہ آباد، بریلی وغیرہ بہت سا ملک ہاتھ سے نکل گیا اور ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۲۲ ہزار ۴ سو ۵۰ روپیہ کا نقصان ہوگیا۔ دوسری عجیب و غریب نادانی سعادت علی خاں نے یہ کی کہ ہندوستان پر اپنا سکہ جمانے کے لئے تمام ممالک محروسۂ انگریزی کا اس شرط کے ساتھ ٹھیکہ لینا چاہا کہ کروڑہا روپیہ زر پیشگی دینے کا وعدہ کیا۔ اس کام کے لئے ایک انگریز مسٹر اڈرلی کو لندن بھیج کر بادشاہ اور پارلیمنٹ کے سامنے ٹھیکہ کی درخواست پیش کر دی۔ اسی زمانے میں لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل ہوکر آ رہا تھا۔ اس معاملہ کی سعی و سفارش کے لئے لارڈ کو ایک کروڑ روپیہ بھیج دیا۔ لارڈ ہندوستان آنے لگا تو اس نے سعادت علی خاں کو خط لکھا کہ میں آتے ہی تمہارا کام کردوں گا۔ نواب اس خوشی سے ایسا پھولا کہ اپنے دربار میں اس کا ذکر کر دیا۔ یہ غلطی پر غلطی ہوئی۔ لکھنؤ کا ریزیڈنٹ کرنل بیلی پہلے ہی سے نواب کا دشمن تھا۔ اس نے بھی سن لیا۔ اتفاق سے انہی دنوں میں نواب عارضۂ جگر و استسقا میں مبتلا ہوا۔ غسل صحت کے بعد سواری پر باہر گیا۔ رات کو آکر کھنی مانگی۔ نواب کے سالے رمضان علی خاں نے زہر ملا کر کھنی پیش کردی پیتے ہی زہر سرایت کرگیا اور خاتمہ کر دیا۔ نواب سعادت علی خاں بڑا زندہ دل، شاہانہ مزاج تھا۔ علم و فن اور شعر و ادب کا بڑا قدرداں تھا۔ سید انشا اللہ خاں، مصحفی، مرزا قتیل، رائے گلاب رائے گلشن۔ اسی دربار کے شعرا تھے (باقی بصفحہ ۱۷۴)

۱۔ سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی کی عبارت مقفیٰ ہے۔ شاہنامہ نثر اردو میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مشہور و مقبول نہ ہوئی، حالانکہ سرور کا مخصوص اسلوب تحریر اس میں بھی موجود ہے۔ سہراب و رستم کی آخری جنگ سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(۷) غازی الدین حیدر (وزارت ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ تا ۱۸۱۹ء ۱۲۳۴ھ۔ شاہی ۱۸۱۹ء ۱۲۳۴ھ تا ۱۸۲۷ء ۱۲۴۲ھ) سعادت علی خاں کا فرزند اکبر تھا۔ چند سال وزارت و نوابی کے بعد لارڈ ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر مستقل بادشاہ بنا دیا اور سلطنت دہلی سے تعلق منقطع کر دیا۔ یہ نواب بھی علم دوست تھا۔ اس کے زمانے میں لکھنؤ میں ٹائپ اور لیتھو کے مطبع قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و طبع ہوئیں۔ رجب علی سرور، نقیر محمد خاں گویا، شیخ ناسخ، خواجہ آتش، خواجہ وزیر اسی زمانے میں تھے۔

(۸) نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء ۱۲۴۲ھ تا ۱۸۳۷ء ۱۲۵۳ھ) اس کے زمانے میں شاہی خاندان میں بہت فتنہ و فساد رونما ہوا۔ اس بادشاہ کی محبوب ملکہ نواب قدسیہ بیگم تھی۔ کسی بات پر بادشاہ اس سے بدظن و بد دل ہوگیا، اس نے زہر کھالیا۔ بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا، اور اس نے ماتمی سیاہ لباس پہننے کا تمام رعایا اور اہل خاندان کو حکم دیا۔ بادشاہ کی والدہ بادشاہ بیگم بہو سے ناراض تھی۔ اس نے ماتم کرنے سے انکار کیا۔ بادشاہ ماں سے ناراض ہوگیا۔ اور اس کو الماس باغ میں رہنے کا حکم دیا۔ بادشاہ کا فرزند اکبر مرزا فریدوں بخت عرف مُنّا جان اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے دادی کے پاس رہتا تھا وہ بھی بادشاہ بیگم کے ساتھ چلا گیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو اپنے پاس رکھنا چاہا۔ بیگم نے نہ بھیجا۔ بادشاہ بیٹے سے بھی ناراض ہوگیا، اور اعلان کر دیا کہ فریدوں بخت بادشاہ زادہ ہی نہیں ہے۔ اس طرح ماں بیٹے (بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر) کی رنجش و عناد کو بہت طول ہوگیا۔ آخر میں بادشاہ نے ماں کو راضی کرنا چاہا تو وزیر المالک نے آتش فتنہ کو اور بھڑکا دیا اور کسی طرح صلح نہ ہونے دی نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو زہر دیدیا گیا۔ نصیر الدین حیدر نے بھی اہل کمال کی بہت قدر کی۔ جدید مطابع جاری ہوئے۔ بعض نادر کتابیں عربی و فارسی کی شائع ہوئیں۔

(باقی بصفحہ ۱۷۵)

"دوسرے دن جس وقت تہمتنِ مشرق (آفتاب) آغشتہ بخون سمندِ نیلگوں (آسمان)
پر سوار ہوا، سہراب رستم سے دوچار ہوا۔ آخرکار تہمتن نے نعرہ کیا، کوہ و ہاموں کا جگر پارہ
کیا، اور سہراب کا کمربند پکڑ کے سر سے بلند کرکے زمین پر دے پٹکا، اور فوراً کمر سے
خنجر آبدار نکال اس کے سینہ کو چاک کر دیا۔ سہراب نے آہ سرد دلِ زخمی و پُردرد
سے کھینچی اور کہا افسوس مشتاقِ دیدار پدر، محروم و ناکام پسر، دار ناپائیدار سے چلا،
تہمتن شیر افگن نہ ملا۔ گر اب تو مچھلی بنکر زیر قدم گاؤ زمین پناہ لے جائے گا یا اختر
ہوکر فلک ہفتمیں پر اپنے تئیں چھپائے گا، میرا باپ کہیں منہ نہ موڑے گا، کسی طرح
تجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ رستم نے پوچھا اس کا کیا نام ہے۔ سہراب نے کہا
رستم جہاں پہلوان ہے، اور میری ماں دختر شاہ سمنگاں ہے۔ یہ سنتے ہی دنیا رستم
کی نظر میں تیرہ و تار بن گئی۔"

۲۔ **گلزار سرور**۔ اس کے آغاز میں سرور نے کچھ اپنا حال اور تالیف کتاب کا
سبب بیان کیا ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور رنگین نگاری
سرور کی ہر جگہ خصوصیت ہے۔ لکھتے ہیں :-

بقیہ صفحہ ۱۷۴

(۹) **محمد علی شاہ** (۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء / ۱۲۵۳ھ تا ۱۲۵۸ھ) نصیر الدین حیدر کی وفات ناگاہ کی خبر
پاتے ہی لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ جنرل لو نے نصیر الدین حیدر کے چچا نصیر الدولہ خلف نواب
سعادت خاں کو تخت نشین کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی نصیر الدولہ ملبوس شاہی پہننے میں
مشغول تھا کہ بادشاہ بیگم اپنے پوتے نصیر الدین حیدر کے لڑکے مرزا فریدوں بخت کو لیکر آ گئی۔ اور
اس کو تخت نشین کرنا چاہا۔ دولت خانہ شاہی کا دروازہ ریزیڈنٹ کے حکم سے بند تھا۔ بادشاہ بیگم
نے ہاتھیوں کے ذریعہ سے دروازہ توڑ ڈالا اور فریدوں بخت کو تخت پر بٹھا دیا اور نذریں لینا اور
احکام شاہی جاری کرنا شروع کر دیا۔ ریزیڈنٹ نے آکر بیگم کو سمجھایا (باقی بصفحہ آئندہ)

”یہاں سے نقاشِ ثانی معترف نادانی، گردش دیدہ بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور، رجب علی بیگ سرور، اپنی گذشتہ داستانِ حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چوہتر (۱۲۷۴) ہجری شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا، گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی، اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی دکھائی...... بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی، بقول مشہور لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی تھی، فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی، اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی، ایسی چہک دمک ہوئی کہ حد سے گذر گئی۔ ہر کمالے را زوالے، فلک کو اُجاڑنا، اس کا نام و نشان بنا کے بگاڑنا منظور تھا، وگرنہ نہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ سلطان عالم نے نو برس محمد شاہی کی، اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی بلکہ خیر خواہی کی، قیصر باغ کو غیرت گلزار ارم بنایا تھا، کیا لکھوں دن رات جو لطف اٹھایا تھا۔ خدا جانے کس کمبخت کی نظر اس شہر کو کھا گئی، امیر فقیر سب پر تباہی آگئی...... ہند میں فوج سرکار قدیم نمک خوار، پیادہ اور سوار، شامت اعمال سے پھر گئے، غرباء سے اُمرا تک بلا میں گھر گئے۔ جابجا شور و شر مچایا قتل و غارت سے فساد ہوا، لُچّوں کا کیا بگڑا، ہندوستان اس بکھیڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اُجڑی، پھا ملک ٹوٹا، پھر لکھنؤ لوٹا۔ یہاں تک کہ بے چراغ ہوا، بے بہن و دے پامال خزاں خانہ باغ ہوا۔“

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کہ مداخلت کرنا بیگم کے لئے اچھا نہ ہوگا لیکن اس نے نہ مانا ریزیڈنٹ نے انگریزی فوج طلب کی اور توپوں کے فیر کا حکم دیدیا۔ بادشاہ بیگم کے حامیتی کچھ کام آئے کچھ فرار ہوگئے۔ بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت گرفتار ہوگئے اور نصیر الدولہ محمد علی شاہ کا لقب اختیار کرکے بادشاہ بن گیا۔ نیک دل اور مخیر تھا، لیکن اس کے عہد میں بعض کمینوں کو بہت عروج ہوا، لکھنؤ کی دوسری بے نظیر عمارت امام بارہ حسین آباد اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ بادشاہ نے اس امام باڑہ کے مصارف کے لئے بارہ لاکھ روپیہ انگریزی خزانہ میں جمع کردئے تھے کہ ان کے سود سے مصارف کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ انتظام آج تک بدستور جاری ہے۔ (باقی صفحہ ۱۷۷ پر)

۲۔ **فسانۂ عجائب**۔ یہ سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی سے ان کا
نام زندہ ہے، اردو انشا پردازوں میں ان کا ایک انفرادی درجہ قائم ہے۔

فسانۂ عجائب کی چند خصوصیات یادگار و قابلِ ذکر و توجہ ہیں:۔

(۱) فسانۂ عجائب کی رنگین و مقفّیٰ عبارت اُس زمانۂ قدیم کے طرزِ نگارش سے
جداگانہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس رنگ کی کم سے کم دو کتابیں ممتاز ہیں
فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا، اور تحسین کی نوطرزِ مرصع۔ ان کے گذشتہ نمونوں سے
ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی، عبارت آرائی، عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب اردو قلم
اور علمی شان میں کسی سے کم نہیں۔ یہی حال فسانۂ عجائب کا ہے۔ پھر بھی سرور نے
اس روش کو اعتدال کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ سلسلِ بیان میں کچھ دیر کے لئے قافیے بھی
ترک کر دیتے ہیں، اور ثقیل الفاظ سے روانی و صفائی میں کمی نہیں آنے دیتے۔ اس لئے
فضلی و تحسین کی سی تعقید اور گنجلک کم پیدا ہوتی ہے۔ اور تحسین کی سی ثقالت و معائیت
شاذ و نادر پیدا ہوتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۷۶)

(۱۰) **امجد علی شاہ** (۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ تا ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ) یہ بڑا مذہبی بادشاہ تھا۔ امور مملکت و عدالت
کا اختیار کلی مجتہد العصر کو سپرد کر دیا تھا۔ مجالس عزا و مرثیہ خوانی کا اہتمام پہلے سے زیادہ اس کے
عہد میں ہوا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے کمال کو اسی زمانے میں عروج شروع ہوا۔

(۱۱) **واجد علی شاہ** (۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ تا ۱۸۵۶ء ۱۲۷۲ھ)۔ یہ بادشاہ عیش و عشرت کی طرف
اس قدر راغب تھا کہ بعض کور نمک و پست فطرت لوگوں کو دخل اندازی کا موقع مل گیا اور نظام سلطنت
بگڑنے لگا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے چند بار تنبیہ کیا گیا، کچھ توجہ نہ ہوئی آخر غدر سے
ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کا حکومت انگریزی سے الحاق
کر لیا۔ شاہی اودھ ختم ہوگئی۔ بادشاہ کو کلکتہ کے فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا۔ (باقی بصفحہ آئندہ)

(۲) فسانۂ عجائب کے اسلوب تحریر کو اب کیسا ہی سمجھا جائے اور کسی نظر سے دیکھا جائے، لیکن یہ قدیم زمانے کا محبوب و مقبول انداز تھا اور علم انشا کا کمال گنا جاتا تھا۔ اس لئے اس کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس لفظی آرایش اور علم و قابلیت کی نمائش سے موزوں اور ناموزوں دونوں کام لئے جا سکتے ہیں۔ مرزا سرور کی تحریر میں بھی مناسب و نامناسب دونوں انداز موجود ہیں۔ مثلاً سرور کہیں عربی و فارسی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اسی سال بادشاہ نے الحاق اودھ اور واپسی سلطنت کی داد فریاد کے لئے ایک وفد انگلستان کو ملکہ وکٹوریا کے پاس بھیجا۔ اس وفد میں جناب عالیہ ملکہ کشور، اور مرزا ولی عہد اور مرزا سکندر حشمت (مخاطب بہ جنرل صاحب) اور مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی خاص لوگ تھے اور بہت سے ان کے مصاحب و خادم تھے۔ یہ لوگ انگلستان پہنچے۔ ملکہ سے ملاقات کی، لیکن ساتھ کے کمینہ طبع لوگوں نے ارکان وفد میں اختلاف رائے پیدا کر دیا۔ ادھر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں غدر ہو گیا۔ اور ولایت کے انگریزوں نے الحاق اودھ کو بھی غدر کا ایک سبب قرار دے لیا۔ غرض یہ وفد ناکام رہا۔ واپسی میں فرانس میں ملکہ کشور اور مرزا سکندر حشمت کا انتقال ہو گیا۔ مرزا ولی عہد بادشاہ کے پاس کلکتہ آ گئے۔ بادشاہ قلعہ فورٹ ولیم سے مٹیا برج میں منتقل کر دئے گئے۔ یہاں نسبتہً بہت عیش و راحت اور یک گونہ آزادی نصیب ہو گئی۔ قلعہ میں بالکل قید ہی تھی۔ ۱۸۸۷ء ۱۳۰۴ھ میں مٹیا برج میں انتقال کیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ کو عیش و نشاط کے علاوہ علوم و فنون، صنعت و تجارت میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ قیصر باغ اسی کی یادگار ہے۔ واجد علی شاہ خود شاعر تھا، اختر تخلص تھا۔ کلیہ دیوان غزلیات، تین جلد مراثی، چند مثنویاں اور بہت سے مجموعے نظم و نثر کے تصنیف کئے۔ جن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ دیگر مشاہیر شعر و ادب کے نام یہ ہیں:۔ مرزا رجب علی سرور، اصغر علی خاں نسیم دہلوی، نواب محمد خاں رند، مظفر علی خاں اسیر، آفتاب الدولہ قلق، نظیر حسن اوج، عابد علی کوثر، علی اوسط رشک، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، امانت، برق، بحر وغیرہ

تراکیب، تشبیہ و استعارہ سے محاکات و منظر کشی کرتے ہیں، لیکن ناکام رہتے ہیں۔ یعنی وہ منظر آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ دیکھیے، رات گزرنا اور دن نکلنا بیان کرتے ہیں:-

"جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہاے انجم آشیانہ مغرب میں چھپایے، اور صیاد ان سحر خیز دام بر دوش آئے، اور سیمرغ زریں جناح مطلا بال غیرت لال قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گذری روز ہوا۔"

یا ایک جگہ "سردی کی شدت" دکھانے کے لئے یہ فقرے لکھتے ہیں:-

"آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اوس برگ بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی، دانہ ہاے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔"

اس سے سردی کا سماں پیش نظر نہیں ہوتا۔ لیکن اسی سردی کو جب اسی مقفیٰ انداز میں لیکن واقعات کے ساتھ اور قریب واقعہ تشبیہوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں تو پوری منظر کشی ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"چلّے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی، گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی، سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم فقر پر ہر شخص کے منھ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا، زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا، ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گواہ شرمی شرر تھا، لیکن سردی کو بھی لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔"

(۳) سرور حسب موقع زبان اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی کے استعمال کی مثالیں اوپر مذکور ہوئیں۔ ضرورت پر آیات قرآن مجید بھی تضمین کر دیتے ہیں، مثلاً

"لیکن باین حکومت و ثروت کاشانۂ امید کا چراغ گل، اولاد بالکل نہ تھی، خواہش فرزند در دل، نہونے کی خواہش متصل، حسرت بسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ہر ساعت بر زباں۔ رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وظیفۂ دہاں۔ لڑکے کی تمنا میں بادشاہ مثل گدا دست دراز، ایسا لاپرواہ بے نیاز کی قدرت سے با نیاز۔"

لیکن اس سے آگے جب اس بادشاہ کے ہاں فرزند پیدا ہوتا ہے، اور بادشاہ شہزادہ کا جنم پتر کھلوانے کے لئے نجومی پنڈت کو بلاتا ہے تو سرور پنڈتوں کی مخصوص زبان و اصطلاحات لکھتے ہیں: —

نجومی پنڈت جفرداں حاضر ہوئے، بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی، مہاراج کا بول بالا، جاہ و حشم، مرتبہ دوبالا رہے۔ ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے شہزادہ کا چندرماں بلی ہے، چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے، دیگ تیگ کا مالک رہے، دھرم مورت یہ بالک رہے، جلد راج پر بیٹھے، پرتھمی میں دھوم مچے، ایسی شادی رچے، مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی، سنیچر پاؤں پڑے گا۔ ایک سنکھیر وسوسے کے بن میں ہاتھ آئے گا۔ ترنی کی کھٹ پٹ سے وہ بکن ستائے گا کہ راج پاٹ چھڑا دیس بدیس لے جائے گا ڈگر میں شہزادہ بھٹکے کوئی پاس نہ پھٹکے، ساتھی چھٹیں، اپنے ڈیل سے ڈانواڈول رہے، پھر ایک منکو ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے راہ لگائے، کوئی کلکن سو بھی ہو کشت لگے۔"

(۴) اسی طرح مختلف فنون کی اصطلاحیں، شریف و رذیل کا طرز کلام، اہل بازار واہل حرفہ کی گفتگو وغیرہ مختلف اجزائے فسانہ مناسب زبان و بیان میں ادا کیا ہے۔ اس اعتبار سے فسانۂ عجائب اس مخصوص اسلوب تحریر کی پہلی بہترین و مکمل تصنیف ہے۔

(۵) اصل فسانہ میں کوئی خاص جدت نہیں ہے۔ خرق قیاس واقعات اور

عجائبات جیسے اس سے پہلے داستان امیر حمزہ وغیرہ میں ہیں فسانۂ عجائب میں بھی ہیں۔

(۶) فسانۂ عجائب کو اس اعتبار سے مطالعہ کرنا ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی، کہ یہ داستانی لٹریچر کا جزو ہے۔ اس سے پہلے کم اور اس کے بعد بڑی کثرت سے نہایت طویل و ضخیم داستانیں لکھی گئیں۔ ان داستانوں میں اس کا کیا درجہ ہے؟ پھر فسانۂ عجائب کی تصنیف (۱۸۲۴ء) کے تقریباً چالیس برس بعد اردو میں جدید ناول نگاری کا دور شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں زنانہ ناول مراۃ العروس لکھا، اور پھر پے در پے متعدد ناول تصنیف کیے، اور پھر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ۱۸۷۸ء میں فسانۂ آزاد لکھا۔ ان ناولوں سے فسانۂ عجائب کا کیا مقابلہ ہے؟

(الف) داستانوں میں فسانۂ عجائب کو کوئی نمایاں مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد الف لیلہ اور بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ اور اس کے سلسلے کی ایک الماری بھر داستانیں لکھی گئیں۔ جن میں سے ایک ایک فسانۂ عجائب سے کئی کئی گنی بڑی ہے اور واقعات و نیرنگ و فسوں اور تجربات و مشاہدات کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

(ب) ناولوں کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی فسانۂ عجائب کو کوئی درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ یعنی افراد قصہ کا کیرکٹر، مربوط و مفرد پلاٹ، اشخاص کا مکالمہ، جذبات نگاری جدید ناول کے اصول سے مطابق نہیں ہیں۔ کہیں یہ اجزا درست ہیں، کہیں ناقص، مثلاً "ملکہ مہر نگار" کا کردار مہر و وفا، صدق و صفا، ہمت و استقلال، دانائی و کاردانی صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ فسانۂ عجائب کا مقابلہ نذیر احمد، سجاد حسین، عبدالحلیم وغیرہ کے ناولوں سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سرشار کے فسانۂ آزاد سے اس اعتبار سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے کہ سرور نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اور سرشار نے اپنے تمام فسانہ میں

لکھنؤ کی معاشرت اور سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کا حال دکھایا ہے۔ لیکن سرور کی نقاشی ایسی ہے جیسے نمایش گاہ میں باتصویر پردہ جس پر بازاروں، مجلسوں، مجمعوں کی تصویریں صحیح کھنچی ہوئی ہوں لیکن بالکل خاموش اور بے حس۔ اور سرشار کی مصوری ایسی ہے جیسے متکلم سنیما کے پردے پر چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویریں۔ سرور مختصر طور پر سرسری بیان لکھتے ہیں۔ سرشار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل لکھتے ہیں۔ سرور قصہ اور اس کے عجائبات سے دلچسپی رکھتے ہیں، سرشار قصہ کو چھوڑ دیتے بلکہ بھول جاتے ہیں اور افراد قصہ اور ان کے خصائص طبع و عجائب فطرت کو بیان کرتے ہیں۔ سرور میں ظرافت و شوخی کہیں نہیں، اور سرشار میں ہر جگہ اور ہر وقت ہے۔

(۷) آخر میں سرور کے متعلق یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے فسانۂ عجائب کے دیباچہ میں میر امن دہلوی اور ان کے باغ و بہار پر چوٹیں کی ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے۔ یا اس فسانہ کو منظر نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا، وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا، فصاحت کا دم بھرتا، جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دین و حصہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں کہ مکی اوروں کے ہات پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ صنعت میں نیک بدنام ہوتا ہے؛ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔
مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

حالانکہ میر امن نے کسی کا نام لیکر چوٹ نہیں کی تھی۔ نہ اس زمانہ (۱۸۰۲ء) تک لکھنؤ کا کوئی نثار و مصنف مشہور ہوا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں لکھنؤ میں بھی جو شاعر ممتاز و مقبول تھے (میر، جرأت، مصحفی، انشا، خلیق وغیرہ) وہ دہلی ہی کے تھے۔ میر امن نے

دہلی کے ٹکسال اور مرکزِ زبان ہونے کے سبب سے یہ لکھ دیا تھا۔

"جو شخص دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امرا کے دیکھے، اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشہ اور کوچہ گردی اس شہر کی کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"

بہر حال رجب علی بیگ سرور کا یہ لعن طعن ہنگامہ آرائی کا سبب بن گیا جس سے اردو لٹریچر میں بھی اضافہ ہوا۔ یعنی سرور کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے ایک قصہ "سروشِ سخن" لکھا اور اس میں سرور کا جواب دیا اور الٹے اُلٹے اعتراض کیے، یہ کتاب سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھی گئی۔ اس کے جواب میں اور سرور کے حمایت میں جعفر علی شیون لکھنوی نے سنہ ۱۸۶۲ء میں ایک فسانہ "طلسم حیرت" لکھا، اس میں اہل دہلی کے طعنوں کا جواب دیا۔

"فسانۂ عجائب" کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سنہ دریافت نہیں ہوئے۔ مرزا محمد عسکری صاحب نے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ "سنہ ۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے"۔ اور یہ سنہ سرور کی تحریر سے ثابت کیا ہے۔ اس سے آگے لکھتے ہیں "کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی ..... یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں، "بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی، اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۴۰ھ ہے جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے"۔ یہ بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ اگر ان سنوں کو صحیح مان لیا جائے تو سرور جس سال کانپور گئے اسی سال کے اندر یہ کتاب لکھ لی، اور آخر میں اسی سال کے قطعات تاریخ شامل کر دئے، یہ بالکل قرین قیاس ہے، لیکن

سنہ ۱۲۴۰ھ (مطابق سنہ ۱۸۲۴ء) غازی الدین حیدر کے زمانے کا سال ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت اس سے تین سال بعد سنہ ۱۲۴۳ھ (مطابق سنہ ۱۸۲۷ء) میں شروع ہوتا ہے، پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ "نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی"۔

فسانۂ عجائب کا طویل نمونہ دینے کی ضرورت نہیں، نہایت مشہور، عام و رائج کتاب ہے۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔ ایک مختصر ٹکڑا درج کیا جاتا ہے جس میں عربی و فارسی کی لفاظی کم ہے، روزمرہ و محاورہ زیادہ :-

یہاں تو یہ حیص بیص تھی کہ جان عالم تشریف فرما ہوا۔ عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پُر آب با دلِ کباب غیظ میں آ، تمتما، طوطے سے بحث رہی ہے۔ شہزادہ نے فرمایا، خیر باشد۔ طوطا بولا آج نرا شر ہے، خیر بخیر، اگر چندے حیات اس وحشی کی، و آب و دانہ قفس بینا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کرتا۔ ہرگز جیتا نہ پاتے، اگر پنجرا خالی دیکھو مزاج عالی پریشان ہوتا، بحسرت و افسوس یہ فرماتے ؎

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی۔ شہزادہ سے کہا، اگر میری بات کا طوطا جواب صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ، اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جان عالم نے کہا کچھ حال تو کہو۔ طوطے نے گذارش کی: حضور یہ مقدمہ غلام سے سنیئے، آج جو شہزادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھر کے دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں!

ہو سے بھر فرمایا، تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا، خدا نہ کرے! اس جرم تبیح پر شہزادی کے نزدیک گشتنی،

سو غلتی گردن زدنی ہوں، بقول میر تقی میر ؎

بے جرم تہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو
کچھ بات بُری منھ سے نکلی تھی بھلے کو

جانِ عالم نے کہا۔ تم بھی کتنی عقل سے خالی، حُمق سے بھری ہو۔ تم تو پری ہو، جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہو۔ گو گویا ہے، پھر طائر ہے۔ میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی، آنکھ بدل، روکھی صورت بنائی، اور ٹیں سے بولا، خداوند نعمت جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے۔ اِس نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا، اگر راستی پہ ہوتا گردن کج کئے سیدھا گور میں سوتا۔ یہ سُن کے وہ اور مکدّر ہوئی۔ مثل مشہور ہے، راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔ جانِ عالم نے مجبور ہو کر کہا جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے سچ کہدو۔

محمد بخش مہجور

شرفائے دہلی سے تھے، رسمی علوم میں اچھی دستگاہ تھی، شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ جرأت (متوفی ۱۲۴۵ھ = ۱۸۲۹ء) کے شاگردِ رشید تھے۔ میر و سودا کا زمانہ دیکھا تھا۔ نثرِ اردو میں وہی طرزِ مقفّیٰ ان کو بھی پسند تھا۔ گلشنِ بہاران سے یادگار ہے، اُسی زمانے کے گمنام مصنف ہیں، اس لیے ان کی کتاب میں سے حمد باری تعالیٰ کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ کہ ان کا نام زندہ رہے:-

حمد و سپاس و ثنائے بے قیاس، اس کریم کارساز، بے نیاز بے نیاز بندہ نواز، بے چون و بے چگوں کو۔ کہ جس نے ساتھ ابرِ کرم اور بہارِ قدرت کے گل ہائے گوناگون انسان ضعیف البنیان سے گلشن تکوین کو سرسبز و شاداب کر کے، اپنے تئیں برنگ نکہت ہر غنچہ و گل میں جلوہ گر کیا ہے۔ فی الواقع بقول میاں جرأت کے ؎

اسے دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ
عیاں گل میں نہاں ہے سنگ میں وہ
وہ ہے ہر رنگ میں اور پھر جُدا ہے
خدا ہے وہ، خدا ہے وہ، خدا ہے

نثر کا چوتھا دور

سنہ ۱۸۳۱ء تا سنہ ۱۸۷۰ء
۱۲۴۶ھ ۱۲۸۶ھ

اس سے پہلے اُن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا جو مصنفین فورٹ ولیم کالج کے ساتھ لیکن کالج سے باہر ہندوستان میں اردو نثر کی تصنیف و تالیف کر رہے تھے۔ یہ چوتھا دوران کے بعد کے مصنفوں کا ہے جن کا زمانہ تصنیف غدر (سنہ ۱۸۵۷ء) سے پہلے یا کچھ بعد ہے۔ یہ تیسرے اور چوتھے دَور کی علٰحدگی کسی خاص ادبی و لسانی تغیر کے اصول پر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے انیسویں صدی کا نصف اول بلکہ دو ثلث تقریباً یکساں ہیں۔ زبان دانی کی بے قاعدگی و باقاعدگی دونوں ساتھ ساتھ جاری رہی ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۷۰ء تک، میر امن سے معاصرین غالب تک بے اصول و با اصول دونوں طرح کے لکھنے والے رہے۔ ہم نے فورٹ ولیم کالج کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر اس کو الگ دَور میں رکھا ہے، اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسی زمانے میں اور لوگ بھی اسی شاہراہ پر گامزن تھے۔ بیرون کالج والوں کو اُسی دَور میں لکھ دیا ہے، یہ چوتھا دَور اسی کے سلسلے میں بعد کے لوگوں کا ہے۔

سداسکھ لال

سنہ ۱۸۳۲ء میں اردو عدالتی و سرکاری زبان مقرر کی گئی، لیکن اس سے پہلے سے اہل ہند کی آسانی کے لئے دیوانی و فوجداری و مال گذاری کے قوانین کا اردو میں ترجمہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۳ء / ۱۲۱۷ھ میں گورنمنٹ مغربی شمالی (جس میں موجودہ صوبجات متحدہ بھی شامل تھے) کی طرف سے

"ہدایت نامہ مال گزاری" اردو میں مرتب ہوا۔ یہ قانون کی سب سے پہلی کتابوں میں ہے جو اردو میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد بھی سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۳۴ء میں منشی سدا سکھ لال نے مجموعہ قوانین (ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ) مرتب کیا، جس میں ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک جملہ ایکٹ ہائے مروجہ ممالک مغربی و شمالی تھے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۶۴ء میں مطبع نورالابصار آگرہ میں چھپی تھی۔ بعد کی تین جلدیں بھی اسی مطبع میں ۱۸۶۶ء میں چھپیں۔ اس کے دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں:-

"فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو، فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اردو میں کردہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا، کچھ تصرف نہیں کیا ہے۔"

اس کے علاوہ سدا سکھ لال نے "فن زراعت" کے متعلق ایک کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی اور اس کا نام گنگا کی نہر رکھا۔ یہ ۲۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے۔ ۱۸۵۰ء میں آگرہ میں طبع ہوا۔

تراجم علوم وفنون۔ اس موقع پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت میں یعنی غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہوئی تھیں، اور ان میں سے اکثر طبع ہو گئی تھیں۔ تاریخ و جغرافیہ، مذہب، سائنس، نجوم و ہیئت، معدنیات (اکنامکس)، منطق، طبعیات (فزکس)، فن زراعت، تعلیمات، درسیات وغیرہ موضوعات و مضامین کی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے چند کتابیں بعض پرائیویٹ کتب خانوں میں دستیاب

ہوتی ہیں۔ کلکتہ وغیرہ کی بڑی یا سرکاری لائبریریوں میں اور ریاستوں یا امیروں کے کتب خانوں میں موجود ہوں گی، لیکن لندن کے انڈیا آفس کی لائبریری میں سب کی سب موجود ہیں، جن میں مطبوعات بھی ہیں اور قلمی بھی۔ ان کی تصنیف و تالیف میں ہنود اہل قلم برابر کے شریک ہیں۔ چند مطبوعہ کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ کھیت کرم ۳ حصہ مصنفہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۲ء۔ (فن زراعت)

۲۔ اصول علم انتظام مدن مترجمہ دھرم نرائن۔ مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء۔ (معاشیات)

۳۔ اصول علم طبعی۔ مترجمہ اجودھیا پرشاد و دیوا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء۔ (طبعیات)

۴۔ عجائب روزگار مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء۔ (طبعیات)

۵۔ مرأۃ العلوم مصنفہ ہری درشن لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۴۹ء۔ (طبعیات)

۶۔ اصول قواعد مائیات مترجمہ اجودھیا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء۔ (طبعیات)

۷۔ قانون انطباع (چھاپہ کا فن)۔ مصنفہ سیتل پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء۔ (سائنس)

۸۔ اصول علم ہیئت مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۳ء۔ (نجوم و ہیئت)

۹۔ مختصر دقائق النجوم مولفہ گھنڈ لے، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۵ء۔ (نجوم و ہیئت)

۱۰۔ خلاصۂ نظام آسمانی مرتبہ پنڈت واسی دھر، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء (نجوم و ہیئت)

۱۱۔ جغرافیۂ ہند، مترجمہ پنڈت سوا روپ نراین دیوا روپ نراین، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (جغرافیہ)

۱۲۔ فتح گڑھ نامہ (جغرافیہ ضلع فتح) مرتبہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء (جغرافیہ)

۱۳۔ پند نامہ کاشتکاری مصنفہ موتی لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء۔ (زراعت)

۱۴- ریشم کا کیڑا مرتبہ موتی لال، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۳ء۔ (صنعت و حرفت)

۱۵- بخار کی کل (اسٹیم انجن) مولفہ ایشوری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۵ء۔ (سائنس)

۱۶- ہوا کا بیان مرتبہ بدری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء۔ (علم طبعیات)

۱۷- معدنیات مولفہ جواہر لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۵ء۔ (طبعیات)

۱۸- خلاصۃ الصنائع مترجمہ بھولا ناتھ، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ (سائنس)

۱۹- تسہیل فی جر الثقیل مصنفہ سید احمد خاں (سر سید)، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۴ء (طبعیات)

۲۰- ترجمہ معاشیات مِل مترجمہ وزیر علی، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء۔ (معاشیات)

۲۱- ترجمہ شمسیہ مترجمہ سید محمد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء۔ (منطق)

۲۲- مقاصد العلوم مترجمہ سید محمد میر، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۱ء۔ (طبعیات)

۲۳- علم حکمت (میکنکس) مولفہ چارلس فنک، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۳ء۔ (سائنس)

۲۴- بحر الحکمۃ (اسٹیم انجن) مرتبہ ریورنڈ پارکن، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۷ء۔ (سائنس)

۲۵- توصیف زراعت مرتبہ کلب حسین، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۰ء۔ (زراعت)

۲۶- علم جغرافیہ مترجمہ میر غلام علی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۱ء۔ (جغرافیہ)

۲۷- رسالہ مقناطیس مترجمہ سید کمال الدین، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء۔ (طبعیات)

۲۸- بجلی کی ڈاک مولفہ جے۔ ڈبلیو۔ بیل، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ (طبعیات)

۲۹- اصول جر ثقیل مرتبہ محمد احسن، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء۔ (طبعیات)

۳۰- چائے لگانے کی کتاب، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء۔ (زراعت)

فقیر محمد خاں گویا

لکھنؤ کے رئیس تھے، شاہان اودھ کے زمانے میں فوج کے رسالدار رہے۔ "نواب حسام الدولہ" خطاب تھا۔ گویا تخلص ہے۔ ناسخ اور وزیر دونوں سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مطبع نولکشور میں دیوان طبع ہو گیا ہے۔ ۱۲۶۶ھ ۱۸۵۰ء میں انتقال کیا۔ گویا کی صرف ایک تصنیف ہے۔ ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء میں "انوار سہیلی" کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے کیا۔ انوار سہیلی کے اردو ترجمے گویا سے پہلے اور بعد کو اور لوگوں نے بھی کئے۔ جن میں سے بعض کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی حفیظ الدین نے خرد افروز کے نام سے ترجمہ کیا تھا، اس کے بعد ۱۸۲۴ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری نے ترجمہ کیا۔ لیکن ان سب سے فقیر محمد خاں گویا کا ترجمہ بہتر ہے۔ سرور کی طرح قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں قدامت کا اثر ہے۔ جس سے خواہ مخواہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ تنہا گویا کا قصور نہیں ہے۔ الفاظ کی صحیح و باقاعدہ ترتیب اُس زمانے میں کیا، بہت بعد تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہر مصنف کی تحریر میں بلا استثنا یہی بات ہے۔ سرسید احمد خاں کی تحریر میں تو یہ بے قاعدگی بہت کثرت سے ہے، خود غالب کی سہل ممتنع زبان بھی اس سے خالی نہیں۔ اگرچہ کم ہے۔ نذیر احمد و حالی کے دَور سے یہ عیب بالکل جاتا رہا۔ فقیر محمد خاں گویا نے اپنے ترجمہ میں اصل کتاب انوار سہیلی کے عربی و فارسی الفاظ و تراکیب جو بجی قائم رکھی ہیں۔ اس لئے زبان بالکل آسان نہیں رہی، پھر بھی نہایت خوشنما، دلچسپ اور پُرمعنی ہے۔ گویا نے دیباچہ میں جو اپنی عبارت لکھی ہے اس کا بھی یہی رنگ ہے۔ سبب تالیف بیان کرتے ہیں:۔

> "اب سنا چاہیے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد رشید شیخ ناسخ صاحب کے ہیں، اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعے کا تھا، اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے

زبان ثناگو لی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجیب حکیم بے مثل تھا۔ اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا، بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے مظنہ ہے کہ بامداد الہام غیبی ہو، دالّا رائے انسان ضعیف البنیان کب کنہ کو اس قدر جزئیات عالم کے پہونچ سکتی ہے۔۔۔۔۔"

غرض ان خواجہ تاشوں کی فرمائش سے گویا نے یہ کتاب مرتب کی۔ ترجمہ کے متعلق کہتے ہیں:۔ "برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے، ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا ہے، لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسان نقاش اوّل کا ہے۔ ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔"

بستان حکمت کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دار القضا میں سپرد کرو تا قاضی اس کا حال دریافت کرے کہ احکام سیاست میں جب تک شرائط شرعی تمام نہوں گے کچھ حکم نہ کیا جائے گا۔ دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار بادشاہ سے زیادہ ہے۔ اور کون قاضی، عادل شہریار سے بالاتر ہے۔ الحمد للہ کہ ضمیر منیر بادشاہ آئینہ ہے باصفا۔ بلکہ جام ہے جہاں نما۔ کہ صورت حال ہر ملازم ورعایا کی اس میں ہویدا ہے۔ رباعی سودا

ایوان عدالت میں تمہارے اے شاہ ہے ظلم کو کیا دخل، معاذ اللہ
شیشے کا اگر طاق سے ٹوٹے ہی پاؤں پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اور یہ یقین اتنا جانتا ہوں کہ کشف شبہات اور رفع حجاب میں کوئی چیز برابر فراست بادشاہ جم جاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بنفس نفیس، رائے جہاں آرا کو قاضی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبح صادق کے روشن ہو جائے۔ جیسا کہ حافظ نے فرمایا۔ بیت

عرض حاجت در حریم حضرت محتاج نیست راز کس مخفی نماند بر فروغ رائے تو

شیر نے کہا کہ اے دمنہ اندیشہ نہ کر کہ اس مہم میں جستجو سے تمام کی جائے گی، اور تحقیق اس کام کی اس طرح پر کہ زیادتی اس سے متصور نہ ہو عمل میں آئے گی۔ نظم

جدا کریں گے ہم اس طرح حق و باطل کو ۔۔۔ کہ جیسے دودھ سے گھی نکال لیتے ہیں
نکال لیتے ہیں جس طرح عطر پھولوں سے ۔۔۔ ہر ایک بات کا ہم بھی نکال لیتے ہیں

نیم چند کھتری

اس زمانے میں ہندو اہل ذوق و ارباب علم اردو شعر و سخن اور علم و ادب کی تحصیل، ترویج و تکمیل میں نہایت مستعدی سے کوشش کر رہے تھے، جیسا کہ پہلی فہرستوں اور نمونوں سے دریافت ہوا۔

منشی نیم چند کھتری بھی ایسے ہی ادیبوں میں ہیں۔ فارسی سے "قصہ گل باصنوبر" ۱۸۳۵ء میں ترجمہ کیا۔ اور شائع و مقبول ہوا۔ اس کا نمونہ مولانا احسن مارہروی کی تالیف "نمونہ منثورات" سے نقل کیا جاتا ہے۔ قصہ کے ٹائٹل پیج کی عبارت یہ ہے:-

زبان فارسی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتری کا، نام سے بہ گو، حیرت کے بموجب استطاب لارڈ جارج آکلنڈ صاحب بہادر دام اقبالہ کے عہد میں دار الامارت کی تصحیح سے چھاپا گیا۔

تحریر کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

"بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خورسند نیم چند یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی چیز کو قرار نہیں، اور ہستی پر سب کا مدار ہے، اس کی ذات لایزال کے واسطے بقا، اور باقی سب کو فنا ہے، مگر یک گلستان سخن کہ خزان جہاں اس کے گلوں پر نہیں آتی، چوروں کی چوری، اور رہزنوں کی سرزوری سے یہ دولت کہیں نہیں جاتی، چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے، اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے،

اس کے مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔"

مولوی قطب الدین دہلوی

ان کے والد کا نام محمد محی الدین احراری ہے۔ دہلی کے بہت بڑے عالم و محدث تھے۔ امارت و ثروت بھی رکھتے تھے۔ مولانا حاجی محمد اسحاق دہلوی (مولانا شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے نواسے) کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف میں سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) **ظفر جلیل** اردو ترجمہ "حصن حصین" (مصنفہ قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی متوفی ۸۳۳ھ ۱۴۲۹ء) مولوی قطب الدین نے تاریخی نام رکھا ہے۔ اس سے سال تالیف ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ء) نکلتا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"صبح و شام ہے اس پاک پروردگار کے لئے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی، اور راہ بتائی اپنی فکر کی۔ یا الٰہی درود و سلام بے حد نازل کر خاتم النبیین شفیع المذنبین رسولؐ امین پر، اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر، اور سب پر۔"

(۲) **مظاہر حق** اردو ترجمہ و شرح "مشکوٰۃ المصابیح"۔ اس ترجمہ کا نام بھی تاریخی ہے، اس سے ۱۲۵۴ھ (مطابق ۱۸۳۸ء) نکلتے ہیں۔ یہ مولانا قطب الدین کا نہایت عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یعنی چار جلدوں میں بہت بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں سے زیادہ پر طبع ہوا ہے۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلی جامع و مکمل حدیث شریف ہے۔ اس کا حال خود قطب الدین صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

بعد اس کے مسکین **محمد قطب الدین** شاہجہاں آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نفع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں

مندرج ہیں۔ اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا مخدومنا و مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحاق نواسہ حضرت شیخ عبد العزیز رحمہما اللہ تعالیٰ کے نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا، لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا، مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے، اس لئے اس ہیچمداں نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علٰحدہ کر کے لکھا، اور فائدے مختصر مناسب مقام کے، شروح مشکوٰۃ وغیرہ سے، مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبد الحق اور حاشیہ سید جمال الدین رحمہم اللہ کے، اور سوائے ان کے سے زیادہ کر کے خدمت عالی میں عرض کی، اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے تبرکاً اس میں درج کئے، اور نام اس کا مظاہر حق رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے۔

مولانا قطب الدین کے استاد بزرگوار کا ترجمہ اس سے بھی پہلے کا ہے لیکن اب نایاب ہے، مولانا نے مظاہر حق کے فائدوں میں ہر جگہ اُن شروح و تراجم و حواشی کا حوالہ دیدیا ہے جن سے استفادہ کیا ہے۔ ان حوالہ جات میں کہیں کہیں لکھا ہے۔ "تقریر مولانا"؛ معلوم ہوتا ہے وہ عبارت ان کے استاد مولانا محمد اسحاق کی ہے، لیکن اس میں اور مولانا کی تحریر میں طرز بیان کا کوئی فرق نہیں ہے۔ مظاہر حق میں احادیث کا ترجمہ تو ہر مقام پر ایک ہی اسلوب قدیم کا ہے، لیکن فائدے کہیں بالکل پرانی روش بے قاعدہ کے ساتھ ہیں، کہیں ترتیب الفاظ زیادہ صاف و باقاعدہ ہے۔ ترجمہ و فائدہ کا نمونہ عربی کی حدیث کو چھوڑ کر درج کیا جاتا ہے :-

اور روایت ہے واثلہ بن اسقع سے کہا، فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے کہ طلب کیا علم، اور حاصل ہوا اس کو، ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب،

اور اگر نہ حاصل ہوا اس کو علم، تو ہوگا واسطے اس کے ایک حصہ ثواب سے، روایت کی یہ دارمی نے۔ **ف** دوہرا ثواب، ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا کہ تحصیل علم میں کھینچی ہے، دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا، اور پڑھانے کا گردوں کو، یا ثواب عمل کا کہ علم پر کیا ہے، اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت ہی کا ہوگا۔ بہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہیے۔ اگر حاصل ہوا نور علی نور، ورنہ طلب علم میں مرنا بھی سعادت ہے۔ بیت

گرچہ نتواں بدوست رہ بردن شرط یاری ست در طلب مردن

مفتی صدرالدین آزردہ

والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری، مفتی صاحب دہلی میں ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا محمد اسحاق، مولانا فضل امام خیرآبادی، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مشاہیر علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ غدر سے پہلے انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی میں صدر الصدور اور مفتی تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگایا گیا، گرفتاری اور جائداد کی ضبطی عمل میں آئی۔ لیکن چند روز بعد رہا کر دیے گئے اور جائداد کا بھی ایک حصہ واپس دیا گیا۔ تعلیم و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ "صدر الصدور" ہونے کی حالت میں بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے شاگردوں میں نواب یوسف علیخاں والی ریاست رامپور، سرسید احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی بھی شامل ہیں۔ عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاوی ان کی یادگار رہیں۔ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا۔ اردو میں شاہ نصیر، میر ممنون اور میاں مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کیا ہے۔ اردو کے

شاعروں کا ایک تذکرہ فارسی میں مرتب کیا تھا، لیکن اب نایاب ہے۔ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء میں انتقال کیا۔ مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے خاص تعلقات تھے۔ اور ان صاحبوں سے اردو میں خط کتابت رکھتے تھے۔ اردو کی یہی تحریریں مفتی صاحب کی یادگار ہیں۔ ایک خط کی چند سطریں نمونہ و تبرک کے طور پر درج کی جاتی ہیں، جو "یوپی میں اردو" سے ماخوذ ہیں:-

نامۂ آزردہ بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منفصلوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبۂ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزاروں کاغذوں پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا، اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا۔ دوستوں اور بد عقیدوں کے جھگڑے میں حکم ہونا۔ مجالس شادی و غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا ...."

مفتی سعد اللہ رامپوری خلف رشید مولوی محمد نظام الدین مراد آبادی۔ اصلی وطن مراد آباد ہے۔ وہیں ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ علمائے عصر سے تحصیل علوم کی جن میں مفتی صدر الدین آزردہ بھی ہیں۔ دہلی میں تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ گئے، وہاں تکمیل کر کے مدرسہ شاہی میں مدرس رہے۔ الحاق اودھ (۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء) تک وہیں رہے۔ اس کے بعد رامپور چلے گئے۔

نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم اور منشی امیر احمد مینائی بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا۔ امیر مینائی اپنی تصنیف "انتخاب یادگار" میں مفتی سعد اللہ کے حالات میں لکھتے ہیں: "جامعیت فضل و کمال میں مشہور آفاق، علم معقول و منقول میں طاق، طبیعت ہمہ گیر فکر وقاد، ہندوستان میں ہزاروں کے استاد، مولوی صاحب کی بہت سی تصنیفات ہیں، مطول و مختصر اٹھائیس تالیفات ہیں، ان کتابوں میں بعض ناتمام ہیں، کچھ چھپ بھی گئی ہیں۔ مولوی صاحب برسوں دہلی اور لکھنؤ میں رہے۔ ایک مدت سے اس دارالریاست (رامپور) میں مکان بنوالیا ہے، اہل و عیال سب یہیں ہیں اب یہی مسکن ہے، مرادآباد سے کچھ علاقہ نہیں رہا یہی وطن ہے۔ سرکار فیض آثار (نواب کلب علی خاں والی رامپور) کی قدر دانی سے باعزاز اکرام منصب حکومت مرافعہ عدالتین پر مامور ہیں، نظم و نثر عربی میں بھی دور دور مشہور ہیں کبھی کبھی شعر فارسی کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں۔" مفتی سعد اللہ آشفتہ تخلص کرتے تھے۔

مفتی سعد اللہ صاحب نے بعض عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ فقہ اکبر کا اردو ترجمہ ۱۲۵۵ھ ۱۸۴۰ء میں کیا، اس کا نمونہ یہ ہے:-

"یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں، واجب ہے ہر مسلمان پر کہ کہے صدق دل سے، یقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر، اور جلا اٹھانے پر پیچھے مرنے کے، اور خیر و شر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے، اور حساب ہونا اور تلنا اعمال کا قیامت میں، اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے، اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، عدد سے نہیں، پر اس راہ سے کہ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔"

عباس بن ناصر علی المورخ

اٹھارویں صدی میں زمانہ زیر تحریر (انیسویں صدی کے درمیان) تک مذہبی کتابیں، فقہ اسلام، عقائد اسلام وغیرہ ضروریات اسلامی کے متعلق کثرت سے لکھی گئیں، جیسا کہ مختصر فہرست مندرجہ صفحہ سے معلوم ہوا ہوگا۔ مولوی عباس نے بھی عام مسلمانوں کے فائدے کے لئے ایک رسالہ **صبح کا ستارہ** لکھا۔ اس کے متعلق خود مصنف آغاز کتاب میں لکھتے ہیں :۔

بعد ازاں عباس بن ناصر علی المورخ بن فضل اللہ العلامہ الجا جموی غفر اللہ لہم کہتا ہے کہ سنہ بارہ سو انچاس ہجری میں جب میرے بھائی قاسم علی نے کہ نہایت سخی و شجاع و مجاہد تھا اور میری والدہ نے انتقال کیا، میں نے کتاب دقائق الاخبار کو کہ حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے احوال میں تصنیف کی تھی، متعلق عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا، تا فائدہ اس کا عام ہو جائے، اور ثواب اس کا میں نے ان دونوں کی روح کو بخشا ...... اور اصل کتاب میں میں نے کچھ کمی و بیشی نہیں کی، مگر بعض جگہوں میں بضرورت یا بقصد اختصار، اور نام اس ترجمے کا **صبح کا ستارہ** ہے۔

مترجم جاجمو (آگرہ) کے رہنے والے تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۳۳ء (۱۲۴۹ھ) میں مرتب ہوا، اور ۱۰ شوال ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) کو مطبع مصطفائی شہر کانپور محلہ ٹپکاپور میں چھاپا گیا۔ اس میں موت اور بعدِ موت کا حال لکھا ہے۔ ہر بیان کو آیات و احادیث و اقوال علماء و اولیاء سے مدلل کیا ہے۔ ترجمہ دقائق الاخبار کے بعد مترجم نے اپنی طرف سے چند اختلافی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک مسئلہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے :۔

مسئلہ: حق تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگنا کہ الٰہی بحرمت نبی یا ولی کے میری

حاجت روا کیا رہا ہے، ملا علی قاریؒ نے قواعد الایمان میں لکھا ہے کہ "اگر بحرمت مصطفیٰ گوید شاید چہ در دعائے استفتاح الشہر الحرام والمشعر الحرام وقبر نبیک علیہ السلام ماثور ومروی ست" اور حصن حصین میں صحیح بخاری وغیرہ سے منقول ہے کہ دعا میں توسل بانبیا وصلحا جائز و مستحب ہے۔ اور فتاوی سراجیہ میں ہے کہ "دعا میں بحق فلاں کہنا ابوالفضل کرمانیؒ نے مکروہ لکھا ہے، اس واسطے کہ حق تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق نہیں۔ ولیکن روایات و آثار سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔" انتہیٰ راقم عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ اگلے زمانہ میں معتزلہ کا بہت غلبہ تھا۔ اس واسطے کرمانی وغیرہ نے بحق کہنا مکروہ لکھا ہے۔ تا بخوبی ثابت ہو کہ اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں، اور کسی کا حق نہیں۔ وہ مالک مختار ہے جو چاہے کرے۔ پس منع کرنا اس لفظ کا احتیاطاً تھا، ورنہ اس کے جواز میں شبہہ نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ نے جذب القلوب الی دیار المحبوب میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ کی ماں نے وفات پائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللّٰھم اغفر لھا بحقی وبحق جمیع الانبیاء من قبلی

امام بخش صہبائیؒ

دلی کے رہنے والے، فارسی کے بڑے عالم و محقق تھے، فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ "سہ نثر ظہوری" وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے دلی کالج[1] میں یہ پروفیسر تھے۔ جہاں مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال

---

[1] ۱۸۲۵ء میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مغربی علوم سکھانے کے لئے ایک اسکول کھولا تھا۔ پھر اس کو ترقی دے کر کالج کر دیا گیا۔ دہلی کالج اور قدیم دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۲۷ء سے اس میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی جاری کر دی گئی۔ یہ عجیب بات تھی کہ (باقی صفحہ ۲۰۱)

آشوب وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ سرسید احمد خاں سے صہبائی کے خاص تعلقات تھے۔ انہوں نے آثار الصنادید کی تیاری میں سرسید کو بڑی مدد دی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ہندوستانیوں کو انگریزوں کی زبان سے تو وحشت و نفرت تھی لیکن انگریزوں کے علوم و فنون سیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ پھر بھی چار سال میں یعنی ۱۸۴۳ء میں انگریزی زبان پڑھنے والوں کی تعداد کالج میں تین سو سے کم نہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں کشمیری دروازے کے قریب تھا۔ ریاضی سائنس وغیرہ علوم کی تعلیم لکچروں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس لئے کہ انگریزی کتابیں آسانی سے میسر نہ آسکتی تھیں۔ اور علوم و فنون کے ترجمے اردو میں ہوئے نہ تھے۔ طالب علموں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ بلکہ وظیفے دے دے کر شوق دلایا جاتا تھا۔ علوم کیمیا و طبعیات کے اسباق و تجربات آلات کے ذریعہ سے سکھائے جاتے تھے۔ سائنس کے تجربے اور مشاہدے ہندوستانیوں کے لئے عجیب حیرت و مسرت کا باعث ہوتے تھے۔ اس کالج کا پرنسپل انگریز ہوتا تھا۔ پروفیسر انگریز اور ہندوستانی دونوں قسم کے تھے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر۔ ماسٹر رام کشن، مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ صہبائی کے زمانے میں ایک فرانسیسی ایم فیلکس بوترو پرنسپل تھا۔ (اس کا نام صہبائی نے اپنے ترجمہ حدائق البلاغت میں بوترس لکھا ہے۔ لیکن فرنچ زبان کے قاعدے سے س کا تلفظ نہ ہوگا و اد پڑھا جائے گا) اس فرنچ پرنسپل کی نگرانی میں ایک ادبی و علمی انجمن ۱۸۴۲ء میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے دہلی کالج میں قائم کی گئی۔ اس کے اصلی کارپرداز مولانا صہبائی اور ماسٹر رام چندر تھے۔ اس انجمن نے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ملک زبان کی بڑی خدمت کی۔ پروفیسر رام چندر کی خدمات کا ذکر آئندہ آئے گا۔ پروفیسر رام کشن نے سر ولیم میکناٹن کی قانونی تالیف ”اصول ہندو شاستر“ کا انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اصول حکومت، فن زراعت، فن طب، صرف و نحو زبان انگریزی وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ مولوی کریم الدین پانی پتی بھی دہلی کالج میں پروفیسر تھے، انہوں نے عورتوں کے لئے چند (باقی بصفحہ آئندہ)

۱۸۴۲ء میں مرتب کیا۔ لیکن مستعدان انصاف پسند بہ مطالعہ کے وقت ظاہر ہوگا کہ اس کم استعداد نے مسائل علمی کے لکھنے اور امثلۂ اردو کے فراہم کرنے میں کس قدر سعی کی ہے۔ اور جو کہ یہ مقصود تھا کہ علم بیان اور بدیع اور عروض سے طالبین کو فائدۂ تام حاصل ہو، اس واسطے بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کردئیے تاکہ از بسکہ لفظا بلفظ کے ترجمے میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی، اس لئے ترجمہ میں اس امر کا مقید نہیں ہوا۔"

ترجمۂ حدائق البلاغت کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

صنعت تلمیح۔ یہ اس طرح پر ہے کہ کلام مشعر ہو کسی واقعہ مشہور پر یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہو جیسے شعر سودا کا ؂

دکھلائیے جاکر تو تجھے مصر کا بازار | یہ واں کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسف کے کہ وہ مشہور ہے اور یہ شعر نصیر محمد خاں گویا کا ؂

منہ دکھانا تو کہاں باتیں تھیں اک مجھ تک | لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسیٰ کے قصے کی طرف اشارہ ہے، حق یہ ہے کہ جو لوگ کہ چاشنی انصاف اور مذاق شعر سے بہرہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا۔

اور جیسے یہ شعر ؂

خزاں میں اس لئے ڈالے ہے خاک بر غنچہ | کہ یہ علاج ہے اس کا جسے ہو استسقا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف مسئلہ طب کے۔"

ا؂ مرزا غالب کو یہ شعر بہت پسند تھا، لیکن وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے:۔

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار | لیکن کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ حدائق البلاغت کے حاشیہ پر دسمبر ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور واقع شہر کانپور سے شایع ہوا۔

مولوی مسیح الزماں خلف مولوی نور محمد۔ ۱۸۴۸ء میں تعلیم مکاتب کے لئے ایک کتاب معلم الحساب ملقب بہ مکتب نامہ لکھی، جس میں لڑکوں کے لئے نصائح، حکایات، انشاے رقعات، اور قواعد حساب درج کئے۔ اس میں ایک جنتری بارہ سو برس کی درج ہے۔ کتاب کے صفحہ پر اوپر انگریزی مہینوں کے نام اور نیچے ایک مہینہ کی تاریخیں خانوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ بیچ میں جو جگہ خالی ہے اس میں کاغذ کا گول ٹکڑا لگا ہوا ہے جس پر ایک سو بارہ سنہ عیسوی لکھے ہوئے ہیں۔ اوپر کے کاغذ کا کوئی سنہ کسی مہینے کے سامنے لانے سے نیچے اسی مہینے کی تاریخیں نکل آتی ہیں۔ اس وضع کی جنتریاں ہمارے زمانے میں بہت عام ہیں، لیکن آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کی کتاب میں بہت عجیب و دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

مکتب نامہ دوسری بار ۱۸۵۵ء (۱۲۷۱ھ) میں مطبع نظامی کانپور سے شایع ہوا۔ بطور نمونہ ایک قاعدۂ حساب درج کیا جاتا ہے:-

"**قاعدہ** - ہر اپریل کے مہینے میں جو سنہ فصلی ہووے جب اس پر ساڑھے چھ سو برس اور بڑھائے جاویں تو سنبت بن جاوے گا، جیسے اپریل ۱۸۵۹ء میں سنہ ۱۲۶۶ فصلی ہیں اس پر ساڑھے چھ سو اور بڑھائے، انیس سو سولہ ہوئے، یہی سال سنبت ہے۔"

منشی عبدالکریم لکھنؤ وطن تھا، کلکتہ میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی کے میر منشی تھے۔ ان کو قصے کہانی کی کتابوں میں الف لیلہ بہت پسند تھی۔

ملازمت سے پنشن لینے کے بعد الف لیلہ کے انگریزی ترجمہ سے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اور ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں چھپوایا۔ پھر ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں باتصویر شائع کیا۔ اس کا حال دیباچہ میں لکھا ہے۔ اسی کا اقتباس بطور نمونہ "سیر المصنفین" سے اخذ کیا جاتا ہے۔

"وہ کتاب سوا دو سو رات کی کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بکمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا، میسر نہ آئی۔ آخر کار جب راقم بہ سبب شدت امراض کے بعد تعریہ پنشن بہ بیت السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے، خانہ نشین ہوا، وہ نسخہ تمام وکمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پہنچا۔ راقم نے اس کو اول سے آخر تک بسبب استعداد سمجھنے انگریزی کے دیکھا ازبسکہ نقلیں دلچسپ تھے دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا۔ اور ۱۲۵۸ھ ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا۔ اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اس کی لی، کمتر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جزو تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی، اور طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا، جس کو نہ دیتا وہ خفا ہوتا، اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے تا سب کے ہاتھ آئے۔ اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت مہد پادشاہ جم جاہ، خاقان زمان، ابو المظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلد اللہ ملکہٗ اور وزارت وزیر اعظم، نواب امین الدولہ عماد الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ دام اقبالہٗ کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ھ اور عیسوی ۱۸۴۷ء ہیں۔"

منشی عبدالکریم کی عبارت سادہ ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن ترتیب الفاظ کی بے قاعدگی وہی ہے جو ان سے پہلے ہر جگہ ہے۔

ماسٹر رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد ان کے شاگرد ہیں۔ گارساں دتاسی دسمبر ۱۸۵۲ء کے خطبہ میں رام چندر کے متعلق لکھتا ہے کہ "ان کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا، اس پنڈت کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی ہے۔ یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا، اور اسی کالج میں اس نے انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا، لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا، وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے، جن میں سے ایک الجبرا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں، اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے، اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں، ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کا نام "محبوب ہند" ہے۔ یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے، جس میں اہم مسائل و معلومات وقت پر، اہل ہند کی تعلیمی حالت پر، اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔"[1]

ان کے علاوہ ماسٹر رام چندر نے عجائب روزگار تصنیف کی جو دہلی میں ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی، ایک کتاب اصول علم ہیئت لکھی جو ۱۸۴۸ء میں چھپی، ایک تالیف تذکرۃ الکاملین کے نام سے مرتب کی جو ۱۸۴۹ء میں دہلی سے نکلی، اس کے بعد تین بار مطبع نولکشور میں چھپی۔ ماسٹر صاحب ملازمت

---

[1] منقول از خطبات گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

انگریزی کے بعد ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ہو گئے تھے۔ اور تذکرۃ الکاملین ریاست کے نصاب تعلیم میں شامل ہو گئی تھی۔

تذکرۃ الکاملین میں یونان، روم قدیم، یورپ، ایران، ہندوستان کے مشاہیر علم و فضل کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ نمونے کے طور پر کتاب کے سب سے آخری شخص کے حال کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"**ذکر مہندس بھاسکر کا**۔ یہ شخص بہت بڑا عقلمند اور مہندس ہند میں گزرا ہے، اس کے برابر ذہین اور عاقل اور سچے علم کی پیروی کرنے والا کوئی اور شخص قوم میں نہیں ہوا ہے۔ یہ بزرگ بمقام شہر بنارس میں بیچ ۱۱۵۰ء کے پیدا ہوا تھا۔ اس شخص نے ہمارے شاستر کی غلطیوں کو درست کیا، لیکن اکثر برہمن اس کے قول پر عمل نہیں کرتے، اگرچہ اس کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بڑے بڑے فاضل اور عاقل ہیں وہ اس کے کلام کو کلام پُران پر ترجیح دیتے ہیں۔ کسی شاستر میں لکھا ہے کہ زمین مثل دائرے کے ہے۔ اور کہیں یہ لکھا ہے کہ وہ مثل مثلث کے ہے۔ بھاسکر نے ان لغو باتوں کو رد کیا اور لکھا کہ زمین کی شکل گردی ہے۔ یہاں سے اس کے ذہن کو دیکھنا چاہیے۔ شاستر میں لکھا ہے کہ زمین سانپ کے پھن اور کچھوے اور آٹھ ہاتھیوں پر سہارا پائے ہوئے ہے۔ بھاسکر نے کہا کہ اگرچہ یہ شاستر میں لکھا ہے، لیکن محض غلط ہے۔ اس نے فرمایا کہ زمین ہوا میں ہمارے معبود حقیقی کے ہاتھ میں معلق ہے۔

آغا امانت لکھنوی

سید آغا حسن نام، امانت تخلص، ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے، شاعری مرثیہ گوئی سے شروع کی۔ اس زمانے میں میاں دلگیر لکھنؤ میں مرثیہ کے بڑے استاد تھے۔ ان سے اصلاح لی۔ پھر مرثیہ

چھوڑ کر غزل گوئی شروع کی۔ بیس برس کی عمر میں کسی بیماری سے زبان بند ہو گئی اور دس برس تک گونگے رہے۔ زبان کا کام تحریر سے لیتے تھے۔ اسی حالت میں کربلا گئے۔ وہاں زبان کھل گئی لیکن لکنت باقی رہی۔ امانت شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں استاد مانے جاتے تھے، رشک، برق، بحر، گویا جیسے باکمالوں کے ہمعصر تھے۔ لیکن تمام کلام ضلع جگت، ایہام، مراعاۃ النظیر سے معمور ہے۔ امانت کا منظوم ڈراما یا ناٹک اندر سبھا نہایت مشہور و مقبول ہوا۔ اردو میں یہ اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ دیوان غزلیات اور واسوخت بھی امانت کی یادگار ہیں۔ ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔

امانت نے اپنی منظوم "اندر سبھا" کی توضیح و تشریح نثر میں شرح اندر سبھا کے نام سے لکھی تھی، لیکن وہ گمنام تھی۔ اس کو سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالہ اردو میں شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت اس زمانے کی روش کے مطابق مقفی ہے، لیکن الجھاؤ اور گنجلک نہیں۔ اکثر صاف و رواں ہے۔ اس میں سے "سبب تالیف اندر سبھا" کا اقتباس بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانۂ ازلی، رفیق شفیق، مونس و غم خوار، فدائی جاں نثار، شاگرد اول، موزوں طبیعت، تخلص عبادت، عاشق کلام امانت، انھوں نے ازراہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے، ایسا کوئی جلسہ (یعنی ناٹک) کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہو وے، اور خلق میں شہرت ہو وے، آخرالامر موافق ان کی فرمایش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا، دم بدم شوق زیادہ ہوا، چونکہ یہ جلسہ کنا سب کو مرغوب تھا، مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا، لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا۔ غرض کہ چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ ہجری میں اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجا سے

چار باب، چار دیباں قرار دے کر شروع کیا۔ شہرت گھر گھر ہوئی، اس حملہ کو خبر ہوئی، دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے۔ ہجوم حد سے زیادہ ہوئے، رفتہ رفتہ بعد ہزاراں ہزار شور و فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا مگر اپنے نزدیک بیکار ہوا، کہ کس ریاض سے ایک درخت لگایا، آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا، خیر جو ہوا سو بہتر ہوا۔ اپنا تو یہ قول ہے "تقدیر سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں"۔

منشی چرنجی لال

الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ فلسفہ و ریاضی کا بہت شوق تھا۔ ایک کتاب مصباح المساحت ۱۸۵۴ء میں لکھی۔ اس کے بعد مسٹر ہنری کارتر کی تحریک اور مسٹر چارلس فنک کی اعانت سے علم نفسیات کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی، اور اس کا نام تعلیم النفس رکھا۔ یہ کتاب گورنمنٹ پریس میں ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک فقرہ یہ ہے:-

دو سینین ضمیمہ میں اکثر سرتذہ بہ سبب اس کے کہ ان کو بہ تعلق ذاتی سیر کتب کی عادت تھی، نامور اور مشتہر ہو گئے ہیں؛ اور کبھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی بلا حصول اس عادت کے فضیلت پیدا کرے۔

مولوی ضیاء الدین

خلف شیخ غلام حسن خاں جاگیردار لسبی دارا پور۔ وطن سے دہلی آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ مدرسہ تعلیم المعلمین (نارمل اسکول) میں مدرس مقرر ہوئے۔ علم طبعیات (فزکس) سے خاص لگاؤ تھا، میجر فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی فرمائش سے "اصول علم طبعیات" پر ایک کتاب مخزن الطبعیات دو حصوں میں ترتیب دی، جو لاہور میں ۱۸۶۵ء ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوئی۔ حصہ دوم کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"ارباب بصیرت پر ظاہر ہو کہ جن اجسام میں کشش اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے اجزا بغیر محسوس ہوئے مزاحمت کے متحرک ہو سکتے ہیں، ان کو سیال کہتے ہیں۔ اجسام سخت اور اجسام سیال میں بڑا فرق یہی ہے کہ اجسام سخت کے اجزا کو کشش اتصال متصل اور پیوستہ رکھتی ہے۔"

مرزا غالب دہلوی

اب تک جن مصنفوں کے حالات لکھے گئے ان میں مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جس کے مفصل حالات اور مکمل سوانح حیات علیحدہ یا تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہوں۔ کتنے ایسے ہیں جن کے سنین ولادت وفات، مولد و مسکن، معمولی احوال زندگی بھی نامعلوم ہیں۔ اس لئے ہم بھی زیادہ تفصیل نہ دے سکے۔ مرزا غالب پہلے شخص ہیں جن کی ساری زندگی کے پورے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ اور اس صنف میں شاید وہ اول و آخر شخص ہیں کہ ان کی تصنیف اور ان کی سیرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی مسلسل سوانح عمری نہیں لکھی، لیکن ان کی تمام حیات نہ صرف ان کی تحریروں میں جا بجا نمایاں ہے بلکہ ان کے اسلوب و موضوع نگارش پر اثر انداز بھی ہے۔ غالب کی اس خصوصیت اور ان کے شعر و ادب کی انفرادیت کے سبب سے، ان کی ترتیب سوانح، تجزیۂ سیرت، تبصرۂ کلام، شرح دیوان کے متعلق کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ سب سے پہلے مولانا حالی نے شاگردی کا حق ادا کیا۔ اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، مولانا کی "یادگار غالب"، کے بعد مسٹر غلام رسول مہر کی کتاب "غالب"، مسٹر محمد اکرام کا "غالب نامہ"، منشی امتیاز علی عرشی کی تالیف "مکاتیب غالب"، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا "مقدمہ کلیات غالب"، ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب "غالب"، مرزا محمد عسکری کی "ادبی خطوط غالب"، اور مختلف مصنفوں کی شرح دیوان غالب،

غالب کو سمجھنے کے لئے، اور موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ منشی مہیش پرشاد ایم اے پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس خطوط غالب کے متعلق برسوں سے مستقل ریسرچ (چھان بین) کر رہے ہیں۔ غالب کے متعلق متفرق مضامین کا، جو مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، کوئی حساب و شمار نہیں ہو سکتا۔

بعض کج فہم و تنگ نظر لوگوں کو شکایت ہے کہ غالب کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اردو زندہ زبان ہے، اور یہ اس کی زندگی کا ثبوت بھی ہے اور اس کی قوت کا سامان بھی۔ اہل یورپ نے اپنے مصنفین و شعرا میں سے ایک ایک کے تذکرہ و تبصرہ سے ایک ایک کیا کئی کئی الماریاں بھر دی ہیں۔ یہاں اگر مرزا غالب، میرانیس، ڈاکٹر اقبال وغیرہ پر ایک ایک دو دو درجن کتابیں لکھ دی گئیں تو ابھی الماری کا ایک ایک خانہ بھی پُر نہیں ہوا۔

غالب کا نام و خطاب: اسد اللہ خاں نام، "مرزا نوشہ" عرف، "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" خطاب شاہی، پہلے اسد تخلص تھا پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب اسد اللہ الغالب کی مناسبت سے غالب تخلص کر لیا۔

نسل و نسب: غالب کے آبا و اجداد توران کے ایک ترک تھے، سلسلۂ نسب فریدوں بادشاہ تک پہنچتا ہے۔ غالب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا۔ کہتے ہیں:-

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ایبکیم از جماعت اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

باپ دادا: غالب کے دادا شاہ عالم بادشاہ دہلی (۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ) کے

عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے، بادشاہ کی طرف سے منصب ملا اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں عطا ہوا۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا کی شادی آگرہ کے ایک رئیس خواجہ غلام حسین کی لڑکی سے ہوئی۔ جو میرٹھ میں فوج کے کمیدان (نائب کپتان) تھے۔ عبداللہ بیگ خاں کا قیام اپنی سسرال میں آگرہ رہتا تھا۔ لیکن مختلف ملازمتیں بھی کیں۔ اول نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے ہاں ملازم ہوئے پھر حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کی سرکار میں تین سو سوار کے سردار رہے۔ وہاں سے ترک خدمت کر کے آگرہ آ گئے۔ آگرہ سے الور جا کر ریاست کے متوسل ہو گئے۔ وہیں ایک لڑائی میں قتل ہوئے۔

چچا| غالب کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر کی شادی نواب فخرالدولہ والیٔ لوہارو کے خاندان میں ہوئی۔ نصر اللہ بیگ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار رہے۔ پھر انگریزی فوج میں چار سو سواروں کے رسالدار ہو گئے۔ اور جنرل لارڈ لیک کے ساتھ بڑی فوجی خدمات ادا کیں۔ جس کے صلے میں نواح آگرہ کا پرگنہ "سونک سونسا" بقید حین حیات جاگیر میں ملا۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ سرکار نے جاگیر واپس لے لی۔ اور ان کے وارثوں کے لیے سات سو روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔

ولادت و تربیت| غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) کو آگرہ میں پیدا ہوئے، ان کا مکان آگرہ میں اس جگہ تھا جہاں اب پیپل منڈی کی سڑک پر "کالا محل" واقع ہے۔ غالب پانچ برس کے تھے جو والد کا انتقال ہو گیا۔ چچا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کی، لیکن ابھی آٹھ برس کی عمر تھی کہ چچا نے بھی انتقال کیا۔ اس کے بعد غالب کی تربیت ان کی ننھیال میں ہوئی اور لڑکپن آگرہ میں گزرا۔ ایک بزرگ استاد شیخ معظم سے تعلیم حاصل کی، آگرہ کے مشہور بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبرآبادی سے بھی کچھ پڑھا

شادی | غالب کی عمر ۱۳ برس کی تھی کہ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی، جو نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کے حقیقی بھائی تھے۔ غالب کے چچا کی شادی بھی اسی خاندان میں ہوئی تھی، اسی وسیلے سے غالب کا رشتہ[۵] ہوا۔ نواب الٰہی بخش خاں دہلی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد غالب کی آمد و رفت دہلی میں شروع ہو گئی۔

تحصیل فارسی | اسی عرصے میں ایک شخص ایرانی ملا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ ۱۸۱۱ء میں (حسب تحریر "قاطعِ برہان" مصنفہ غالب) آگرہ آیا، اور غالب کے گھر دو برس رہا۔ یہ شخص "زرتشتی" سے مسلمان ہوا تھا۔ غالب نے اس سے فارسی زبان سیکھی۔ اس شخص ایرانی اور اس سے تحصیل فارسی کے متعلق خود غالب کے بیانات میں عجیب و غریب اختلاف نظر آتا ہے۔ "اردوے معلیٰ" کے متعدد خطوط کے علاوہ ایک مکتوب مرقومہ ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں رئیس رامپور کو لکھتے ہیں:-

"مبدءِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجکو ملے۔ بارے مراد بر آئی، اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے"۔ (از مکاتیب غالب صفحہ ۶۲)۔

---

۵ نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکے نواب شمس الدین احمد خاں کو والیٔ فیروز پور بنا دیا تھا، اور خود گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہ نواب شمس الدین احمد خاں، نواب مرزا داغ دہلوی کے والد تھے۔ اس حساب سے غالب کا داغ سے سسرالی رشتہ تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں ۱۸۳۵ء میں قتل ہوئے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں والیٔ فیروز پور و لوہارو ہوئے۔ ان سے غالب کے خاص تعلقات انس و محبت تھے۔

اس کے برعکس ایک خط میں فرماتے ہیں :-

"مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھکو بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کے لیے ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔"

ان دو بیانوں میں مطابقت نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ دوسرا بیان بطور ظرافت ہے۔ یا یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہے کہ غالب زبان و ادب فارسی میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اور یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلا بیان چند فارسی محاوروں کے سلسلے میں ہے جن کے معنوں میں غالب اور نواب خلد آشیان کے درمیان اختلاف تھا۔ نواب صاحب ہندوستانی مصنفین لغات کے معنوں کو درست سمجھتے تھے۔ غالب اسی خط کے آئندہ سطور میں ان سب فرہنگ نویسوں کو نالائق اور غیر معتبر ٹھہراتے ہیں۔ یہ غالب کی نشتر زنی ہے کہ کسی اہم بات کے لیے شاندار اور فیصلہ کن الفاظ لکھتے ہیں۔ چنانچہ نواب صاحب کا "منہ بند کرنے کے لیے" کہہ دیا کہ "میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے" گویا "حقائق و دقائق زبان پارسی" لطائف تصوف اور اسرار معرفت تھے کہ ایک مرشد کامل نے دو سال میں سارا سلوک طے کرا دیا، یا سینہ سے لگا کر علم لدنی آن واحد میں عطا کر دیا، اور اس سے "نفس مطمئنہ" حاصل ہو گیا۔ بلاشبہہ غالب کو "اس امر خاص میں نفس مطمئنہ" حاصل تھا، اور اکثر ان کی رائے درست ہوتی تھی۔ لیکن یہ بات ان کو کافی مطالعہ کے بعد حاصل ہوئی ہو گی۔ یہ ضرور ہے کہ عبدالصمد ایرانی سے دو سال تک جو فارسی میں گفتگو کی ہو گی، شعر و شاعری کا ذکر و فکر رہا ہوگا، اس سے یک گونہ بصیرت پیدا ہو گئی ہو گی جس نے ذوق سلیم، فکر صحیح، مطالعہ وسیع کے ساتھ مل کر آئندہ رائے صائب کا ملکہ پیدا کر دیا۔

قیام دہلی غالباً ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ء میں غالب آگرہ چھوڑ کر دہلی آ رہے؛ اس لئے کہ نواب خلد آشیاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "میں باون برس سے یہاں رہتا ہوں" (از مکاتیب غالب)۔ لیکن دہلی میں آخر عمر تک کوئی ذاتی مکان نہ بنایا۔ مختلف محلوں میں کرایہ کے مکانوں میں رہا کئے۔ سب سے آخر میں حکیم محمود خاں مرحوم کے مکان کے قریب مسجد کے عقب میں رہتے تھے۔ اس مکان کے متعلق کسی کو لکھتے ہیں:-

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اولاد ہوئی لیکن زندہ نہ رہی۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنالیا تھا۔ عارف اور ان کے بچوں کو اولاد سے بڑھ کر سمجھا۔ غالب کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے مرزا یوسف خاں۔ ان سے بھی بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا یوسف نے کسی مرض سے صحت پائی تو غالب نے کہا تھا:-

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

بھائی نے ۳۰ برس دیوانہ رہ کر آخر ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ زین العابدین خاں بھی دو بچے چھوڑ کر جوانی میں داغ دے گئے۔

دیگر حالات غالب کو چچا کی جاگیر کے عوض سات سو روپیہ سالانہ بحساب باسٹھ روپیہ آٹھ آنہ ماہوار ملتے تھے۔ لیکن اس قدر آمدنی ان کے لئے کافی نہ تھی اور وہ اس کو اپنے حق سے کم بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے اس میں اضافہ کرانے کی غرض سے ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے۔ گورنمنٹ میں اپیل کی، شہنشاہ انگلستان اور انگریز حکام کی شان میں زوردار قصیدے کہے۔ لیکن دو سال رہ کر کلکتہ سے ناکام آئے، اس سفر میں لکھنؤ، بنارس کی بھی سیر کی۔ نوابان اودھ کی مدح میں قصیدے پیش کئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار سے پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوا

لیکن ۱۸۵۶ء میں الحاق اودھ کے ساتھ بند ہو گیا۔

۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ میں دہلی کالج میں "مدرس فارسی" کا جدید عہدہ قائم کیا گیا، اس کے لئے مسٹر ٹامسن نے (جو بعد کو صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہوئے) غالب کا انتخاب کیا۔ اور ملاقات یا امتحان کے لئے بلایا۔ غالب پالکی میں گئے۔ لیکن منتظر رہے کہ صاحب بہادر لینے کے لئے آئیں، وہ غالب کو امیدوار ملازمت سمجھ کر نہ آئے، انھوں نے اپنی کسر شان سمجھی، اور نوکری سے معذرت کر کے لوٹ آئے۔ مولوی امام بخش صہبائی اس عہدے پر لے لئے گئے۔ غالب کو چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اور ہمیشہ کچھ برائے نام بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ ۱۸۴۵ء ۱۲۶۲ھ میں جو کوتوال شہر تھا اس کو غالب سے کچھ عناد تھا، اس نے قمار بازی کے الزام میں غالب کو گرفتار کر لیا اور چھ مہینے کی سزائے قید کرادی۔ لیکن تین مہینے کے بعد خود مجسٹریٹ ہی کی رپورٹ پر رہا کر دئے گئے۔ قید خانہ میں غالب کے ساتھ ہر طرح کی عزت کا سلوک ہوتا تھا، گویا صرف نظر بندی تھی، لیکن غالب کے غیور و حساس قلب پر اس بے عزتی کی ایسی چوٹ لگی کہ وہ خود اپنی نظر سے گر گئے، اور اپنے نزدیک روسا و معززین سے ملنے جلنے کے قابل نہ رہے، چنانچہ ۱۸۵۲ء ۱۲۶۷ھ میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

"سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہو گیا ہوں، بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کر لوں۔"

لیکن لوگوں نے غالب کو ایسا نہیں سمجھا، ہر رئیس دربار شاہ کی نظر میں بھی وہی وقعت رہی جو ہمیشہ سے تھی، چنانچہ ۱۸۵۰ء ۱۲۶۶ھ میں بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ نے غالب کو "تاریخ شاہی" لکھنے کی خدمت پر مامور کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب و خلعت دیا، پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی اور جب ۱۸۵۴ء ۱۲۷۱ھ میں بادشاہ کے استاد

ذوق کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے پھر جب نواب یوسف علی خاں مسند نشیں رامپور ہوئے (۱۸۵۵ء تا ۱۸۶۵ء) تو انھوں نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ کردی۔ جس زمانے میں نواب صاحب اپنے والد کی مسند نشینی سے پہلے، دلی میں اقامت گزیں تھے، تو ۱۸۴۰ء سے پہلے نواب صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ مسند نشیں ہونے کے بعد نواب صاحب نے شاعری شروع کی اور غالب کو استادِ سخن بھی بنالیا، انہی کے مشورے سے ناظم تخلص کیا۔ غدر میں جب بادشاہ دہلی و قلعۂ شاہی سے تعلقات کے سبب سے غالب کی سرکاری پنشن بند ہوگئی تو نواب صاحب ہی کی سعی و سفارش سے تین سال بعد ۱۸۶۰ء میں پھر جاری ہوئی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ غالب نے اس حقیقتِ حال کے اظہار سے اغماض کیا ہے۔ یوسف مرزا صاحب کو ان کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:[1]

"والی رامپور کو اس پنسن[2] کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خداساز ہے بعلی بن ابی طالب علیہ السلام۔"

نواب کلب علی خاں رئیس رامپور (۱۸۶۵ء تا ۱۸۸۶ء) نے بھی غالب کے سو روپیہ ماہوار جاری رکھے۔ ان دونوں رئیسوں کے دربار سے تنخواہ مقرر کے علاوہ بھی صدہا روپیہ وصول ہوتے رہے۔

وفات: ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا، اور حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے خسر کے پائین مزار دفن ہوئے۔ "آہ غالب بمرد" مادۂ تاریخ ہے، جس میں دس

[1] منقول از مکاتیب غالب صفحہ ۵۵۔
[2] غالب پنشن کو سین سے پنسن لکھا کرتے تھے۔

بارہ آدمیوں کو تو ارد ہوا، اور وہ اس وجہ سے کہ آٹھ برس پہلے خود غالب اپنی موت کی آرزو اور پیشین گوئی میں "غالب مُرد" (۱۲۷۷) سے تاریخ نکال چکے تھے۔ اب اس پر لفظ آہ اور حرف بَ کا اضافہ عامۃ الورود تھا۔

اخلاق و عادات | غالب، انسان، دوست، استاد، مربّی، مخدوم، خادم، شہری ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے۔ بہت بڑا حلقۂ احباب رکھتے تھے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں شریک تھے، اور واقعی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ خدمتِ احباب، ہمدردی، فیاضی کا یہ حال تھا کہ اپنی آمدنی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر صرف کر دیتے تھے۔ اسی لئے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ لیکن ہمیشہ قرض کا سخت بار محسوس کرتے تھے، اور جلد ادا کرنا چاہتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے تھے۔ ہر ایک کے ہر حال سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ شاگردوں کے کلام پر اہتمام کے ساتھ اصلاح دیتے تھے۔ باقاعدہ جواب دینے کا ایسا التزام تھا کہ بیماری، ضعف، معذوری میں بھی لیٹے لیٹے لکھ یا لکھوا دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ مرنے سے ایک روز پہلے کئی پہر کے بعد بیہوشی سے افاقہ ہوا تو نواب علاء الدین احمد خاں کو جوابِ خط لکھوایا، اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا۔ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا"۔ فراخ حوصلہ ایسے تھے کہ کسی سائل کو دروازے سے خالی نہ جانے دیتے تھے۔ ایک بار لفٹنٹ گورنر کے دربار سے سات پارچہ کا خلعت اور تین رقوم جواہر لیکر آئے، جانتے تھے کہ چپراسی اور جمعدار انعام مانگنے آئیں گے، اس لئے گھر آتے ہی خلعت و جواہر بازار بھیج دئے۔ چپراسی آئے تو اُن کو بٹھا لیا، بازار سے ان چیزوں کی قیمت آئی تو انعام دے کر رخصت کیا۔ نہایت متواضع، ملنسار، بے تعصب، زندہ دل آدمی تھے۔ ہندو مسلمانوں سے یکساں تعلق اور برتاؤ تھا۔ ان کے خطوط کے مکتوب الیہم میں منشی ہرگوپال تفتہ، ماسٹر پیارے لال آشوب،

منشی بہاری لال مشتاق، بابو ہرگوبند سہاے، منشی شیونراین وغیرہ کتنے ہندو شامل ہیں۔ منشی ہرگوپال کو مرزا تفتہ کہا کرتے تھے۔ ان کے نام ۱۲۳ خطوط ہیں، اتنے کسی دوسرے کو نہیں لکھے۔

علم وفضل اور سخن فہمی | غالب کو مطالعہ کتب سے بیحد شوق تھا۔ لیکن کتاب خریدتے نہ تھے، کتب فروشوں سے کرایہ پر منگا کر پڑھتے تھے۔ شعر وادب، اخلاق وتصوف، طب وحکمت، قافیہ ونجوم سے بہت دلچسپی تھی، ان علوم وفنون کو خصوصاً ادبیات و تصوف کو کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ درسیات رسمی کی تعلیم مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن ان کے فہم دراک، ذہن وقاد اور ذوق نقاد نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ شعراے عجم کے کلام پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کے ذوق سلیم اور ذہن متوازن نے یہ چیلنج دے دیا تھا:- "بہ دریدہ گر اینجا بود زباں دانے" اور اسی سبب سے اپنے معاصرین میں سے کسی کو فارسی و اردو میں اپنا ہم پایہ نہ گردانتے تھے۔ مومن وذوق سے خاصی چوٹیں چلتی تھیں۔ لیکن چونکہ حقیقی شاعر اور صحیح سخن فہم تھے، اس لئے شعر کو شاعر کی ذات سے الگ کر کے بھی دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ مومن و ذوق کے ان اشعار کو بیحد پسند کرتے تھے:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ——— جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ——— مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوق)

مومن کا شعر سن کر فرمایا تھا کہ "کاش مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا۔" مومن و غالب میں ایسی چشمک تھی کہ دونوں ایک مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے، پھر بھی غالب مومن کے قدردان تھے۔ مومن کے انتقال (۱۸۵۱ء) پر یہ رباعی کہی تھی:-

شرط است کہ بہرِ دل خراشم ہمہ عمر ——— خونابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر

چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر — کافر باشم اگر بہ رنگِ مومن

ظرافت | شوخی و ظرافت غالب کا وہ چمکتا ہوا جوہر تھا، جس کی آب و تاب آج تک باقی ہے۔ ان کے خلق و عادت کی یہ خوبی اُن کی تمام زندگی پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ بات بات میں شوخی، اور فقرے فقرے میں ظرافت تھی۔ ان کی مہر و محبت، سخاوت و تواضع کی اب صرف یاد رہی یاد باقی ہے، کوئی اثر و نتیجہ جاری و باقی نہیں، لیکن ان کی شوخی و ظرافت آج بھی ویسا ہی ہنساتی اور خوش کرتی ہے جیسا ان کی زندگی میں ان کے مخاطب و مکتوب الیہ کو خوش کرتی تھی۔ (غالب کے لطیفے "یادگارِ غالب" وغیرہ میں دیکھنے چاہئیں) آج کل مزاحیہ نگاری ایک خاص علم و فن بن گئی ہے، لیکن یہ سب "عقلی مزاح" ہے، اور غالب کی "فطری ظرافت" تھی۔ غالب کو اپنی اس فطرت سے بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ طبعی زندہ دلی کے سبب سے وہ غم و الم کو آسانی سے جھیل جاتے تھے، اور مصیبت کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی بعض نازیبا باتیں "مذاق" کے پردے میں چھپ جاتی تھیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ہنسی ہنسی میں بعض کام بنا لیتے تھے۔ ایک دن غدر کے بعد تحقیقات کے لئے غالب کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے، اس نے ان کا حلیہ دیکھ کر پوچھا، "تم مسلمان ہو؟" یہ بولے، "حضور آدھا" کرنل نے کہا "کیا مطلب ہے؟" بولے، "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا!" ایک اور موقع پر کہا تھا کہ "میں نے کسی دن نماز نہیں پڑھی اور کسی دن شراب نہیں چھوڑی، پھر سب مجھے مسلمان کیوں سمجھتے ہیں؟" یہ باتیں اصل میں غالب نے جان و آبرو بچانے کے لئے ڈر سے کہی تھیں، لیکن شوخی و ظرافت کے رنگ میں کہیں، اور واقعہ بھی یہی تھا، اس لئے ان کا نازیبا ہونا مخفی و غیر محسوس رہا۔

شراب و کباب | غالب شراب پیتے تھے، لیکن اس عیب کو چھپاتے نہ تھے

علانیہ پیتے تھے، اور اس گناہ کا احساس رکھتے تھے۔ آم کا بیحد شوق تھا۔ آموں کی کسی نے صفت پوچھی تو کہا، "بہت ہوں اور میٹھے ہوں"۔ کھانے میں شامی کباب خاص طور پر پسند تھے۔ جب اور کچھ نہ کھا سکتے تھے تب بھی کباب ضرور کھاتے تھے۔ ان تینوں چیزوں کا اپنے خطوط میں بار بار ذکر کیا ہے۔

بعض عجیب باتیں | غالب کے حالات میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو اُن کے اخلاق سے مخالف رکھتی ہیں۔ غالب غیور تھے، خود دار تھے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ دہلی کالج کی ملازمت کا ارادہ اپنے معیارِ عزت کو پیش نظر رکھ کر ترک کر دیا، اور پچاس روپیہ ماہوار کی آمدنی سے قطع نظر کر لی۔ لیکن دوسرے موقعوں پر تحصیل زر کے لئے جد وجہد اور الحاح و زاری میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ غدر سے پہلے پنشن کے اضافہ کے لئے کلکتہ کا سفر کیا، اور انگریز حکام کی مدح میں فارسی قصیدے کہے۔ یہ کوشش نامناسب نہ تھی، لیکن قصیدہ خوانی، اور اس حد تک عجیب تھی۔

پھر غدر کے بعد جب پنشن بند ہو گئی، تو اس کو جاری کرانے اور دربار و خلعت کو بحال کرانے کی خاطر مدح خوانی و قصیدہ سرائی کی کوئی حد نہ رکھی۔ ملکہ وکٹوریا، گورنر جنرل وائسرائے، لفٹنٹ گورنر، کمشنر وغیرہ کوئی انگریز حاکم جس کو پنشن کے معاملے سے ذرا سا بھی تعلق تھا، ایسا نہ رہا جس کی تعریف میں قصیدہ یا قطعہ نہ کہا ہو۔ دونوں موقعوں کے لئے فارسی کے ۲۵ قصیدے اور قطعے کہے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے خطوط میں پنشن بند ہونے کی حسرت، اجرا کی ضرورت، آرزو، توقع، انتظار، بیقراری کے جذبات جیسے اور جتنے جابجا ظاہر کئے ہیں، وہ بجائے خود عجیب و دلچسپ ہیں۔ غالب کے قدیم مجموعات خطوط میں بھی یہ مضامین ہیں، لیکن اب "مکاتیبِ غالب" میں رئیسانِ رامپور کے نام غالب کے خطوط شائع ہو جانے سے ان واقعات پر اور زیادہ روشنی پڑ رہی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ غالب اجرائے پنشن کے لئے نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر

سے سفارش چاہتے ہیں۔ نواب صاحب اپنے استاد کی تعمیل ارشاد کرتے ہیں، اور غالب کو اطمینان دلانے کے لئے لکھتے ہیں کہ "ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذی شان سے تذکار محامد و مدائح ذاتی و صفاتی آپ کا، عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدردانی سرکار دولت مدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں پیشگاہ گورنمنٹ سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا"۔ جب پنشن جاری ہونے کا حکم آتا ہے تو غالب جانتے ہیں کہ اس کامیابی میں نواب صاحب کی کوشش و سفارش شامل ہے۔ اور ایک خط میں نواب صاحب سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں "جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالم غیب میں آپ کا اقبال مجھکو مدد دے رہا ہے"۔ لیکن پنشن وصول ہونے کے بعد جب لوگ ان سے یہ بات پوچھتے ہیں تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ "والی رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں"۔

"مکاتیب غالب" کی اشاعت نے غالب کی سیرت کا ایک نیا باب کھول دیا ہے، یا جو باب پہلے مجمل تھا اب اس کی شرح شائع کر دی ہے۔ غالب کے دوستوں میں بعض رؤسا و جاگیردار بھی تھے۔ اور وہ ہمیشہ ہر موقع پر امداد کرتے رہتے تھے، لیکن ان میں سے نواب ضیاء الدین خاں اور نواب علاء الدین خاں بھی، جن سے خاص الخاص مراسم و تعلقات تھے، ایسے نہ تھے کہ بے تحاشا دیتے، اور غالب کی ضرورتیں اسی کی متقاضی تھیں۔ خوبی تقدیر سے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں رئیسان رامپور کے بعد دیگرے ایسے قدردان مل گئے جو اپنے آپ کو ان کا شاگرد سمجھتے تھے، اور اس قدر عزت کرتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی۔ ان بزرگوں سے طلب زر کے لئے غالب کی الحاح و التجا، اور حسن طلب یا قبح سوال کے اسالیب و تراکیب، عجائب فطرت بھی ہیں، اور نوادر ادبیت بھی۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مکاتیب غالب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

یہاں مثالاً بعض فقرے نقل کئے جاتے ہیں ۔

نواب یوسف علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں :۔

(۱) "سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مشاہرہ ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پونہچی، اور روپیہ وصول میں آیا، اور صرف ہو گیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ بعد اس مشاہرہ مقرری کے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجکو اور بھیج دیجئے گا تو چلا لیجئے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔"

(۲) "یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لیکے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ ڈھائی سو[1] روپیہ جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں سے لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں۔"

نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں :۔

(۱) "پیر و مرشد! حضرت فردوس مکان (یعنی نواب یوسف علی خاں) کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر نہیں بنتی، دو سو پچاس کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی ..... یہ رسم بُری نہیں ہے، اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔"

(۲) "حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے، اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔"

---

[1] نواب صاحب نے اپنے چھوٹے لڑکے صاحبزادہ حیدر علی خاں کی شادی کے موقع پر ۱۲۵ روپیہ تورہ و خلعت کے بجائے بھیجے تھے۔

(۳) "ماہ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کیا کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے پابہ رکاب فقیر کو روپیہ مل جائے، تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے۔"

ان محسنانِ رامپور کی شان میں قصیدے تو چار پانچ بھی نہیں، اور یہ مکتوبات کی مدح خوانیاں کثیر و طویل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ غالب نواب خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) کے دعوت نامہ پر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رامپور پہنچے۔ نواب صاحب نے ۷ر نومبر کو ایک ہزار روپیہ عطا کئے۔ ۲۸ر نومبر کو غالب مرزا تفتہ (منشی ہرگوپال) کو رامپور سے خط لکھتے ہیں، لیکن اس عطیہ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ مزید بخشش کی آرزو لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"میں نثر کی داد و نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا۔ سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔"

دسمبر میں نواب صاحب نے دو سو روپیہ زادِ راہ کے لئے مرحمت کر دئے۔

غالب میں یہ بات بھی بڑی دلچسپ تھی کہ کسی ہندوستانی کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے، خصوصاً اپنے زمانے کے اور اپنے زمانے سے قریب کے شعرا و مصنفین فارسی کو تو بالکل ہیچ و پوچ سمجھتے تھے۔ ان میں بھی ہندو اہل قلم سے نہایت بیزار تھے۔ خاصکر جب خود ان کے مقابلے میں کسی ہندی یا ہندو کا نام کوئی شخص لیتا تھا تو جل جاتے تھے، اور بڑی تحقیر سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ مرزا قتیل، مولوی غیاث الدین مصنف غیاث اللغات وغیرہ سب کو نالائق سمجھتے تھے۔

۵ے زین العابدین خاں عارف کا چھوٹا لڑکا۔ غالب نے اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کو متبنیٰ بنایا تھا۔ حسین علی خاں غالب کی وفات کے بعد ریاست رامپور میں ملازم دربار ہو گئے تھے۔

سراج الدین علی خاں آرزو کی "برہانِ قاطع" کی قطع و برید کا تو ایک ہنگامہ برپا رکھا۔
بعض اور فرہنگ نویسوں کے متعلق نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں :-

میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری۔ شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی عقلائے
عجم میں سے نہیں، ہندان کا مولد، ماخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا قیاس۔
ٹیک چند، ورستیا لکو ٹی لال ان کے پیرو، سبحان اللہ، ہندی بھی اور ہندو بھی!
نور علی نور !!

مولوی امام بخش صہبائی غالب کے ہم عصر اور دوست تھے اور فارسی کے بڑے
مشہور و مستند فاضل تھے غالب ان کو بھی کچھ نہ سمجھتے تھے۔ خانِ آرزو کی لغت
"برہانِ قاطع" کی غلطیاں ثابت کرنے کے لئے غالب نے "قاطع برہان" لکھی۔
غالب کے جواب میں کسی شخص نے "ساطع برہان" شائع کی۔ اس کے مصنف
رحیم بیگ کے متعلق غالب لکھتے ہیں (سیاح نامی شاگرد کے نام کے خطوط کا یہ اقتباس ہے):۔

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مُلّائے
کتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا
ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے...... کتاب پڑھ نہیں سکتا،
سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا۔ لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے
ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ
مولوی الٰہی بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھنے کو اپنے
کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا
تلمذ موجب عز و وقار ہو۔[52]

---

۵۱ اردوئے معلیٰ (مجموعہ رقعات غالب) بحوالہ مکاتیب غالب

۵۲ عودِ ہندی (مجموعہ رقعات غالب)

اسی کتاب کی بحث کے سلسلے میں ایک اور جگہ غالب نے مولانا صہبائی پر اس سے زیادہ سخت حملہ کیا ہے، مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" کو ایک رقعہ (مطبوعہ عود ہندی) میں لکھتے ہیں :۔

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو "امام المحققین" خطاب دیا ہے، کیتے محققین نے آپ کو (یعنی مولوی امام بخش کو) اپنا امام مان لیا ہے؟ ...... اگر حضرت (یعنی رحیم بیگ) بنحو تو فیق ثانی بصیغہ تثنیہ امام المحققین کہتے، تو ایک امام ہیر وامام (آپ) اور نراین داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

غالب کا مقصود یہ ہے کہ امام بخش صہبائی سب محققوں کے امام تو ہو نہیں سکتے۔ دو محققوں کے امام ہو سکتے ہیں۔ ایک رحیم بیگ کے، دوسرے نراین داس تنبولی کے۔ صہبائی اس زمانے میں زندہ نہ تھے ورنہ ان فقروں کا مزہ لیتے۔

غالب کا مذہب | بیسویں صدی سے پہلے اہل ہند کی ذہنیت ایسی نہ تھی کہ تذکرہ و تاریخ میں کسی مشہور شخص یا شاعر و مصنف کے مذہب و عقائد کے متعلق بحث روا رکھی جاتی۔ لیکن عصر حاضر میں تقلید فرنگ اور تحقیق و تنقید کے رواج نے اس کی اجازت دیدی ہے۔ اہل یورپ اپنے مشاہیر کے متعلق ذرا ذرا سی بات کی کرید کرتے ہیں۔ ایک سال ولادت یا وفات کو متعین کرنے کے لئے دلیلوں پر دلیلیں لاتے ہیں اور صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ اسی طرح عقائد و رجحاناتِ مذہبی کے ایک ایک پہلو کو روشن کرتے ہیں۔ اور یہ محض علمی تحقیقات ہوتی ہے، عناد و فساد مقصود نہیں ہوتا۔ غالب کے مذہب پر بھی اسی طرح نظر ڈالنی چاہیئے۔ ان کے لئے اپنا پسندیدہ مذہب ثابت کرنے کی کوشش تاریخی و علمی نظر میں غیر مستحسن ہے۔ ان کا کوئی مذہب ثابت ہو یا کوئی مذہب بھی ثابت نہ ہو، مورخ و نقاد یا شاعر و ادیب کے نزدیک ان کا پایۂ کمال غیر متزلزل رہنا چاہیئے۔ غالب کے متعلق اس زمانے میں اس امر خاص

پر بھی بحثیں ہوئی ہیں، مختلف مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں، اور وہ ہمارے پیش نظر ہیں۔ تاریخ و تذکرہ اور تنقید و تبصرہ کے ذریعہ سے لوگوں نے غالب کے لیے مختلف عقائد ثابت کیے ہیں، یعنی: تفضیلی، مائل بہ تشیع، شیعہ، شیعہ غالی، نصیری، صوفی، چشتی و نظامی، اور بے دین و لامذہب۔ اور ان عقائد کے لیے خود غالب یا غالب کے دیکھنے والوں کے بیانات دلیلوں میں لائے گئے ہیں، تفصیل کی گنجایش نہیں، مختصر طور پر ہماری رائے و تحقیق یہ ہے:

غالب کو بے دین و لامذہب ان کے مختلف و متضاد اقوال کی بنا پر کہا گیا ہے، کہ کبھی نصیری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کبھی شیعہ ہونے سے بھی انکار ہے۔ کبھی اپنے آپ کو صوفی صافی بتاتے ہیں۔ کبھی خلفائے راشدین سے بھی بیزار ہیں۔ جس کا ایسا مذہب ہو۔ اس کا کوئی مذہب نہیں۔ لیکن غالب پر یہ الزام لگانا انتہا درجہ کی جسارت اور محض عناد ہے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ غالب شاعر بھی تھے اور ظریف بھی، دنیا دار بھی تھے اور رند مشرب بھی۔ ایسا شخص جیسا موقع دیکھتا اور ضرورت سمجھتا ہے کبھی بطریق انبساط، کبھی بطرز شاعری، کبھی بتقاضائے بشریت جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے، لیکن دوستوں کے نجی خیالات اور اصلی معتقدات نہیں ہوتے۔ اگر اس طرح کے مواقع و اقوال کی گرفت کی جائے تو نماز روزے کے لطیفوں پر بھی غالب کو کافر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ فتوا سے کفر نہ کہ عقل کا ثبوت ہوگا۔ اسی طرح اگر غالب نے یہ کہا:

منصور فرقۂ علی اللّٰہیاں منم آوازۂ انا اسد اللّٰہ در افگنم

تو اس کو دعوائے نصیریت سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ مضمون ایسا سوجھا اور اس میں انا اسد اللہ ایسا معنی خیز تھا، کہ اگر اس سے شرک جلی بھی لازم آتا تو غالب کہنے سے باز نہ رہتے۔ اور بے شک کہنا چاہیے تھا۔ ایسے شعر اتفاق سے پیدا

ہوجاتے ہیں کہ نوادرِ شاعری میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ "صوفی" ہونے کا غالب نے بار بار دعویٰ کیا ہے، اور اپنے آپ کو چشتی نظامی بھی بتایا ہے، یعنی لکھا ہے :-

"شاہ محمد اعظم صاحب خلیفہ تھے مولانا فخرالدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اسی خاندان کا۔"

مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بزرگ تھے۔ غالب کے آباؤ اجداد سب سُنّی تھے۔ ان کی بیوی سُنّی تھیں، ان کی سسرال والے (جاگیرداران لوہارو) سُنّی تھے۔ اور ان میں سے اکثر اسی خاندان کے مرید و معتقد تھے۔ اس لیے غالب بھی اسی خاندان کے مریدوں تو عجب نہیں۔ لیکن غالب کا اپنے آپ کو صوفی صافی کہنا اصطلاحی معنوں میں نہ تھا، بلکہ بطور رسمی ورد تھا، "ولی اللہ" ہونے کا دعویٰ نہ تھا، بلکہ یہ مقصود تھا کہ :-

"آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل"

غالب نے تصوف کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا، اس کے مسائل ذہن نشین تھے، اصطلاحیں بر زبان تھیں، باتیں کرنے اور باتیں بنانے کا بہت شوق تھا، سخن آرائی اور سخن پروری کی بڑی مشق تھی۔ اسی کا اثر ان کی باتوں اور ان کی شاعری سے نمایاں ہے فارسی و اردو کلام میں تصوف کے مسائل بہت لکھے ہیں، لیکن ان میں تصوف کی زبان ہے، صوفی کا دل نہیں۔ خواجہ میر درد اور غالب کے متصوفانہ کلام کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درد دل سے کہتے ہیں، اور غالب زبان سے۔ درد اُس عالم میں پہنچے ہوئے ہیں، اور غالب کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غالب "حقیقتِ حقّہ وحدتِ وجود" کے بڑے قائل ہیں، اور فرماتے ہیں کہ

"زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لا موجود الا اللہ ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں"

لیکن یہ کہنا ایسا ہے جیسا نواب مرزا داغ دہلوی کہتے ہیں :-

"بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے"

حقیقت یہ ہے کہ غالب چاہے "صوفی" نہوں، لیکن صوفی ہونے کا جو ماحصل ذہنیہ ہے ، بلکہ طریقت جس چیز سے عبارت ہے . یعنی بقول شیخ سعدی :-

طریقت بجز خدمت خلق نیست به تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اس میں غالب کامل تھے اسی صفت کے سبب سے عابد پر عالم کو اور زاہد پر خادم خلق اللہ کو ترجیح دی گئی ہے ۔ غالب کی تمام زندگی آئینہ ہے ، اور وہ سب کی سب "خدمت خلق" کے لئے وقف ہے ۔ جس میں اپنے پرائے سب شامل ہیں ، اور جو دلی سے بنگال و گجرات اور پنجاب و دکن تک جاری ہے ۔

غالب کے مذہب کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں :-

"مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو بعد رسول خداؐ کے بہ تمام اُمت سے افضل جانتے تھے"

مولانا آزاد دہلوی (صاحب آب حیات) کی رائے ہے :-

"مگر ان راز و تصنیفات سے یہی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا ، اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا ، نہ کہ تبرا و تکرار میں"

لیکن غالب کا ایک فقرہ اس سے زیادہ کا بھی پتہ دیتا ہے ، فرماتے ہیں :-

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں ، مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں ختم المرسلینؐ کا شریک گردانتے ہیں ۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر جانتے ہیں"

"ابوالائمہ" سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور جن بزرگوں کو حضرت علی کا ہمسر مانا جاتا ہے ان کو "نومسلم" کہا ہے، اور جو لوگ مانتے ہیں ان کو "مشرک" ٹھہرایا ہے۔

تصانیف فارسی | غالب نے آخری بادشاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر کے حکم سے ۱۸۵۰ء ۱۲۶۶ھ میں خاندان تیمور کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کا نام "پرتوستان" تجویز کیا تھا۔ لیکن پہلا حصہ تمام ہوا تھا کہ غدر ہوگیا۔ یہ حصہ "مہر نیمروز" کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ اس میں تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کے حالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ ظفر تک کی تاریخ ہوتی لیکن لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس حصے کا نام غالب نے "ماہِ نیم ماہ" تجویز کیا تھا۔ اس ترکیب پر ان کو بڑا ناز تھا۔ دوسرے رستخیز بیجا پر بہت فخر کرتے تھے۔ یہ ہنگامۂ غدر کا مادۂ تاریخ ہے، اور بیشک بے مثل ہے[۱]۔ (۲) دستنبو، اس میں غدر کا حال لکھا ہے۔ خود غالب کا بیان یہ ہے: "گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔ اور اس میں صرف اپنی سرگذشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔" (۳) پنج آہنگ میں فارسی انشاپردازی کے نمونے ہیں۔ (۴) کلیاتِ نظم غالب، بقول غالب "ایک فارسی دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا ہے"۔ اس میں قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات، سب کچھ ہے۔ (۵) سبد چین میں چند فارسی قصائد و غزلیات و قطعات ہیں۔

---

[۱] "رستخیز بیجا" تخرجہ کے ساتھ تاریخ ہے۔ تخرجہ کا عیب جن تاریخی مادوں میں حسن بن گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ رستخیز کے اعداد (۱۲۷۷) ہیں۔ ان میں سے (بجا) کے چار عدد نکالے جائیں تو ۱۲۷۳ھ پیدا ہوتے ہیں، یہی غدر کا سال ہے۔ "بیجا" کہکر تخرجہ (تفریق) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "رستخیز بیجا" (یعنی بے محل قیامت) غدر کے لئے کس قدر موزوں لفظ ہے۔ غالب کی دوسری تاریخ "غدرِ ہندی" ۱۲۷۳ھ بھی خوب ہے۔ لیکن پہلی اس سے بھی بہتر ہے۔

(۶) قاطع برہان میں خانِ آرزو کی "برہانِ قاطع" کے اغلاط ثابت کئے ہیں۔ بعد کو اس میں اضافہ کیا اور اس کا نام درفش کاویانی رکھا۔

اردو تصانیف | (۱) عودِ ہندی، رقعات غالب کا پہلا مجموعہ غالب کی زندگی میں، وفات سے چار مہینے پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء (رجب ۱۲۸۵ھ) میں پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۶۲ رقعات ہیں اور ان کے علاوہ غالب کی لکھی ہوئی دو کتابوں کی تقریظیں اور تین کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔

(۲) اردوئے معلیٰ حصہ اول دوسرا مجموعہ خطوط، غالب کے انتقال سے ۱۹ روز بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء مطابق ۲۱ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روز جمعہ کو مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ غالب کے شاگرد مرزا قربان علی سالک نے سال طبع لکھا:۔
"آج اردو کا شتی تمام ہوا" ۱۲۸۵ اس میں ۴۶۴ صفحے اور ۲۷۴ خطوط ہیں۔

(۳) اردوئے معلیٰ حصہ دوم، ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے متعلق مولوی عبد الاحد مالک مطبع نے لکھا ہے کہ "اس حصہ میں خاص کر وہ رقعے ہیں جن میں انھوں نے (مرزا غالب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے۔ اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں" اس میں ۶۵ صفحے اور ۳۵ رقعے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں جب شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے اردوئے معلیٰ کے دونوں حصے یکجا شائع کئے تو آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا جس میں غیر شائع شدہ ۲۳ خطوط ہیں۔

(۴) مکاتیب غالب، آخری مجموعہ خطوط ہے۔ جس میں نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروایان رامپور کے نام غالب کے ۱۱۵ مکتوبات ہیں۔ یہ مجموعہ نہایت خوبصورت ٹائپ میں بہترین طباعت کے ساتھ ریاست کی جانب سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔ منشی امتیاز علی صاحب عرشی ناظم

کتب خانۂ سرکاری نے ۱۸ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں ان خطوط کی مدد سے غالب کے حالات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ یہ رقعے ادبی اعتبار سے کچھ زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ درجنوں رقعے صرف چار چار یا پانچ پانچ سطروں کے ہیں جن میں تنخواہ ماہانہ کی ہنڈی (یا بقول غالب ہنڈوی) کی رسیدیں ہیں۔ پھر بھی کہیں کہیں کوئی ادبی یا علمی بات بھی آگئی ہے، یا کوئی قطعہ یا تاریخ شامل ہے، جواب تک شائع نہ ہوا تھا۔ غالب کا مخصوص اسلوب نگارش سب میں ہے، اور ظرافت اکثر میں۔ اس لئے یہ مجموعہ بھی تبرکات غالب میں شامل ہے۔

(۵-۶-۷) لطائف غیبی، تیغ تیز، نامہ غالب، یہ تینوں رسالے "قاطع برہان" کے مخالفوں کے جواب میں لکھے ہیں۔

(۸) تقریظیں اور دیباچے، مختلف کتابوں کے لئے لکھے تھے: "عود ہندی" اور "اردوئے معلی حصہ دوم" میں شامل ہیں۔

غالب کا اسلوب تحریر | تقریظوں اور دیباچوں میں غالب نے تحریر کا طرز وہی رکھا ہے جو خود ان کتابوں کا ہے یا جو اس زمانے میں مقبول و رائج تھا، یعنی قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی۔ بقول مولانا حالی کے، "مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیئے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمایش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارد کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانہ میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔ اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔" اگرچہ ان تحریروں میں کوئی جدت و ندرت نہیں، تاہم غالب کی یادگاریں ہیں۔ اس لئے دو تین تحریروں کے چند فقرے نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مرزا حاتم علی مہر کی مثنوی کی تقریظ:۔

"یہ مثنوی کہ مجموعہ دانش و آگہی ہے، اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت

ایک نہر ہے کہ بحرِ سخن سے ادھر کو بہی ہے۔ سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے، تقطیعِ شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں دلکش ناد تمام پایا ہے۔ اسی رو سے اس مثنوی نے شعاعِ مہر نام پایا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہاں مہر سے مراد آفتاب ہے۔ یہ شعاع اس مہر کی ہے کہ جو ذرۂ خاکِ رہِ بوتراب ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ سخنورِ روشن ضمیر مہر چہر، مرزا حاتم علی مہر کو سخن طرازی میں ید بیضا ہے۔"

۲۔ گلزارِ سرور مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی تقریظ:۔

"مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان کی خوبی میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور "فسانۂ عجائب" کی یکتائی کو مٹایا، وہ یہ تحریر ہے۔ کیا ہوا، ایک طرح اور ایک روش کے ہیں۔ یہ دونوں دلفریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں۔ مانا کہ ایک دوسرے کا ثانی ہے۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔ مانی نقش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیمبری کا کرے۔ کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے۔ کس حوصلہ کا آدمی ہے۔"

۳۔ حدائق الانظار تالیف خواجہ بدرالدین خاں کا دیباچہ:۔

"دریں ولا میرا برادر زادہ سعادت توامان خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان، کہ وہ ایک جوان شیریں بیان تیز ہوش ہے، اور ہر فن کی تحصیل میں سخن کش نکتہ سنج ہے۔ ستار کا جو خیال ہوا، ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ مصوری کی طرف جو طبیعت آئی، وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئی۔ اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا، "معز زنامہ" کی فارسی نثر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا۔ ...... بعد اختتام نگارش غالب فلک زدہ سے دیباچہ لکھنے کی آرزو کی، میں نے ہر چند عجز آمیز معذرت انگیز گفتگو کی، بیدادگر نے ایک بات نہ سنی، اور ایک عذر

نہ مانا۔ بھلا اس اصرار کا کیا علاج اور اس ضد کا کیا ٹھکانا۔ بھیجا اور بار بار بھیجا، ناچار بجز خامہ فرسائی کچھ بن نہ آئی۔"

۴۔ سراج المعرفت کا دیباچہ۔ اس کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں، خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میرلال کی کتاب "سراج المعرفت" پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کئے ہیں، اس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے لکھے۔" اس دیباچہ کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال یک نامۂ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے لاموثر فی الوجود الا اللہ، اور خط میں مندرج ہے لاموجود الا اللہ۔ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا۔ وہ نامہ آور اور نام آور کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی نغز کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیاے پیشین صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجب تعینات اعتباری اٹھا دیں، اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے، اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ زہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں، اور نفی شرک فی الوجود، جو اصل مقصود ہے، ان کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے، اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے نداے روح افزاے

من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ ......

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے، اور بسبب استیلائے وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہر چند ان کو سمجھاتیں گے، راہ پر نہ آئیں گے، ناچار اشغال و اذکار وضع کئے۔ تاکہ قوتِ متخیلہ اس میں الجھی رہے، اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو، اور ہم اس کو بجبر یا بتکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ ع

دانی ہمہ اوست در ندانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے، اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا، بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بےخبری اور بیخودی چھا گئی، اور وہ کیفیت جو موحدین کو بجز دِ فہم حاصل ہوتی ہے، اس شائبہ کے نفس کو بیخودی میں آ گئی۔ ایک دریا میں جا ان کو دوا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھے ہیں، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو سببِ مافات بیخودی کے واسطے محتاج اشغال و اذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔"

رُقعاتِ اردو کی خصوصیات اور غالب کی اوّلیت — نثرِ اردو میں غالب کی اوّلیت اور اوّلیت ان کے رقعات کے سبب سے ہے۔ اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا، اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں، اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا، اس میں غالب اوّل بھی ہیں اور آخر بھی۔

سنہ ۱۸۵۰ء تک غالب فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔ اس سال میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی۔ وہ فارسی تحریریں بڑی محنت و کاوش سے لکھا کرتے

تھے۔ اب اس تاریخ کے ساتھ خطوط فارسی پر بھی محنت کرنا دشوار تھا۔ اس لئے اردو میں خط کتابت شروع کردی۔ پھر غدر کے بعد صدمات اعزہ و احباب، مالی تردّدات، اور پیری و امراض نے زیادہ مضمحل کردیا تو ۱۸۶۱ء میں ارادہ کرلیا اور اعلان کردیا کہ فارسی انشا پردازی ترک کرکے اردو ہی میں لکھا کریں گے۔ لیکن باوجود اس عزم کے بضرورت کبھی کبھی فارسی میں بھی خطوط لکھتے رہے۔ آخر ۱۸۶۵ء سے فارسی نگاری بالکل چھوڑ دی، اور تا دم مرگ (۱۸۶۹ء) اردو میں خط کتابت کرتے رہے۔

جتنے خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں، اور تین چار مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان کی ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحات ہے، اور تعداد خطوط تقریباً ۸۲۵۔ اگرچہ رقعات کا شمار تصنیف میں نہیں ہوا کرتا، لیکن ایسا ضخیم مجموعہ یقیناً غالب کی مستقل تصنیف کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ خصوصاً جب ان میں سے تخمیناً سو خطوط کو چھوڑ کر (غالباً اس سے بھی کم) باقی سب میں کم غالب کا ایجاد کردہ طرز تحریر ہے۔ یا ان کی شوخی و ظرافت ہے، یا ادبی نکات ہیں، یا علمی مباحثہ ہے، یا اشعار کی تشریح ہے، یا شاگردوں کے کلام کی اصلاحات ہیں۔

"رقعات غالب" کی خصوصیات مختصر طور پر یہ ہیں:-

(۱) غالب نے القاب و آداب، مزاج پرسی و خیریت نگاری کا قدیم دستور، جس سے سر مو تجاوز کرنا روا نہ رکھا جاتا تھا، بالکل ترک کردیا۔ یہ بات نہیں کہ یہ باتیں لکھتے ہی نہ تھے، مگر ان قاعدوں کے اور ان کی ترتیب کے پابند نہ تھے۔ کبھی القاب و آداب بالکل چھوڑ دیتے اور اول سطر سے مضمون شروع کردیتے تھے، کبھی لکھتے تھے تو نئے، مختصر، موزوں القاب لکھتے تھے۔ مثلاً "میاں"، "برخوردار"، "بندہ پرور"، "مہاراج"، "پیر و مرشد"، "بھائی صاحب"، اس سے زیادہ لکھا تو "میری جان کے چین، میاں سرفراز حسین"، "میرے مہرباں، میری جان، مرزا تفتہ سخندان"۔ کبھی یہ سب غائب اور خط اس طرح سے شروع:-

"ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟" یا "مارڈالا یار تیری جواب طلبی نے!"

اسی طرح دعا، سلام اور اپنا نام، اور تاریخ تحریر لکھنے میں بھی کوئی پابندی نہ تھی مثلاً

"نورچشم، راحت جان، میر سرفراز حسین، جیتے رہو اور خوش رہو۔"

"ناوک بیداد کا ہدف، پیر خرف یعنی غالب آداب بجالاتا ہے۔"

"قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے؟"

"۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے۔"

"جواب کا طالب غالب۔ سہ شنبہ، از روے جنتری ۲۶، اور از روے رویت ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ۔"

(۲) خط کو مکالمہ بنا دیتے ہیں، اس طرح لکھتے ہیں گویا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ خود بعض لوگوں کو لکھتے ہیں کہ: "پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنی ہیں۔" "بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔" "اب حضرت سے باتیں کر چکا، خط کو سر نامہ کرکے کہار کو دیتا ہوں۔" اس طرح کے خط کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا، میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں، میں نے پوچھا، کیا آج جائیں گی؟ اس نے کہا، آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو انھوں نے اس طرح لکھا ہے:۔

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت، ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔"

اس طرح کا ذرا طویل انتخاب آگے درج ہوگا۔

(۳) اس طرز مکالمہ میں کبھی یہ جدت پیدا کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

"میر مہدی۔ جیتے رہو! آفریں! صد ہزار آفریں! اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھے رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے!"

اس "ظالم" سے مراد یہی میر مہدی ہیں۔

(۴) غالب کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی جس نے، بقول مولانا حالی، ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، ان کی شوخی تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی..... پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، اس میں ان کی لڑکی کو، جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:-

"کیوں بھئی! اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں صبیتیں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں رئیس لوہارو کو ان کے بچپن کے زمانے میں، ان کے رقعے کا جواب، جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:-

"اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بین غالب

کی پُتلی۔ چشم جہاں میں تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر، اور پُتلی تم۔ میاں تم رہے
دادا، تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں۔"

(۵) کبھی اس پیرایۂ ظرافت سے حُسنِ طلب کا کام لیتے ہیں جیسے نواب صاحب رامپور کے نام کا خط پہلے درج کیا گیا۔ کبھی کسی فرمائش کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک بار نواب علاء الدین احمد خاں نے اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت، اور تاریخی نام کی فرمائش کی۔ غالب مادۂ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ اس فرمائش کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"شیر ببر کے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتے ہیں، طریقِ صید افگنی سکھاتے ہیں۔ جب جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حُسنِ طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو؟ کہ مجھ پیر غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین احمد خاں! تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دُہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

(۶) ظرافت کے لئے نئے نئے پیرایے پیدا کرتے ہیں۔ نادری میں کپڑے بیچنے پڑے تو لکھتے ہیں:۔

"اور لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں۔"

رامپور کے ایک جشنِ سرکاری کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"طوائف کا وہ ہجوم، حکّام کا وہ مجمع، کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا جا ہے"

(۷) بعض خطوط مقفّی بھی لکھے ہیں، لیکن بقول مولانا حالی۔ مقفّی عبارت خاصکر ان خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت، اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ منشی میر عباس کو ان کے احترام اور قدامت پسندی کے سبب سے سراسر مقفّی خط لکھا ہے۔

(۸) بعض جگہ الفاظ کی ترتیب میں قدامت ہے۔ یہ فارسی کی عادت کا اثر تھا، جو پہلے سے تھا اور بعد تک رہا ہے۔ بعض فارسی محاوروں کو ترجمہ کر دیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:-

"کوئی بیہودگی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم مارے" (فارسی: برہم زدن)

اب بعض خطوط درج کرتے ہیں اور بعض کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں رئیس رامپور کے نام کا مکمل مکتوب یہ ہے:-

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عزّ ورود لایا۔ تنخواہ جنوری ۱۸۶۶ء حال کا روپیہ از روئے ہنڈوی ملفوفۂ عرضی وصول میں آیا۔ اگرچہ یہاں مینہ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل نصف ربیع سے ہاتھ دھو لیں۔ مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے اس رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب۔ جمعہ ۱۰ اگست ۱۸۶۵ء

(قطعہ)

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس

کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بیار لائے گلنار گوں، بیار، برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پہ اے ابر بار بار برس

ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

جناب قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

نواب خلد آشیاں ہی کے نام دوسرا عریضہ ہے۔ رامپور کی نمائش گاہ بے نظیر میں شریک نہ ہو سکنے کی حسرت لکھتے ہیں، کیا خوب پیرایہ پیدا کیا ہے:-

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے، نمائش گاہ سرسبز رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں، کہ ہائے میں وہاں نہیں! اڑنے پر پچتاتا ہوں، اڑ نہیں سکتا۔ ناگاہ دیو نے گود میں لے کر اڑایا اور پالکی میں بٹھا دیا، کہار چلے، راہ میں نہ ٹھہرے، دربار رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر منظر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر، دیدہ بھی بے پروبال، نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر کہہ آیا ہوں یہ سب بطریق فرضِ محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔ بارے تین بیت کا قطعہ بہ رسم تہنیت بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو میں خوشنودیِ مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں۔

نمائشے ز درخشان خویش
برآراست نواب عالی جناب

بہ بیں چوں طرب را نہایت نماند
بود سال آں "بخشش بے حساب"

خدایا پسندد خداوندگار
کہ از طبع غالب رود پیچ و تاب

بخشش بیحساب کے بارہ سو پچاسی ہوتے ہیں۔ طرب کی نہایت بلے موعدہ ہے۔ جب وہ نہ رہی تو دو عدد گھٹے۔ اور ۱۲۸۳ رہ گئے۔ فہو المقصود۔ اگر حضرت کی مرضی ہو، تو دبدبۂ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب غالب - ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۶۷ عیسوی۔[۵]

قاضی عبد الجمیل بریلوی کے نام کا خط ہے، اس میں فضلائے ہند پر رائے زنی ہے۔ مقتضی عبارت نقل ہے:-

صاحب، وہ خط جس میں شعر رسیدِ معلوم کے تھے مجھ کو پہنچا، اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا۔ اور ذکرِ اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں، یہاں ترک کی نام ہے۔ اخوان و احباب، مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ آپ در خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بہ رکاب ہوں۔ طرح، بفتح بمعنی نو، اور بمعنی قریب، سچ۔ لیکن طرح بفتحتین اور چیز ہے۔ غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتبی تھا نا عاقل۔ جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا، اس کا فن لغت میں کیا قدم ہوگا۔ مصرع "کیستم من کہ تا بہ بزم"، لاحول ولا قوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا بہ بزم"، یہ فارسی نالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے ؎

کیستم من کہ جاوداں باشم　　چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بگوید در کدامیں سال　　مرد غالب بگو کہ "غالب مرد"

یہ مادۂ تاریخ از روئے نجوم نہیں۔ بلکہ از روئے کشف ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

---

۵ یہ دونوں خط مکاتیب غالب مرتبہ منشی امتیاز علی صاحب عرشی رامپوری سے منقول ہیں۔

مرزا غالب کی دستخطی تحریر

وفات سے ۸ مہینے پہلے

اقبال نشان والا شان عزیز تر از جان میرزا علاؤ الدین خاں کو درویش دلریش
غالب دیوانہ کی دعا پہنچے سال گذشتہ تم کو یاد ہوگا میں نے دبستان فارسی
کا تم کو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل لکھدیا ہے اب جو
چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا
بلکہ مہینوں کی بھی نہیں ہے غایت یہ بارہ مہینے جسکو
ایک برس کہتے ہیں اور جیتوں ورنہ دو چار مہینے پانچ سات مہینے دس
بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی ثبات حواس میں اپنے دستخط
سے یہ توقیع تمکو لکھہ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین
ہو چاہیے کہ میرے جاننے والے جس طرح مجھکو جانتے تھے
ویسا تمکو جانیں اور جس طرح مجھکو مانتے تھے تمکو مانیں کل شیء ہالک
الا وجہہ ذو الجلال والاکرام یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ ہجری

[illegible]

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں، اور ان کے اشعار پر اصلاح دیتے ہیں:-

آج غزل کو دیکھا، کل یہ لفافہ روانہ کردوں گا۔ شعر

کوئی آتا نہیں آگے ترے یکتا ہو کر
آئینہ جب نظر آیا ہے تو دوتا ہو کر

یہ مطلع دلنشیں ہے۔ مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو دوتا کہنا چاہیئے یا نہیں۔ شعر

مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا
بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

مردم، آنکھ کی پتلی، مذکر نہیں۔ معشوق کی قید کیا ضرور، دعویٰ حسن پرستی رہے عموماً۔ یہ خوب ہے۔ شعر

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشم سیاہ
بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

شعر

حرمت مے کے لئے پیر مغاں کا یہ حکم
ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہو کر

یہ شعر بے لطف ہو گیا، اس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی، تو وہ ابہام "ریش قاضی" کہاں رہا؟

غالب کا یہ نکتہ شاعروں اور ادیبوں کے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محاورۂ فارسی جو کسی خاص معنی کے لئے مستعمل ہو، بجنسہ لینا چاہیئے۔ اس میں تغیر کرنا، مثلاً اردو میں ترجمہ کر لینا، جائز نہیں۔ شراب چھاننے کے کپڑے کو فارسی میں ریش قاضی کہتے ہیں۔ اردو میں اس کو قاضی کی ریش نہیں کہتے، اس لئے شاکر کے شعر میں وہ ایہام نہیں رہتا۔ اردو شعر میں اس کی مثال ناسخ کا یہ شعر ہے:-

نہ پی ریش قاضی تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لاابالی ہے (ناسخ)

میر مہدی مجروح کے نام خط لکھتے ہیں، اور اس میں مکالمہ کا عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ اس سے بہتر اور شوخ تر مکالمہ خود غالب کے اور رقعات میں بھی نہیں ہے۔ اس رقعہ میں لکھا ہے

کہ میرن صاحب آئے، اور ان سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر معمولی و عام طریقہ پر نہیں لکھتے، بلکہ اس طرح شروع کرتے ہیں :-

"اے میرن صاحب! السلام علیکم۔" "حضرت آداب۔" "کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کو خط کا جواب لکھنے کی؟" "حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟" "نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔" "حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے؟" "بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے باز رکھتے ہو؟" "سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے، اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے!" "اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟" "کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھئے گا۔" "میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!"

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر خط کا مضمون شروع کرتے ہیں۔

ان گوناگوں جدتوں، نوبنو اسلوبوں، رنگا رنگ ظرافتوں نے غالب کے خطوط میں ایسی دلکشی اور انفرادیت پیدا کر دی ہے کہ یہ طرز ان سے شروع ہو کر انہیں پر ختم ہو گیا۔ لیکن عام طور پر یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ان خطوں کو دیکھ کر لوگ سادہ و بے تکلف خط لکھنے لگے۔

خواجہ اماں دہلوی

بدر الدین خاں عرف خواجہ اماں، دہلی کے رہنے والے، مرزا غالب کے عزیز تھے، یعنی بقول غالب، "میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے"۔ انھوں نے داستان "بوستان خیال" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ "بوستان خیال" کا مصنف میر تقی خیال گجرات کا رہنے والا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں دہلی آیا۔ اس زمانے میں "داستان امیر حمزہ" بہت مقبول تھی۔ میر تقی خیال نے اس کے جواب میں "بوستان خیال" لکھی۔ چونکہ پہلی داستان میں تاریخ اسلام کے ایک بزرگ حضرت امیر حمزہ کے کارنامے تھے، اس لئے خیال نے بھی ایک ۔۔ برگزیدہ ہستی تلاش کی۔ اور شاہزادہ معز الدین ابو تمیم کو ہیرو بنایا جو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل میں تھے۔ میر تقی خیال نے دس جلدوں میں بہت ضخیم داستان تیار کی ہے۔ خواجہ اماں دہلوی نے مہاراجہ شیو دان سنگھ والی ریاست الور کی فرمائش سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ باقی کے لئے عمر فانی نے وفا نہ کی۔

ترجمۂ خواجہ اماں کی پہلی جلد کا نام حدائق الانظار اور دوسری کا ریاض الابصار ہے۔ پہلی جلد کے لئے غالب نے دیباچہ لکھا تھا جس کا اقتباس ان کے دونوں میں درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر غالب نے کئی دوستوں کو لکھا ہے اور خریداری کی فرمائش کی ہے۔ خواجہ غلام غوث بےخبر کو لکھتے ہیں:- "میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے …… آپ کے پسند آسے یا اور اشخاص خریدکرنا چاہیں تو چھ روپیہ قیمت اور محصول ذمہ خریدار سے"

خواجہ اماں نے تمہید میں مقفیٰ عبارت لکھی ہے، اور عربی و فارسی سے کام لیا ہے، لیکن اصل داستان بہت سادہ سلیس لکھی ہے۔ ریاض الابصار کی تمہید کے چند فقرے یہ ہیں:-

"امید کہ یہ ناظورۂ نایت جدید بھی مثل جملہ جلد گزرانیدہ بحصول نقد سرخروئی، پذیرائی، اور خلعت سرسبزی استحسان، جیب و دامان مراد کو پُر کرے، اور چاکر موروثی اسی وسیلۂ جزیلہ کے سبب گاہ گاہ مذکور بارگاہ فلک کارگاہ و سرمایۂ اعزاز و افتخار ہووے۔ خدا کا شکر کہ ادائے شکر خداوند نعمت کے پردے میں ادائے شکر نعمت خدا ہو، یعنی شکر نعمت خداوند گیا، شکر خدا ادا ہوا۔"

داستان کا نمونہ یہ ہے۔ اس قدر صاف بامحاورہ زبان لکھی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔

"اب عاقب حرانی کا حال سنو، اول بیان ہوا ہے کہ عاقب حرانی حکومت کے عمدہ و فن عیاری میں بھی نہایت مستعد و چالاک ہے۔ اس نے ایک شب قصد کیا کہ خبردار ہو کر بنفس نفیس واسطے حریف کے لشکر میں چلے اور دیکھے کہ وہ حکیم قمرانکوس کس کام میں مشغول ہے۔ آخر عاقب حرانی ایک نقب کی راہ سے جس کا دہن بیرون شہر باغ میں تھا، باہر نکلا اور بہت ہوشیاری سے جم قدر کے لشکر میں پہنچا۔ اتفاقاً اس وقت ایک خدمت گار خاص قمرانکوس کا کسی کام کے واسطے خیمے سے نکلا تھا۔ عاقب نے اس خدمت گار کی گردن میں اس طرح کمند ڈالی کہ حلق سے آواز تک نہ نکلی۔ بعد ازاں اس کا بستہ باندھ کر ایک خرابے میں رکھ آیا اور اپنی صورت اس خدمت گار کی شکل سے تبدیل کی، بلکہ اسی کا لباس پہنا اور خدمت گاروں کی صف میں داخل ہو گیا۔"

مولوی غلام امام شہید

والد کا نام مولوی شاہ غلام محمد۔ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ وطن تھا، عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے۔ فارسی آغا سید محمد اسمعیل مازندرانی سے حاصل کی تھی، نظم فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔

اردو میں شیخ مصحفی کے۔ ایک عرصہ تک صدر نظامت آگرہ میں سررشتہ دار رہے۔ ۱۸۳۹ء میں سرسید احمد خاں بھی نوکر ہو کر آگرہ آگئے۔ مولانا شہید، سرسید اور دیگر مشاہیر آگرہ کی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ شہید کی ترکِ ملازمت کے بعد ہندوستان کے مشاہیر امرا و رؤسا۔ ان کی خدمت کرتے رہے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور، سرسالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد، سعید عالم خاں رئیس سورت ان کے بڑے قدر داں تھے۔ حیدرآباد سے ۴۳۰ روپیہ سالانہ نذرانہ مقرر ہو گیا تھا۔ جو آخر عمر تک ملتا رہا۔ یہ سب قدر دانیاں شہید کے عشق و محبت رسول اللہ کی برکتیں تھیں۔ ان کی شیفتگی و فدائیت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ بجز نعت شریف لکھنے اور پڑھنے کے کوئی شغل نہ تھا۔ اسی سبب سے "مداح نبی" و "عاشق رسول" کے مبارک القاب سے مشہور تھے۔ اطراف ہندوستان میں، اضلاع آگرہ و مراد آباد و رامپور و الہ آباد و دکن میں شہید نے صدہا شاگرد و مرید چھوڑے۔ پیرانہ سالی میں انتقال کیا۔ تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں۔

فارسی میں قصائد و غزلیات وغیرہ کا ضخیم کلیات شہید کی یادگار ہے۔ اردو میں انشائے بہار بے خزاں ان کے خطوط و مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۶۶ء میں مرتب و شائع ہوا۔ دوسری کتاب محفل میلاد النبیؐ میں پڑھنے کے لئے تصنیف کی جو مولد شریف شہید کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی اور اتنی مرتبہ چھپی کہ اس کی اشاعتوں کا شمار دشوار ہے۔ آج تک رائج و شائع ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک روایت، ایک ایک شعر سے شہید کا عشق و ولولہ، جوش و شوق، سوز و درد مترشح ہے۔ سنا ہے جب شہید خود اس کو محفل میں پڑھتے تھے، عجب سماں بندھ جاتا تھا۔ اکثر اہل محفل پر وفور رقت سے غش طاری ہو جاتا تھا۔ اس طرز اور اس مقصد کی یہ اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کو دیکھ کر لوگوں نے اس سے اخذ و اقتباس کیا، اس کی نقلیں کیں، اس کے ہوبہو نمونے کی کتابیں لکھیں۔

مولد شریف شہید میں حمد و نعت کے مقامات مقفّٰی، عالمانہ اور عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب سے معمور ہیں۔ باقی مضمون سادہ عبارت میں ہے۔ لیکن اس میں بھی عربی کے الفاظ بیساختہ قلم سے نکلتے ہیں۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا وہی قدیم رنگ ہے۔ بعض مقامات سے مختصر نمونے دکھائے جاتے ہیں۔ حمد و نعت اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

"سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ کہ ذات مستجمع صفات اس کی بری ہے شرک اور زوال سے، اور اُلوہیت اور صمدیت اس کی پاک ہے ادراک وہم و خیال سے، مشابہت اعراض اور جواہر سے قطعاً مبرّا، اور مناسبت اوہام خواطر سے مطلقاً معرّا، کیسا معبود مطلق کہ جس نے بنی آدم کے واسطے چراغ رہنمائی کا انبیا کے ہاتھ میں دیا، اور تمام عالم کو سید الانبیا، سند الاصفیا، احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع جمال جہاں آرا سے روشن کیا۔"

تخلیق نورِ محمدی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں :۔

اے عاشقان روئے محمدؐ و اے شیفتگان گیسوئے احمدؐ، جانو اور آگاہ ہو کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مادّہ تمام موجودات اور خلاصہ جمیع کائنات کا ہے۔ یعنی جب صانع باکمال کو ظاہر کرنا اپنے حُسنِ بے زوال کا منظور ہوا۔ پہلے نور احدیت سے نور احمدی پیدا کیا۔ اور تمام موجودات کو اس کے نور سے عالم ظہور میں لایا۔ اور ظہور اس ذات ستودہ صفات کا سب انبیا کے بعد محض اس واسطے تھا کہ جس طرح بعد طلوع آفتاب کے روشنی ماہتاب اور ستاروں کی چھپ جاتی ہے، فروغِ ملت محمدی ناسخ سب ملتوں کی ہے۔ اگر وہ نورِ قدم پہلے سب کے جلوہ افروز ہوتا تو اور انبیا رسالت اور نبوت سے محروم رہتے۔ رباعی للعلم

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ	ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ
اے ختم رُسل قرب تو معلوم شد	دیر آمدۂ، ز راہ دور آمدۂ

سیرتِ پاک کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"جب عمر شریف آٹھ برس کی ہوئی عبدالمطلب کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ دریافت کیا کہ اب ایام اپنی موت کے قریب آئے۔ ابوطالب وغیرہ سے کہا کہ اگرچہ موت سب کے واسطے ہے، لیکن مجھے اس فرزند ہشت سالہ کی نسبت یہ کہ ابھی صغیر ترا ور یتیم بے مادر و پدر ہے، سخت حسرت و تاسف ہے۔ کاش عمر میری اس کی تربیت تک وفا کرتی تو اپنے سامنے خاطر خواہ تربیت اور پرورش کرتا، اب تم میں سے کون اس کی پرداخت کا متکفل ہو سکتا ہے۔ ابولہب نے کہا میں بجان و دل حاضر ہوں۔ جواب دیا کہ تو دولت و مال البتہ بہت رکھتا ہے۔ لیکن سنگدل اور بے رحم ہے۔ فرزندانِ یتیم اکثر مجروح دل شکستہ خاطر، نازک مزاج ہوتے ہیں۔ تھوڑے سے رنج کا تحمل نہیں کر سکتے۔ شاید تجھ سے کسی بات میں خاطرِ نازک اس یتیم کی آزردہ ہو جائے۔ بعدہٗ حمزہ نے مثل ابولہب کے التماس کیا، جواب پایا کہ تو کوئی فرزند نہیں رکھتا۔ اس یتیم کے درد سے کیونکر خبردار ہو گا۔ پھر عباس نے کہا اگر میں اس خدمت کا سزاوار ہوں تو شرطِ خدمت کی بجا لاؤں۔ کہا تو عیال و اطفال بہت رکھتا ہے۔ اپنے لڑکوں کے ہوتے یتیم بے پدر کو کب یاد رکھے گا۔ تب ابوطالب نے کہا کہ میں ہر چند مال اور سرمایہ کچھ نہیں رکھتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے لائق اس خدمت کا جانو تو بدل و جان حاضر ہوں۔ کہا تو البتہ قابل اس کام کے ہے۔"

انشائے بہار بے خزاں سے ایک "رقعہ تہنیت و تعزیت آمیز" کا مختصر اقتباس اول و آخر سے درج کیا جاتا ہے :۔

"مجموعہ انشائے شیریں زبانی، دیباچہ کتابِ سخن معانی زاد حشمتہٗ۔ قلم بعد تشریحِ مراتبِ اشتیاق و آرزومندی کے، تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے، اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانے میں خوشی و غم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے، اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔

دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں، ایک دولھا دُلھن کے سہرے کے کام آتا ہے، دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں، ایک بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں، دوسرے کو کھرل میں پیس کر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں، ایک محفلِ سرود میں کام آتی ہے، دوسری مُردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے..... حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا، گویا اسی گردشِ لیل و نہار کی خزاں و بہار کا تماشا دکھایا۔ دراس غم نے جتنا رُلایا تھا، آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا...... رنج میں دو بہتر جو پہلے منھ پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں دعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے، اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مُبارک ہو۔"

شہید کی تمام انشا پردازی میں یہی قافیہ پیمائی و عبارت آرائی ہے۔ اور اس طرزِ نگارش میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ تخلیقِ معانی، ایجادِ اسالیب اور تزئینِ بیان کے بہتر سے بہتر نمونے شہید کی نثر میں ملتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "روضۂ تاج گنج آگرہ" کے متعلق بہت مشہور ہے۔ اس طرح کے اسلوبِ تحریر سے محاکات و منظر کشی کا کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ مدح خوانی کی جاتی ہے۔ قصیدہ سے کسی بادشاہ کی شوکت و عظمت جیسی کچھ ذہن نشین ہوا کرتی ہے، وہی کام شہید کی نثر تاج محل کے متعلق کرتی ہے۔ بہرحال ان کے علم و فضل اور صنعت گری کا نہایت نادر نمونہ ہے۔ مختصر ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے:۔

"سبحان اللہ، کیا روضہ ہے! کہ رضوان جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہے۔ بارک اللہ، کیا باغ ہے جس میں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج اس باغ کا ایک زرد آلو ہے، چاند اس چمن کا گل شبو ہے، پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اٹھائے تو اس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی دشوار

ہوجائے، دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا ہے، عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے، ویسا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مبصر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کا ل ہے۔ سنگ مرمر پر سنگ موسیٰ کی پچی کاری کہئے یا آنکھوں کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نموداری، حرف ہیں یا کافور کے خرمن پر مشک کے دانے پڑے ہیں، غلط ہیں، ہیرے کی تختی پر نیلم کے نگیں جڑے ہیں۔ مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہے کہ یہ خم دیکھئے اور اس بارگاہ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھئے، محراب کا خم، پردے سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جاکر ذرا بہار کا عالم دیکھئے۔ نہیں نہیں، غلطی ہوئی مجھ سے، بلکہ محراب کا یہ اشارہ ہے کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے تب آگے قدم بڑھائیے۔ بس جو ادھر چوکھٹ لانگھنے کی عزیمت ہوئی تو ادھر عقل اور حکمت رخصت ہوئی۔ سیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے، لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر

خلف خواجہ ظہور اللہ کشمیری۔ ان کے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کی اولاد سے تھے۔ سلاطین مغلیہ کے تسلط کشمیر کے زمانے میں خواجہ بیخبر کے بعض بزرگ کشمیر میں قاضی رہے۔ بیخبر کے والد کشمیر سے ترک وطن کر کے لاسہ (تبت) چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال پہنچے، مہاراجہ نیپال نے بڑی عزت کی۔ خواجہ غلام غوث نیپال میں ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ ان کے والد ہندوستان آ گئے۔ اور بنارس میں قیام کیا۔ خواجہ صاحب نے یہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ ان کے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں، لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب کے میر منشی تھے۔ بیخبر

۱۶ سال کی عمر میں ۱۸۴۰ء میں میر منشی کے نائب مقرر ہوئے۔ صوبہ کا صدر مقام آگرہ تھا۔ بیخبر مدتوں آگرہ رہے۔ جب لارڈ ایلن برا گورنر جنرل (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء) نے گوالیار پر حملہ کیا (۱۸۴۳ء) تو گورنر کے منشی خانہ کے ساتھ بیخبر بھی شریک مہم ہوئے۔ اور خاتمۂ جنگ پر کارگزاری کے صلے میں خلعت پایا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ غالو کی پنشن کے بعد ان کی جگہ میر منشی ہو گئے۔ غدر کے زمانے میں صدہا ہندوستانیوں کی جان بچائی اور گورنمنٹ کے بھی انتہا درجہ کے وفادار رہے۔ اس کے صلے میں سند اور خلعت ہفت پارچہ مع تین رقوم جواہر سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئے۔ ملکہ وکٹوریا کے خطاب شہنشاہی اختیار کرنے کے موقع پر لارڈ لٹن نے جو دربار کیا اس میں بھی خواجہ صاحب کو تمغہ قیصری عطا ہوا۔ ۴۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۵ء پنشن لی۔ گورنمنٹ نے خان بہادر ذوالقدر کا خطاب دیا اور یہ مزید اعزاز بخشا کہ پنشن لینے کے لئے عدالت کی حاضری معاف کی۔ پنشن کے بعد نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر، والیِ رامپور نے خواجہ صاحب کو ریاست کا مدارالمہام بنانا چاہا، لیکن انھوں نے شکریہ کے ساتھ معافی چاہی۔ اور آخر عمر کو یادِ الٰہی میں گزار کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

بیخبر عربی و فارسی کے عالم تھے۔ فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ اہلِ زبانِ ایران جو وارد ہندوستان ہوئے انھوں نے ان کی زباندانی و نکتہ سنجی کی داد دی۔ بیخبر مرزا غالب سے چھوٹے تھے۔ اور ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ غالب باوجود بڑا ہونے کے، بیخبر کی نہایت عزت کرتے تھے۔ اور خطوط میں "قبلہ" اور "مولانا" لکھتے تھے۔ بیخبر کی سخن گوئی کے ایسے مداح تھے کہ ان کو ایک خط میں لکھا تھا:۔ "رامپور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے! ابداع اس کو کہتے ہیں، جدتِ طرز اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے۔ خدا تم کو

سلامت رکھے!" رقعات غالب کا پہلا مجموعہ (عود ہندی) بیخبر کی اعانت و مشورہ سے طبع ہوا۔

بیخبر کے رقعات و نظم فارسی کا مجموعہ خونا بۂ جگر کے نام سے شائع ہوا۔ رقعات و نثر اردو کا مجموعہ فغان بیخبر ہے، جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ بیخبر کے انتقال کے بعد ان کے ایک عزیز نے بقیہ نظم و نثر کا مجموعہ رشک لعل و گوہر کے نام سے ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں شائع کیا۔ بیخبر اردو کے بھی شاعر تھے، لیکن کم کہتے تھے۔ اردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۴۶ء میں توجہ کی، یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔ تقریظوں میں بیخبر کا بھی وہی رنگ ہے جو اس زمانے میں مقبول تھا۔ گویا تقریظ کا مفہوم نثر میں قصیدہ خوانی تھا۔ لیکن اور قسم کی نثریں اس سے بہتر و سلیس تر لکھی ہیں۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں۔

(۱) مولوی غلام امام شہید، بیخبر کے رشتہ کے خسر ہوتے تھے۔ بیخبر ان کی بے انتہا عظمت کرتے تھے کہ لوگوں کو تلمذ کا شبہہ ہونے لگا تھا۔ بیخبر نے شہید کی "انشائے بہار بیخزاں" کی تقریظ لکھی ہے۔ مختلف مقامات سے اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے! تار نگاہ میں بے تکلف موتی پروے جاتے ہیں۔ واہ واہ

ف۵ "عود ہندی" میں اس رقعۂ غالب کے ساتھ بیخبر کی وہ غزل بھی درج ہے۔ مسلسل غزل کہی ہے۔ مطلع و مقطع اور ایک شعر نقل کیا جاتا ہے:-

چشم کہ باز شد زخواب ، فتنۂ از و بپا رسوست
پردہ ز رخ کہ بر کشاد ، مہر ز شرم زرد رو ست

جام صبوحے کہ زد ، شیشہ بسجدہ می رود
مے ز لب کہ کام یافت ، جوش نشاط در سبوست

بخت کجاست بیخبر ، تا بر کاب او دوم
بر سر رہ نشستہ ام ، نیم نگاہم آرزوست

کلک گہربار کی کیا دُرافشانی ہے ...... حرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے، گویا درختوں سے چاندنی کھیت کیا ہے، کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے، جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے ......

اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا، میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا، ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا، یعنی در پردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو منصفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیسا کیسا جلتا۔ ان کی اس نثر نے رتبہ نظم کا کھو دیا، استادوں کا سفینہ دریا میں ڈبو دیا"

(۲) بحر نے شہید کا دیوان مرتب کرکے اس پر دیباچہ لکھا ہے، اس کے متعلق شہید کو خط لکھتے ہیں:-

"قبلہ! میری شوخی دیکھئے، یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں، دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں، چاند کے روبرو نورافشانی کا معما حل کرتا ہوں، لعل کے حضور میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیح سے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سنئیے، موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھیے، یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو کرے، اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے، گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے ....
میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو، اس کے لئے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو"

(۳) بیخبر نے اپنی انشا پردازی سے منظر کشی بھی کی ہے۔ صبح، دوپہر، شام کا سماں دکھایا ہے۔ ان مضامین میں مقفّیٰ فقرے اور مبالغہ و تشبیہ وغیرہ بھی ہیں، اور سادہ و سلیس عبارتیں بھی۔ دوپہر کے منظر کا اقتباس یہ ہے:-

"دوپہر کا وقت ہوا، آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر تبخالے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتش باری ہونے لگی کہ ہوا نے شعلۂ جوالہ کی صورت پیدا کی۔ خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی۔۔۔۔۔ برہمن بتخانے کے کونے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا کہ بت بن گیا۔ میکدے میں منہ زانو پر سر رکھے اس شکل سے ہو بیٹھے کہ معلوم ہوتا تھا مٹکے پر پیالہ دھر دیا۔ غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگالیں مٹی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا، خس کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں، فرشی پنکھے کھینچے گئے، خس کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر لخلخہ کا یقین آنے لگا، صراحیاں برف میں لگائی گئیں، شربت کی قلفیاں جمائی گئیں۔"

پہلے اور تیسرے نمونے کے خط کشیدہ فقروں میں کس قدر جدید، موزوں اور مکمل تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ دوسرے فقرے میں لطیف ظرافت بھی ہے۔

بیخبر کا اسلوب نثر اس زمانے سے جداگانہ نہیں ہے، لیکن روش قدیم کے محاسن تحریر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیخبر بیسویں صدی کے شروع تک رہے ہیں، لیکن ان کا طرز نگارش بھی انیسویں صدی کے نصف اول کا ہے، اور اسی زمانے کے لکھنے والوں اور غالب کے ہم عصروں میں ہیں۔ اس لئے ان کو اسی دَور میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مصنفین دکن

شمالی ہند کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس دَور سے پہلے کے مصنفینِ دکن کا پہلے سلسلہ، دکن میں ذکر آ چکا ہے۔ دورِ چہارم میں بھی دکن کے اہلِ تصانیف کی خدمات گراں قدر ہیں۔ اس لئے ان کا امتیاز قائم رکھنے کے لئے علاحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) محمد ابراہیم بیجاپوری

محمد ابراہیم بیجاپوری مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے ہمعصر ہیں۔ ان کا ترجمہ انوار سہیلی اس سال طبع ہوا ہے جس سال سرور نے اپنا فسانۂ عجائب لکھا ہے، یعنی ۱۲۴۰ھ میں۔ تصنیف کا زمانہ کچھ پہلے ہوگا۔ اس کا نمونہ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی تالیف (دکن میں اردو) سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ تحریر اس دَور کی تصانیفِ شمالی ہند کے مقابلے میں کس قدر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ دکنی الفاظ، محاورات، طرزِ بیان کی اتنی کثرت ہے کہ بعض معاصرینِ دکن، باغ و بہار و گنج خوبی وغیرہ کی عبارت سے بھی زیادہ قدامت آمیز ہے۔ چند فقرے یہ ہیں:-

"چین کے ملک کے اندر میں چوترس میں ایک بڑا بادشاہ تھا، اس کا نام ہمایوں فال ہور اُسے ایک بڑا اچھا وزیر تھا، اس کا نام خجستہ رائے۔ ہمایوں فال ایک بار خجستہ رائے کو ساتھ لیکر شکار کو گیا۔ وہاں سو اُٹھتے تو دھوپ پڑی تھی۔ ایک پہاڑ کی انی پو چھاؤں تھے۔ چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو ساتھ لے کر اسی چھاؤں کے تلے جا بیٹھا۔ ہور دیکھا تو کیا، کہ ایک جھاڑ اسی کا کھوڑ کا بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر شہد کے کھیاں پوتی بندنے اندر گھستے اور باہر نکلتے ہیں۔۔۔۔۔"

(۲) شمس الامراء امیر کبیر ثانی

نظام حیدر آباد (دکن) کے دربار میں امیر الامراء تھے۔ ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے،

اور تین شاہان آصفیہ (نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی، نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث اور نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع) کا زمانہ دیکھا۔ آخری عہد میں امیر کبیر کا خطاب ملا، اور پیشکاری و مدار المہامی کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ شمس الہندسہ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ دیگر علوم و فنون میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء میں رحلت کی۔

رسالۂ شمسیہ۔ یہ علم طبیعیات پر چند رسالے ہیں۔ مؤلف "دکن میں اردو" کو ان کے مترجم کا نام تحقیق نہیں ہوا۔ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں طبع ہوئے۔ ان کا دیباچہ خود شمس الامرا امیر کبیر نے لکھا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ خود انھوں نے ترجمہ کیا ہے نہ کسی مترجم کا نام لکھا ہے۔ اس لئے ان رسالوں کو شمس الامرا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اہتمام بہرحال انھیں کا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

بندۂ درگاہ یزدی کا محمد فخر الدین خاں الملقب شمس الامرا اس طور پر گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفر کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں بسبب میلان طبیعت کے نسبت اس حرف شوق رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں ۔۔۔۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ ہندیوں کے فائدہ کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کے معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا، اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جاوے گی، پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریورنڈ جالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو سنہ ۱۸۱۵ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے ہم پہنچے۔

کتاب کے ترجمہ کا نمونہ یہ ہے :-

"کشش ثقل کے بیان میں۔

استاذ - اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت و حقیقت سے کلیۂ عمدہ کی آگاہ کردوں، جس کو کشش ثقل کہتے ہیں، اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعیدہ باہم یک دیگر تجاذب رکھتے ہیں، اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام ثقیلہ کے زمین پر۔

تلمیذ کلاں - گولی ہاتھ سے گرنا، اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا، اور سیب کا جھڑ کے زمین پر آنا، یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں؟

استاذ - ہاں یہ سبب اسی قوت کے ہیں جس کو ثقل تعبیر کرتے ہیں۔ پس وہ اجسام جس میں کچھ بھی میں ہے، اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر قریب عمود وار گریں گے ......"

اس دیباچہ اور ترجمہ میں بہ نسبت ابراہیم بیجاپوری کے ترجمۂ انوار سہیلی کے دکنی زبان کا اثر بالکل نہیں ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں دس بارہ سال کا پس و پیش ہے۔

۲- رسالہ اعمال کرہ - یہ رسالہ بھی انھیں امیر کبیر کے اہتمام سے ترجمہ ہوا، اور ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ اس میں چار باب ہیں، پہلے مقالے میں تعریفات، دوسرے میں جغرافیہ، تیسرے اور چوتھے میں ہیئت۔ دو ایک مقام سے اس کے نمونے یہ ہیں :-

سوال - جون کی دسویں کو آفتاب کون کون مقام میں عمود وار رہتا ہے، اور کون کون مقام میں طلوع اور غروب نہیں ہوتا؟

جواب - سندیلہ اور کلکتہ اور آوا اور مکادر جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عمود وار رہتا ہے، اور منطقہ مبردہ شمالی میں کنفزئی اور گرین دیہ اور کیپ میں غروب

نہیں ہوتا، اور منطقۂ بردۂ جنوبی میں اس جگہ کہ جہاں تمام بحور ہیں، طلوع نہیں کرتا۔

زحل کا بیان۔ یہ ستارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے، آفتاب سے بہت دور ہے، اور باستعانت بہتر آلۂ دوربین کے اہل علم کو اس ستارے کی پیٹی کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے، اور یہ پیٹی اس ستارے کے اطراف بتمامہ ایک حلقۂ روشن ہے۔ اور اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اور ان اقمار میں سے ایک قمر اس حلقہ کی سطح پر حرکت کرتا ہے۔

محمد عثمان مبین انھوں نے عقائد اسلام اور مسائل فقہ کے متعلق ایک کتاب لوازم الاسلام ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۵ء میں مرتب کی۔ اس میں سے "وحدت الوجود" کی بحث کا نمونہ "دکن میں اردو" سے نقل کیا جاتا ہے:-

"جان کہ اے دوست تمام عالم میں نظر کر دتو خلق کئی کئی طرح کا ہے جو حدیث میں آیا ہے۔ عالم اٹھارا ہزار طرح کا ہے۔ بالفعل عالم دنیا کو دیکھو تو کوئی عاجز ہے کوئی مختار ہے۔ اور کوئی قابل ہے، اور کوئی نابکار ہے۔ اور کوئی نیک ہے کوئی بد ہے اور کوئی بد شکل ہے اور کوئی خوش قد ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر سبب اپنے ہوتے ہیں۔ آپ ہی مختار ہوتے تو سب لوگ خوب و خوش اور نیک ہوتے جو پسند خاطر ہر ایک ہے۔ یہاں یقین یہ ہوا کہ پیدا کرنے ہارا ان کا کوئی جدا ہے کہ ان کی قابلیت کے موافق پیدا کیا جیسا کہ کمہار مٹی سے طرح طرح کے باسن قابلیت پر ہر ایک ظاہر کیا کرتا ہے۔ پس جان تو پیدا کرنے ہارا سب عالم کا شاید دوسرا کوئی ہے۔"

یہ عبارت بھی باوجود آسان طرز بیان کے، صاف نہیں ہے، گنجلک پیدا ہو گئی۔

غلام امام خاں ترین حیدر آبادی

انھوں نے دو کتابیں لکھی ہیں جو تاریخ دکن کے سلسلے میں نہایت معتبر مانی جاتی ہیں:-

(۱) تاریخ رشید الدین خانی - یہ سلاطین دہلی و دکن کی تاریخ ہے، جو غلام امام خاں نے شمس الامرا نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے لکھی، اور اپنے مربی و مخدوم کے نام پر اس کا تاریخی نام رشید الدین خانی رکھا۔ یعنی سنہ ۱۲۷۰ھ میں مرتب کی، اور یہی سنہ اس کے نام سے نکلتا ہے جو سنہ ۱۸۵۴ء کے مطابق ہے۔ چنانچہ مصنف دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ (اقتباس درج کیا جاتا ہے):-

> اما بعد، اس خوشہ چین خرمن اساتذۂ متقدمین و متاخرین، خادم العلماء نائب الشعرا غلام امام خاں ترین المتخلص بہ ہجر ابن محمد منور خاں ملک غفر اللہ ذنوبہ نے سنہ ۱۲۷۰ بارہ سے ستر ہجری نبوی میں بیچ عہد ...... میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کے حسب الحکم ...... نواب معلی القاب اقتدار الدولہ

۵۱ اس کتاب کے سال تالیف کے سلسلے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب (دکن میں اردو) میں لکھتے ہیں: "اگرچہ کتاب سنہ ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے:۔ سلطنت دہلی کو بہادر شاہ شاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کی تحریر تک کہ آخر ذی حجہ سنہ ۱۲۳۹ھ ہے سولہ برس چھ مہینے پچیس دن ہوتے ہیں"۔ یہاں یہ سنہ ۱۲۳۹ھ یقیناً غلط ہے۔ خواہ ہاشمی صاحب سے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہو یا ان کی کتاب کے کاتب مطبع یا ان سے پہلے اصل تاریخ کے ناقل و کاتب سے۔ اس لئے کہ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ سنہ ۱۲۵۳ھ سنہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ سال زیر بحث بہادر شاہ کے باپ اکبر شاہ ثانی کے سال جلوس سنہ ۱۲۲۱ھ (سنہ ۱۸۰۶ء) سے سولہ سترہ برس بعد کا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصنف تاریخ "رشید الدین خانی" نے کم سے کم ۳۲ سال اس کی تالیف میں صرف کرکے سنہ ۱۲۷۰ھ میں اس کو ختم کیا، تو اتنے پہلے نواب رشید الدین خاں کا زمانہ اور ان کا حکم نہیں ہو سکتا اور کتاب کے نام اور دیباچہ سے ظاہر ہے کہ انھیں کے لئے لکھی گئی۔

بہادر جنگ محمد رشید الدین خاں بہادر دام اقبالہٗ کے، خلاصہ احوال فرماں روایان ہند و دکن کا، راجہ ہائے کبار اور سلاطین والا اقتدار سے، ضمیمۂ کیفیت ورود و نزول افسران فرہنگ اہل فرنگ کے، اور جملہ سوانحات آشتی و جنگ ان کے رؤسائے اس دیار کے، ابتدائے عروج سے انتہائے زوال تک ہر ایک ریاست بد اگانہ کے، کتب قدیم و جدید سے جمع فرلق، اور اخبارات حال کے انتخاب کرکے، سلیس فقرات بندی میں یہ ایک کتاب مختصر تیار کی ہے۔ تا ارباب امارت اور اصحاب متانت کو وقت تقریر اور تدبیر کے کار آمد ہو، اور نام اس کا اسم گرامی پر جناب ممدوح کے "رشید الدین خانی" ہے۔ اور مادۂ تاریخ بھی "رشید الدین خانی"

یہ ضخیم کتاب ہے۔ بڑی تقطیع کے تقریباً ۸۰۰ صفحوں پر چھپی ہے۔ راجگان ہند، سلاطین دہلی، اسلامی سلاطین دکن، مشاہیر دکن کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں انگریزوں کے دکن میں آنے، اور حیدر علی و ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے کے واقعات بھی درج کئے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ غلام امام خاں مصنف "رشید الدین خانی" نے یہ دیباچہ کی عبارت جو بالیقین ان کی اپنی تحریر ہے، ترجمہ نہیں ہے، بالکل طرز قدیم میں لکھی ہے بے قاعدہ ہے۔ لیکن خود کتاب کی عبارت نہایت صاف، مربوط، سلجھی ہوئی ہے۔ نمونہ کے لئے "دکن میں اردو" سے آصف جاہ اول کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:۔

نواب چونکہ بہ نفس نفیس جمیع مقدمات مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے اگر بعضے ندمانے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کرکے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کے لئے عرض کیا۔ نواب نے خدمت دیوانی کے لئے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ متدین کو تجویز کرکے، جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا، اس عہدہ کا مژدہ ان کو پہنچایا۔

محمد ابوالخیر خاں بہادر جو ایک دور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے۔ انھوں نے اس کو نامناسب جانا۔ اور شب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت ان کے سپرد ہونے والا تھا، ابوالخیر خاں در دولت پر حاضر ہوئے، اور نواب کو اطلاع کرائی۔ نواب باہر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ نا وقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا جناب والا کل دیوان کی چاہتے ہیں۔ میں اس بات کا خیال کرتا ہوں شاہجہان آباد میں جب اس تقرری کا علم ہوگا تو وہ یقین کریں گے۔ آصف جاہ بہ پیرسنی کی وجہ سے آرام طلب ہوگئے ہیں۔ اور یہ بات نامناسب ہوگی۔ تو نواب نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں۔ ابوالخیر خاں نے عرض کیا۔ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلام کا حکم ہو۔ فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گزرے گا۔ صبح کو جب اعلام کا حکم خان موصوف کے لئے ہوا، تو خان موصوف نے اس معتمد علیہ کا نام زبان فارسی میں ندا کی کہ "از خدمت صوبہ داری برہانپور فلاں شخص سرفرازی یافت"۔ ہر چند ناواقف لوگ مع خدام کے کہتے رہے انھیں اعلام دیوانی کا حکم ہے۔ مگر چوبدار نے حسب ایمائے خان موصوف جلد بجا آوری کرا دیا، اور نذر پیش کرائی۔

یہ دونوں عبارتیں۔ دیباچہ و اصل کتاب کی۔ مشکل سے ایک شخص کی لکھی ہوئی تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ جو شخص اونچی سلیس و با اصول تحریر لکھ سکتا ہے اس سے تعجب ہے کہ دیباچہ میں ایسی بے ربطی جائز رکھے۔ اس کے علاوہ، اسی مصنف نے چودہ[1] برس بعد دوسری تاریخ لکھی ہے، جس کا نیچے ذکر آتا ہے۔ اتنے عرصہ میں زبان اور طرز بیان زیادہ شائستہ ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ لیکن مندرجہ ذیل نمونوں سے معلوم ہوگا کہ دوسری کتاب (خورشید جاہی) کی دیباچہ و اصل مضمون کی عبارتیں باہم مشابہ ہیں، لیکن اتنی بامحاورہ و باقاعدہ نہیں ہیں جیسی "رشید الدین خانی" کی مرقومہ بالا عبارت[5] ہے۔

---

[5] ہم نے دونوں کتابوں کے دیباچے مولانا احسن مارہروی کی تالیف (نمونۂ منثورات) سے اور دونوں کتابوں کی درمیانی عبارتیں مولوی نصیر الدین ہاشمی کی کتاب (دکن میں اردو) سے نقل کی ہیں۔

(۲) تاریخ خورشید جاہی۔ امیر کبیر ثالث موصوف الصدر کے فرزند خورشید جاہ محمد محی الدین خاں بہادر۔ امیر کبیر رابع کے حکم سے مرتب ہوئی۔ دیباچہ میں حال تالیف لکھتے ہیں :-

سنہ ہذا میں کہ ایک ہزار دو سو چوراسی ۱۲۸۴ ہجری ہے، اس کمترین عقیدت گزین پیرو علماء دین مولوی محمد نام خاں ترین ریاضی داں ملک تخلص کو فرمایا کہ ایک کتاب علم تاریخ میں مختصر مفید۔ واسطے ملاحظہ اوقات گرامی ہمارے۔ اور فوائد عام خلائق کے الکھ کر گزرانو، تا ہم اس کو صحیفۂ طبع سے آراستہ کرکے انعام ارباب استعداد کا کریں۔ چوں کہ بعد تحریر کتاب ثانی "رشید الدین خانی" کے، کہ اس وقت تخلص نامہ نگار کا ہجر تھا۔ ان ایام میں فرصت حاصل تھی، حسب الفرمان واجب الاذعان کے کمر سعی کی میان جاں کے باندھ کر ارادہ کیا ہے۔ حسبی اللہ نعم الوکیل ۔۔۔
چونکہ اس میں احوال صوبہ جات کا براسہ نہ تھا، اس واسطے اس کی ابتدا صوبہ جات سے کی گئی ہے، اور ذکر اولیائوں کا اور سوانحات بادشاہان ایران و توران اور روم کے مندرج و مندرج ہیں۔ اور مفصل کیفیت حال جہاندہ سال کی ۱۲۷۰ سنہ ہجری سے زمانہ ہذا تک بیان کی گئی ہے، اور نام اس کا بہ اسم گرامی بہ ممدوح کے "خورشید جاہی" ہے۔ اور مادۂ تاریخ "تاریخ جلیل" ہے۔"

کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ صوبہ خجستہ بنیاد کا حال لکھتے ہیں :-

"اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں، پس زمانہ میں نظام شاہیہ کے، صوبہ احمد نگر قرار پایا۔ صاحب نسخۂ جدید لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈھ تھا، اور عہد میں راجہ بھوج کے دہارا کہا کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈھ کا نام دولت آباد رکھا، اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدہٗ جب نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پہنچی، نزدیک ہمایوں موضع کھڑکی میں

۱۰۶۱ھ میں ایک شہر کمال لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کرکے نام اس کا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا۔"

شاہ علی قلعہ ادھونی (حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے۔ نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے فن ریاضی کے دو رسالے ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں مرتب کئے۔ ایک کا نام تذکرہ رکھا، دوسرے کا انوار بدریہ۔

انوار بدریہ کا نمونہ یہ ہے:-

تعریف نسبت مساوات۔ مقادیر دو نصف کی جو مراتب میں برابر، اور نسبت میں ایسے ہوں کہ دو مقداریں ایک صفت کے وہ نسبت ہو جو ہر دو مقداریں صف آخر کی ہے۔ پس اطراف ہر صفت کے نسبت دیئے کو اوساط نسبت مساوات کہتے ہیں۔

شمالی ہند میں بھی اس زمانے میں اور اس سے پہلے ریاضی، سائنس، فلسفہ وغیرہ بہت سے علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

دورِ چہارم کی نثر پر تبصرہ

(۱) یہ دور اس لئے یہاں ختم کیا گیا ہے کہ اس کے بعد سرسید احمد خاں کے زمانے سے اردو زبان و ادب میں نمایاں انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ سرسید کی تصانیف، اخبار، سوسائٹی، کالج کے ذریعہ سے تعلیم اور وسائل تعلیم بھی وسیع ہو گئے۔ اور ان کے زیر اثر بہترین مصنف بھی پیدا ہونے لگے، جن کی اختراعات ادبی نے شمع راہ کا کام کیا۔ سرسید کی کوششوں کے ساتھ ساتھ دہلی، لکھنو، لاہور وغیرہ بہت سے مقامات پر

تعلیمی ادارے قائم ہوئے، اور انفرادی و اجتماعی سعی و کاوش سے انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے، "کائناتِ اردو" ہی بدل گئی۔

(۲) سرسید کی مساعیٔ علمی و ادبی اسی دَور میں شروع ہو گئی تھیں، لیکن بیشتر تصانیف اور وسیع تر کارنامے غدر کے بعد کے ہیں۔ اور آخر صدی تک جاری رہے ہیں۔ اس لئے ان کو دورِ آیندہ میں رکھا ہے لیکن سب سے پہلے۔

(۳) چوتھے دَور میں زبان، محاورات، ترتیبِ الفاظ، پابندیٔ قواعد، تمام مصنفین میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں۔ انشا و غالب سے بہتر اردو کسی نے نہیں لکھی۔ اس زمانے میں غالب اس اعتبار سے نہایت ممتاز و منفرد ہیں۔

(۴) عبارت میں قافیہ پیمائی بہت مقبول ہے، لیکن "ادبیاتِ لطیف" (فسانہ انشا) میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ مذہب اور علوم و فنون کی کتابوں میں نہیں ہے یا کہیں کہیں ہے۔ اس زمانے میں طرزِ بیان کی سادگی و شگفتگی عام نہیں ہے۔

(۵) اس دَور میں یعنی انیسویں صدی کے .. سال میں (علاوہ فورٹ ولیم کالج کے) ہر علم و فن کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اگرچہ ان کا ایک حصہ چھپنے کے بعد بھی اب کمیاب یا مفقود ہے، اور ایک حصہ مسودہ کی صورت میں رہا۔ لیکن بہت سا لٹریچر معلوم و موجود ہے۔

(۶) دہلی کالج اور دہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے رواجِ تعلیم اور اشاعت علوم میں بڑا کام کیا۔ ہزار ہا ہندوستانیوں کو عالم و روشن خیال بنایا، اور درجنوں مصنف و اہلِ قلم پیدا کر دئے، جنھوں نے آیندہ دَور کی پیشوائی و رہنمائی کی۔

(۷) اس دَور میں ہندو اہلِ قلم بھی اردو نثر کی ترقی میں برابر کوشش کرتے رہے۔ ہر قسم کی کتابیں خصوصاً علوم و فنون، سائنس وغیرہ کی طرف بہت توجہ کی، جیسا کہ بعض نمونوں سے، اور مصنفین کی فہرست سے معلوم ہوا ہوگا، ان صاحبوں کی تصانیف کے نمونے زیادہ دستیاب نہ ہو سکے۔

(۸) یورپین مصنفین نے بھی اردو میں اور اردو کے متعلق اپنی زبانوں میں تصانیف کیں۔ اس دور کے یورپین مصنفین کے تذکرے اور نمونے، ان کی مساعیِ علمی کو یک جا دکھانے کے لئے پہلے درج کر دئے گئے ہیں۔ ان میں فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی خاص طور پر قابل ذکر، اور اس کی تصانیف اُس کی یادگار ہیں۔ اس کا حال اور فہرست تصانیف درج ہو چکی ہے۔

(۹) اس زمانے میں انگریز حکام کی اردو سے دلچسپی کی یہ مثالیں بھی یادگار ہیں کہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں دربار کیا، جس میں خطابات اور خلعت دئے گئے۔ اسی موقع پر لفٹنٹ گورنر نے انگریزی میں نہیں، بلکہ اردو میں تقریر کی۔ اس کے بعد فروری میں چیف کمشنر لکھنؤ نے اودھ کے تعلقداروں کا جلسہ کیا، اس میں بھی اس نے اردو میں تقریر کی۔

(۱۰) لیتھو اور ٹیپ کے مطابع، خصوصاً لیتھو کے (سنگی) چھاپے خانے نہایت کثرت سے جاری ہوئے۔ ۱۸۳۲ء سے اردو سرکاری زبان قرار پائی، ۱۸۳۵ء سے اخبارات کو آزادی ملی۔ اس لئے اس سال کے بعد سے ۱۸۷۰ء تک تمام ہندوستان میں ایک سو کے قریب اخبارات و رسائل جاری ہوئے، جن میں سے بعض اسی دوران میں بند ہوگئے۔ بہت سے بعد تک جاری رہے۔ چند اخبار مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آگرہ اخبار، دبدبۂ سکندری رامپور آج تک جاری ہیں۔ مطابع میں جس نے سب سے زیادہ ترقی کی، مطبع نول کشور ہے۔ یہ بھی اب تک قائم ہے، اودھ اخبار اسی مطبع کا پرچہ ہے۔ آگرہ اخبار پریس اور دبدبۂ سکندری کا مطبع حسنی بھی باقی ہیں۔ ان کے علاوہ اور چند چھاپے خانے اسی زمانے سے اب تک موجود ہیں۔

(۱۱) علمی و اصلاحی انجمنیں بے شمار قائم ہوئیں، ان میں سب سے پہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی (قائم شدہ ۱۸۴۲ء) تھی، اور وسعت و خدمت کے

لحاظ سے سب سے اعلیٰ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی (قائم شدہ ۱۸۶۲ء) اور زمانۂ زیرِ بحث میں باعتبارِ ترتیبِ قیام سب سے آخری نینی تال انسٹی ٹیوٹ (قائم شدہ ۱۸۶۹ء) یہ اُمرا، و رؤسا کی انجمن تھی۔ اس کا مقصد تصنیف و تالیف نہ تھا، بلکہ مختلف ذرائع سے ملک میں تعلیم و روشن خیالی کی اشاعت کرنا تھا۔ ان کے علاوہ شاہجہانپور، اٹاوہ، بنارس، بدایوں، مرادآباد، الہ آباد، لاہور، بہار وغیرہ مقامات پر الگ الگ انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ جنھوں نے تصنیف، ترجمہ، اخبار، تقریر وغیرہ تمام ذرائع علم و ادب کی ترقی کے لئے استعمال کئے۔

(۱۲) مذہبی مناظرے، علمی مباحثے اور شعر و سخن کے مشاعرے بھی جاری رہے، جن کے وسیلوں سے اردو کی خدمت ہوتی رہی۔ گارساں دتاسی (جس کے خطبات سے اس تبصرہ کی اکثر معلومات اخذ کی گئی ہیں) کے آخری خطبہ میں مذکور ہے کہ اس دور کا آخری شاندار مشاعرہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں ہوا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ "اودھ اخبار مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۹ء میں اُن شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا جو اِس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہدایات میں یہ بھی ہے کہ شعرا پہلے سے اپنے نام، تخلص، مذہب، عمر، استاد کا نام، اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہوگیا، مطبوعہ دواوین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع دیدیں۔"

غرض یہ "عہدِ اردو" آیندہ ادبی انقلاب اور علمی ترقی کے لئے پیش خیمہ تھا۔ جس نے آنے والی نسلوں کے لئے راستہ بنادیا۔

نثرِ اُردو کا پانچواں دَور

سنہ ۱۸۷۱ء تا سنہ ۱۹۰۰ء
۱۲۸۸ھ تا ۱۳۱۸ھ

سر سید احمد خاں

سید[لہ] احمد خاں ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۱۷ء مطابق ۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے سید تھے۔ ان کا سلسلہ نسب امام نہم حضرت امام محمد تقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے، اسی لئے وہ اپنے آپ کو تقوی سید لکھتے تھے۔ غالباً ان کے بزرگ ہندوستان میں شاہجہاں کے عہد میں آئے، اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک ان کو سلطنت مغلیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا۔ سرسید کے بزرگوں میں سے ایک شخص سید محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے اور مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے۔ جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے ان کو یکہ بہادر کا خطاب دیا۔ سرسید کے دادا سید ہادی تھے، ان کو بادشاہ عالمگیر ثانی کے سنہ ۲ جلوس (سنہ ۱۷۵۵ء / ۱۱۶۸ھ) میں جواد علی خاں کا خطاب اور منصب ہزاری ذات دو پانصد سوار ملا، اور ان کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علی خاں خطاب دیا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے، اور وہیں انتقال کیا، جواد علی خاں (سرسید کے دادا) بدستور دہلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا، اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے (سنہ ۱۷۵۹ء / ۱۱۷۳ھ تا سنہ ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ) تو سرسید کے دادا کے خطاب میں

لہ سرسید کے حالات مولانا حالی کی حیات جاوید سے ماخوذ ہیں۔ بلکہ اسی کتاب کی عبارت کو مختصر کر کے مسلسل کر دیا ہے۔

جوادالدولہ کا اضافہ ہوا۔ اور عہدۂ احتساب و کروڑ صوبہ شاہجہاں آباد عنایت ہوا۔ اور پھر ۱۱۸۸ھ/۱۷۶۴ء میں عہدۂ قضائے لشکر پر متعین ہوئے۔ اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے، اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہوگیا۔" سید ہادی کے بیٹے، یعنی سرسید کے والد میر متقی، ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ جب سید ہادی کے بعد ان کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا، مگر چونکہ ان کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لئے شاہ عالم کے انتقال کے بعد ان کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا تھا، اور وہ دربار خاص میں جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا، برابر جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اس خاص دربار میں گیا ہوں۔" سرسید کے والد کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دہلی میں مشہور ہے بیعت تھی، اور شاہ صاحب ان پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔

سرسید کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانیؒ کی اولاد میں تھے۔ آپ کے بھائی خواجہ نجیب الدین نواح دہلی میں "شاہ فدا حسین" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بڑے عالم اور خوش بیان تھے، لیکن "رسول شاہی" فرقہ میں داخل ہوگئے تھے، اس لئے چار ابرو کا صفایا کئے، ایک عرقی باندھے، بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ خاندان میں سب سے زیادہ بااقبال لائق دانشمند، صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اور خود آلات رصد کے بنانے پر قادر تھے۔ علم ہیئت اور آلات رصد کے متعلق چند رسالے بھی تصنیف کئے تھے۔

ان میں سے ایک کا سرسید نے اردو میں ترجمہ کردیا ہے۔ ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں سرسید کے ماموں بھی فنون ریاضی کے ماہر تھے۔ خواجہ فرید الدین تحصیل علوم کے بعد ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء میں مدرسہ کلکتہ میں (جو فورٹ ولیم کالج سے پہلے قائم ہوا تھا اور آج تک ہے) سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر سپرنٹنڈنٹ ہوکر گئے۔ وہاں سے گورنر جنرل مارکوئس ولزلی نے ان کو ایران میں سفارت پر بھیجا۔ اس کے بعد برما میں ایک پولٹیکل معاملے کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے بھیجا۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے کلکتہ سے بلاکر وزیر سلطنت بنایا اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح رسول شاہیوں میں داخل تھے۔ لیکن وہ وضع اختیار نہ کی تھی۔ مرنے سے دو سال پہلے اپنے مرشد کی پوری پوری پیروی کرنے کے لئے صرف ایک بار چار ابرو کا صفایا کرایا تھا۔

سرسید کی والدہ نہایت دانشمند، نیک دل، پاک سرشت تھیں۔ ان کی تربیت و اخلاق کا سرسید کی حیات و سیرت پر خاص اثر ہوا ہے۔ ان کا خاندان حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا معتقد و مرید تھا۔ لیکن وہ خود حضرت شاہ غلام علیؒ سے ارادت رکھتی تھیں۔ ان کی خانقاہ میں نذر نیاز، تعویذ گنڈے کا رواج نہ تھا۔ اس لئے سرسید کی والدہ بھی ان چیزوں کی معتقد نہ تھیں۔ لیکن ان سے بالکل منکر و مانع بھی نہ تھیں۔

سرسید کا بیان ہے کہ "میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے ہاں کے بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس بچے کو دیا جاتا تھا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود (سرسید کے بیٹے) کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین کا انتقال ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں ہوا۔ والد کا ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں۔ بڑے بھائی سید محمد خاں منصف بمقام ضلع فتحپور کا ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں۔ والدہ کا ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں۔ سرسید کے بھائی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے اور بڑے پاک باطن تھے۔ ان کا مرنا اہل اللہ کا سا مرنا تھا۔ دسہرے کی تعطیل میں دہلی آئے تھے۔ وہاں بخار کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو بھی بخار آنے لگا۔ ان کو یقین ہوگیا کہ اب وقت آگیا۔ اسی حالت میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ گئے۔ اپنی قبر کے لئے جگہ پسند کی۔ جب قبر تیار ہوگئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ قبر میں اتر کر لیٹے۔ بہت پسند کی۔ دوسرے دن کفن کے لئے کپڑا منگوایا۔ سلوا کر پہنا۔ پسند کیا۔ پھر ایک دن حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ کو (جو ان کے پیر و مرشد کے سجادہ نشین تھے) بلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ اور تیسرے دن انتقال کیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے شیخ سعدیؒ نے کہا ہے:۔

عروسی بود نوبت ماتمت — چو بر نیک روزی بود خاتمت

مفتی صدرالدین خاں آزردہ نے جو سرسید کو ان کے بھائی کی تعزیت کا خط بھیجا تھا، اس میں یہ شعر لکھا تھا:۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت — مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

سرسید کی تعلیم | سرسید کی بسم اللہ کی تقریب حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ شاہ صاحب حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ نقشبندیہ کے خلیفہ تھے۔ سرسید کو شاہ صاحب سے بسم اللہ پڑھنے پر بڑا فخر تھا۔ بڑے ہو کر انھوں نے اس موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا، اور اپنی تقریب بسم اللہ کے ذکر پر اس شعر کو بھی پڑھا کرتے تھے:۔

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی — زفیض نقشبند وقت، جانِ[۱] جانِ جانانی

۱؎ جان جاناں حضرت میرزا مظہرؒ اور ان کی جان حضرت شاہ غلام علیؒ۔

اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید کے بعد فارسی و عربی پڑھی، صرف و نحو، معانی و بیان و بدیع، منطق و فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، تمام علوم میں بصیرت پیدا کی۔ فنِ طب بھی حاصل کیا اور چند مہینے مطب بھی کیا۔ دہلی میں جو اہلِ علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ۔ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ پھر نوکر ہونے کے بعد، جب فتحپور سے بدلکر دہلی میں آئے تو مولوی نوازش علی دہلی کے مشہور عالم و واعظ سے پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا۔ فقہ و اصول فقہ پڑھا، مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے مقاماتِ حریری و سبعہ معلقہ پڑھے۔ مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین صاحب کے خلف الصدق تھے، حدیث پڑھی۔ پھر قرآن مجید کی سندلی۔ استادوں سے تو اتنا ہی پڑھا، لیکن اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا۔ سر سید کے شوق علم کے متعلق یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ جب وہ دہلی سے قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک جانے لگے۔ اس وقت مولوی نوازش علی سے تکمیل تعلیم کر رہے تھے۔ مولوی صاحب سے کہا، آپ میرے ساتھ چلئے۔ انھوں نے عذر کیا کہ میرے پاس بہت سے طالب علم ہیں۔ ان کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ سر سید نے کہا سب کو لے چلئے۔ ان کے مصارف کا میں ذمہ دار ہوں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوے۔ آخر سر سید مولوی صاحب کو اور ان کے سب شاگردوں کو لے گئے، اور جب تک وہاں رہے سب کے اخراجات کے کفیل رہے۔ اور یہ لطیفہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ غازی پور میں سر سید کے پاس ایک یہودی سالم نام، صنعا (یمن) کا رہنے والا آیا، اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش میں پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سر سید نے پوچھا کیا تنخواہ لوگے؟ اس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے۔ سر سید نے کہا، میں تم کو پچیس روپیہ مہینہ دونگا، مجھے عبرانی زبان سکھاؤ۔ یہودی نے یہ سُن کر خوشی کے مارے بڑھ کر سر سید کی

داڑھی چوم لی، اور کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے
زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مُسرف اور آوارہ مزاج تھا، اس لئے
اس کو بقدرِ ضرورت دیتے رہے، اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ
وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اس کا چڑھا ہوا تھا، حساب کر کے اس کے حوالے
کر دیا۔

سرسید کی جوانی | سرسید کا زمانۂ شباب رنگین صحبتوں میں گزرا تھا، باغوں کی
سیر، میلوں، تماشوں، راگ رنگ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی
بڑے زندہ دل، بذلہ سنج، حاضر جواب تھے۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان
نہایت حسین تھی۔ لیکن اس کی ماں بھدی اور نیلے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں
جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مُجرے کے لئے آئی تھی، سرسید بھی تھے۔ اور وہیں
ان کے ایک ظریف دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے۔
"مادرش بسیار تلخ است" سرسید نے فوراً یہ مصرع پڑھا۔

گرچہ[۱] تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

لیکن بھائی کے مرتے ہی سرسید کا دل رنگین صحبتوں سے اُچاٹ ہو گیا۔ لباس اور
وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا۔ داڑھی
چھوڑ دی۔ پائنچے تشرع کر لئے۔ کُرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ
رفتہ کم ہونے لگی، اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا۔

سرسید کی ملازمت | سرسید کے والد کو قلعہ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے انتقال
کے بعد وہ آمدنی بند ہو گئی۔ معافی کی ملکیں بھی والد کی حیات تک تھیں، وہ بھی ضبط
ہو گئیں، تو ان کو سرکار انگریزی کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں

۱؎ یہ مصرع اس طرح ضرب المثل ہے۔ "صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد"

دہلی میں صدر امین تھے۔ انھوں نے ۱۸۳۸ء میں سرسید کو اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ پھر فروری ۱۸۳۹ء سے کمشنری آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے۔ وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں منصف مین پوری مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۸۴۲ء میں مین پوری سے فتحپور سیکری آگئے اور وہاں چار برس منصف رہے۔ فتحپور سیکری میں جہاں اکبر بادشاہ کی خوابگاہ تھی، حسن اتفاق سے وہی عالی شان مکان سرسید کو رہنے کے لئے ملا۔ یہ چاروں برس اسی مکان میں گزرے۔

اسی زمانے میں بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی نے سرسید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے سرسید کو بلا کر "جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" کا خطاب دیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۸۴۶ء میں فتحپور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔ یہاں سے دوبار قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک بھی گئے۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس گزرے تھے کہ غدر ہو گیا

غدر میں سرسید کی خدمات

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء (۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ) کو دہلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ مئی کو یہ خبر بجنور پہنچ گئی۔ وہاں اس وقت بیس یوروپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ مسٹر شیکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ تھے۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو یہ لوگ بہت گھبرائے۔ لیکن سرسید نے جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔" چنانچہ سرسید مع اور ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔

آخر باغیوں کو نشیب و فراز سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا اور سب کو رڑکی روانہ کر دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہو گئی۔ اور وہ لوگ سرسید کے اور ان کے رفقا میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہو گئے۔ سرسید نے ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا۔ لیکن باغی دشمن ہو گئے تھے اس لئے سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں میرٹھ کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں مختلف مقامات پر چند بار باغیوں نے ان کے قتل و غارت کا ارادہ کیا لیکن ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچا لیا۔ اثنائے راہ میں چاند پور سے چل کر سرسید نے پھراؤں پہنچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چند روز مولوی محمود عالم صاحب[51] کے مکان پر جو ان کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصل سرگذشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی۔ اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔

سرسید میرٹھ میں کئی مہینے رہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج کے

---

[51] مولوی محمود عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ خاکسار مؤلف کے پردادا تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد میں تھے۔ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ زمانۂ غدر میں اپنے وطن پھراؤں میں بغایت توکل اور سکون و وقار کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اہل قصبہ نے لوٹ مار کے ڈر سے اپنا زر و زیور ان کے پاس رکھ دیا تھا۔ مولوی محمود عالم صاحب رح مرزا غالب کے ہم عمر تھے۔ اور ان سے بھی مراسم رکھتے تھے۔ دہلی کی آمد و رفت کے زمانے میں سرسید سے بھی تعلقات قائم ہوئے ہوں گے۔ غالب سے دو سال پہلے ۴ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۸۶۷ء کو وفات پائی۔ سرسید کے قیام پھراؤں کا ذکر مولانا حالی کی "حیات جاوید" مطبوعہ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۱ سے ماخوذ ہے۔ باقی تمام حالات بھی اسی کتاب سے تقریباً مولانا حالی ہی کے الفاظ میں نقل کئے گئے ہیں۔

سپاہیوں نے ان کا گھر اسباب سب لوٹ لیا۔ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں۔ سرسید میرٹھ سے دہلی آئے۔ گھر تباہ ہوچکا تھا۔ ماں خالہ کو میرٹھ لیگئے۔ انگریزوں نے رڑکی میں اپنی فوج جمع کرلی۔ سرسید بھی تمام عملۂ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رڑکی بلالیے گئے۔ تمام روہیل کھنڈ سخت باغی تھا۔ بجنور، مراد آباد، بریلی کے ضلع سرکشوں کے زیر اثر تھے۔ ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لئے رڑکی سے فوج روانہ ہوئی۔ سرسید بھی ساتھ تھے۔ اس موقع پر سرسید نے کمال دلیری و دانشمندی سے کام لیا۔ حکام سرکاری میں یہ بحث پیش آئی کہ اب ان اضلاع سرکش میں کون لوگ باغی تصور کئے جائیں۔ سرسید نے اس باب میں افسران فوج سے گفتگو کی اور بہت بحث مباحثہ کے بعد یہ طے کرالیا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پائے جو بندوق لے کر سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو فسادات رعایا، ہندو مسلمان، دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں کئے، ان کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت اگر سرسید یہ جرأت نہ کرتے اور یہ فیصلہ نہ کرا دیتے تو ضلع بجنور بالکل تباہ ہوجاتا خصوصاً کوئی مسلمان اس ضلع میں باقی نہ رہتا۔ سرسید کی اس دانشمندی کے سبب سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا اور ضلع مراد آباد میں ضبط شدہ جاگیریں سب سے زیادہ واپس دی گئیں۔

خدمات غدر کا صلہ | گورنمنٹ کی خیرخواہی اور وفاداری جو سرسید سے ظہور میں آئی، وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاندپور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس کام کے لئے کمیٹیاں اور سبھائیں بنائیں اور گورنمنٹ کو میموریل بھیجے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ سرسید نے اردو کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اس وقت اُردو کے مخالفوں کی تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ ۱۸۸۲ء میں پھر ہندوؤں نے ایجوکیشن کمیشن کو میموریل بھیجے۔ سرسید نے باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا کہ یہ مسئلہ تعلیمی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا پولیٹکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی، ہندوؤں نے سر انٹونی مکڈانل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پھر ایک میموریل اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کے لئے پیش کیا۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج و الم کے سبب سے (جس کا سب سے بڑا باعث سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد کی علالت اور سوء مزاج تھا) ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے، مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا جو ۱۵ر مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ یہ غالباً ان کی آخری قومی تحریر تھی، اس میں بھی ان کی فطری صاف گوئی نمایاں ہے۔ مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں:-

"غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبہ کے ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر اُس زمانے میں، جبکہ صوبۂ بہار میں کیتھی حرف

اور بہار کی زبان بعوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ
معاون اس تجویز کے تھے، پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے
میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے مردہ مضمون کے اٹھانے
کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے،
اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں
پیش کی ہیں۔ اس وقت ہر آنر نے عدالتوں کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔
لیکن سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور رزولیوشن پاس ہوا جو
دونوں قوموں کو سر انٹونی مکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔ یعنی عدالت کی زبان
بجائے ہندی و اردو کے انگریزی قرار دی گئی۔

سرسید کا سفر لندن بھی قوم کی خاطر تھا۔ وہاں بھی قوم و مذہب کی خدمت سے غافل
نہ رہے، جس کا پہلے ذکر کیا گیا۔ ولایت سے آکر ایک رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا،
جس کا پہلا نمبر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۸۷ھ کو نکلا۔ اس پرچہ کے ذریعہ
سے اردو صحافت میں، انشا پردازی میں، اخلاق و معاشرت میں، عام معلومات میں اس
قدر ترقی اور اتنا اچھا انقلاب پیدا ہوا کہ اس زمانے کے بیسیوں اردو رسائل و اخبارات
سے نہ ہو سکا تھا۔ سرسید کے علاوہ بہترین اہل علم و قلم اس کے مضمون نگار تھے۔ "تہذیب الاخلاق"
کے بعض مذہبی مباحث سے مسلمانوں نے اختلاف کیا، جوابات لکھے، سرسید پر کفر کے
فتوے لگائے، اس رسالہ کے جواب میں رسالے نکالنے شروع کئے۔ یہ سب کچھ ہوا،
لیکن اس سے اردو زبان و ادب کو بڑا نفع پہنچا۔ "تہذیب الاخلاق" کی سلیس، با اصول،
پُر زور نثر نگاری نے تمام ملک میں یہی طرز نگارش عام کر دیا۔ تہذیب الاخلاق پہلی بار
۱۸۷۰ء (۱۲۸۷ھ) سے ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) تک جاری رہا۔ دوسری بار ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) سے ۱۸۸۱ء (۱۲۹۹ھ) تک۔

تیسری بار ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۷ء تک۔ سرسید کی وفات کے بعد "تہذیب الاخلاق" کی جلدوں سے سرسید، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک وغیرہ مضمون نگاروں کے مضامین کے مجموعے مرتب کر دئے گئے، جو ان بزرگوں کی مستقل تصانیف کا حکم رکھتے ہیں۔

سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ہی ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی۔ اس کے مقاصد کا اعلان پہلے سے اشتہار و اخبار کے ذریعہ سے کر دیا گیا تھا کہ "انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں، اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے، اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے، اور اس کام کے لئے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔" چنانچہ نواب کلب علی خاں بہادر رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں رئیس دانپور اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ کی۔ انعامی اشتہار جاری کیا گیا، تین انعام پانسو، تین سو، اور ڈیڑھ سو روپیہ کے مقرر ہوئے۔ میعاد معینہ کے اندر ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے موصول ہوئے۔ مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کا مضمون سب سے عمدہ تھا، مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔ اور پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ایم اے کو ملا، جو اس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے۔ دوسرا انعام نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو، اور تیسرا انعام مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسید نے ان مضامین سے رپورٹ تیار کر کے شائع کی۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ علی گڑھ کالج کی اسکیم بھی تھی۔ گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹوں نے قیام کالج کی تجویز کو پسند کیا اور ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ کیا۔

مجوزہ مدرسۃ العلوم[1] مسلمانان کے لئے سرمایہ جمع کرنے کے لئے سرسید نے کمیٹی خزینۃ البضاعۃ قائم کی۔ جس میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل نے دس ہزار روپیہ اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے ایک ہزار روپیہ دئے۔

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ اور یکم جون سے جماعت بندی ہوکر تعلیم شروع ہوگئی۔ قیام مدرسہ کی تاریخ مولوی مقصود حسین نے خوب کہی ہے۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:۔

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ کی ... بولا یہ مجھ سے ہاتف "اٹھ روزہ سے کچھ کہ"

۱۲۹۲ھ

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھا، اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہوگیا۔ ۱۸۸۳ء تک ایف اے، بی اے، ایم اے، اور قانون کے امتحانات کے لئے کلکتہ یونیورسٹی سے اس کالج کا الحاق ہوگیا۔ اس کے بعد سائنس، آرٹس اور قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی سے اس کا تعلق ہوگیا۔ اور آج وہی کالج مسلم یونیورسٹی بنا ہوا ہے۔

سرسید ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے دو قانونی مسودے کونسل میں پیش کئے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون، اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہوگئے اور اس وقت سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔ تیسرا نہایت ضروری و مفید مسودۂ قانون وقف خاندانی (یا وقف علی الاولاد) کے متعلق تیار کیا تھا۔ تاکہ ذی مقدور خاندانوں کی اولاد موروثی جائداد کو فروخت نہ کر سکے۔ اور وہ چھوٹے

---

[1] لفظوں میں عیسوی سنہ ظاہر کیا گیا ہے، اور اعداد سے ہجری سنہ نکلتا ہے۔

چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں نیلام نہ ہو سکے۔ لیکن اُس وقت مختلف وجوہ سے سرسید یہ مسودۂ قانون کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ اب "قانون وقف علی الاولاد" پاس ہو گیا ہے اور رائج ہے۔

اس کے علاوہ سرسید نے قانون انتقال جائداد، قانون حقوق استفادہ، قانون ترمیم ضابطہ فوجداری، قانون لوکل سیلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسطہ کے کونسل میں پیش ہونے پر جیسی پُر زور اور باوقعت تقریریں کیں، ان کو سُن کر کونسل کے انگریز ممبر اور خود وائسرائے بھی حیران تھے۔ سرسید برائے نام انگریزی جانتے تھے۔ اپنے دستخط کر سکتے تھے اور چند جملے ٹوٹے پھوٹے بول سکتے تھے۔ لیکن کونسل میں اسپیچ دینے کے لئے اکثر چھوٹی چھوٹی تقریروں کو وہ اول خود اردو میں لکھ کر ان کا انگریزی میں ترجمہ کراتے تھے۔ اور پھر انگریزی مسودہ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں پڑھتے تھے۔ اور بڑی بڑی اسپیچوں کو کونسل کا سکرٹری پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ سرسید کی ایک انگریزی اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی گئی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہ سنی تھی۔"

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید کونسل کے ممبر تھے، ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی۔ جس سے ان کا بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ (ماہر تعلیم) ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کمیشن کے چند سوالات یہ تھے:- "آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی کے زیادہ مفید ہوگی؟" "کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف قومی محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟" "گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم کی تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟" "گرانٹ ان ایڈ (امداد تعلیمی) کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟" "گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے، اور اس میں کامیابی کی کیا توقع ہے؟" اس طرح کے سب سوالوں کے

جواب سر سید نے نہایت دانشمندی، معاملہ فہمی، صداقت اور دلیری کے ساتھ دئے۔

۱۸۸۳ء میں سر سید نے "محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن" قائم کی، تاکہ اس کے چندے سے مسلمان لڑکوں کو انگلستان بھیجا جائے، اور سول سروس کے امتحان مقابلہ، یا ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری یا بیرسٹری، ڈاکٹری، انجینیری کا ڈپلوما حاصل کرنے میں اعانت کی جائے۔

۱۸۸۶ء میں سر سید نے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہ ہندوستان میں سب سے بڑی تعلیمی انجمن تھی۔ سر سید کی زندگی میں اس کے گیارہ اجلاس ہوئے۔ اتنے ہی عرصے میں اس کانفرس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی۔ بے شمار انجمنیں، مکاتب، اسکول قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں، تعلیمی مردم شماریاں ہوئیں، غیر سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ طالب علموں کو وظائف دئے گئے۔ اسی طرح سے مسلمانوں کی اصلاح حال اور ترقی تعلیم کا ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا گیا۔ یہ کانفرنس آج تک قائم ہے۔ گرچہ آجکل ملکی انقلابات اور سیاسی حالات کے سبب سے پہلی سی سرگرمی نہیں رہی۔

"انڈین نیشنل کانگرس" کی مخالفت بھی سر سید کا ایک کارنامہ ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس سے ایک سال پہلے کانگرس قائم ہوئی تھی۔ پہلے یہ مجلس بنگالیوں نے بابو سریندرو ناتھ بنرجی کی سعی و مشورہ سے کلکتہ میں قائم کی تھی اور اس کا نام "بنگال نیشنل لیگ" رکھا تھا۔ پھر اسی سے انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل کی گئی۔ پہلے اس کا جو مقصد مشتہر کیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اس کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے بعد مختلف پمفلٹوں کے ذریعہ سے جو خیالات شائع کئے گئے ان میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ حکومت کی برائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش

لوگوں کے دل پر برا اثر ہوتا تھا۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی سرسید نے دو سال تک کانگرس کی رفتار اور کارروائی کو بغور دیکھا۔ آخر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے کہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن (شورش) پھیلانا بعینہ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا۔ پس مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ایجی ٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں۔ چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جبکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور انڈین نیشنل کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سرسید نے کانگرس کے خلاف نہایت مفصل اور پرزور لیکچر دیا۔ اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں دوسرا لیکچر ایسا ہی طولانی دیا۔ اور پھر مضامین، تحریروں اور زبانی گفتگو کے ذریعہ سے علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم مسلمان کانگرس میں شریک ہوئے۔ اس کام میں کانفرنس کے وجود نے بھی مدد دی۔ دونوں کا انعقاد دسمبر کے ہفتہ آخری میں ہوتا تھا۔ اس لئے ہزارہا مسلمان کانفرنس کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے علی گڈھ میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (مجلس محبان وطن) اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگرس میں شریک نہیں ہیں، ان کی رائیں اور خیالات اور خط و کتابت بصورت پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائے۔ اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائے۔ اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسطہ، اضلاع شمال مغرب و اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگرس کے برخلاف جلسے کئے گئے۔ تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد، اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا۔

ان تدبیروں سے گورنمنٹ کو یقین دلایا گیا کہ کانگرس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔ سرسید ایک خط میں بدرالدین طیب جی کو کانگرس کے ایجی ٹیشن میں مسلمانوں کی شرکت کے نقصانات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ: "غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل چلے تھے، بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

سرسید کی گوناگوں خدمات کا یہ مختصر خاکہ ہے جو "حیاتِ جاوید" سے تقریباً مولانا حالی ہی کے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ان کی مذہبی خدمات شامل نہیں ہیں۔ ان کا ذکر ان کی تصانیف کے سلسلے میں آئے گا۔

سرسید کی تصانیف اور علمی و مذہبی خدمات

۱۸۳۵ء میں اخبارات کو آزادی ملی۔ اسی سال سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے دہلی سے سید الاخبار جاری کیا۔ سرسید کی سب سے پہلی علمی و ادبی خدمت اس اخبار میں مضمون نویسی تھی۔

(۱) جامِ جم (فارسی)۔ ملازمت آگرہ کے زمانے میں سرسید نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال لکھا۔ ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(۲) جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ مولفہ ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ)۔ مولود شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لیے سرسید نے اس رسالہ میں اس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتیں درج کیں۔

(۳) تحفۂ حسن، مولفہ ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ)۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ۔ یہ رسالہ شیعوں کی تردید میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سرسید نے کبھی شیعوں کے عقائد و اعمال سے تعرض نہیں کیا۔

(۵) التسہیل فی جر الثقیل۔ مطبوعہ ۱۸۴۴ء۔ ابو ذر یمنی کے عربی رسالہ سے کسی عالم

بوعلی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، اور "معیار العقول" نام رکھا تھا۔ سرسید نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس رسالہ میں مصنف نے جر ثقیل کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے، دبانے، نچوڑنے کے لئے پانچ کلیں بتائی ہیں، اور ان کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

(۵) آثار الصنادید۔ یہ کتاب سرسید کا نہایت عجیب و نادر کارنامہ و یادگار ہے۔ اور اردو میں اپنی نوع کی پہلی چیز۔ جس محنت و کاوش سے مرتب کی گئی اس کے لحاظ سے کم سے کم ہندوستان میں اور اردو میں آخری چیز بھی ہے۔ اس میں عمارت دہلی کا حال ہے۔ عمارات بیرون شہر، لال قلعہ و عمارت قلعہ، عمارات شہر دہلی، یعنی تمام حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باؤلیوں، کنوؤں وغیرہ کے حالات، ان کے نقشے، تصویریں، کتبے، دہلی کے پرانے شہروں، قلعوں، محلوں کا بیان، پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے، جس میں ایک سو بیس مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوشنویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اکثر عمارتوں کے عرض و طول و بلندی کی پیمائش کرنی، ہر عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے، ہر کتبے کا بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا، اور اس طرح سو سو سے زیادہ عمارتوں کی تحقیقات کرنی فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب سے پڑھے نہ جا سکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے، اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

باوجود اس قدر مشکلات کے "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ میں چھپ کر تیار ہوگیا۔ اس کی عبارت سرسید نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی، اس لئے رنگین و مقفیٰ تھی۔ سلیس و رواں نہ تھی۔ اُسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی ولایت جاتے تھے، وہ اس کا ایک نسخہ ساتھ لیگئے۔ اور وہاں جاکر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبروں نے بہت پسند کیا۔ اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ مسٹر رابرٹس نے دہلی واپس آکر سرسید کی شرکت سے انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ اس وقت سرسید نے اس پر نظر ثانی کی۔ پہلے ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ و تکلفات کے سبب سے بے مزہ ہوئی تھی۔ دوبارہ سادہ و سلیس عبارت میں لکھی گئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن غدر میں اس کے تقریباً تمام نسخے تلف ہوگئے۔ مسٹر رابرٹس کی بھی دہلی سے تبدیلی ہوگئی تھی اس لئے انگریزی کا ترجمہ بھی رہ گیا۔ لیکن فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرکے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی۔ اسی فرنچ ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا۔

"آثار الصنادید" کا تیسرا ایڈیشن منشی رحمت اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور میں ۱۹۰۴ء میں شائع کیا۔ جس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی خوبیاں جمع کردیں۔

(۶) کلمۃ الحق، مولفہ ۱۸۴۵ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے۔

(۷) راہ سنت در رد بدعت، مولفہ ۱۸۵۰ء۔ یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہل بدعت کے برخلاف، تبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔

(۸) نمیقہ دربیان مسئلہ تصور شیخ، مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان

میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے، جس میں تصورِ شیخ متعلقِ مشائخ نقشبندیہ کو
وسیلہ محبت خدا و محبت و رحمت الٰہی بتایا ہے۔

(۹) سلسلۃ الملوک، مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ اُن راجاؤں اور بادشاہوں کی مختصر مگر مفید
صحیح فہرست ہے جو دہلی میں پانچ ہزار برس سے فرماں روا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس
میں راجہ جدھشٹر سے ملکہ وکٹوریا تک ۲۰۲ بادشاہوں کا حال نقشہ و جدول کی صورت
میں لکھا ہے۔ جو اب آثار الصنادید کے تیسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ اور دوسرے
میں بھی تھی۔

(۱۰) قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین۔ اس رسالہ میں قدیم خیالات کے مطابق
سرسید نے زمین کی حرکت کو غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن بعد کو حرکتِ زمین کے قائل
ہو گئے تھے اور اس کو یقینی جانتے تھے۔

(۱۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، مترجمہ ۱۸۴۶ء۔ سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ
فرید الدین نے پرکار متناسبہ کے عمل پر، جو انھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے،
فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ سرسید نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا
ترجمہ اردو میں کیا، اور مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔

(۱۲) سیرتِ فریدیہ۔ سرسید نے یہ کتاب اپنے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کے
حالات میں لکھی ہے۔ اس میں اپنے بچپن کے حالات بھی درج کیے ہیں۔

(۱۳) تاریخ ضلع بجنور۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں سرسید صدر امین ہو کر بجنور گئے۔ وہاں
کلکٹر کی فرمائش سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔ کلکٹر نے اس کو گورنمنٹ میں بھیج دیا۔ ابھی
وہاں سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا۔ اور وہ غالباً آگرہ میں غدر کے سبب سے تلف ہو گئی۔

(۱۴) تصحیح آئینِ اکبری۔ شہنشاہ مغلیہ اکبر اعظم (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے وزیر و مشیر
ابو الفضل (متوفی ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) نے بادشاہ کے اصول و طریقِ سلطنت پر "آئینِ اکبری" لکھی تھی۔

اس کی فارسی زبان بالکل نئے طرز کی تھی، جس میں عربی کے الفاظ کم تھے۔ اور اسلوب بیان دشوار فہم تھا۔ کاتبوں کی بے پروائی سے اس کتاب میں غلطیاں بہت تھیں۔ سرسید نے بجنور میں ایک تاجر دہلی حاجی قطب الدین کی فرمائش سے آئین اکبری کی تصحیح کی۔ پہلی اور تیسری دو جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہوگئیں۔ دوسری جلد کی تصحیح میں دشواریاں تھیں۔ اس لئے اس کو مؤخر رکھا تھا۔ جب اس کی صحت مکمل ہوئی اور مطبع میں بھیجی گئی تو غدر ہوگیا۔ اور وہ ضائع ہوگئی۔ اس کی پہلی جلد خاکسار راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دہلی کے نامور لوگوں نے آئین اکبری پر تقریظیں[1] لکھی تھیں۔

---

[1] مولانا صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ کے علاوہ مرزا غالب نے بھی منظوم تقریظ مثنوی کی صورت میں لکھی تھی۔ اہل ہند کی فارسی انشا پردازی سے نفرت و تحقیر غالب کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اور انگریز پرستی کو انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس لئے "آئین اکبری" کی تعریف کرنا ان کے خلاف آئین تھا۔ چنانچہ اپنی تقریظ منظوم میں سرسید کی اس تصحیح کو ننگ و عارِ ہمتِ والا بتایا ہے۔ آئین اکبری کو "متاع کس مخر" کہا ہے۔ اس کے طرز تحریر سے اپنی انشا پردازی کو کنایۃً خوشتر بتایا ہے۔ سرسید کی اس کوشش کو "مردہ پروردن" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اکبر بادشاہ کے آئین و اصول حکمرانی کے مقابلے میں انگریزوں کی ریل، دخانی جہاز، تار برقی، بجلی کی روشنی وغیرہ کو سراہا ہے۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

مژدہ یاراں را کہ این دیرین کتاب ۔۔۔ یافت از اقبال سید فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی ۔۔۔ کہنگی پوشید تشریف نوی
دید کو تصحیح آئین رائے دست ۔۔۔ ننگ و عار ہمت والاے دست
کس مخر باشد متاعی این متاع ۔۔۔ خواجہ را چہ بود امید انتفاع
گر ز آئین می رود با ما سخن ۔۔۔ چشم بکشا اندرین دیر کہن
صاحبان انگلستان را نگر ۔۔۔ شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئین ہا پدید آوردہ اند ۔۔۔ آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

(باقی صفحہ ۲۹۵ پر)

(۱۵) تاریخ سرکشی بجنور، مراد آباد آکر لکھی۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقیہ تاریخ نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس میں بہت سی تحریریں اور یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لئے مواد جمع کرتے رہتے تھے، ایسی حالت میں، جبکہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، انگریزی عملداری بالکل اٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے، اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے، وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
فتنگ گردوں بگرداند دخاں — نرہ گاو و اسپ را ماند دخاں
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
حرز تحریرش اگر گوئی خوش است — نے فزوں از ہر چہ می جوئی خوش است
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است — گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مردہ پروردن مبارک کار نیست — خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

سرسید نے یہ تقریظ نہیں چھپوائی اور یہ کہہ کر کتاب کو واپس کردی کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ غالب کے کلیات فارسی میں چھپی ہوئی ہے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ جب سے سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا، مرزا غالب سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہوگیا تھا۔ اتفاق سے مرزا غالب ۱۸۶۰ء میں رامپور سے دہلی کو جاتے ہیں مراد آباد آئے۔ سرسید مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اسی حجاب کے سبب سے غالب نے ان کو اطلاع نہ دی تھی۔ وہ سرائے میں ٹھہر گئے تھے۔ سرسید کو معلوم ہوا تو فوراً سرائے میں پہنچے اور مرزا غالب کو مع اسباب اور (باقی صفحہ آئندہ پر)

(۱۶) رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ مراد آباد ہی میں یہ رسالہ بھی ۱۸۵۸ء میں لکھ کر چھپوایا۔ یہ بھی سرسید کی ملکی خیرخواہی، قومی محبت اور اخلاقی جرأت کی یادگار ہے۔ ہنگامۂ غدر میں گورنمنٹ عموماً اہل ہند سے اور خصوصاً مسلمانوں سے بدظن ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ تباہیاں مسلمانوں پر آئی تھیں۔ سرسید نے اس کتاب میں غدر کو حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔ اور تمام بدتدبیریاں اور سختیاں گنائی ہیں۔ سرسید نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل ہند نے سرکشی کے لئے پہلے سے کوئی سازش نہ کی تھی، مسلمانوں میں بھی جہاد کی کوئی سازش نہ تھی۔ اودھ کی ضبطی بھی اس عام فساد کا باعث نہ تھا۔ فوج میں باہم بغاوت کی صلاح بھی نہ تھی، باغی فوج کی پہلے سے بادشاہ دہلی سے بھی سازش نہ تھی، بلکہ بہت سی باتیں برسوں سے جمع ہو رہی تھیں۔ جن سے ہندوستانیوں کا دل گورنمنٹ سے پھٹتا جاتا تھا۔ اور سب کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت، قانون سازی اور مشورہ و تدبیر میں ہندوستانیوں کو کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۵)

آمزیوں کے اپنے مکان پہلے آئے۔ مرزا پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا آپ خاطر جمع رکھئے۔ میں نے اس کو بہت حفاظت سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا بھئی مجھے دکھا دو، تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ میں بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے ؎

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند   چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے" اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہو گئی۔ مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔

دخل نہ تھا، اور حاکم و رعایا کے درمیان تبادلۂ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گورنمنٹ کے احکام و قوانین کی مصلحت کو اہلِ ہند نہ سمجھ سکتے تھے بلکہ برعکس سمجھ لیتے تھے، اور ان کو سمجھانے کا کوئی وسیلہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے جو انتظامات کئے، اور جو قانون نافذ کئے ان سے ہندوستانیوں کو غلط فہمی پیدا ہوئی، اور انھوں نے اس کے دو نتیجے سمجھے۔ ایک یہ کہ سرکار ہندوستانیوں کو مفلس و تباہ کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مذہب میں مداخلت کرنا اور ان کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ یہ مسالہ مدتوں سے جمع ہو رہا تھا۔ اس کے بھڑک اٹھنے کے لئے کارتوس کاٹنے کا حکم اور نافرمانی پر میرٹھ کی فوج کو پابہ زنجیر کرکے رسوا کرنا اشتعال کا سبب بن گیا۔ بہرحال غدر کی معلومات کے متعلق سرسید کا یہ رسالہ آج بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ سرسید اگر اس کی مطبوعہ کاپیاں ہندوستان میں عام طور پر شائع کر دیتے، تو اہلِ ہند میں از سرِ نو جوش پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا، لیکن انھوں نے یہ دانشمندی کی کہ چھپوانے کے بعد اس کی ایک جلد گورنمنٹ انڈیا کو بھیج دی، اور چند جلدیں اپنے پاس محفوظ و مخفی رکھیں۔ باقی کچھ کم پانسو جلدیں سیدھی ولایت کو گورنمنٹ کے پاس بھیج دیں۔ وہاں اس کے ترجمے ہوئے، اس پر بحثیں ہوئیں۔ اکثر نے اس رسالہ کو سرسید کی خیرخواہی پر محمول کیا، لیکن بعضوں نے اس کی بنا پر سرسید کو غدار و مفسد قرار دیا۔ اور گورنمنٹ سے سرسید کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ سرسید نے شائع کرنا کیسا، کسی کو یہ کتاب دکھائی تک نہیں، تو وہ حیران رہ گئے۔

(۱۷) لائل محمڈنز آف انڈیا (ہندوستان کے وفادار مسلمان)۔ چونکہ غدر کے بعد گورنمنٹ کی چشمِ غضب سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھی۔ ان کی غداری کا ہر جگہ چرچا تھا، اور وفاداری کا کہیں ذکر نہ تھا، اس لئے سرسید نے مسلمانوں کے حالات کا ایک سلسلہ اس نام سے شروع کیا، اور اس کو اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ۲۷۳ صفحے چھپ کر اور شائع ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوا، اور تین نمبروں کے بعد ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

(۱۸) تحقیق لفظ نصاریٰ۔ غدر کے بعد بعض مسلمانوں کی ایسی تحریریں گورنمنٹ کو دستیاب ہوئیں جن میں انگریزوں کو "نصاریٰ" لکھا تھا۔ انگریزوں نے اس لفظ کو اپنی توہین و تحقیر سمجھا، اور یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حقارت سے "ناصری" (یعنی ناصرہ گاؤں کا رہنے والا) کہتے ہیں، اسی طرح مسلمان ہم کو "نصاریٰ" کہتے ہیں۔ اس بنا پر گورنمنٹ نے بعض مسلمانوں کو سزائیں دیں۔ سرسید کو جو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے زمانۂ قیام مرادآباد میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر مختصر رسالہ لکھ کر شائع کیا۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ ناصری سے مشتق نہیں ہے، بلکہ نصر مشتق ہے۔ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کو ناصری نہیں کہا گیا، نہ "قریۂ ناصرہ" کا کہیں ذکر ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عیسائی خود اپنے آپ کو "نصاریٰ" کہتے تھے۔ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار نے لکھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے، کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی! اس رسالہ کی اشاعت کے بعد کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔

(۱۹) تصحیح تاریخ فیروز شاہی۔ مرادآباد ہی میں سرسید نے ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح کی۔ یہ مورخ برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا تھا، بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں مشہور تھا۔ اس لئے اس کی یہ تاریخ، جو فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت کے متعلق ہے، بہت معتبر اور مستند ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لئے سرسید نے چار مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے تصحیح کی، اور سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔

(۲۰) تبیین الکلام۔ یہ تصنیف بھی سرسید کی قومی محبت، تدبر و دانشمندی، شوقِ علم و تحقیق، ہمت و استقلال کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کہاں سرسید اور ان کی قدیم رنگ کی تعلیم و سرکاری و قومی مصروفیتیں، اور کہاں توریت و انجیل کی تفسیر!

لیکن بقول مولانا حالی کے، "مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمتِ دشوار"۔ سرسید نے غدر کے بعد جتنی کتابیں لکھیں، ان سے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ عیسائی قوم اور انگریزی حکومت کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی اور غداری کا خیال رفع کیا جائے، دوسرے یہ کہ اسلام کی ہمہ گیری و رواداری اور مطابقتِ عقل و سائنس کو مسلمانوں کے ذہن نشین کر کے ان میں بیداری، روشن خیالی اور آزادیِ رائے پیدا کی جائے، اور انگریزوں سے میل جول ان کے علوم و فنون، اور ان کی حکومت سے فائدہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر سرسید نے پہلے انجیل کی تفسیر اور پھر قرآن کی تفسیر لکھی۔ "خطبات احمدیہ" اور اس کے مختلف مقالے جو علٰحدہ شائع ہوئے۔ وہ بھی اسی کام کے لئے تھے۔ بلکہ ان کے صدہا مضامین "تہذیب الاخلاق" کا بھی بیشتر یہی مدعا تھا۔

غدر سے پہلے جب دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثے ہونے لگے، اس وقت سرسید کو خیال آیا کہ اسلام کی حمایت میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ، جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے۔ مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا، وہ اسلام کو بدستور ظلم، خوں ریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے، اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لئے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضرور تھا، اسی طرح یہ بھی ضرور تھا کہ مناظرہ کے مخاصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل

ہونے کے لئے کوئی طریقہ اس بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے۔ اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں موافق یا مخالف ہیں ان کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہوگئی ہے رفع کیا جائے۔[۱]

اس تفسیر کے لئے عیسائی مذہب، بائبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے واقفیت ضروری تھی، اور بہت کچھ سامان درکار تھا۔ یہ سرسید کی بےنظیر ہمت و محنت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں خریدیں۔ ایک انگریزی خواں نوکر رکھا جو ان کا ترجمہ سناتا تھا۔ کتب احادیث و تفسیر سے سندیں بہم پہنچانے کے لئے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا۔ ایک یہودی سالم نام کو نوکر رکھ کر عبرانی زبان پڑھنی شروع کی۔ مولوی عنایت رسول چریاکوٹی عربی و عبرانی کے بہت بڑے عالم تھے، ان سے مدد لی۔ اپنی اردو تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کرانے کے لئے ایک یوروپین کو سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا۔ کئی ہزار روپیہ کا پریس ٹرڑکی سے منگوایا، اور اس کے لئے اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ چنانچہ تالیف کے ساتھ ساتھ طباعت بھی شروع ہوگئی۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں اور اس کا اردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔ تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں بڑی محنت اور تحقیق و تلاش سے لکھے ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت باہمی تنافر مذہبی کے دور کرنے کی تمہید ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی ناقدردانی و مخالفت، اور طباعت کی کثرت مصارف کے سبب

[۱] یہ عبارت بجنسہٖ مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" سے منقول ہے۔ دوسری کتابوں کے متعلق بھی اس سے پہلے اور بعد کی اکثر عبارتیں اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ البتہ کہیں مقدم و مؤخر اور مختصر کر دی گئی ہیں۔

سے دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔ ایک میں دس مقدمے اور دو تتمے ہیں۔ دوسری میں تفسیر۔ اس کتاب کا پورا نام سرسید نے یہ رکھا ہے:۔ "تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ و الانجیل علی ملۃ الاسلام"۔ ۱۸۶۲ء ۱۲۷۸ھ میں غازی پور میں شائع ہوئی۔ (اس کا نمونہ آئندہ درج کیا جائے گا)

(۲۱) علاج ہومیو پیتھک۔ بنارس میں سرسید نے ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کے رائج کرنے کی کوشش کی، شفاخانہ قائم کیا۔ اسی کے سلسلے میں ایک رسالہ بھی ۱۸۶۷ء میں لکھ کر شائع کیا۔

(۲۲) احکام طعام اہل کتاب۔ مسلمانوں کے دلوں سے انگریزی معاشرت کی نفرت دور کرنے، اور انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کی عادت ڈالنے کے لئے یہ رسالہ لکھا، اور قرآن و حدیث سے اہل کتاب کے کھانے کو جائز ثابت کیا۔ سرسید نے خود پہلے ہی سے انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے حسب عادت اس پر بھی بہت لے دے کی۔

(۲۳) سفرنامۂ لندن۔ سرسید نے اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو انہیں راہ میں پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کئے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

(۲۴) خطبات احمدیہ۔ سرسید کی مذہبی خدمات ماضی و مستقبل میں بہترین خدمت یہ تصنیف ہے۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں لکھیں، "اسباب بغاوت"، "تبیین الکلام" وغیرہ، وہ بھی قوم و مذہب کے سوز و درد کا نتیجہ تھیں، لیکن اُن میں دنیا کے مقاصد و فوائد کا خیال بھی شریک تھا۔ "خطبات احمدیہ" خالص اسلامی خدمت تھی۔ اس کے بعد سرسید نے تفسیر القرآن لکھی، اور وہ بھی دینی خدمت، اور اس سے زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی۔ لیکن وہ ایسا کام تھا جس کے سرسید اہل نہ تھے، جس کو ضروری سمجھنے میں سرسید سے غلطی ہوئی۔ جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر تھا، جیسا کہ اس کتاب کے ذکر میں بیان کیا جائے گا۔

"خطباتِ احمدیہ" کی ضرورت واہمیت اور اس کی تالیف کے لئے سرسید کی کوشش و
کاوش کا اندازہ مولانا حالی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں
اسلام تین خطروں سے گھِرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔
سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا، ان کی منادیوں میں، اخباروں اور رسالوں
میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی، اسلام کی برائیاں اور بانیٔ اسلام پر نکتہ چینیاں ان کی
تقریر و تحریر کا موضوع تھا۔ اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آجاتے تھے۔
دوسرے، مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی،
ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہوں میں کھٹکتے تھے۔ اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت و فساد کا
سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ تیسرے مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم
اور مغربی علوم و فنون کی طرف سے خطرہ تھا، جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتے جاتے تھے
اور جن سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، یہاں تک کہ خود سرسید کو یہ تعلیم پھیلانی پڑی۔
اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے عقائد و اعمال اور اصول و قوانین کی طرف
سے غلط فہمی پیدا ہو جائے۔

سرسید نے ان مقاصد کی طرف پہلے ہی بار اس وقت توجہ کی تھی جب مراد آباد
میں "تفسیر انجیل" کی بنیاد ڈالی۔ پھر جب سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغرب کی کتاب
لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی جس کی نسبت عیسائیوں
میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کی بیخ کنی میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت سرسید کی
بے چینی اور جوش و خروش کا عجب حال تھا۔ آخرکار جب انھوں نے دیکھا کہ غدر میں اسلامی
کتب خانے برباد ہو گئے اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لئے ضرورت ہے وہ
یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو ان کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو
برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان کے

اس سلسلے میں سرسید کی یہ خدمات بھی قابل ذکر ہیں کہ لندن پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک مصنف جان ڈیون پورٹ نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں ایک کتاب "محمد اینڈ قرآن" لکھی ہے۔ سرسید نے اس کے مضامین سنے اور بہت پسند کیے۔ مصنف کو اتنی استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے چھپواتا اور لندن کا کوئی پبلشر اس کے چھاپنے کی ہامی نہ بھرتا تھا۔ سرسید نے فوراً روپیہ کا بندوبست کر کے وہیں اس کتاب کو چھپوا دیا اور اس کی کئی سو جلدیں ہندوستان کو بھیج دیں۔ یہاں اس کا ایک ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن دہلوی نے کیا اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہوئے۔

انگلستان کے ایک اور ذی وقعت مصنف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو اس نے کسی زمانے میں اسلام کی تائید میں لکھی تھی وہ بالکل نایاب ہو گئی تھی۔ سرسید نے لندن میں ایک جرمن کتاب فروش کی دکان سے دس گنی قیمت پر خرید لی اور ہندوستان میں آ کر ان لوگوں کے لیے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اس کا اردو ترجمہ مولوی محمد احسن پروفیسر بریلی کالج سے کرا کے حمایت الاسلام کے نام سے شائع کر دیا۔

۲۵۔ رسالہ ابطال غلامی۔ یہ مضمون اگرچہ بقدر ضرورت "خطبات احمدیہ" میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول "تہذیب الاخلاق" میں شائع کیا اور پھر علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ علمائے اسلام کو تو یہ بھی احساس نہ تھا کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب و افریقہ میں جاری ہے اس میں کیا برائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق ہے یا نہیں۔ اور اس کی بھی پروا نہ تھی کہ عیسائی قومیں اسلام پر بڑا طعن کرتی ہیں کہ اس نے لونڈی غلام بنانا جائز کیا ہے۔ اگرچہ اٹھارویں صدی تک یورپ و امریکہ میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی اور

وہاں غلاموں کی جو حالت زار تھی، اس بے رحمی اور سنگدلی کی اسلام میں مثال نہیں پائی جاتی۔ لیکن انیسویں صدی سے وہاں غلامی کا بالکل انسداد ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرنے میں دلیر تھے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہایت مدلل طریقے سے ثابت کیا کہ اسلام نے اوّل اوّل غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور آزاد کرنے کی ترغیب دی اور پھر اس رسم کو بالکل ممنوع کر دیا۔ سرسید کے بعض دعووں اور دلیلوں میں علمائے اسلام سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲۶) تفسیر القرآن۔ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں کمال جرأت سے کام لیا۔ ان کے پیش نظر وہی خطرے تھے جو "خطبات احمدیہ" کے لکھنے کا باعث ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ و سائنس پڑھ کر اسلام کے ہر عقیدہ و قانون کو عقل سے جانچیں گے، اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اس لئے سرسید نے یہ طے کر لیا کہ اسلام کے ہر عقیدے، ہر قانون، ہر حکم، ہر قضیے کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے اور جو اس کسوٹی پر کھرا نہ نکلے اس کو مسلمانوں کے باہر کر دیا جائے۔ سرسید کا یہ خیال صرف ایک حد تک درست تھا۔ یعنی اسلام کی بہت سی باتیں عقل انسانی اور قدرت کے قوانین معلومہ و مسلمہ کے بالکل موافق ہیں۔ بلکہ جملہ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جس کی صداقت و فضیلت کی علم و عمل اور عقل و تجربہ نے ہمیشہ تصدیق کی ہے، تصدیق کرتے چلے جاتے ہیں، اور تصدیق کرتے رہیں گے۔ لیکن نفس مذہب ایسی چیز ہے جس میں بعض اَن دیکھی اور ان سمجھی باتوں کے ماننے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اور اسلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ نہ مستثنیٰ ہونے کی ضرورت ہے نہ مستثنیٰ ہونا ممکن ہے۔ مثلاً سب سے پہلے خود خدا کی ہستی اور یکتائی ہے جس پر آج تک کوئی عقلی اور علمی دلیل ایسی قائم نہیں ہو سکی جس کی تردید نہ ہو سکی ہو اور جس کو سب نے بالاتفاق مان لیا ہو، اسی لئے

ہر زمانے میں منکرانِ خدا پائے جاتے ہیں۔ لیکن خدا نے اپنی ذات کے ایمان و یقین کو
ایسی وجدانی چیز بنایا ہے کہ وہ بے دیکھے نظر آتا ہے اور بے چھوئے محسوس ہوتا ہے۔
اسی سبب سے خدا کے ماننے والوں کے مقابلے میں نہ ماننے والے نہ ہونے کے برابر
ہیں۔ دوسری چیز روح ہے، جس پر تمام دین و آخرت کا انحصار ہے، جس کے وجود کا
ہر شخص کو یقین ہے، اور جس کی حقیقت کی جستجو ازل سے آج تک ہو رہی ہے، لیکن
معمہ حل ہونے میں نہیں آتا۔ خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لوگوں نے روح
کے متعلق سوال کیا، اور خود اللہ تعالیٰ نے حضور کو اس کا جواب سکھایا۔ فرمایا:
يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (لوگ تم سے روح کو پوچھتے ہیں کہہ دو
کہ روح ایک حکم خدا ہے)۔ اس "امر رب" یا حکم خدا سے آگے ایک نکتہ اور ایک حرف بھی
کوئی فلسفی و سائنس داں آج تک نہیں بتا سکا۔ اور باوجود اس کے کوئی شخص روح سے
انکار نہیں کر سکتا، اور سب نہیں تو اکثر و بیشتر روح کو غیر فانی مانتے ہیں۔ تیسری چیز عمل،
چوتھی خواب، پانچویں الہام یا وحی، چھٹی عالم مثال یا برزخ، ساتویں حیات بعد الموت۔
اسی طرح کتنی چیزیں ہیں جن کی ماہیت و حقیقت معلوم نہیں، لیکن ان کا قائل ہوئے
بغیر بھی چارۂ کار نہیں۔ اسی لیے اسلام و قرآن سے نفع و ہدایت حاصل کرنے کے
لیے "ایمان بالغیب" کی شرط لگا دی گئی ہے۔ فرمایا ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ
يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (یہ کتاب قرآن ان پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے
ہیں)۔ اس لیے نوجوانوں اور نئے روشن خیالوں کو سب سے پہلے یہی سمجھانا تھا کہ اگرچہ
اسلام کا کوئی عقیدہ و عمل، کوئی حکم و قانون اصول طبیعی، قوانین فطرت یا سنت اللہ کے
خلاف نہیں ہے، لیکن انسان کی عقل تمام طبیعت کے اصول اور فطرت کے قوانین کا
احاطہ نہ کر سکی ہے نہ کر سکتی ہے۔ انسانی عقل و علم اور تجربہ و مشاہدہ پہلے بہت محدود
تھے، پھر ان میں وسعت ہوتی گئی اور برابر ہوتی جائے گی۔ لیکن بہرحال وہ کبھی غیر محدود

اور ہمہ گیر و ہمہ داں نہیں ہو سکتے۔ ولیم ہاروے نے جب اعلان کیا کہ خون انسان کے جسم
میں برابر دورہ کرتا رہتا ہے، تو لوگوں نے غصے میں آکر اس کے پتھر مارے کہ کیا بکتا ہے۔
ہمارے بزرگوں نے تو کبھی یہ بات نہ کہی تھی۔ لیکن اب گردشِ خون گویا آنکھوں دیکھی چیز
ہے۔ اور اس پر فنِ طب اور علاج الامراض کے کتنے مسئلے مبنی ہیں۔ نیوٹن نے "نظریۂ
ثقل" ثابت کیا، اور نظامِ عالم اسی پر ڈھال لیا گیا۔ اس کے بعد آئن اسٹائن نے
"نظریۂ اضافیت" کو تسلیم کرا دیا، تو اسی کے سامنے گردن خم کر دی گئی۔ آئندہ کوئی
شخص "نظریۂ وصفیت" (؟) منوا دے گا تو اسی پر ایمان لے آئیں گے۔ مسمریزم اور
ہپناٹزم کے کرشموں سے کسی کو انکار نہیں۔ متقدمین کے اشراق و کشف کے سب منکر ہیں۔
ریڈیو میں دہلی و بمبئی و لندن کی خبریں آگرہ میں بیٹھے سنتے ہیں۔ لیکن حضرت عمر فاروق
رضی اللہ عنہ کی آواز "یا ساریۃ الجبل" (اے ساریہ پہاڑ کو دیکھو) ہزاروں میل پر حضرت
ساریہ رضی اللہ عنہ کو پہنچ گئی تو اس کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں۔ محض اس لیے کہ حضرت عمرؓ
کسی مشین کے پاس کھڑے ہو کر نہ بولے تھے، اور حضرت ساریہ کے سامنے ریڈیو کا بکس
نہ رکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ آلات کے ذریعہ سے آواز رسانی کا اصول دریافت ہو گیا ہے۔
بغیر اسبابِ ظاہری کے آواز سننے کا گُر ابھی ہاتھ نہیں آیا ہے۔ آگ پر چلنا اب بچوں کا
کھیل ہو گیا ہے، پانی پر چلنے کا بھید ابھی نہیں ملا۔ اب وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ ریڈیو پر
بولنے والے کی آواز کے ساتھ صورت بھی سامنے آجایا کرے گی، اور ہم آگرہ میں لکھنؤ کا مشاعرہ
دیکھ بھی کریں گے اور سنا بھی کریں گے۔ پھر کیا تعجب ہے اگر شبِ معراج کی صبح کو حضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ مکہ کو بیت المقدس کا پورا نقشہ بتا دیا اور فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے لا کھڑا کیا کہ دیکھتا جاؤں اور بتاتا جاؤں۔
کسی شخص کو لٹا کر اس کے ننگے پیٹ پر تلی کے اوپر تلوار کی دھار رکھ کر تلوار کے دونوں
سرے پکڑ کر زور سے دبائیے کہ تلوار کھال کے اندر آدھی غائب ہو جائے، نتیجہ کیا ہوگا؟

پیٹ اور تلی پھٹ جائے گی، لیکن آج بیسویں صدی میں ہندوستان کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو تلی کے مریض پر یہی عمل کرتے ہیں، اور ایک دفعہ نہیں، پیٹ پر جگہ جگہ بار بار تلوار رکھ کر اسی طرح دباتے ہیں۔ آج تک کسی کا پیٹ نہیں پھٹا۔

اس طولانی تقریر کا مقصد یہ ہے کہ سرسید کا تفسیر القرآن میں تمام معجزات و خرقِ عادت اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا، ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا، جنوں سے صحرائی جانور مراد لینا وغیرہ وغیرہ اصلاحی نظر سے غیر ضروری تھا، وہ اسے نگاہ میں غلط فہمی پر مبنی۔ چنانچہ مولانا حالی کی بھی یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں: "آخر عمر میں سرسید کی خود رائی جو ہمیشہ ان کو بہت زیادہ رہی تھی، وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی سے وہ ایسے معنی پیدا کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسے معانی ان آیات کا مراد ہو سکتے ہیں اور وہ انھیں کو صحیح سمجھتے ہیں۔"

سرسید نے ایمان بالغیب کی اہمیت و ضرورت پر نظر نہیں کی۔ انھوں نے یورپ کے ایک فلسفی کو متن کا یہ مقولہ نہ سنا تھا کہ "وہ شخص جو صرف ان چیزوں پر عقیدہ رکھتا ہے جن کو وہ پوری طرح سمجھتا ہے، تو اس کا مذہب بہت ہی مختصر ہے، اس کا مذہب بہت چھوٹا ہے۔" اس قسم کی باتوں کے علاوہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے دوسرے مسائل کی تشریح و توجیہ میں البتہ کمال کیا ہے۔ مثلاً قصص قرآنی پر عیسائیوں کو اعتراض تھا کہ غلط بیان ہوئے ہیں، یا بعض واقعات کی صحت سے کوئی اصل ہی نہیں۔ سرسید نے ہر ایسے قصے یا واقعہ کا بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن و بائبل کی تطبیق کی ہے، یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جب قصے کا پتہ موجودہ بائبل میں نہیں لگا اس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ اسی طرح ارکان و فرائض اسلام نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مصالح بیان کئے ہیں۔ جہاد اسلام کی تشریح اس قدر واضح و مدلل طریقے سے کی ہے کہ اس پر انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسی طرح تعدد ازدواج، طلاق، غلامی وغیرہ قوانین و احکام کی تفسیر قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

اگر سرسید ایسے پوری تفسیر اور آیت آیت کی تشریح و توجیہ کے بجائے صرف ایسے

ہی مسائل پر الگ الگ مضامین لکھ دیتے، تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہرحال ان کی نیت بخیر تھی، ان کے خلوص و صداقت میں کوئی کلام نہیں، اس لئے ان کو خطائے اجتہادی پر بھی ثواب ملے گا۔ سرسید پر اس سے پہلے بھی کفر کے فتوے لگائے جا رہے تھے، یہ تفسیر دوسمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا۔ انھوں نے کافر گروں کو اپنے اس شعر سے جواب دیا ہے:-

خدا دارم، دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و ساماں کہ من دارم

اسی کے ساتھ کا دوسرا شعر ہے:-

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

تفسیرِ قرآن کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی، اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اور جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ وہ چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک، اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیا تک، اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السمٰوات، ازالۃ الغین فی قصۃ ذی القرنین، ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم وغیرہ، جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہئے، سرسید سے یادگار رہ گئے۔

(۲۷) النظر فی بعض المسائل۔ چند مسائل اسلامی و قرآنی پر بحث کی ہے۔

(۲۸) سفرنامۂ پنجاب۔ علی گڑھ کالج کی کوشش کے سلسلے میں سرسید نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے جو لکچر دئے اور تقریریں کیں وہ سب برجستہ و برمحل زبانی تقریریں تھیں، لیکن سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہو گئے۔

(۲۹) جواب اُمّہات المومنین۔ یہ گویا سرسید کی آخری تصنیف ہے۔ کسی ولیسی عیسائی نے حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے تعدد ازدواج پر اعتراض کیا،

"ازالۃ اوہام" (؟) "امہات المومنین" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ سرسید نے باوجود ضعف و مرض کے اس کا جواب لکھا۔

(۲۰، ۲۱) انشاء اللہ۔ نادان خدا پرست۔ یہ دو مضمون قصہ کے طور پر سرسید نے لکھے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہونے کے بعد ان کو الگ بھی چھاپ دیا گیا۔

(۳۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ سرسید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" تین دفعہ کر کے گیارہ بارہ برس جاری رہا۔ اس میں اور لوگوں نے بھی مضامین لکھے، لیکن سب سے زیادہ سرسید کے مضامین ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے سب مضامین علیحدہ چھاپ دئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی سرسید کی ایک تصنیف ہے۔ یہ رسالہ اردو کا پہلا رسالہ نہ تھا۔ اس سے پہلے درجنوں نکل چکے تھے اور نکل رہے تھے لیکن مضمونوں اور مضمون نگاروں دونوں کے لحاظ سے ہندوستان کا بہترین پرچہ تھا۔ سرسید کے مجموعہ مضامین میں زبان اور بیان مضمون کی ایسی رنگا رنگی، اتنی جدت، اس قدر دلکشی ہے کہ بغیر مطالعہ کے اندازہ دشوار ہے۔ اس میں مذہبی، قومی، اخلاقی، اصلاحی، ہر قسم کے مضامین ہیں۔ اور ان کے اسلوب نگارش میں فکر و تخئیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، متانت و جزالت، شوخی و ظرافت ہر رنگ کا حسب موقع جلوہ ہے۔ بعض نمونے پیش کئے جائیں گے۔

(۳۳) خطوط سرسید۔ سرسید کے پوتے مرحوم سر راس مسعود نواب مسعود جنگ، متوفی ۱۹۳۷ء نے چند سال ہوئے ان کے خطوط کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ غالب کے بعد سرسید پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان و ادب اور علم و عمل کے نقطہ نظر سے دلکش اور فائدہ کا گنجینہ ہیں۔ ان میں پرائیوٹ خط بھی ہیں۔ اور قومی و ملکی و مذہبی معاملات کے متعلق بھی۔ صرف ان خطوں سے بھی سرسید کی سیرت و اخلاق کا صحیح و اصلی نقشہ مرتب ہو سکتا ہے۔

(۳۴) مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ سرسید کی تمام تقریریں یکجا شائع کر دی گئی ہیں۔

سرسید کا طرزِ تحریر اور اس کے نمونے (۱) دورِ قدیم۔ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے غالباً ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں دہلی سے "سید الاخبار" جاری کیا۔ سرسید نے سب سے پہلے اس میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۷ء تک متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب کا اسلوبِ تحریر قدیم ہے یعنی الفاظ کی بے محل تقدیم و تاخیر یا قواعد سے بے پروائی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں "وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور نثریوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد رہتے تھے۔" اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ یہ بے پروائی دانستہ تھی یا فی نفسہ پسندیدہ، ضروری اور قابلِ تقلید ہے۔ بلکہ سرسید کے زمانے میں قواعدِ زبان کی پابندی سخت نہ تھی۔ الفاظ کی بے ترتیبی عام تھی، چند نثر والوں پر کثرت دستور ہوتا تھا کہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد رکھتے تھے۔ متعلقاتِ فعل کو فعل کے بعد رکھ دیتے تھے۔ بعض فارسی اسلوب اور فارسی محاورات کے ترجمے اس زمانے میں مستعمل تھے جو اب نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں سرسید کی تحریر میں بھی ہیں لیکن یہ بات نہیں کہ ان کو اس کا احساس نہ تھا۔ اصل میں عادت یوں ہی تھی۔ ان کے ہم عصروں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو یہی عادت نہ ہو۔ غالب کے رقعے خالص ادبی ٹکڑے ہیں لیکن وہاں بھی غالب کی اس عادت کی یادگاریں موجود ہیں۔ یہ عادت رفتہ رفتہ چھوٹی ہے۔ سرسید کے رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" میں جا بجا ایسے فقرے ہیں جو تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بہت کم ہیں۔ "اسبابِ بغاوت" کا ایک فقرہ ہے "جس کی یعنی انگریزی گورنمنٹ کی ابتدا ۱۸۰۳ء وقت شکست ہونے مرہٹوں دلی کے پاس سے شمار ہوتی ہے" یہ تعقید بعد کو قریب قریب جاتی رہی۔ "وہ" کی جگہ "وے" انھوں نے بعد کو بہت کم کر دیا تھا۔ "کر کے" کی جگہ "کرکر" آخر تک لکھتے بولتے رہے۔ ان لفظوں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ التزام کے ساتھ بولتے تھے۔ بلکہ جیسا چاہا کہہ دیا۔ اسی طرح "چونکہ" کی جگہ "جو کہ" لکھتے تھے۔

اسباب بغاوت ہند کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:-

لیجس لیٹیو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوئے، بخوبی معلوم نہیں ہو سکی، اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کو واجبات سے تھا، ملحوظ نہیں رہیں، اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی، بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی، ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے ورنہ اس تجویز سے واقف نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی۔ اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعضی باتیں جو درحقیقت گورنمنٹ سے بہ صدق دل اور مخالف طبیعت و طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس کے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں یا بری، زیادہ تر ان کے سوء خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی، اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں، اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔ اور کوئی شخص ان کے اس بات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس خیال کے دور کرنے والی نہ تھی۔ جبکہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیے، تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے، اور جبکہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی تو ان سوء خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ ان کے دل پر تھا اس کا علاج نہ ہونا، صرف اسی سبب سے تھا کہ لیجس لیٹیو کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے۔

گر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہوتی جاتیں ... اب اگر غور سے دیکھو جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے یہی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستان میں یہ فساد کر دیا۔"

اس اقتباس میں سرسید کے طرز تحریر کے علاوہ ان کا نرم و گرم بیان، صاف گوئی، جرأت اور صحتِ رائے بھی قابل دید ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا وہ زمانہ (۱۸۵۸ء) ہے جب نتائج و مواخذات غدر سے امن بھی نہ ہوا تھا۔ اور یہ وہ تحریر ہے جو سرسید نے ولایت بھیجنے کے لئے چھپوائی گئی تھی، چنانچہ سب سے پہلے لندن کی گورنمنٹ نے دیکھی، ترجمہ کرائی اور اس پر رائے زنی کی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سرسید نے اپنی زندگی میں اس کو دوبارہ نہیں چھپوایا۔ پھر ۴۵ برس بعد علی گڈھ کالج کے "ڈیوٹی بک ڈپو" نے ۱۹۰۳ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ وہی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے۔

آثار الصنادید کا اقتباس یہ ہے:-

نشیمن ظلِ الٰہی یا سنگین تخت

"اس مکان کے بیچوں بیچ میں شرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا تخت ہے چار گز کا مربع۔ اور اس پر چار ستون لگا کر بنگلے کے طور پر اس کی چھت بنی ہے، اور آدمی کے قد سے زیادہ کرسی دی ہے، اس کے پیچھے ایک طاق ہے سنگ مرمر کا بنا ہوا، سات گز لمبا ڈیڑھ گز کا چوڑا، اس پر پتھر ہر قسم کے چرند و پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں ایک آدمی کی تصویر ہے جو طنبورہ بجا کر گا رہا ہے۔ ملک اٹلی میں جو فرنگستان میں واقع ہے، آرفیوس کلاونت کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سن کر مست ہو جاتے تھے، اور اس کے گرد آ بیٹھتے تھے۔ اسی ملک میں رفیل ایک مصور تھا کہ تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس مصور نے آرفیوس کے گانے کی جو کہانی مشہور تھی اس کے مطابق اپنے خیال سے ایک مرقع کھینچا تھا، اور چرند پرند اس کے گرد گانا سننے کو

بیٹھے ہوئے بناتے تھے۔ یہ صورت ۱۵۲۰ء میں مرا نگرہ یہ مرقع اس کا بنایا ہوا ملک اٹلی اور ولایت فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے، اور اب تک اس کی تصویر موجود ہیں۔ نہ ہی مرقع اس طاق میں پتھر کی پچیکاری میں کھود ہے۔ پس یہ تصویر اسی کی نقوش کی ہے۔ اور چونکہ اس مرقع کا سوائے فرنگستان کے اور کہیں رواج نہ تھا۔ اس سبب سے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی انگریز اٹلی کے ملک کا شریک تھا۔ اس محراب کی بغل میں دروازہ ہے، اور اندر سے بھی آنے کا رستہ ہے بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے امرا میں سے جس کسی کو عرض کرنا ہوتا تھا، اس تخت پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ یہ تخت اتنا اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا گلا تخت تک پہنچتا ہے :

یہ تحریر "اسباب بغاوت" سے جو رسالہ ہے (۱۸۵۴ء) کی ہے۔ اور اسی اسلوب کی ہے۔

(۲) دورِ جدید۔ غدر کے بعد جب سرسید نے اپنا مقصد حیات، مسلک زندگی اور لائحۂ عمل متعین کر لیا، اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے قومی و ملکی، مذہبی و معاشرتی، اصلاحی و اخلاقی، علمی و تعلیمی خدمات شروع کیں، اس وقت سے ان کے فکر و قلم اور زبان و بیان کا اصلی جوہر اور حقیقی کمال نمایاں ہوا۔ ان سے پہلے کسی ایک شخص کے زبان و قلم سے اس قدر گوناگوں مضامین ادا نہ ہوئے تھے۔ سرسید کی مختلف موضوعات کی کتابیں، اخبار و رسالہ کے مضامین، پبلک تقریریں اور پرائیویٹ خطوط شاہد ہیں کہ ہر نوع کی بہتر سے بہتر تحریر کی بنیاد ڈالنے والے سب سے پہلے سرسید ہیں۔

سرسید کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی، بیان کا جوش، طرزِ ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت، اس قدر کثرت، صحت اور

موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی۔ ان کے ساتھیوں میں ان سے بہتر نہ
تھی، اور ان کے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہی کے اتباع کی بدولت تھی۔ سرسید پیچیدہ سیاسی
مسائل، باریک مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو نہایت صفائی، سادگی، بے تکلفی اور
زور و قوت کے ساتھ بیان کر سکتے تھے۔ ان کی برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں
بھی وہی انداز پیدا ہے، جو غور و فکر سے لکھی ہوئی کتابوں و مضامین میں ہے۔ حسب موقع
اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و سنجیدگی سے برمحل کام لینا، جذب و تاثیر پیدا کرنا ان کے لئے
بالکل فطری و طبعی بات تھی۔ کسی خاص کوشش و ارادہ کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ
ہوتی تھی اور صحیح انداز خود بخود پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ دوست کے بولنے کی ان کو عادت
تھی بے تکلف ان کو استعمال کر دیتے تھے۔ یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اس زبان کو اہل دہلی
کیا اور کس طرح بولتے ہیں۔ دینی، علمی، فلسفیانہ، سائنٹفک، تنقیدی مضامین اس قدر [illegible]
بیان کرتے تھے کہ اس فن میں گویا ان کو قابلیت حاصل تھی۔ بعض مضامین میں علماء سے
یورپ کی فکر و رائے پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ بعض میں عرب و عجم کی تحقیق پر نقد و نظر
کی ہے۔ اپنے زمانے کے اہل قلم اور اپنے مخالفوں کے مباحث کی تنقیح کی ہے۔ خود
سرسید کی تصانیف میں تاریخ و سیرت، مذہب و اخلاق، سیاست و حکمت وغیرہ موضوعات
شامل ہیں۔ ہر جگہ سرسید کا جوش بیان اور زور قلم نمایاں ہیں۔ اور انہوں نے اردو زبان
میں ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ جہاں ان کو اصابت رائے
حاصل نہیں ہے وہاں بھی ان کا خلوص و دلسوزی ناقابل انکار ہے۔

مزاح و ظرافت سرسید کا فطری رنگ تھا۔ لیکن یہ موقع و محل پر صرف ہوتا تھا۔
خصوصاً پرائیویٹ خطوط میں یا مخالفوں کے مباحثہ میں اس رنگ کی شوخی نہایت دلچسپ
اور کارگر ہے۔ جذب و اثر پیدا کرنے کے موقع پر کوئی روحانی قوت ان کے اندر کام
کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب ان کے مختلف اسالیب بیان کے نمونے ان کی تصانیف،

ٹکڑوں اور خطوں سے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) تبیین الکلام (تفسیر توراۃ و انجیل) مطبوعہ ۱۸۶۲ء کے مقدمۂ تاسعہ میں لکھتے ہیں:-

"اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک لفظ یا ایک فقرہ کئی معنی رکھتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں دوسری زبان کا ایسا لفظ نہیں ہوتا جس سے وہ سب معنی حاصل ہوں۔ اس لئے مترجم مجبوری یا تو اس کا ترجمہ کسی ایک پہلو پر کرتا ہے، یا صرف بموجب اپنی رائے اور اپنے اعتقاد اور اپنے مسلمات کے اس کا ترجمہ کر دیتا ہے جو درحقیقت کلام الٰہی کی وسعت کو تنگی میں ڈالتا ہے، کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ جب تک بذریعہ الہام کے کوئی خاص معنی کسی کلام الٰہی کے مقرر نہوے ہوں، اس وقت کلام الٰہی سے جس قدر مطالب ہوں اُن سب کو سمجھے اور سب پر غور کرے، اور جو مطلب حق اور صحیح ثابت ہو اس کو اختیار کرے۔ پس جبکہ مترجم نے اس کلام الٰہی کو جس میں متعدد پہلو تھے ایک پہلو پر جو اس کے اعتقاد کے مطابق تھا، ترجمہ کر دیا تو اس نے ایک عام حق تلفی کی، خصوصاً اس صورت میں جبکہ اس کا اعتقاد جس کے بموجب اس نے ترجمہ کیا درحقیقت غلط ہو۔ ان وجوہات سے ہم مسلمانوں کے ہاں ضرور تر ہے کہ جس زبان میں مذہب کی اصلی کتابیں ہوں اس زبان سے واقف ہونا چاہیے، اور جب تک اصل زبان سے واقفیت نہو، صرف ترجمہ پر اعتقادیات میں اعتماد نہیں ہو سکتا۔ دیکھو کیسی غلطی کی کتنے بڑے مترجم یکویلا اور تھیوڈوشن اور سیمیکس نے کہ کتاب اشعیاہ باب ۷، درس ۱۴ میں جو "علمہ" کا لفظ عبری زبان کا تھا، اس کا ترجمہ بجائے "کنواری" کے "جوان عورت" کر دیا۔ اس لئے ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے کہ جب تک بخوبی صحت نہو جاوے، اس وقت تک ترجموں کی نہ تصدیق کرنی چاہیے نہ تکذیب کرنی چاہیے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جو کچھ خدا نے اُتارا ہے اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔"

(۲) خطباتِ احمدیہ میں "تعددِ ازدواج" پر بھی نہایت طویل و مدلل بحث کی ہے۔ اس کے ایک حصے کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعددِ ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا، جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا، جو قانونِ قدرت کے برخلاف نہ ہو، اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے، اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت، اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو، اور یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے:
فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) ...... اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا و علما نے لیے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعددِ ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر شدِ ضرورت کے کبھی تعددِ ازدواج کی، جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، جرأت نہیں کرےگا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعی ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ اِنْ لَمْ تَعْدِلُوْا[1] بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا[2]۔ پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] یعنی اگر عدل نہ کر سکو۔

[2] یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے۔

(۳) تفسیر القرآن میں "سورۂ توبہ" کی تفسیر میں مسئلہ جہاد پر بحث کرتے ہوئے آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات (لڑائیوں) کی نسبت لکھتے ہیں:-

"تمام انبیا جبکہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں۔ اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا مگر بعد حضرت مسیح کے اس کے لئے یہ زمانہ آیا جس میں اس کے پیرووں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اس کو ترقی دی گئی ..... پس یہ کہنا کہ نبی کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں، ایک ایسا قول ہے جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں۔ مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں نصیحت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا، اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں، حاصل نہیں ہوئی تھی، اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اس کے بعد اگر اس کے (یعنی دین مسیحی کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔"

(۴) تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے سرسید نے جو خدمت قوم و مذہب کے ساتھ اردو زبان و ادب کی انجام دی اس کے نتائج و فوائد نہایت وسیع و جلیل اور زود اثر و دور رس ثابت ہوئے۔ سرسید کے مخالف کثرت سے تھے جو ان کی ہر اصلاح و تحریک اور ہر تجویز و رائے کی مخالفت کرتے تھے، خواہ وہ قومی ہو یا مذہبی یا تعلیمی۔ سرسید حسب ضرورت ان کا جواب لکھتے تھے۔ اس طرح سرسید کی جولانی قلم کے لئے میدان

بڑھ گیا۔ اور دوسرے مخالف مصنفوں اور رسالوں نے بغیر ارادہ وہی سادہ و صحیح اسلوب بیان اختیار کر لیا جو سرسید نے شروع کیا تھا۔ مضامینِ سرسید کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(الف) تہذیب الاخلاق پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے سب سے پہلے پرچے میں سرسید نے اس کے جاری کرنے کا مقصد بیان کیا ہے، لکھتے ہیں :۔

"اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے، مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا، اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا۔ جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے، اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"

(ب) اس سے تین سال بعد نئے سال ہجری کے پہلے پرچے میں جو "افتتاحیہ" سرسید نے لکھا ہے، اس سے ان کی ہلکی سی شوخی تحریر، ظرافت و طنز، اور مخالفین کو جواب دینے کا انداز معلوم ہوگا۔ فرماتے ہیں :۔

"الحمد للہ کہ سنہ ۹۰ نوے پورا ہوا اور سنہ ۹۱ اکیانوے شروع ہو گیا۔ ہمارے اس پرچہ کو جاری ہوئے سوا تین برس ہو گئے۔ پچھلا سال بھی خندۂ گل و نالۂ بلبل سے خالی نہیں گیا، ہمارے آہ و نالہ نے بدستور غلغلہ رکھا، اور ہمارے ناصحانِ شفیق کا بھی شور و شغب کم نہوا۔ سہ

حسنِ شہرت، عشق رسوائی تقاضا می کند   جرمِ معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست

ناصحانِ شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ، آخرکار ہم کو کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا۔ دور و نزدیک
کے مولوی صاحبوں سے کفر کے فتووں پر مہریں چھپوا ہی منگوائیں، اور ہمارے اور ہمارے
ناصحِ شفیق جناب مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیا،
اور "امداد الآفاق" اس کا نام رکھا۔ بھلا اور کچھ ہوا یا نہ ہوا، بیچارے غریب چھاپہ والے
کو تو فائدہ ہوگیا۔ اسی سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی بخش خاں صاحب
بہادر نے (جو امید ہے کہ اب تک حاجی بھی ہو گئے ہوں گے، اور ان شاء اللہ تعالیٰ
آیندہ سے ان کو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے، جن میں سے ایک
کا نام شہابِ ثاقب اور دوسرے کا نام تائید الاسلام۔ اخباروں میں نور الانوار اپنا
نورِ عالم میں برساتا ہی تھا، مگر اس سے ایک اور پرچہ ان کے گھر کا اُجالا مسمّی بہ "نور الآفاق
لامع ظلمۃ النفاق" پیدا ہوا ہے، جو نہایت ہی دلچسپ ہے، اور ہمارے اس پرچہ
"تہذیب الاخلاق" کے جواب میں نکلا ہے۔ اس کے مضامین ظاہرا تو جناب
حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں، مگر بعض
لوگ ان مضامین کو لے پالک بتاتے ہیں۔ بہرحال ہم کو اس سے کیا کہ وہ میاں
نذیر کے ہیں یا میاں بشیر کے، کسی کے ہوں مگر دلچسپ ہیں۔ خدا ان کی عمر
دراز کرے۔"

(ج) اسی سلسلے میں ایک اور اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی علی بخش خاں
(سب آرڈینیٹ جج گورکھپور) سرسید کے شاید سب سے بڑے مخالف تھے۔ سب سے زیادہ
تردیدی کتابیں اور مضامین انھی نے لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے
علماء سے سرسید کے کفر کے فتوے لکھوا کر لائے۔ ان کی مذکورۂ بالا کتاب
"تائید الاسلام" کے جواب میں سرسید نے ایک مضمون "دافع البہتان"

لکھا۔ اس مضمون کو ذیل کے فقرے پر ختم کیا ہے۔ شوخی و ظرافت قابل دید ہے:۔

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں، بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانہ کے حج کو تشریف لیجانے والے تھے۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں، جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہوجاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہوگئے ہوں، اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں، مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں، نہ کسی بشارت سے، آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں، جب تک میں ہی نہ معاف کردوں معاف نہیں ہوسکتے۔ پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج در احمد کا احرام باندھیے، اور گناہوں کی معافی چاہیے، ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہوجاوے گا۔"

(د) سر سید نے "آزادی رائے" پر ایک اخلاقی و اصلاحی مضمون عالمانہ تحقیق کے رنگ میں لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک انگریز محقق کے مقالے سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ آغاز مضمون میں ذکر کرتے ہیں کہ "ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لائق اور قابل زمانہ حال کے فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں" اس کا ایک فقرہ (پیراگراف) یہ ہے:۔

اگرچہ رسم و رواج بھی اُس کے برخلاف رایوں کے ظاہر ہونے کے لئے ایک بہت قوی مزاحم کار گنا جاتا ہے، لیکن مذہبی خیالات مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت قوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس

مخالف رائے کا اظہار ہونا ان کو ناپسند ہے، بلکہ اسی کے ساتھ جوش مذہبی اُمنڈ آتا ہے اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا، اور اس حالت میں ان سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو انھیں کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پونہچاتے ہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے انھیں کے مذہب کے لوگ ان کے حل پر متوجہ نہوں، اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے اور بلا دفع کئے باقی رہ جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں بسبب ناتحقیق باقی رہ جانے ان اعتراضوں کے جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں اسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں، مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انھی کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اغراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہے تو اس کو خود معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں۔ اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔"

یہ مضمون بھی سر سید کے طویل محققانہ مقالات میں سے ہے۔ اس طرح کے اخلاقی مقالے مختلف عنوانات، تصویریشن، سیلف ریسپکٹ، رسم و رواج، خوشامد، ریا وغیرہ پر بڑی کثرت سے لکھے ہیں۔ یہ فن مقالہ نگاری سر سید کے زمانے سے پہلے اردو میں داخل نہ ہوا تھا۔ اخبارات و رسائل کے جاری ہونے سے اس کا آغاز ہوا۔ سر سید کے اخبار "سوسائٹی گزٹ" اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" سے پہلے اور بہت سے اخبار اور رسالے جاری تھے۔ اور ان میں مذہبی، اخلاقی، علمی مقالات شائع ہوتے تھے۔ لیکن سر سید نے نئے نئے مفید و دلچسپ عنوانوں پر مضامین لکھے، بڑی کثرت سے لکھے، اور نہایت صحیح اسلوب بیان اختیار کیا۔ اس لئے اوّلیت و افضلیت کا سہرا سر سید ہی کے سر ہے۔

(۵) مقالات کی ایک قسم تمثیلی یا رمزیہ ہے، جس کو انگریزی میں "ایلیگوری" کہتے ہیں۔ اس طرزِ نگارش میں مستقل کتابیں، "سب رس"، "اخوان الصفا"، "بستانِ حکمت" وغیرہ پہلے بھی اردو میں لکھی گئی ہیں، جن کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن مختلف و متفرق موضوعات پر مختصر مقالات تمثیلی لکھنے کا رواج سرسید کے زمانے سے، بلکہ انہی کے قلم سے شروع ہوا۔ اگرچہ ان کے ساتھ ہی ساتھ اور لوگ بھی شریک کار ہوگئے۔ آزاد کے مضامین "نیرنگِ خیال"، محسن الملک کی "توجہ"، وہ تعلیم و تربیت کی شبیہ"، حالی کی "زبانِ گویا"، اور ان سب سے بڑھ کر شرر لکھنوی کے مضامین "دلگداز" اردو کی قابلِ قدر یادگاریں ہیں۔

سرسید کی تمثیل نگاری کا ایک نادر نمونہ ان کا مضمون "امید کی خوشی" ہے۔ اس کے مختلف مقامات کے اقتباسات سرسید ہی کے الفاظ میں مسلسل کرکے لکھے جاتے ہیں:۔

"او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے، تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے، نام آوری نام آوری کے لئے، بہادری بہادری کے لئے، فیاضی فیاضی کے لئے، محبت محبت کے لئے، نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ بھلا گنہگار انسان جبکہ شیطان کے چنگل میں پھنسا، اور تمام بدیوں نے اسے گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی، تو نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا، تو نے ہی اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو نے ہی

اس کو ذلت سے نکالا، اور پھر اس کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا تھا۔

وہ پہلا ناخدا، جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا، اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بلکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے۔ اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی گرجنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوتِ بازو، اور اے بہادری کی ماں، تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے، ان کا کان نقاروں سے تیرے نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ[۱] قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے جن کی بھلائی چاہتا ہے، انھیں کو دشمن پاتا ہے، دوست آشنا دیوانہ

۱؎ یہاں سرسید خود اپنی مثال دیتے ہیں۔

کہتے ہیں، عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز، اقارب
سب سمجھاتے ہیں، اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں:-

وہ بعد کس کی بات مانے ہیں — بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہار ہار کر، محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر، بہت سے
ہمدردی کرتے ہیں، پر کوئی ٹھکانے سے الگ کر کر، مگر اے بیقراروں کی راحت اور
ٹوٹے شکستہ خاطروں کی تقویت، تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہمارے دل
کی عزیز، اور ہمارے پیارے مہدی[۵] کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی
تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے، اور دنیاوی
حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق
ہو جاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے
کو ہوتی ہے، تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس
وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال
بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری
یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے،
اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی
کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا! جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے،
جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے
ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری سے۔ مگر

---

۵ یعنی نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں

ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام امید ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی سخت گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بشاشت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے، اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بڑا ہے اور رنجوں کے زمانہ کے ختم ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بفتہ ہر سکوں حست و دو بنگر تفاوت را
دیدن، رفتن، ستادن، نشستن، خفتن و مردن

(د) سرسید نے بعض مضامین "مکالمہ" کے طرز میں لکھے ہیں۔ اردو میں یہ روش مرزا غالب کی یادگار ہے۔ لیکن سرسید کی مقالہ نگاری کے دور میں مکالمہ یا ڈرامے کا انداز اور لوگوں نے بھی شروع کر دیا تھا۔ "تہذیب الاخلاق" کے جاری ہونے سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مرآۃ العروس" شائع ہو چکی تھی۔ جس میں افرادِ قصہ کی گفتگو پرانی داستانوں کی طرح نہیں، بلکہ ڈراموں کے انداز میں تھی۔ پھر "تہذیب الاخلاق" کے دوسرے دور میں اخبار "اودھ پنچ لکھنؤ" (مجریہ ۱۸۷۷ء) نکلنے لگا تھا اور اس میں مزاحیہ مضامین مکالمہ کے طرز میں بھی لکھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۷۸ء سے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "اودھ اخبار" میں اپنا فسانہ آزاد شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے اندازِ تحریر سے سرسید باخبر تھے، تاہم ان کے طرزِ مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کا اتباع کیا ہے۔ ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

انھوں نے عجائبات مذہب یا معجزات کے انکار میں ایک مضمون "عجائبات کا ذہول در قبول

لکھا ہے۔ اس کو مکالمہ کے رنگ میں شروع کرتے ہیں۔

"ہیں! تم نے یہ کیسی متضاد باتیں کیں؟"

"حضرت میں کیا کروں؟ انسان کی جبلت ہی ایسی متضاد باتوں پر واقع ہوئی ہے۔"

"اس متضاد جبلت کے سبب بڑے بڑے بزرگوں، یہاں تک کہ انبیا کو بھی نہایت مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مذہب سی عمدہ چیز کا بھی اسی جبلت نے ستیاناس کر دیا۔"

"حضرت، ابتک تو ہماری سمجھ میں یہ معما نہیں آیا۔ اگر آپ کچھ تفصیل سے بتا دیں تو شاید سمجھ میں آجاوے۔"

"میاں سمجھو! دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں کہ انسان نہ ان کو سمجھ سکتا ہے، نہ گن سکتا ہے۔ دن کا ہونا، رات کا آنا، چکدار سورج کا نکلنا، باریک چاند کا دکھائی دینا، اور پھر بڑھتا جانا، بدر ہونا، اور اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا، پھر گھٹتا جانا، اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا، کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟"

(اس کے بعد بہت سے عجائبات قدرت، کالی گھٹا کا اٹھنا، درختوں کا اگنا، پرندوں کا ہوا میں اڑنا، شہد کی مکھی کے کرتب وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ اور ہر بات پر کہتے ہیں کہ کیا عجائبات قدرت نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں)

"گر جو کہ یہ باتیں روز مرہ دیکھنے میں آتی ہیں، ان کا عجیب بلکہ عجیب تر ہونا، انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اس سے ذہول (فراموشی یا غفلت) ہو جاتا ہے۔ مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے، یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے، تو عجائبات کو اس کے ساتھ لگاتا ہے، اور جو عجائبات اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں، ان سب کو قبول کر لیتا ہے: بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیقت

یا اس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔ (اس کے بعد حضرت نوح، سلیمان، موسیٰ، یونس عیسیٰ علیہم السلام کے معجزات کا ذکر کرکے لکھتے ہیں)

یہی خیال اولیاء اللہ تک بھی پہنچ گیا۔ جب تک ان میں کرامتیں نہ پائی جائیں، اور ان پر یقین نہ کیا جائے کہ ولیوں نے مُردوں کو بھی زندہ کر دیا ہے، اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا، اور پتھر، پیڑ، اور حیوان پیدا کئے، اور پتھر کو سونا کیا، اس وقت تک ان کے ولی ہونے پر بھی یقین نہیں ہوتا.....

رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے، نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہوں، قبول کرتے ہیں۔ مگر یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں، اور کوئی سمجھدار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے، بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات، خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے گو کہ بعد کو اس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اس میں بہت سے عجائبات شامل کر دئے ہوں۔ اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے وہ ان عجائبات پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے، جو قدرت کے عجائبات کو ذہول کرتے ہیں اور خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائب پرستوں سے بچائے۔

(مثال) سرسید کو حسب موقع جدید اسالیب بیان پیدا کرنے، اور ہر موضوع کو قوت و قدرت کے ساتھ بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ مثلاً بقول مولانا حالی کے، "واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے تھے کہ جو برائیاں بسبب الف و عادت کے دلوں میں کھب گئی ہوں، ان کی برائی، اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں

اُن کی خوبی، فوراً دلوں پر نقش ہو جائے"۔ یہ کمال جو سرسید کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے، ان سے پہلے نہ تھا۔ اور ان کے بعد کی تحریروں کے مقابلے میں بھی ان کی انفرادیت آج تک قائم ہے۔ اس کی مثالیں خاص کر "تہذیب الاخلاق" کی قدیم و جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔ جن میں سے بہترین نمونہ سرسید کا مضمون بحث و تکرار ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

> جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ اور پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے۔ اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں۔ اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں۔ اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں۔ اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا، اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔
>
> نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں عنیف

عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستینیں چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں، اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں، لپاڈکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا، تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا، تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے، اور اس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب، شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔"

(۵) **سرسید کی تقریر**۔ بقول مولانا حالی کے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے قومی اور ملکی مجمعوں میں اسپیچ یا لکچر دینے کا رواج نہیں پایا جاتا۔ سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ملکی زبان میں پبلک اسپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ مولانا حالی سرسید کے سیرت نگار کرنل گرہیم کی رائے نقل کرتے ہیں کہ "وہ (یعنی سرسید) ایک پیدائشی اوریٹر (مقرر) ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرز تقریر مسٹر گلیڈ اسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اسی جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے، اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔ اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔"

مولانا حالی کہتے ہیں کہ "اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا، جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گزر چکے تھے۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا...... ۲۹ دسمبر کو جو لکچر کہ سرسید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں، جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا، اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو، اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو.... خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کر دی تھی:۔

"اے بزرگانِ پنجاب، میں فرض کرتا ہوں کہ میں بد عقیدہ ہوں، اگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کی دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں، اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، جو بڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ، سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت سرا کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔
بس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے، اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجیے، اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا، اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت، رُو سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسل ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو، اس سے عبرت پکڑو، اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔"

(ب) اوپر کی تقریر سے گیارہ برس بعد ۱۸۸۴ء میں سرسید نے بمقام گورداسپور خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں تقریر کی تھی۔ یہ ایڈریس مسلمان عورتوں کی طرف سے سرسید کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس کی بانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں، مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی تقریر تھی جس میں شریف ہندو، مسلمان، عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ سرسید کے چند فقرے یہ تھے:-

اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں ہے۔ جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی[1] ہے وہ میرے لئے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔

اے میری بہنو، میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں، مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔

تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھربار کا انتظام، ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔

---

[1] سرسید نے ایڈریس کو مؤنث بولا ہے، لیکن اب مذکر بولنا فصیح مانا جاتا ہے۔

میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں، درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمہارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو، مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

اے میری ہندو اور عیسائی بہنو، تم نے جو اپنی محبت و وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس پرائز میں اور اس امداد میں، جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے، شرکت کی، وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو، اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔"

(ج) سرسید نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں (غالباً ۱۸۹۴ء میں) بمقام علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی، اس کے چند آخری فقرے یہ تھے:-

"اے حضرات! اگر میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے، مگر اس سے نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے، ورنہ ہم اور قوموں سے

بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے دو علانیہ ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمود محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے، جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے، اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا، اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا، اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔

دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر، سی، ایس، آئی کی طرف نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) ہمارا یہ داڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے۔ اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں، اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں، اور سید راس مسعود "دادا صاحبہ"۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت کرنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

(۶) **سرسید کے خطوط** - خطوط میں بھی سرسید کی طرز تحریر اور آفتِ طبع کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔ القاب غالب کی طرح مختصر لکھتے ہیں۔ "بھائی"، "مخدومی" وغیرہ۔ ظرافت جو غالب کی طرح سرسید کی بھی طبیعت ثانیہ ہے جا بجا جھلکتی ہے۔ سرسید کے لائق پوتے سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے "خطوط سرسید" کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ چند خطوں کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

(الف) سرسید کے کسی نہایت عزیز دوست کو ایک زمانے میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا، اور اس امر کی اطلاع انھوں نے سرسید کو بھی کی تھی۔ اس کے متعلق سرسید ان کو لکھتے ہیں:-

"بھائی... کل میں سارے دن متردد رہا، کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں

پڑھنا، اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دو دو وقتی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت بگڑ بنا گیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے، جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں؛ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس پر صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر بھلی یا بری گزرگی، اور حضور رخصت نہیں دیں، تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا۔ بلا تامل اسی وقت استعفا دے دینا تھا، صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدا سے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مرجاتے، نہایت اچھا ہوتا۔

والسلام۔"

(ب) خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں سے سرسید کو خاص محبت و یگانگت تھی، اور اسی خصوصیت کے سبب سے ان پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی بھی رہتی تھی۔ جب خان بہادر صاحب ریاست رامپور کی اسٹیٹ کونسل کے جوڈیشل ممبر ہو کر رامپور چلے گئے تو سرسید نے اپنی علالت کے زمانے میں (غالباً ۱۸۹۷ء میں) ان کو یہ خط بھیجا تھا:۔

"مکرمی بندگیو! ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے

جیسے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماردوں حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ "اے کہ ہرگز فرامشت نکنم" کا نقشہ ہو گیا ہے۔"

سرسید کی تحریر کی خصوصیات

(۱) سرسید کی تحریر میں جو طرزِ قدیم کا اثر اور متروک الفاظ کا استعمال ہے، وہ کوئی عیب نہیں۔ اُس زمانے کے سب لوگ ایسا ہی لکھتے تھے۔ البتہ یہ بات ضرور محسوس ہوتی اور ذرا گراں گزرتی ہے کہ کبھی کبھی ان کے فقرے زیادہ طویل اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم کر دیا جائے تو زیادہ سلیس ہو جائیں۔ الفاظ کی بے قاعدہ تقدیم و تاخیر بھی معنی میں اُلجھن پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کمی ان کی تحریر میں نہیں ہے۔

(۲) سرسید نے مختلف موضوعات و مضامین پر قلم اٹھایا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ہر موضوع اور ہر موقع کے لیے اس کے مناسب زبان و بیان اختیار کیا ہے۔ کسی دعوے پر دلیل لاتے ہیں تو ایسی قوت کے ساتھ کہ اس سے بہتر کا امکان نظر نہیں آتا۔ جذبات سے اپیل کرتے ہیں تو ایسی ہی تاثیر کے ساتھ۔ کسی مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں تو اس کے کسی جزو کو نہیں چھوڑتے، کوئی منفرد واقعہ بیان کرتے ہیں تو تصویر کھینچ دیتے ہیں، ظرافت و مزاح کا موقع ہوتا ہے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے ہیں۔

مصنفوں اور ان کی تصانیف کی فہرست درج کرتے ہیں، اور ان میں سے بعض کے حالات اور نمونے بھی۔

(۱) تواریخ راسلس مترجمہ سید محمد میر لکھنوی (۱۸۳۹ء)
(۲) عجائبات فرنگ سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش (۱۸۴۷ء)
(۳) نجات قاسم مصنفہ شاہ محمد قاسم ابو العلائی دانا پوری (۱۸۵۷ء)
(۴) تذکرۃ المشاہیر مرتبہ منشی سدا سکھ لال (۱۸۶۰ء)
(۵) تصویر شعرا مرتبہ مفتی اکرام اللہ صدیقی گوپاموی (۱۸۶۱ء)
(۶) ترجمہ سہ دفتر ابو الفضل مرتبہ مولوی قمر الدین اکبرآبادی (۱۸۶۱ء)
(۷) تذکرہ شعر و سخن مرتبہ نیاز علی پریشاں (۱۸۶۶ء)
(۸) گلستان بےخزاں مرتبہ حکیم سید قطب الدین خاں باطن اکبرآبادی (۱۸۶۱ء)
(۹) آثار شعرائے ہنود مرتبہ دیبی پرشاد (۱۸۶۵ء)
(۱۰) سفرنامہ یورپ مرتبہ مرزا نثار علی بیگ اکبرآبادی (۱۸۶۶ء)
(۱۱) زبدۃ الحکمۃ مصنفہ مولانا عبد الحق خیرآبادی
(۱۲) خلاصۃ المنطق مصنفہ منشی دیبی پرشاد بدایونی (۱۸۶۲ء)
(۱۳) منہج المنطق مترجمہ مولوی محمد رضا خاں لکھنوی (۱۸۸۱ء)
(۱۴) انتخاب یادگار مرتبہ منشی مفتی امیر احمد مینائیؔ (۱۸۷۳ء / ۱۲۹۰ھ)
(۱۵) البرہان (سرسید کی تفسیر قرآن کا رد) مصنفہ مولوی محمد علی تحصیلدار بچھرایونی (۱۸۸۰ء کے بعد)
(۱۶) آئینۂ وکالت مصنفہ پنڈت گرداری لال کشوردت منصف ایٹہ (۱۸۸۹ء / ۱۳۰۶ھ) [1]

---

[1] ان کتابوں میں سے کچھ خاکسار راقم کے پاس ہیں اور اکثر جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے کتب خانہ میں ہیں۔ مفتی صاحب کا نام صفحہ ۱۴۹ کے حاشیہ میں غلطی سے مفتی انعام اللہ چھپ گیا ہے ـ

ان میں بھی دو کتابیں غدر سے پہلی کی ہیں۔ باقی انیسویں صدی کے نصف آخر کی ہیں۔ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی؛ لیکن یہاں اُن چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے جو بلحاظ موضوع یا باعتبار مصنفین ممتاز ہیں اور اردو ادب کے لئے اضافہ۔ اِن میں سے بعض کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

سید محمد میر لکھنوی ان کا حال دریافت نہیں ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر نام ونشان اس طرح درج ہے:۔

تواریخ راسلس شہزادۂ حبش کی، جس کو عالم متبحر جانسن صاحب ڈیموئیل جانسن ایل ایل ڈی، نے تصنیف کیا، سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے واسطے اردو زبان میں اس کو ترجمہ کیا، اور پادری جان جیمس مور صاحب نے منشی محمد فتح اللہ خاں اکبرآبادی کی استعانت سے تصحیح کر کے گرین وے صاحب کے چھاپے خانے میں چھپوایا۔ ۱۸۳۵ء مسیحی۔

اس کا مختصر دیباچہ یہ ہے:۔

"عاصی کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسنی الحسینی نے واسطے صاحبان عالی شان آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے تاریخ راسلس شہزادے کی، کہ جسے ڈاکٹر جانسن صاحب نے بکمال فصاحت اور بلاغت تحریر کیا ہے، اور صاحبان عالی شان بھی اس رسالے کو بہت عزیز رکھتے ہیں، از بان اردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبان فہم وفراست کو تہذیب اخلاق بخوبی دریافت ہو۔"

ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:۔

شہزادی نے جواب دیا کہ میں نے بہت مجرد لوگوں سے ملاقات کی جو اس ہی سبب سے بغیر شادی کے اپنی زندگی کو عالم تجرد میں بسر کرتے ہیں، لیکن کبھی نہ دیکھا کہ ان کی

تمیز و فراست اور لوگوں کے حسد کرنے کے لائق ہو۔ ان کی زندگانی بغیر دوستی و محبت کے مثل خواب و خیال کے گزرتی ہے۔ ہر ایک روز ان کو بے فائدہ اور بار خاطر معلوم ہوتا ہے، اس واسطے کہ بیکار اور بے شغل و بے یار و یاور پڑے رہتے اور خستگی دل سے رہائی کے لیے بیہودہ شغلوں اور خطاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ ان کے چلن ان شخصوں کے موافق ہیں جو اپنے تئیں پست رتبوں میں جانتے ہیں۔ اسی سبب سے دل حسد و بغض سے بھرے رہتے ہیں اور زبان پر لوگوں کی غیبت و عیب جوئی جاری ہوتی ہے، گھر میں بدمزاج رہتے ہیں اور باہر بدظن۔ جیسے چور و قزاق جو شرع سے باہر ہو کر یہی چاہتے ہیں کہ صحبت انسانی کو برہم کریں۔ رشک سے کہ کسی کی منفعت سے آپ محروم رہتے ہیں۔

یہ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ اُس زمانے میں لوگوں نے فارسی زبان سے بھی ایسا اچھا ترجمہ مشکل سے کیا ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش حیدرآباد وطن اصلی تھا۔ سیر و سیاحت کے لیے گھر سے نکلے۔ تمام ہندوستان کی سیر کر کے انگلستان کا سفر کیا۔ یورپ کے دوسرے مقامات و مصر وغیرہ کی بھی سیر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی سیاحوں میں سب سے قدیم تھے۔ ۱۸۲۸ء سے سیاحت شروع کی۔ ۱۸۳۷ء میں ولایت کا سفر کیا۔ حالات سفر لکھتے گئے، جن کو ۱۸۴۷ء میں دہلی میں چھپوایا۔ پھر دوبارہ ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ عجائبات فرنگ اس کا نام ہے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ محض ایک سیاح کا سفرنامہ ہے، جس کی کوئی قومی، ملکی یا تعلیمی غرض نہ تھی۔ اور سب لوگوں کے سفر مثلاً مولوی مسیح الدین، سر سید احمد خاں، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کے اس سے بعد کے ہیں، اور بغرض سیر و سیاحت نہ تھے۔ پھر

انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی میں بھی لوگوں نے یورپ کے سفر نامے لکھے ہیں۔

یوسف خاں کمبل پوش ۳۰ مارچ ۱۸۳۶ء کو کلکتہ سے انگلستان روانہ ہوئے تھے، اور ۱۵ جولائی ۱۸۳۹ء کو واپس کلکتہ پہنچے۔ سفر کے حالات بقید تاریخ لکھے ہیں۔ راستے کے ہوٹلوں اور لندن وغیرہ کے محلوں کے نام اور نمبر تک درج کئے ہیں۔ اپنا مذہب سلیمانی بتایا ہے۔ ہر جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ اصول مذہب بھی لکھے ہیں اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا مذہب بتایا ہے۔ "سلیمانی" نام کا یہی سبب ہے۔ شراب پیتے تھے، بڑی بے تکلفی سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ ایک جگہ کمال جسارت سے شراب کو جائز بتا دیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

> "وہاں کے ایک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی، اور شراب انگوری ہم کو پلائی، عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا، اس نے مجھ سے کہا، تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو، شراب کیوں پیتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبر نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔"

انگریزوں کے اخلاق کی بے حد تعریف کرتے ہیں، سفر میں جن مصائب میں انگریزوں نے ان کی مدد کی ہے ان کا ذکر بڑی احسان مندی سے کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کے اخلاق سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یورپ و لندن کے حسن و جمال کے نہایت مداح ہیں۔ ہر جگہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ حسین عورتوں سے اپنی محبت کا حال لکھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں: "اگر خالی اغراض نفسانی سے تھی"، وہاں کی بدکاری کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں۔ غرض کمبل پوش صاحب نے سفر اور سفر نامہ دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔

اس عجائبات فرنگ کی زبان بالکل وہی ہے جو سوا سو [۱۲۵] برس پہلے کی ہونی چاہیے۔ تاثیر بیانی بھی کی ہے۔ لیکن دلچسپ واقعات اور ذاتی تاثر کے سبب سے فسانہ و ناول کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مختصر اقتباسات یہ ہیں۔ شروع میں لکھتے ہیں:-

"آغاز حال مؤلف۔ یہ فقیر تخمیناً سن اٹھارہ سو اٹھائیس [1828] عیسوی مطابق سن بارہ سو چوالیس [1244]
ہجری کے حیدر آباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج،
گورکھپور، نیپال، اکبر آباد، شاہجہاں آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں
پہنچا۔ یہاں بمددگاری نصیبے اور یاوری کپتان مٹ خاں منگلی صاحب بہادر سے،
ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے دار ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے
ایسی عنایت اور خداوندی میرے حالِ پُر اختلال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں
تاب بیان و یارائے گویائی۔ بیس برس خاص سلیمانی میں عہدہ جماعہ داری کا دیا۔
بعد چند روز کے صوبہ داری ساٹھ روپے کی دے کر دربار میں تعینات کیا۔ چند دن چین سے
زندگی بسر کرتا اور شکرانہ نعمت حقیقی کا بجا لاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا
دامنگیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے
بیشتر کتب تاریخ کی سیر کرتا، دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے
محظوظ ہوتا۔ جب کہ سن اٹھارہ سو چھتیس [1836] عیسوی میں دل میرا طلبگار سیاحی جہان،
خصوص ملک انگلستان کا ہوا، شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس
کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بعد عنایت و انعام اجازت دی۔ بجز تسلیمات
بجا لایا۔ اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارہ کلکتہ میں
پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ
مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس [1837] عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت
انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا ازابیلا۔ کپتان اس کا ڈبیدن صاحب مع اپنی
بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے گنگا پر آ لگا تھا۔"

پیرس کی سیر میں لکھتے ہیں:-

"پندرھویں دن ایک مکان میں گیا، وہاں صدہا آدمی تولیے شطرنجیاں بن رہے

تھے، بناوٹ میں تصویر عمدہ کھینچتے۔ دریافت ہوا کہ وہ سب مصور رہتے تھے، تصویریں قالین اور دریوں پر ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ کسی مصور کامل نے تصویریں کاغذ پر کھینچی ہیں۔ ان کی کاریگری دیکھ کر سخت متحیر ہوا۔ حال ان کا پوچھا، ظاہر ہوا کہ واسطے فرش دیوان عام شاہ فرانسیس کے بنتے ہیں، اور کہیں نہیں بیچتے۔ زبان فرانسیسی میں اس کام کو ٹپسٹری کہتے ہیں۔ اس کے بعد کونسل کے مقام پر گیا۔ ایک مکان فلک بنیاد دیکھا۔ ستون سنگ مرمر کے اینڈال رست اس میں لگے۔ صاحبان کونسل اپنے رتبے کے موافق جا بجا بیٹھے۔ ہر ایک کے مہر رکھے۔ اس مکان کی شکست و ریخت کے لیے مزدور لگے تھے۔ میں یہ حال دیکھ کر باہر نکلا۔ پانی برسنے لگا۔ سارے کپڑے تر ہوئے، گرتے پڑتے گھر پہنچے۔ وہیں دو رنڈیاں[1] ایک خوبصورت، دوسری کریہ الہیئت تھیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ترک سمجھ کر تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں۔ ایک بار پاؤں پھسلا، دو لوٹ کھا کر گر گئیں۔ میں نے قریب جا کر زن جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا، وہ بڑی محنت سے فرانسیسی بولی میں کچھ کہنے لگی۔ مگر اس زبان سے مجھ کو آگاہی نہ تھی۔ آخر اس نے ایک دھکا دیا، مجھکو زمین پر گرا دیا۔ دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اٹھایا تھا، میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچائی غنیمت سمجھا وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے میرے پیچھے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہنچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمراہی ہنسنے لگے۔ میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔ پاؤں میں چوٹ آئی تھی، اس سبب سے دو ایک دن قیام کیا۔"

شاہ محمد قاسم داناپوری

سید شاہ محمد قاسم ابوالعلائی ابن سید تراب الحق داناپور کے ایک ذی علم صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے

---

[1] اس زمانے میں لکھنؤ میں عورت کو رنڈی کہتے تھے۔ یہاں بری عورتیں مراد نہیں ہیں۔

سلسلہ ابوالعلائیہ کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن آپ کو اس شغل سے زیادہ ملازمت کرنے کا شوق تھا چنانچہ کچھ دنوں کچہری صدر دیوانی الہ آباد میں رہے۔ پھر صدر دیوانی الہ آباد سے آگرہ کو منتقل ہوئی تو [illegible] میں شاہ محمد قاسم صاحب بھی آگرہ آگئے۔ صدر نظامت میں "مسل خواں" تھے۔ ایک مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے مسل پڑھ رہے تھے، واقعات مقدمہ نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ یکایک جذب پیدا ہوگیا، زور سے "اللہ" کا نعرہ مارا اور مسل پھینک کر نکل گئے۔ بہت دنوں تک کچہری کا رخ نہ کیا۔ لیکن انگریز حاکم ان سے بہت خوش تھا پھر بلایا اور اپنے دفتر والوں سے کہہ کہ آئندہ ان کو کوئی "اللہ والی" مسل نہ دی جائے۔

آگرہ کے صدر نظامت میں بیشتر حکام و وکلا مسلمان تھے۔ مفتی انعام اللہ خان بہادر گوپاموی وکیل صدر تھے۔ ان سے شاہ محمد قاسم کے خاص تعلقات ہوگئے۔ مولوی غلام امام شہید[1] بھی دفتر نظامت آگرہ میں ملازم تھے۔ مولوی کریم اللہ خاں صدر الصدور (سب جج) تھے۔

---

[1] اس داستان اردو کے صفحہ ۲۴۸ و ۲۴۹ پر مولوی غلام امام شہید کا حال درج ہے۔ ان کا سال وفات کسی تذکرہ میں درج نہیں ہے۔ اس لئے ہم بھی نہ لکھ سکے تھے۔ اب شہید کی وفات کے متعلق خواجہ غلام غوث بیخبر کا قطعۂ تاریخ دستیاب ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہید کا انتقال ۱۲۹۳ھ میں ہوا۔ قطعہ یہ ہے۔

شاعر بے مثل غلام امام	سحری از شاعریش شد پدید
بود بذاتش نہ ہمیں یک صفت	عالم یکتا و ادیب وحید
صوفی و صافی دل و روشن ضمیر	حاجی و مداح رسول حمید
قطع تعلق ز ہمہ کار کرد	داد دل و عشق پیمبر خرید
داشت "امام الشعرا" در خطاب	خوش سخنی کرد تخلص شہید
خنجر برّان اجل ناگہاں	از دم خود تار حیاتش برید
تافت ازیں غمکدۂ تیرہ رو	جنت و بگزید ارم آرمید
بیخبر غم زدہ اندر غمش	چارہ بجز صبر و رضا چوں ندید

(باقی بصفحہ ۳۴۷)

ان سب کی نشست مفتی انعام اللہ کے مکان پر رہتی تھی۔ اُس زمانے کا یہ عجیب واقعہ یادگار ہے کہ نواب چینا پٹن (میسور) کے برادرزادہ سید شاہ احمد علی قادری عرف ضیاءالدین دلاور جنگ کو جہاد کا شوق پیدا ہوا، اور میسور سے چل کر آگرہ آئے۔ بخت واتفاق سے مفتی انعام اللہ کے مہمان ہوئے۔ یہاں آگرہ کے اکثر علماء و رؤسا کا مجمع رہتا تھا۔ سب نے سید احمد علی صاحب کے عزم جہاد کی تائید کی اور امداد بہم پونہچائی۔ سید میسوری اپنے مریدوں اور رفیقوں کو لیکر شاہجہانپور کی طرف روانہ ہوئے۔ یورپئوں سے جہاد کیا، اور راجہ پوائیں شاہجہانپور کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد آگرہ کے بعض وکلاء و حکام و رؤسا پر رشوت ستانی کا مقدمہ برپا ہو گیا جس میں مفتی انعام اللہ، مولوی غلام امام شہید، شاہ محمد قاسم وغیرہ متہم گردانے گئے۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لئے مسٹر ولسن جج مرادآباد خاص طور پر متعین کرکے بلائے گئے۔ مفتی انعام اللہ کے داماد خواجہ غلام غوث خان بہادر بےخبر اس وقت لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے۔ لیکن وہ بھی اپنے خسر کی مدد یا سفارش نہ کرسکے۔ آخر مقدمہ کا ثبوت بہم نہ ہوسکا۔ تمام حضرات میں سے صرف شاہ محمد قاسم کو ۲ ماہ کی سزا کا حکم ہوا تھا، وہ بھی اپیل میں منسوخ ہو گیا۔ اس مقدمہ کا سال ۱۸۴۲ء تھا۔ یہ ہنگامہ آگرہ میں "ولسن گردی" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اسی سال تمام وکلاء و عہدہ دار جو ولسن گردی کے لپیٹ میں آئے، ترک وکالت و ملازمت کرکے صدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۶)

گفت تاریخ ہم آخر ز رنج
"وائے امام شعرا شد شہید"
۱۲۹۳ھ

سلہ مولوی کریم اللہ خاں ابن قاضی فقیر اللہ نیاز مند مؤلف کے بزرگوں میں تھے "خان" کا خطاب تھا۔ نشان نسب نہیں ہے۔ پھراؤں ضلع مرادآباد وطن تھا۔ ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔

سے علیحدہ ہو گئے۔ شاہ محمد قاسم بھی آگرہ سے اپنے وطن دانا پور چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔

شاہ محمد قاسم صاحب تصانیف ہیں۔ اسرار قاسمی اور اعجاز غوثیہ فارسی میں لکھیں۔ اسرار قاسمی کا اردو ترجمہ مفتی انعام اللہ نے کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اردو میں نجات قاسم تصنیف کی ہے جس میں حضرت سیدنا امیر ابو العلا کے حالات و کرامات کا ذکر ہے۔ ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۶ء میں بمقام مینی تال لکھی ہے۔ اور مطبع اشرف الاخبار آگرہ میں اسی سال چھپ چکی ہے۔

نجات قاسم کا نمونہ مختلف مقامات سے یہ ہے:-

"یہ کاتب گنہگار جب پہلے پہل شہر اکبر آباد میں حاضر ہوا ہے تو سال بارہ سو اٹھ ہجری تھا۔ جس وقت روضہ منورہ پر حاضر ہو کر بعد قدم بوسی اور فاتحہ کے آنکھیں بند کر کے پائیں مزار شریف کے بیٹھا معاً کانوں میں یہ آواز آئی کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت کے انتقال کے پورے دو سو برس کے بعد تو زیارت سے مزار انور کے مشرف ہوا۔"

"جس روز یہ کاتب عاصی صدر دیوانی کی کچہری کے ساتھ بلدہ متبرکہ اکبر آباد میں پہنچا اس کی صبح کو مکان فرودگاہ سے بہ تمنائے زیارت روضۂ منورہ اپنے پیشوا حضرت امیر ابو العلا قدس اللہ سرّہٗ کے چلا۔ گر چہ کہ اس وقت تک شہر کے محلوں اور سواد شہر سے محض نابلد تھا۔ اور جو آدمی ہمراہ تھے وہ بھی بالکل ناواقف تھے، گونہ تردد ہوا۔ پھر یہ خیال کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کسو سے راستہ درگاہ شریف کا پوچھ لیں گے۔ جب چار سو دروازے سے آگے بڑھا ہنوز نوبت پوچھنے کی کسو سے

---

۵۱ حضرت سیدنا امیر ابو العلا رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء بزمانہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہوا ہے۔ حضرت کی ولادت سنہ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء میں بعہد شہنشاہ اکبر ہوئی۔

نہیں پہنچی تھی کہ دو لڑکے نہ معلوم کدھر سے آکے میری پالکی کے ساتھ ہوئے اور خود بخود پوچھنے لگے کہ تم اتو لالا کی درگاہ پر جاؤ گے۔ فائدہ۔ واضح ہو کہ شہر اکبر آباد کے بازاری لوگ اور سب لڑکے ہمارے حضرت کو اتو لالا کہتے ہیں، اور یہ لفظ ان کی زبان سے اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ لطف اس کا تحریر میں نہیں آسکتا۔۔۔۔"

حضرت امیر ابوالعلاؒ کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

جاننا چاہیے کہ جب حضرت خواجہ فیضی قدس سرہٗ کسولڑائی میں شہید ہوگئے۔ تب راجہ مان سنگھ نے اس عہدۂ نظامت پر بدوا ان کے جناب حضرت امیر ابوالعلا قدس سرہٗ کو مقرر کرکے منصب سہ ہزاری ذات اور سہ ہزاری سوار کا بادشاہ کے حضور سے دلوایا۔ آپ کے پاس اسباب تجمل اور شوکت کا از قسم ہاتھی گھوڑے اور اونٹ اور رتھ وغیرہ سامانِ امرائی بہت تھا۔ چنانچہ نقل ہے کہ بعد ترک دنیا اور جلوہ افروزی مسند فقر و درویشی کے بھی یہ حال تھا کہ جب کدھی آپ شکار کو تشریف لیجاتے تو بیالیس نفر صرف بازدار ہم رکاب فیض انتساب کے ہوتے تھے، اور سامان کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ الغرض راجہ مان سنگھ باوصف ایسے احتشام ظاہری کے کہ تمام قلمرو بنگالہ کا مالک اور حاکم تھا۔ حضرت کی اس قدر تعظیم و تکریم کرتا تھا کہ اپنی مجلس میں جمیع امرا بلکہ اپنے فرزندوں سے بھی بالاتر جگہ آپ کو دیتا تھا۔

مفتی اکرام اللہ صدیقی مفتی انعام اللہ خاں صدیقی گوپاموی کے فرزند رشید تھے۔ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور علما سے عصر سے اکتساب علم کیا۔ ڈاکٹر مکند لال اکبر آبادی سے ڈاکٹری پڑھی۔ پھر مختاری کا امتحان پاس کرکے الہ آباد میں مختار رہے۔ تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ متعدد کتابیں فارسی و اردو

میں لکھیں ۔مثلاً علمائے اودھ، اخبار واصلین، تذکرۂ مصنفین، قواعد اردو، فارسی جدید، مفید الطلاب۔

ان میں تصویرِ شعرا خاص چیز ہے۔ اسی زمانے میں آگرہ شعرائے شہر و بیرونِ شہر کا اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ اکثر شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ مولوی غلام شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات نے اس میں عجیب روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں بابو بینی پرشاد وکیل صدر کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے سخنوروں کے کلام و حالات مفتی اکرام اللہ نے مرتب کیے، اور اس گلدستہ کا تاریخی نام "تصویرِ شعرا" (۱۲۷۷ھ) رکھا۔ ۱۸۶۱ء میں مرزا علی حسین قیصر کے مطبع حیدری میں طبع ہوا۔ اس کی تمہید مختصر کرکے درج کی جاتی ہے:-

بشنو از انصاف اگر مقبلی	شعر بود حجت روشن دلی
در شرف شعر رسول خدا	گفت بسے قول بمدح و ثنا
شعر کہ اصحاب نبی گفتہ اند	چوں دُر و یاقوت و گہر سفتہ اند
شعر علیؑ گفت و حسینؑ و حسنؑ	کعبؓ و انسؓ گفت و اویسؓ قرن
شعر کہ حسانؓ عرب گفتہ است	سید کونین پذیرفتہ است
منع ز اشعار نکرد شہ نبیؐ	تائب از آں کار نکرد شہ نبیؐ
بلکہ بر او کرد ہزار آفریں	سید کونین رسولؐ امیں

سخنورانِ معنی آفریں پر واضح اور آشکار ہے کہ سخن کی قدر افزائی کے لیے طبعِ سلیم اور ذہنِ فہیم درکار ہے۔ سخنور کو ہمیشہ سخندان کی جستجو ہے، کس واسطے کہ گوہر کی جوہرشناسی سے قدر اور آبرو ہے۔

نرسد ہیچ کمالے بہ سخن سنجیدن	کہ سخن را صلہ نیست بجز فہمیدن

جو لوگ اس قاعدے کو نہیں مانتے ہیں، وہ آپ اپنی قدر نہیں جانتے ہیں۔ بیشک

سخن کی تمیز کے لئے مخاطب معنی فہم درکار ہے۔ اپنی ستائش اپنی زبان سے کب سزاوار ہے۔ شاعر جب تک سخن فہم سے داد نہ پائے گا، اپنے مونہہ میاں مٹھو کہنے سے سخن گو نہو جائے گا۔ بیت

طوطی ز معنی سخن خویش غافل است ہرکس سخنوراست سخندان نمی شود

اس نظر سے شعرائے فخر البلاد اکبرآباد کو اہل جوہر جوہر شناس کی جستجو اور سخنور سخن فہم کی آرزو رہتی ہے۔ الحمد للہ کہ دعائے باطنی نے مدعائے دلی کی صورت دکھائی۔ اور بعد عرصہ دراز کے مراد ان کی باحسن وجوہ برآئی کہ ان دنوں بحسن اتفاق جناب برگزیدۂ آفاق جوہر آئینۂ کمال، صورت گر حسن وجمال، معنی آفرین، نازک خیال، نکتہ سنج عدیم المثال، استاد یکتا، امام الشعرا فاضل وحید حضرت مولانا قدم امام شہید مدظلہم اور سخنور شیریں مقال معنی سنج نازک خیال یعنی برادر گرامی قدر منشی غلام غوث صاحب بےخبر میرمنشی نواب مستطاب لفٹنٹ گورنر بہادر اس شہر میں رونق افروز ہوئے۔ ہر طرف ان کے مقدم سعید سے عید ہوگئی، خاص و عام فیض یاب اور مسرت اندوز ہوئے۔ معنی پرور ان سخنور نے موقع وقت غنیمت سمجھ کر اس بات کا ارادہ کیا کہ کلام ہمدگر سے چاشنی گر مذاق ہوں، اور جوہر طبع آزمائی دکھائیں۔ یہ بات سنتے ہی انجمن آرای سخن و معانی، رموز شناس اسرار سخندانی سر دفتر ارباب ہنر، جوہر شناس صاحب جوہر نوبادہ گلشن مراد، بومنی پرشاد صاحب عالی قدر وکیل عدالت صدر زاد حشمتہٗ نے اپنے دولت خانہ فیض کاشانہ کو فرش منقش اور مصفا اور کنول جھاڑ مردنگیاں دیوارگیریاں فانوس اور مرآت حیرت افزا سے جسے دیکھ کر آفتاب و مہتاب بھڑک جاوے اور پریدہ ہوئے رنگا رنگ گلہائے بوقلموں عطریات گوناگوں سے جس کی خوشبو سے چمن زار بہشت مہک جاوے، پیراستہ کر کے صلائے عام دی؛ اور

۵؎ چار پانچ سطریں مدحیہ الفاظ کی تھیں۔ وہ چھوڑ دی ہیں۔

ارباب ذوق و شوق کو خبر کی کہ نکتہ وران صحیح نفس اور سخن سنجان دقیقہ رس تشریف لادیں، ہم کو مرہون منت فرمادیں۔ پس تمام شہر میں اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی عجب طرح کی رنگین صحبت ہوئی ..... یہ مجموعہ اس مجمع کا جامع کلام ہے۔ "تصویر شعرا" اس کا تاریخی نام ہے۔

کلام شعرا کا بھی نمونہ دکھایا جاتا ہے۔ طرحی و غیر طرحی غزلوں کے علاوہ چار یا پانچ شاعروں نے بانی مشاعرہ بابو بینی پرشاد صاحب کی مدح میں رُباعیاں بھی پڑھی تھیں۔ ان میں سے مرزا عباس ملیح اکبر آبادی کی رُباعی درج کی جاتی ہے:۔

بابو کا ہے دل حُبِ علی سے آباد ہے دوستی علی سے ہر دم دل شاد
اس "دوستی علی" کے بن ہو اعداد ہے ہم عدد اس سے "بابو بینی پرشاد"
۵۹۰

طرحی غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:۔

اسیر۔ میر گلزار علی خلف و جانشین میاں نظیر اکبر آبادی:۔

ساقی جوش میں آ ظرف کو دیکھ کے کھول ان تنگ ظرفوں کو اتنا نہیں بھر دیتے ہیں
آنکھ اپنی سر محفل نہیں ملنے پاتی دیکھتے ہیں وہ کدھر جام کدھر دیتے ہیں

باطن۔ حکیم سید قطب الدین اکبر آبادی:۔

رازداران حقیقت کے لبوں پر ہے مہر خود خبردار ہیں وہ کس کو خبر دیتے ہیں

بہادر۔ بابو رن بہادر سنگھ:۔

اے مسیحا ترے بیمار شب ہجراں کو جام خورشید میں تبرید سحر دیتے ہیں
دل بھرا آتا ہے، اب خیر نہیں عالم کی آج طوفاں کی خبر دیدۂ تر دیتے ہیں

راجہ۔ مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی:۔

یار کے حسن پر آشوب کی ہر دل میں جگہ یہ وہ دریا ہے جسے کوزے میں بھر دیتے ہیں
راجہ یہ شوق اسیری ہے کہ مرغان قفس اپنے منقار سے پر اپنے کتر دیتے ہیں

صفیر۔ لالہ گنگا سہائے :-

اڑ گئے ہجر کی شب وصل کے دشمن تیرے — آج آواز نہیں مرغ سحر دیتے ہیں

مہر۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر شاگرد ناسخ :-

یہ نئی طرز مسیحائی ہے سبحان اللہ — جان آجاتی ہے، وہ دم بھی اگر دیتے ہیں

ہم تو اللہ کو بھی یوں نہیں کرتے سجدہ — اے صنم سر کو ترے پاؤں پہ دھر دیتے ہیں

حکیم قطب الدین باطن حکیم میر خیری ظاہر کے فرزند، محلہ تاج گنج آگرہ میں رہتے تھے۔ غالباً ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے، اس لئے کہ تذکرہ "شعر و سخن" مرتبہ نیاز علی پریشان میں جو ۱۲۸۶ھ میں لکھا گیا ہے، اور جس کا ذکر اس کے بعد آتا ہے، حکیم باطن صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ حکیم صاحب کے اسلاف طبیب شاہی رہے ہیں۔ انھوں نے عربی و فارسی میں نظیر اکبرآبادی سے حاصل کی۔ شاعری میں بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم سید جد علی اکبرآبادی حضرت مولانا فخر الدین قدس سرہٗ کے خلیفۂ خاص تھے۔ اور حکیم صاحب خود حضرت سید غلام نصیر الدین دہلوی عرف میاں کالے[۵] کے مرید تھے۔ اپنے پیشۂ آبائی طبابت کے سلسلے میں صاحبزادہ محمد یٰسین خلف ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سرکار سے وظیفہ پاتے تھے۔

باطن صاحب نے چار دیوان، ایک مثنوی اور مختلف منظومات یادگار چھوڑی ہیں۔ اور ایک عجیب و غریب پرگوئی کا ثبوت یہ دیا ہے کہ تمام مثنوی میر حسن کا خمسہ کر دیا ہے۔ اور اس کا نام "عجز رقم" رکھا ہے۔ یہ سب نظم کی تصانیف ہیں۔ ایک نثر کی تصنیف تذکرہ گلستان بےخزاں ہے۔ جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گلشن بےخار کے جواب میں لکھی ہے۔ چنانچہ حکیم باطن اپنے تذکرہ کی تاریخ میں لکھتے ہیں :-

---

۵؎ حکیم مومن خاں دہلوی نے میاں صاحب کے نام کا کیا خوب سجع کہا ہے :- "ہر دم نام میاں کالے"

خامہ نے جب دیا جواب سوال | "وہ بروز رکھ کے "گلشن بے خار"
نقصان زمانہ سے کسے سے لئے | ہے "گلستان بے خزاں" میں بہار
بلبل فکر پھر تو سے باطن | پہچانا یہ کھول کر منقار
نام تاریخی اس شگوفے کا | "نغمۂ عندلیب" کہہ سے یار

۱۲۶۱ھ

لیکن حکیم صاحب نے شعرا کے حالات میں وہی عبارت آرائی و قافیہ پیمائی کی ہے جو فسانۂ عجائب وغیرہ کا طرۂ امتیاز ہے اس لئے طویل نمونہ درج کرنا بے لطف ہوگا۔

حمد باری تعالیٰ عز اسمہ صنعت براعۃ الاستہلال یا تذکرۂ شعر و شاعری کے ساتھ لکھتے ہیں:-

"مطلع انوار انواع صفات، حسن مطلع تجلیات غزل کائنات، حمد اس شاعر یکتا کی ہے جس نے بے مدد ادات و بوقلموں منقدین، بیت الغزل عالم میں حسن حسن مقطع از مطلع تا مقطع ساتھ ایک فکر کے بیاض عدم سے لاکر قلم قدرت سے صفحۂ دیوان وجود پر لکھیں"

تذکرہ میں حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں:-

"مومن تخلص، مومن خاں نام، اس کی بندش جمعہ ان آباد، شاگرد ان سخن کے استاد، اگر زور بیاض سحر بیاض فکر دیکھے تو صحن خانہ سے کوچ کر جائے۔ اس کے ہوش میں خرابی پائی جائے۔ رشتۂ جان تار تار ہو۔ رشک مضمون سے ہر شاعر بیقرار ہو۔ قدمال کے بیقرار ہو۔ کلام میٹھا ایسا گاڑھا کہ جس کی حیرت سے شیریں زبان مثل کوہکن کے شور مچائیں نشہ شراب الفاظ سے مخموران خمخانۂ سخن دستار کو ہوا میں اڑائیں۔"

نیاز علی پریشاں خلف شیخ رجب علی۔ شیخ صدیقی تھے۔ ان کے اسلاف قدیم دہلی کے تھے۔ جو سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ دہلی سے اودھ گئے لد

سندیلہ کو مسکن بنایا۔ لیکن پریشان کے قریبی بزرگ آگرہ آ گئے۔ ان کی ولادت و تربیت آگرہ ہی کی ہے۔ پریشاں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ مثنوی، واسوخت، غزل قصیدہ سب کچھ کہا ہے۔ لیکن ان کی بہترین یادگار تذکرہ شعر و سخن ہے۔ اس کی ترتیب ان کو بالیقیں حکیم قطب الدین باطن کے تذکرہ کو دیکھ سن کر سوجھی ہوگی۔ لیکن اس پر بہت اضافہ کیا، اور ترتیب کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ یعنی ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء (مطابق ۱۰ رجب ۱۲۸۶ھ) کو آگرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرنے کا ارادہ کیا، اور کئی مہینے پہلے اس کا اعلان تقسیم کیا اور اخباروں میں چھپوایا۔ یہاں تک کہ ہندوستان سے باہر بھی اس کی خبر پہنچ گئی۔ چنانچہ فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ ۱۸۶۹ء میں اس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

> "ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہونے والا تھا۔ اودھ اخبار مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔"

(از خطبات گارساں دتاسی ص ۲۰۲ مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

پریشان نے مشاعرے کے اشتہار میں ایک نقشہ درج کیا تھا اور شرکائے مشاعرہ سے اس کی خانہ پری کی درخواست کی تھی۔ خانے یہ تھے۔ نام شاعر، تخلص، ولدیت، نام استاد، مدت شاعری، استاد زندہ ہیں یا نہیں، سکونت قدیم و جدید، تصنیفات، عادات۔ اشتہار میں مشاعرے کی غرض پریشان نے یہ لکھی ہے:۔

> "غرض اس جلسہ دلچسپ سے یہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شہروں یا قصبوں کے شاعروں کا حال مفصل ایک خاص تذکرے میں واسطے یادگاری کے لکھا جاوے، تاکہ طرح واحد کے ذریعہ سے ان کی فکر کا نتیجہ ظاہر ہو۔"

یہ مشاعرہ مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کاشی کے مکان واقع کشمیری بازار آگرہ میں منعقد ہوا۔

اس کا حال پریشان لکھتے ہیں :-

"اتنی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں بعد ایک دوسرے کے بہت صفائی کے ساتھ پڑھیں - مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر جب پڑھ چکے تو خلیفہ سید گلزار علی صاحب اسیر نے پڑھ کر لوگوں کو محظوظ کیا - اس کے بعد جناب راجہ صاحب بہادر نے کلام دلاویز سنایا - آفتاب طلوع ہو گیا تھا - مشاعرہ برخاست ہوا"

دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"سب سنئے کہ ایک روز جی نے چاہا کہ کوئی ایسا کام کیجئے جس سے نام باقی رہے۔ اگر یہ فقیر بادشاہ نہ تھا کہ رعایا پر رحم کرتا۔ غنی نہ تھا کہ محتاجوں کو مال و زر دیتا۔ زور آور نہ تھا کہ رستم کی طرح گرز اٹھاتا۔ سپاہی نہ تھا کہ تیر و شمشیر کے وار دکھاتا۔ صاحب کرامت نہ تھا کہ کشف سے کرشمے ظاہر کرتا۔ عالم نہ تھا کہ حق کا رستہ بتلاتا۔ سخی نہ تھا کہ ایثار کرتا۔ حکیم نہ تھا کہ معالجہ کرتا۔ شاعر تھا جھوٹ سچ بکتا تھا - پھر اس کی صورت نام باقی رہنے کی تھی - غزل، رباعی، مثنوی، واسوخت، مخمس، مسدس وغیرہ کہنے والے کہہ گئے ہیں۔ کسی نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ مضمون آرائی، نظم و نثر کی صفائی مجھ سے کب بن پڑتی ہے۔ الغرض دو چار شعر مرتب کرکے تو کیا کیجے۔ اس پر فخر کرنا بیجا [?] [illegible] ہے - وضع میں دھبا لگتا ہے۔ سب سے قطع نظر کرکے یوں ٹھہرائی کہ ایک تذکرہ نئی طرز کا تصنیف ہو تو کیا خوب ہو - پھر یہ بھی خیال ہوا کہ تذکرے تو بہت سے ہیں، محمد نیاز علی ترکیب [?] کر گئے بھئی ایسا کہ وہ تذکرہ بطور مشاعرے کے مرتب ہو جس میں زمانۂ حال کے سخنوروں کا کلام خواہ فارسی خواہ اردو ایک ہی طرح پر لکھا جاوے - غرضکہ یہ پہلو یہ نکالا کہ طرح زیر طبیعت کے آزمانے کی کسوٹی ہوتی ہے، کھوٹا کھرا پرکھا جاتا ہے۔ قافیہ اور ردیف کی نشست، بندش اور ترکیب کی خوبی، الفاظ و معانی کی درستی، مضمون اور خیال کی چستی معلوم ہو جاتی ہے - خیر ان باتوں کو سوچ سمجھ کر استادنا جناب مرزا صاحب

گر دوں وقار سے کہا۔ انھوں نے فرمایا۔ ہاں بات تو ٹھیک ہے، ضرور تدبیر کرو۔ لاؤ طرح کہدیں۔ شاعر پسند کریں۔ چنانچہ مصرع طرح اردو کا فرمایا۔ ع

تری دیوار کے سایہ تلے آکر ہما ٹھہرے

دوسرا مصرع میرے بڑے بھائی مولوی احمد خاں صاحب تخلص صوفی نے تجویز کیا۔ وہ یہ ہے:-

در سرم از نکہت زلف ست سودائے دگر

فارسی کا مصرع کیا شگفتہ ہے، اور اردو کا بہت بھدا۔ ردیف قافیہ وسیع، بحر رواں۔ تمام حسن رکھتا ہے۔ ایک اشتہار میں دونوں مصرعے معہ یک نقشہ تجویزہ مولف کے لکھ کر جا بجا بھیجے گئے۔"

پریشان کو تذکرہ کا تاریخی نام شعر و سخن ۱۲۹۸ھ خوب ہاتھ آیا ہے۔ اس تذکرہ میں شعرائے آگرہ کی فارسی واردو غزلیں ایک سو ایک ہیں۔ باہر کے شاعروں میں اسی آباد کی ۱۴ غزلیں درج ہیں۔ جن میں اصغر علی غنیمت شہرت خواجہ آتش لکھنوی اور منیر شکوہ آبادی ممتاز ہیں۔

شعرائے آگرہ میں بعض سن رسیدہ و کہنہ مشق ہیں۔ لیکن اکثر نوجوان و کمسن ہیں۔ بعض شاعروں نے غالب کو اپنا استاد بتایا ہے۔ مثلاً مددعلی تپش۔ شیخ عبدالمجید رسوا۔ رسوا نے اپنے حال میں لکھا ہے کہ "ایک مدت جناب میرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کی خدمت میں رہ کر نظم و نثر فارسی کی مہارت کی"۔ یہ شاعرہ غالب کے انتقال سے آٹھ مہینے بعد ہوا ہے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی

مولانا عبدالحق کے دادا مولوی فضل امام خیرآبادی تھے جن کی تصنیف مرقات علم منطق میں آج تک

شامل درسیات ہے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ریاست پٹیالہ میں ملازمت کی۔ پھر دہلی میں صدر الصدور رہے۔ ۱۲۴۵ھ؁/۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ جو ۱۲۱۲ھ؁/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا غالب کے بالکل ہم عمر تھے اور بڑے مخلص و بے تکلف دوست۔ علوم معقول اپنے والد سے حاصل کئے، اور علم حدیث حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے۔ دہلی میں سررشتہ دار رہے۔ پھر جھجر، الور، ٹونک کی ریاستوں میں ممتاز عہدوں پر رہے۔ لکھنؤ میں بھی صدر الصدور رہے۔ ریاست رامپور میں نواب یوسف علی خاں نے بلایا اور تلمذ اختیار کیا۔ نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ پڑھا۔ بڑے عالم متبحر تھے، اور عربی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر۔ ہندوستان میں ان کا جواب نہ تھا، بلکہ عرب کے شعراء سے معاصرین سے بھی تحسین حاصل کی۔ کثیر التصانیف تھے، عربی میں درجنوں کتابیں اور حاشیے لکھے ہیں۔

مولوی فضل حق کے قیام لکھنؤ کے زمانے کا ایک لطیفہ[1] بہت دلچسپ ہے جو حضرت قبلۂ عالم مولانا الحاج پیر سید جماعت علی شاہ صاحب امیر ملت محدث علی پوری دامت برکاتہم نے بیان فرمایا کہ جس زمانے میں مولوی فضل حق صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے، منشی نولکشور نے ان کی خدمت میں درخواست کی کہ اوقات فرصت میں مطبع کی عربی کتابوں کی صحت کتابت فرما دیا کریں۔ مولانا فضل حق نے قبول کر لیا، ایک مرتبہ مجتہد العصر لکھنؤ کی ایک مناظرہ کی کتاب مطبع نولکشور میں طبع ہونے کے لیے آئی۔ اس کی کاپیاں تصحیح کے لئے مولانا فضل حق کے پاس آئیں۔ آپ کتاب کی تصحیح بھی کرتے جاتے تھے اور مجتہد صاحب کے اعتراضات کا جواب بھی حاشیہ پر لکھتے جاتے تھے۔ جب کتاب چھپ کر مجتہد العصر کے پاس پہنچی تو انہوں نے سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی کمائی برباد گئی، اور منشی نولکشور سے دریافت کیا، انہوں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ آخر مجتہد صاحب نے کتابوں کے انبار میں آگ لگوا دی۔

---

[1] ماخوذ از فضلائے ہند مرتبہ مفتی انتظام اللہ صاحب۔

سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں اور منشی امیر احمد مینائی نے "انتخاب یادگار" میں مولانا فضل حق کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم صادر ہوا۔ لیکن مولانا کے فرزند ثانی اور منشی غلام غوث بے خبر نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی، اور آخر رہائی کا حکم حاصل کر لیا۔ لیکن "تا تریاق از عراق" والا مضمون صادق آیا جس وقت پروانہ آزادی انڈمان پہنچا۔ اسی وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں وفات پائی، اور رنگون میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا عبدالحق ان کے فرزند اکبر تھے ۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیل علوم کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں سند فضیلت حاصل کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے کچھ دنوں ٹونک میں رہے۔ پھر نواب کلب علی خاں نے رامپور بلا لیا۔ اور اپنے پوتے نواب حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۷ء تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدت حکومت رامپور میں رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتہ گئے۔ وہاں حسب کم دفعہ اور مدرسہ عالیہ کے افسر رہے۔ شمس العلماء کا خطاب پایا۔ وہاں سے ۱۸۸۶ء میں نواب حامد علی خاں نے رامپور بلا لیا اور خود تلمذ اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہو کر وطن خیرآباد گئے اور ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے زمانے میں امام فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سے متعدد نامور علماء نکلے۔ مولانا نے بیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب زبدۃ الحکمۃ اردو میں لکھی۔ یہ منطق کی قدیم کتابوں میں ہے۔ اور ایک کامل فن کے قلم سے نکلی ہے۔ اس سے پہلے منطق کی ایک اور کتاب کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی "ترجمہ شمسیہ" مرتبہ سید محمد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۲ء، لیکن وہ ترجمہ ہے اور اب ناپید۔ مولوی عبدالحق کی کتاب کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی منطق میں ایک کتاب "مبادی الحکمۃ"

کے نام سے لکھی ہے۔ اسی زمانے میں اور لوگوں نے بھی منطق کے رسالے لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ اس کے بعد دیا جاتا ہے۔

زبدۃ الحکمۃ میں مولوی عبدالحق صاحب نے علمائے سابق کا اختلاف اور ان پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے مختصر نمونہ یہ ہے۔

"جاننا چاہیئے کہ علم دو قسم ہے، ایک تصور دوسرے تصدیق۔ اس واسطے کہ جو چیز جانی جاوے بغیر حکم کے یعنی اثبات یا نفی اس کے ساتھ نہ ہو بلکہ صرف معنی اور مفہوم اس چیز کا ذہن میں حاصل ہو۔ اس کو تصور کہتے ہیں۔ جیسے کہ درک زید کا یا قائم کا۔ بغیر اس کے کہ حکم کیا جاوے زید پر ساتھ قائم کے۔ اور اگر جانی جاوے اس طور پر کہ حکم ہو اس پر اثبات یا نفی کا۔ اس کو تصدیق کہتے ہیں۔ جیسے جاننا زید کے قائم کے معنی کا اور یقین کرنا اس کا۔ اور تصدیق کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ حکما کے نزدیک تصدیق صرف حکم کا نام ہے اور تصور موضوع محمول کا اور نیا تصور نسبتہ حکمیہ کا اس کی تحقیق کی شرط ہے۔ یہ تصورات اس کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ اس تقدیر پر تصدیق ادراک بسیط کا نام ہے۔"

منشی دیبی پرشاد بدایونی | ان کا حال دریافت نہیں ہوا۔ ~~سنہ~~ ۱۸۶۹ء ~~۱۲۸۶ھ~~ میں ایک رسالۂ منطق اُردو میں خلاصۃ المنطق کے نام سے لکھا ہے۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں منشی نول کشور کے مطبع میں چھپا ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

فصل چہارم بحث حجت میں۔ حجت تین قسم ہے۔ اوّل قیاس اور وہ استدلال ہے حال کلی کو حال جزئی پر۔ جیسے کل انسان حیوان ہیں۔ اور کل حیوان جسم ہیں۔ پس قیاس ہوا کہ کل انسان جسم ہیں۔ پس حال کلی یعنی حیوان سے حال جزئی یعنی انسان پر دلالت ہوئی۔ دوم استقرا یعنی استدلال حال جزئی سے حال کلی پر۔ جیسے ہر انسان وطیور و بہائم

کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتا ہے، پس معلوم ہوا کہ سب حیوانات کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتے ہیں۔ یہاں حال جزئیات یعنی انسان وطیور وبہائم سے حال کلی حیوان پر دلالت کی گئی۔ سوم تمثیل وہ دلالت کرتا ہے حال جزئی سے حال جزئی پر بسبب اشتراک کسی امر کے ان میں، جیسے کہیں کہ بھنگ حرام ہے کیونکہ شراب حرام ہے، اور دونوں جزئی ہیں مسکر کے۔ یعنی دونوں میں نشہ ہے۔ مگر واضح ہو کہ استقرا و تمثیل مفید ظن ہیں، اور قیاس مفید یقین۔

مولوی محمد رضا لکھنوی

ان کا حال بھی معلوم نہیں بجز اس کے کہ جس وقت رسالہ منہاج المنطق لکھا ہے، مولوی محمد رضا خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع کھیری تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بیلنٹین کے انگریزی رسالہ منطق کا اردو ترجمہ ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"بجائے مصطلحات و الفاظ متداولہ منطق انگریزی کے بجنسہ مصطلحات و الفاظ مستعملہ منطق عربی داخل ترجمہ کئے، اور التزام اس امر کا رکھا کہ محاورۂ زبان اردو بھی ساقط نہ ہو اور ترجمہ بھی لفظاً بلفظ ہو۔"

یہ ترجمہ ۱۲۹۸ھ میں مرتب ہوا اور ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور میں طبع ہوا۔

انگریزی میں کتب منطق کی ترتیب اور پڑھانے کا طریقہ عربی کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہے۔ یہی فرق اوپر کے دو مصنفوں کی تالیفات اور مولوی محمد رضا خاں کے ترجمہ میں ہے، اگرچہ ترجمہ کی زبان ان دونوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ صاف نہیں ہے۔ منہاج المنطق کا نمونہ یہ ہے:

۲۶۔ قضیہ صادقہ کا عکس کچھ ضرور نہیں کہ صادق ہی ہو۔ مثلاً کل گھوڑے حیوان ہیں قضیۂ صادق ہے مگر اس کا عکس کہ کل حیوان گھوڑے ہیں کاذب ہے۔ اصل قضیہ میں ہم نے سب گھوڑوں کا ذکر کیا ہے نہ سب حیوانات کا، اس لئے اس کے عکس میں ہم کو کل حیوان کے ذکر کرنے کے بجائے صرف بعض حیوان کا ذکر کرنا چاہیے، اور اصل

قضیہ میں اس بات کا ایما نہیں پایا جاتا کہ کُل حیوان گھوڑے ہیں، البتہ بعض کے ہونے کا پایا جانا ہے

۲۷۔ یہ اقوال جو دفعہ ۲۲ سے ۲۶ تک مذکور ہوئے، بواسطہ اشکال کے بخوبی بیان ہو سکتے ہیں۔ پہلے یہ قضیہ لو کُل گھوڑے حیوان ہیں۔ اور فرض کرو کہ سب گھوڑے ایک مثلث میں گھیرے جاویں، اور سب حیوان ایک دائرے میں۔ پس اس صورت میں اگر قضیہ مذکورہ صحیح ہے تو بالکل مثلث دائرہ کے اندر گھر جاے گا، اس طور پر △ اور بالکل مثلث کے دائرہ میں گھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کے کُل افراد پر حکم ہے، اور چونکہ گھوڑے کے سوا اور بھی حیوان ہیں، اس لئے مثلث دائرہ کی تمام سطح پر محیط نہیں۔ اور اگر ہم اصل قضیہ کو منعکس کریں تو اس صورت میں کُل حیوان تو محکوم علیہ ہو ہی نہیں سکتے مگر چند۔ پس ہم کو حیوان کے ساتھ لفظ بعض کی بھی قید لگانی ضرور ہوگی، اور ہم شکل میں بھی دیکھتے ہیں کہ دائرہ کی بعض سطح مثلث کے ساتھ منطبق ہے حالانکہ بالکل مثلث بعض دائرہ کے ساتھ منطبق ہے۔

مولوی محمد علی تحصیلدار

بچھرایوں ضلع مراد آباد وطن تھا۔ سنہ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا سنہ ۱۸۲۳ء میں سررشتہ داری صدر صدور سے ہوئی۔ صیغہ نظامت اور سررشتہ داخل خارج میں رہے۔ حدود تحصیلات قائم کرنے پر مامور رہے۔ رجسٹرار دیوانی رہے۔ پھر سنہ ۱۸۴۵ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں تحصیلدار ہوئے۔ تبادلے ہوتے رہے۔ بلاری ضلع مراد آباد سے جون سنہ ۱۸۷۶ء میں پنشن پائی۔ اور سنہ ۱۸۸۷ء ۱۳۰۵ میں رحلت فرمائی۔ مولوی عبدالرشید صاحب نے قطعۂ تاریخ کہا:۔

جناب محمد علی حامی دیں
بہ معقول و منقول فرد یگانہ
بگویم سنِ رحلتش بادلائل
مفسر محدث فقیہ زمانہ
۱۳۰۵

مصرعِ تاریخ کے اعداد (۱۲۳۰) میں دلائل کے اعداد (۷۵) جمع کرنے سے ۱۳۰۵ھ سال وفات نکلتا ہے۔

سرسید کی مذہبی تحریروں نے علمائے ہند کو نہایت مضطرب کر دیا تھا۔ ہر طرف سے ان کی مخالفت میں کتابیں اور اخبار و رسائل شائع ہو رہے تھے۔ حدِ اعتدال کو قائم رکھنا عالم و جاہل دونوں کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ جوشِ مخالفت میں سرسید پر کفر کے فتوے لگا دئے گئے پھر جب ۱۸۸۰ء سے سرسید نے تفسیر قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو مخالفت اور بڑھ گئی۔ ان مخالفوں میں ایک زبردست مخالف مولوی محمد علی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے سرسید کے ایک ایک فقرہ ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کر دیا، اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں۔ یہ مجلدات **البرہان** کے نام سے مشہور ہیں۔ پورا نام یہ ہے:۔ البرہان علیٰ تجہیل من قال بغیر علم فی القرآن۔ اب نہ سرسید کی تفسیر کوئی پڑھتا ہے نہ اس کا رد دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہے۔ لیکن اس قسم کا لٹریچر بھی انیسویں صدی کی عجیب و غریب پیداوار ہے۔ مولوی محمد علی صاحب بڑے عالم اور باخبر بزرگ تھے۔ اُس زمانے میں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے۔ دوسری طرف سرسید اور مولوی چراغ علی نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مُسلّم قوانین و اصول کی توجیہ اور رائے زنی شروع کر دی۔ ایسے معرکہ آرا میں مطابق حدیث شریف اِختِلَافُ اُمَّتِی رَحْمَۃٌ (میری اُمت کا اختلاف رائے و اجتہاد بھی رحمت ہے) کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے، کبھی دوسرا۔ بہرحال مولوی محمد علی صاحب نے عیسائیوں اور (بقول خود) نیچریوں، دونوں کے جواب لکھے۔ ۱۸۷۲ء میں کانپور سے ایک رسالہ نورالآفاق اسی مذہبی مناظرے اور مناقشے کے لئے جاری ہوا تھا۔ اس میں مولوی صاحب نے مضامین لکھے۔

مولوی محمد علی صاحب کی متعدد غیر مطبوعہ تصانیف کے علاوہ مطبوعہ کتابیں یہ ہیں:۔

(۱) رَدُّ الشِّقَاقِ فِی جَوَازِ الاِسْتِرْقَاق۔ سرسید کے رسالہ "ابطال غلامی" کا جواب،

اسلام میں لونڈی غلام بنانے کے رواج کو جائز ثابت کیا ہے۔ مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء

(۲) ظفر مبین۔ مسٹر اینڈرسن کے اعتراضات کا جواب

(۳) سوط اللہ الجبار۔ یہ بھی اینڈرسن کا جواب ہے۔

(۴) البرہان۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مطبوعہ مطبع گلزار احمدی مراد آباد

مولوی محمد علی نے اپنی تصنیف البرہان میں سرسید کی ہر قسم کی غلطیاں قرآن فہمی و عربی دانی کے متعلق صرف و نحو، علم زبان علم کلام، اصول تفسیر کے حوالوں کے ساتھ بیان کی ہیں۔ زبان میں قدامت کا اثر ایسا ہی ہے جیسا سرسید کی تحریر میں۔ سرسید کو ہر جگہ "سید العالئفہ" یا "سید الطائفہ، نیچریہ" لکھا ہے۔ اول لفظ قال لکھ کر سرسید کی تفسیر کا حصہ نقل کیا ہے۔ پھر قلت لکھ کر اپنا جواب لکھا ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

"قال، جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے ان کو نہیں دکھ سکتے تھے۔ پس وہ ان کو قریب اس پہاڑ کے لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑ گڑاہٹ اور زور و شور کی آواز اور پتھروں کی آواز کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔

قلت۔ بیان واقعہ میں کس قدر مغالطہ کو کام میں لارہے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ہیں۔ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً یعنی ہم تجھ پر ایمان نہ لاویں گے جب تک اللہ کو عیاناً نہ دیکھ لیں گے۔ اس گستاخی و کفر کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا تھا اگر یہ کہتے کہ ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ان پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا، بلکہ حضرت موسیٰ ان کو سمجھا دیتے کہ تم خدا کو اس دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھا دیا تھا کہ لَن تَرَانِي[۱] اور چونکہ بقول سید الطائفہ کے وہ بیہو

---

[۱] یہاں شاہ عبد العزیز صاحب کی تفسیر عزیزی سے ایک طویل فارسی عبارت اپنے قول کی تائید میں نقل کی ہے۔ وہ حذف کر دی گئی۔

آتش فشاں تھا، اور آتش فشاں پہاڑوں کا حال جو کچھ ہے وہ کوئی عجائبات سے نہیں،
ایک معمولی بات ہے۔ اس سے تو بدرجہا زائد عجائبات وہ دیکھ چکے تھے کہ ان کی
نظروں کے سامنے بحر قلزم پھٹ گیا۔ اور پانی کے تودے کوہ ہائے عظیم کے برابر ان کے
دائیں بائیں کھڑے ہو گئے، اور وہ خشکی میں ان تودوں کے درمیان عین قعر دریا میں ہو کر
نکل گئے۔ عصا کی کیفیت دیکھ چکے تھے کہ اژدہا ہو کر ساحروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو
نگل گیا۔ مقام رفیدیم میں ایک سنگ خارا سے بارہ چشمے پانی کے جاری کر دئے۔ ان
عجائبات کے مقابلہ میں ایک ایسے امر کو کہ دستور مستمر کے موافق ظہور اس کا ہمیشہ ہوتا
رہتا ہے وہ لوگ کس طرح پر عجائبات اور کرشمہ سمجھ سکتے تھے، اور ایسا امر معمولی کہ اس
میں موسیٰ علیہ السلام کی نہ کچھ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، نہ ان کی عظمت، نہ ان کی نبوت و
تقرب پر دلالت کرتا ہے، کسی طرح پر باعث اس کا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے اس
متوارثہ عزیمہ سے کہ (لَن نُّؤمِنَ لَکَ) رجوع کریں، بلکہ یہ امر تو موجب ازدیاد کفر اور
بدگمانی کا تھا کہ قوم کو دھوکا دیا۔ خدا کے دکھانے کا تو انکار کیا اور کوہ آتش فشاں میں
لیجا کر ان کی مٹی خراب کی۔ ورنہ سید الطائفہ کے نزدیک وہ لوگ سب کے سب
اندھے بہرے نہ، نہ ایسے مسلوب الحواس تھے کہ دور سے نہ گڑگڑاہٹ کی آواز
سنی نہ آگ کے شعلے دیکھے نہ آگ کی گرمی ان کو محسوس ہوئی، اپنی موت ان کو نظر نہ آئی
یہاں تک کہ اس مقام سے کہ جہاں سے یہ امور محسوس ہو سکتے تھے آگے تک بڑھے
چلے گئے، یہاں تک کہ ایسے قریب پہنچ گئے کہ مرنے تک کی نوبت پہنچ گئی ......
پس کس طرح عقل باور نہیں کرتی کہ ایسے لوگ موسیٰ عم کے کہنے سے دیدہ و دانستہ
آتش فشاں پہاڑ کے قریب اپنی جان کھونے کو چلے جاتے اور ان سے یہ جھگڑا نہ کرتے
کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے دکھانے کے تجھ سے خواہاں تھے تو ہمیں اس آتش فشاں پر
مار ڈالنے کے واسطے لئے جاتا ہے۔"

مفتی امیر احمد مینائیؒ

حضرت امیر مینائیؒ لکھنوی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مشاہیرِ مصنفینِ نثر میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔ لیکن انھوں نے بھی نثر کی چند کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک تذکرۂ شعرا ہے، اس لئے اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ دوسری اُردو لغت کی کتاب (امیر اللغات) ہے۔ یہ اُردو کی بہترین خدمت تھی اگر مکمل ہو جاتی، لیکن ناتمام بھی حضرت امیر مینائیؒ کا کارنامہ ہے۔ یہ راہ پہلے انھیں نے نکالی جن اصول پر لکھنا شروع کیا تھا، ان پر عمل کر اور لوگوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔

امیر مینائیؒ مولوی کرم محمد کے فرزند رشید تھے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے عہد حکومت میں ۱۲۴۴ھ/۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے درسیات کی تکمیل مفتی سعد اللہ رامپوری اور علماے فرنگی محل سے کی، شاعری کا بچپن سے شوق تھا منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ حاصل کیا۔ اُس زمانے میں آتش و ناسخ کے شاگردوں کے باہم معرکے اور انیس و دبیر کے مقابلے زور شور پر تھے۔ جرح و قدح اور نقد و نظر کا بازار گرم تھا۔ اس لئے کسی ادنیٰ شاعر کو فروغ حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت امیر مینائیؒ نے شروع ہی سے شاعری پر محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہرت حاصل کر لی کہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۲ء میں جبکہ امیر صاحب کی عمر بیس سال کی تھی واجد علی شاہ نے ان کو طلب کیا اور کلام سُنا۔ بادشاہ کے حکم سے دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان لکھ کر پیش کیں۔ اور دربار شاہی سے خلعت پایا۔

غدر کے بعد ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں نواب یوسف علی خاں نے رامپور بلایا۔ اور بڑی عزت کی۔ اپنے کلام پر اصلاح بھی لی۔ پھر ان کے بعد نواب کلب علی خاں نے امیر کو اپنا اُستاد بنا لیا ان کے بعد نواب حامد علی خاں نے قدر و منزلت کی۔ ۴۲ برس ریاست رامپور میں بڑی عزت و راحت سے رہے۔

پھر نواب مرزا داغ نے امیر صاحب کو حیدرآباد بلایا، حضور نظام کا ایما پہلے ہو چکا تھا۔ امیر حیدرآباد گئے، لیکن جاتے ہی بیمار ہو گئے اور ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

خاکسار مولف نے تاریخ وفات کہی تھی: "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" (۱۳۱۸)

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب حضرت امیر مینائی سفر دکن پر جانے لگے تو اپنا یہ شعر پڑھا ؎

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن — کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

اس میں لفظ غریب الوطنی سے ان کا سال وفات (۱۳۱۸ھ) نکلتا ہے۔

امیر مینائی بڑے عالم، مفتی، عابد و زاہد، اور صاحب عرفان تھے۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں رامپور کے ایک عارف کامل حضرت امیر شاہ قدس سرہٗ کے مرید اور صاحب اجازت تھے۔ باوجود مشاغل شعر و ادب اور خدمت سلاطین کے ریاضت روحانی میں فرق نہ آتا تھا۔ دیانت کا یہ حال تھا کہ جس زمانے میں امیر صاحب رامپور میں عدالت دیوانی کے حاکم تھے، نواب خلد آشیاں کلب علی خاں ولی عہد تھے۔ ایک مرتبہ ولی عہد بہادر کے کسی خادم خاص کا مقدمہ حضرت امیر مینائی کی عدالت میں پیش ہوا۔ ولی عہد نے امیر صاحب سے اس کی سفارش کہلا بھیجی۔ لیکن انھوں نے انصاف و دیانت کو ہاتھ سے نہ دیا اور روئداد مقدمہ کے لحاظ سے اس شخص کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس وقت ولی عہد کو یہ بات ناگوار گذری لیکن جب خود تخت نشین ہوئے، اور مصالح عدالت و سیاست پر نظر پڑی تو ایک دن خود امیر صاحب سے فرمایا کہ آپ کی اس کارروائی کا مجھ سے زیادہ قدر شناس کوئی نہیں۔

حضرت امیر مینائی عربی و فارسی کے عالم ہونے کے علاوہ ہندی و سنسکرت بھی خوب جانتے تھے، طب بھی پڑھی تھی۔ علم جفر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جفر میں دو کتابیں، "انور غیبیہ" اور "رموز غیب" بھی لکھی تھیں۔ امیر مغفور کی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ کثرت سے ہیں۔ ۲۵ سے کم نہیں ہیں۔ لیکن اکثر نظم کی ہیں جن میں دو دیوان عشقیہ، مرآۃ الغیب (۱۲۸۹ھ) اور صنم خانۂ عشق (۱۳۰۶ھ) ایک دیوان نعتیہ محامد خاتم النبیین (۱۲۸۰ھ)، ایک مجموعہ واسوخت، مینائے سخن (جو بعد وفات شائع ہوا) خاص چیزیں ہیں۔ نثر میں رسالہ میلاد شریف خیابان آفرینش (۱۳۰۵ھ)، نماز کے اسرار، زاد الامیر، امیر اللغات اور انتخاب یادگار مطبوعہ یادگار ہیں

ل ممکن ہے یہ نام تاریخی ہوں۔ پہلے سے ۱۲۶۴ھ اور دوسرے سے ۱۲۶۵ھ نکلتے ہیں۔ امیر مرحوم کی اکثر کتابوں کے نام تاریخی ہیں۔ اس لئے یہ قیاس ہوتا ہے۔

ہیں۔ امیر مرحوم کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبر آبادی مرحوم (سابق پروفیسر وکٹوریا کالج گوالیار) نے مکتوبات امیر مینائی کے نام سے مجموعہ خطوط شائع کردیا ہے۔

امیر صاحب کے مکان رامپور میں ۱۸۹۵ء میں آگ لگ گئی تھی۔ جس سے ان کے کتب خانہ کا بڑا حصہ جل گیا۔[1] یہ حضرت امیر کے ذاتی نقصان کے علاوہ ملک و قوم اور زبان و ادب کا اتنا بڑا نقصان تھا جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی۔ کتنی غیر مطبوعہ تصانیف خاک سیاہ ہوگئیں۔ جن میں ان کے دوسرے دیوان کے بعد کا کلام بھی تھا، جس کے متعلق خود حضرت امیر کا بھی خیال تھا کہ "صنم خانہ" سے بہتر ہے۔ "صنم خانۂ عشق" کو وہ اپنا بہترین کلام نہ سمجھتے تھے۔

امیر مرحوم کی تصانیف نثر میں "انتخاب یادگار" (۱۲۹۰) سب سے قدیم ہے۔ یہ نام تاریخی ہے۔ ۱۸۷۳ء میں مرتب ہوا۔ اس میں صرف اُن شاعروں کا حال و کلام درج ہے جو رامپور کے رہنے والے یا دربار رامپور سے تعلق رکھنے والے تھے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر کے حکم سے لکھا گیا۔ امیر مرحوم دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"ایک دن بندگانِ حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت سخن گوئی کی حقیقت نقشِ صفحۂ روزگار رہو۔ اسی ضمن میں اعزاز اس ہیچمداں کا بھی منظور ہوا، لہٰذا یہ ہیچمیرز اس خدمت پر مامور ہوا، در محض باقتضائے عطوفت خسروانی آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا۔ تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا۔"

---

[1] بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے کی ہو۔ ۱۸۹۰ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا۔ پھر بھی ادھر سے جلے ہوئے کاغذ اُڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثہ سے ہم سب پر عجب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ بعض تقریبیں جن میں شریک ہوا یاد ہیں۔ حامد حسن قادری

پچھ۷۰۰ سو صفحے کے قریب ضخامت ہے۔ اور چار۴۰۰ سو سے زیادہ شاعروں کا حال ہے۔
شروع میں ۴۶ صفحوں میں تمام والیان ریاست رامپور کا مفصل حال لکھا ہے، اور ان میں
سے جو شاعر تھے ان کا کلام بھی۔ اس کے بعد عام شعرا کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب سے
ہے۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی جس زبان کا جو مسلمان یا ہندو شاعر ہے اس کا تھوڑا یا بہت
تذکرہ ضرور ہے۔ عربی اور ہندی کے تمام اشعار کا اردو ترجمہ بین السطور میں لکھ دیا ہے۔
انتخاب یادگار میں چونکہ شعرائے رامپور کا احاطہ کرنا تھا۔ اس لئے ہر قسم کے شاعر
شامل کرلئے گئے۔ بہرحال یادگار ہونے میں شک نہیں۔ کتنے اچھے شاعر ہیں جو کبھی بھی
دوسرے کسی تذکرے میں نہ مل سکتے۔ "خمخانۂ جاوید" جیسے تذکروں کو انتخاب یادگار سے
بہت مدد ملی۔
اس کی طرز تحریر میں کوئی خاص بات نہیں۔ جس زمانے میں امیر مغفور نے یہ کتاب
لکھی ہے۔ مقفٰے عبارت کا رواج تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ سرسید کی صاف اور رواں تحریریں
شائع ہو رہی تھیں۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مرآۃ العروس" وغیرہ مشہور ہوگئی تھیں۔ عام
کتابوں اور رسالوں میں قافیہ کی آرائش باقی نہ رہی تھی۔ لیکن غالباً کچھ تو حضرت امیر کی اپنی پسند
کچھ یہ خیال کہ شاہی فرمان سے کتاب لکھی جاتی ہے تو اس پر محنت بھی ہونی چاہئے۔ اور کچھ
خصوصیت اور زیب و زینت بھی، انتخاب یادگار کی اس خاص طرز کے باعث تھے۔ مختصر
نمونہ یہ ہے:۔

"حیا۔ صاحب عالم مرزا رحیم الدین خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین رشت۔ اٹھتر
برس کا سن ہے۔ جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن ہے۔ نہایت خوش طبیعت نیک خصال
ہیں۔ آفرینش سخن میں بڑے ذی کمال ہیں، شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ وطن قدیمی
ان کا دہلی ہے مگر مدت سے اسی سرکار فیض آثار سے تعلق ہے، مع اہل و عیال یہیں
رہتے ہیں۔ مشق کا یہ عالم ہے کہ موتی طبیعت سے دریا کی طرح بہتے ہیں، زبان اچھی

مذاق اچھا ہے۔ فکر بلند ذہن رسا ہے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ اشعار ان کے قابل دید ہیں:-

تھے کل نگاہ میں مرے عقدے تمام حل — اتنا سا کام آپ کو دشوار ہو گیا

تڑپنا میرا وہ دیکھ گیا یہ حرف غلط — نہ بیٹھنے کا مگر ان کو اک بہانہ ہوا

دشمن صد چاک دامن و رسوائے عشق کا — یہ بھی کیا میں ہو گیا میرا گریباں ہو گیا

چین کیا آئے شب غم موت بھی آتی نہیں — یاں تو دم کا بھی نکلنا دل کا ارماں ہو گیا

باقی ہے دل پہ یاس مرگ تمنا سے — درد نکل جائے نہ دم کی طرح

یہ میرا نقش ہے، دنیا نہیں ہے — کہ وہ کہتے ہیں اڑا دو گے گھر سے نکال کر

امیر صاحب نے حیا کے بہت سے شعر درج کئے ہیں۔ یہاں امیر کی پسند اور انتخاب کی خوبی دکھانے کے لئے چند شعر نقل کر دیئے گئے ہیں۔

امیر مینائی مرحوم کا دوسرا کارنامہ امیر اللغات ہے۔ ان سے پہلے بھی اردو لغات[۱] کی کتابیں بہت لکھی گئیں۔ لیکن کوئی جامع کتاب کوئی نہ تھی۔ امیر مرحوم نے اردو محاوروں کا

۱؎ اردو لغات۔ اردو کی چند قدیم لغت کا ذکر دور متقدمین کے ذکر میں آچکا ہے۔ اہل یورپ کی لغات اردو سے پہلے میر عبدالواسع ہانسوی نے غرائب اللغات لکھی تھی جس کو سراج الدین علی خان آرزو نے دوبارہ صحت کے ساتھ نوادر الالفاظ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی نے کوئی قابل ذکر لغت کی کتاب نہیں لکھی۔ یورپ والوں کو ہندوستان میں آکر اردو زبان سیکھنے کے سلسلے میں اردو کی فرہنگ کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک مشنری ایم۔ بی۔ نیسیس نے ۱۷۴۰ء میں اردو لغات مرتب کئے۔ پھر ۱۷۶۳ء میں فرگسن نے ہندوستانی انگریزی لغت لکھی۔ پھر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۲ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری شائع کی۔ اس کے بعد اہل یورپ نے کثرت سے اردو لغت لکھے، جن میں یہ کتابیں ممتاز ہیں:- (۱) کپتان ٹیلر کی اردو انگریزی لغت (۱۸۰۸ء) - (باقی حاشیہ صفحہ ۳۷۱ پر)

احاطہ اور سند کے اشعار کا اضافہ بڑی کاوش کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن صرف دو جلدیں الف ممدودہ و الف مقصورہ کے الفاظ کی ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں۔ تکمیل نہ ہو سکی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۰)

(۲) گلیڈون کی ڈکشنری ۱۸۰۹ء۔ (۳) کپتان روبک کی "لغت جہازرانی" ۱۸۱۱ء۔ (۴) جان شیکسپیر کی اردو لغت ۱۸۱۳ء۔ (۵) ڈنکن فوربس کی ہندوستانی لغت ۱۸۴۷ء۔ (۶) فرانسیسی برٹرینڈ کی اردو لغت ۱۸۵۸ء۔ (۷) ڈاکٹر فیلن کی چار اردو ڈکشنریاں عام الفاظ کی الگ اور قانونی الفاظ کی الگ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۰ء تک۔ (۸) پلیٹس کی اردو ہندی ڈکشنری ۱۸۸۴ء۔

اہل ہند نے بھی لغت نویسی کی طرف توجہ کی۔ (۱) میر اوحد الدین بلگرامی نے اردو لغات اور محاورے "نفائس اللغات" میں جمع کئے۔ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ عربی مترادف الفاظ بھی لکھے ہیں۔ محمد علی شاہ اودھ کے عہد حکومت (تا ۱۸۴۲ء) میں مرتب ہوئی۔ (۲) اس کتاب میں جو لغت رہ گئے تھے۔ ان کو بھی شامل کر کے محبوب علی رامپوری نے منتخب النفائس کے نام سے نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کی۔ یعنی تمام لغت جدولوں میں لکھی ہے۔ تین خانے بنائے ہیں۔ پہلے خانے میں اردو لفظ، اس کے سامنے دوسرے خانے میں فارسی مترادف اور تیسرے میں عربی۔ متن میں کوئی عبارت نہیں۔ لغت کے اعراب، تشریح، سند کے اشعار وغیرہ سب حاشیے میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں امجد علی شاہ اودھ (عہد حکومت تا ۱۸۴۷ء) کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ اور ۱۸۷۱ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی۔ (۳) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ ۱۸۹۲ء۔ (۴) امیر اللغات (۵) فصیح اللغات مولانا احسن مارہروی نے مرتب کرنی شروع کی تھی۔ حضرت داغ دہلوی سے اس کے سند کے شعر لکھوائے تھے لیکن ناتمام رہ گئی۔ (۶) نواب عزیز جنگ کی "آصف اللغات"۔ یہ ڈکشنری کیا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ لیکن ناتمام رہ گئی۔ تقریباً ۸ ہزار صفحوں میں حرف رت تک نوبت پہنچی تھی۔ (۷) اس اعتبار سے اردو کی سب سے پہلی مکمل عظیم الشان لغت نور اللغات ہے۔ جو مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی نے ۱۹۳۰ء میں مکمل کر کے شائع کی۔ (۸) اس کے بعد سب سے جامع اللغات مولوی عبدالمجید نے شائع کی۔ یہ نوراللغات سے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۷۲ پر)

امیر اللغات کا دیباچہ امیر صاحب نے نہایت سلیس و رواں اردو میں لکھا ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے "امیر اللغات" کی داستانِ تالیف بھی معلوم ہو گی:-

میں نے ہوش سنبھال کر آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زباندان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انھیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا، اور اسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی، اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں۔ اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی۔ اور غدر ہو گیا۔ وطن کی تباہی اور گھربار کے لٹنے سے جیسے حواس ہی جمع نہ ہو سکے، افسوس کیسے؛ لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سہارا دیا۔ اب میں پھر اپنی لغت کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی میرے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکان اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے، اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے تھے، دونوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو ملی یہ سکا کہ اپنے ارادے کو پورا کر دوں۔ تاہم کچھ نہ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی، لیکن کچھ بھی ہو، یہاں وہی دُھن بندھی رہی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۱)

زیادہ ضخیم ہے۔ ان بڑی کتابوں کے علاوہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، مرزا عزیز لکھنوی، مولوی فیروز الدین وغیرہ نے مختلف اردو لغات شائع کی ہیں۔ (۹) انگریزی لغات کے اردو معانی کے لئے اب تک کوئی مکمل و مستند ڈکشنری نہ تھی یہ کمی حال میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے پوری کر دی کہ انگریزی کی اسٹینڈرڈ ڈکشنری کو اردو میں منتقل کر کے انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

۱۸۸۴ء میں علوم کے قدرداں سر الفرڈ لائل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی، فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا، جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست و حال وائس پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی) کے ذریعے سے سر الفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔

آگے کا قصہ یہ ہے کہ لفٹنٹ گورنر نے نمونہ پسند کیا اور سرپرستی و امداد کی امید دلائی۔ لیکن وہ چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کا انتقال ہو گیا۔ امیر اللغات کا کام رک گیا۔ آخر نواب حامد علی خاں کے عہد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ امیر اللغات کا نمونہ یہ ہے:-

"آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی ہیں یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جہاں کسی کام میں بہت کچھ محنت و مشقت ہو چکے، تھوڑی سی کوشش باقی رہے۔ داغ ؎

جو بیٹھیں آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں — رہی ہیں بس یہی آنکھوں کی سوئیاں باقی

اس مثل کی نسبت ایک کہانی مشہور ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی عورت نے ایک شخص کو دیکھا کہ مردہ سا پڑا ہے اور تمام بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی ہیں۔ سمجھی کہ کسی نے اس پر جادو کیا ہے، اس لیے کہ بقول مشہور ایک قسم کے جادو میں سوئیاں بھی چبھوتے ہیں۔ وہ سوئیاں نکالنے لگی۔ سارے بدن کی سوئیاں نکال دیں، صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں کہ ایک عورت وہاں اور آ گئی۔ اس سے اس نے کہا کہ اب آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں تو یہاں ٹھہری رہ میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کسی ضرورت کو گئی۔ اس عورت نے اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال دیں۔ اور وہ شخص سحر سے نجات پا کر اٹھ بیٹھا۔ محبت اور ہمدردی اس عورت کی ثابت ہوئی جس نے آنکھوں کی سوئیاں نکالی تھیں۔"

امیر مینائی کے خطوط بھی ان کی عمدہ یادگار ہیں۔ بعض میں شعر و ادب کے مسائل بیان کیے ہیں۔ بعض پرائیویٹ خط بہت دلچسپ ہیں۔ اس طرح کا ایک خط حضرت داغ دہلوی کو لکھا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مرزا داغ کو حضور نظام دکن نے "استاد السلطان" کا خطاب دیا۔ اخبار میں اس کا تذکرہ چھپا۔ امیر صاحب نے بھی دیکھا۔ انھیں دنوں میں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا لیکن انھوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر لکھتے ہیں:-

معدن لطف اتم قدیم کرم سلامت۔ سلام مسنون خلاص مقرون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ آیا۔ ممنون یادآوری فرمایا۔ بندہ نواز! مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ بہرکیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں یہ امر نے آپ کا ملقب بخطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھپا۔ یہ دیکھ کر نہایت سرور ہوا تھا۔ مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور رکھیت گیا عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تمکنت سے فرمائی وہ میرے سرور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے۔ شکایت جو آپ نے "صنم خانۂ عشق" دیوان دوم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے، وہ دیوان چھپا کہاں، ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے رشک و حسد سے نہ گزاریں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یکجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہو گئے ہو یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رکاوٹ کے لیے ایک بات قرار دی ہے

(داغ نے امیر کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہوگا، اس کا جواب اسی خط میں دیتے ہیں)

اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا۔ اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا۔ یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آگیا کہ مرحوم و مغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو۔ کوئی اور حوصلہ نہیں ہے .....

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہوجاتا ہے میں کہتا کیا ہوں جو بھیجوں۔ جی افسردہ رہتا ہے۔ کبھی کسی گلدستے والے کے اصرار سے کچھ کہتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغت چشم بد دور آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں خدا جمعیت خاطر بڑھائے۔

(اسی خط کی آخری سطروں میں کس بے تکلفی و خلوص سے لکھتے ہیں

ارے یہ بات آسمان ہونے کی مٹھائی تو لٹا۔ یا بات دیانت داری سوں کہا گیا ہے اب جو وہ وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔ امید ہے کہ کبھی کبھی بسم اللہ دریافت رہے۔ میں ابتدا سے تمہارا دوست دولت خیرخواہ ہوں۔ میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر ۳ مارچ ۹ء

یہ خط مکتوبات امیر مینائی میں شامل نہیں ہے۔ رسالہ نیرنگ[۵] دہلی کے امیر نمبر سے نقل کیا گیا ہے۔ اس سے نادر یادگار ہے۔

---

[۵] مولوی عزیز اللہ خاں رامپوری مرحوم نے غالباً ۱۵۲۷ء میں ریاست رامپور سے "نیرنگ" جاری کیا۔ گھر کا چھاپہ خانہ ان کے والد مغفور سعید اللہ خاں صاحب عیش رامپوری کا قائم کردہ "مطبع سعیدی" موجود تھا۔ سعید اللہ خاں بھی بڑے صاحب ذوق تھے ایک رسالہ تہذیب نام مدتوں نکال چکے تھے۔ بعض نادر کتابیں اپنے مطبع سے شائع کیں۔ منیر شکوہ آبادی کے کئی دیوان چھاپے۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا دیوان شائع کیا۔ منشی احمد علی شوق قدوائی کی نظموں کا مجموعہ "گنجینہ" کے نام سے شائع کیا۔ ان کے فرزند رشید عزیز اللہ خاں نے نیرنگ کو علمی و ادبی شان کے ساتھ جاری رکھا۔ بعض خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع کئے جن میں میر نمبر اور امیر نمبر ممتاز ہیں۔ عزیز اللہ خاں بیمار رہنے لگے تو ان کے دوست (باقی حاشیہ صفحہ ۳۷۶ پر)

ایک اور خط حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی کے نام یہ ہے :-

۸ر۲۰ر سنہ ۱۹۵۶ء

محبی حکیم صاحب

سلام مسنون دعا مشحون۔ مہربانی نامے نے پونہچ کر شکر گذار یادآوری کیا۔ اب تک آپ کا فائز مرام نہونا سخت افسوس کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دلخواہ کامیاب فرمائے۔ یہ داعی خیر دعا سے کسی وقت غافل نہیں ہے۔

بھانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے۔ نہیں (میں ہی) کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو، مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اس کے استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت آسی مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہ گیا۔ اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے، تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے۔ انکھڑیاں چشم معشوق کے لئے مخصوص ہے، اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔ بھدنا لفظ نہیں ہے، بدعت ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صبا ؎

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنوں زا دل میں
رہ گیا ہے نگیں حسن کا سودا دل میں

ایچ دار مذکر ہے۔ سند کے واسطے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں اور جا بجا سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵)

عشرت رحمانی صاحب رامپوری نے ہاتھ بٹایا اور نیرنگ کا اہتمام اپنے ذمہ لیکر دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ عزیز اللہ خاں کی بے وقت جوان موت نے ایسا صدمہ پہونچایا کہ نیرنگ دہلی میں بھی اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ وہ کچھ عرصہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔

میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول
ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے
بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے، اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں
بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ تسلیم دہلوی ؎

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارکباد مرگ — یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

میر ؎

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں — راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے، وہ سند کے لئے پورے طور
سے کافی نہیں ہو سکتا۔ مگر دیوان میں اس طرح چھپا ہے، اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے
سنا ہے۔ غافل لکھنوی ؎

اتنی مینائی کہاں دیکھیں جو سیر جزو و کل — عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہے۔ مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر لکھا ہے۔ لہذا مختلف فیہ کہا
جا سکتا ہے۔ ناسخ ؎

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی — تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہ ؎

بارہا میں گیا ہوں نزد امام — کبھی مجھکو نہ دی کوئی دشنام

ظفر ؎

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے — خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو — کا ہے کو سننے کو دشنام کسو کے آتے

سب بندہ زادے اور جلیل حسن باتخصیص تسلیم گذار و سپاس گزار ہیں۔

امیر فقیر

پنڈت گرراج کشور دت

ان کا مفصل حال معلوم نہیں۔ آگرہ کے رہنے والے تھے، سینٹ جانس کالج آگرہ میں تعلیم پائی۔ مختلف مقامات پر منصف رہے۔ سب ججی سے پنشن لیکر آگرہ میں قیام کیا۔ اپنے پرانے کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ رہے۔

پنڈت صاحب متعدد قانونی کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب آئینۂ وکالت ہے۔ جو ۱۸۹۵ء ۱۳۰۲ھ میں اورینٹل جوب پریس آگرہ سے شائع ہوئی۔ پنڈت جی اس کتاب کے دیباچے میں ان کتابوں کا ذکر کرکے جن سے اس کی تالیف میں مدد لی ہے، لکھتے ہیں :-

> "اگرچہ کتاب ہذا کی نسبت کسی قسم کی اختراع کا دعویٰ کرنا مناسب میرے ایک قسم کی گستاخی ہوگی، مگر اس قدر میں جرأت کرکے کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زیادہ مضمون کتاب ہذا کا میرے ذاتی تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہے۔"

پنڈت گرراج کشور صاحب سے پہلے قانون کی بہت کتابیں لکھی گئی تھیں۔ تمام قوانین اردو میں منضبط ہو گئے تھے۔ اور اس قسم کی کتابیں برابر مرتب و شائع ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام الہ آباد کا مطبع نظائر قانون ہند کر رہا تھا۔ جس نے شاید کوئی ایکٹ اور کوئی نظیر اردو میں منتقل کرنے سے نہ چھوڑی تھی۔ بقول خود اہل مطبع کے "ہر چہار عدالت ہائی کورٹ واقع ہند" یعنی کلکتہ و مدراس و بمبئی و الہ آباد کے نظائر قانونی کا لفظ بلفظ ترجمہ ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ مسٹر جسٹس سید محمود جج ہائی کورٹ الہ آباد کے قانون شہادت کی شرح اسی مطبع نے شائع کی تھی۔

لیکن پنڈت گرراج کشور کی تصنیف آئینۂ وکالت اپنی وضع کی خاص کتاب ہے۔ پنڈت جی نے مقدمہ کی پیروی، استغاثہ، اپیل، جرح و جواب دہی کے قانون اور طریق کار بتانے کے علاوہ وکیلوں کو ایسے اصول سمجھائے ہیں جو ایک تجربہ کار اور ہمدرد حاکم ہی سمجھا سکتا

تھا۔ قانون جیسے خشک موضوع کو مثالوں اور تمثیلوں سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ زبان میں البتہ پُرانا پن موجود ہے۔ وکیل کے ذاتی اخلاق کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

خودی اور طمع سے ہمیشہ وکیل کو سخت پرہیز کرنا چاہیے ...... خودی یا غرور ایسی بُری چیز ہے کہ جس شخص میں یہ ہوتی ہے وہ اپنے آپ پر نامناسب اور بیجا طور پر فخر اور ناز کرتا ہے اگر با عموم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اپنے دل میں کچھ اس کی وقعت نہیں سمجھتے ہیں ...... طمع ایسی بُری شے ہے کہ یہ انسان کی طبیعت سے نیکی اور با لعموم عمدہ اور پسندیدہ صفات کی بیخ کنی کرتی ہے ...... ایک مشہور مصنف فارسی نے کیا خوب کہا ہے۔ مصرعہ "طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی" یعنی طمع کے تین حروف ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ اور ایک انگریزی مصنف نے طمع کے مندر کا ذکر کیا ہے اور اس مندر کا طمع کو دیوتا قرار دیا ہے اور طمع کی صورت اور اس کے تعلقات[۵۱] کا نوٹو اس طرح پر کھینچا ہے کہ اندر مندر کے طمع کا دیوتا بیٹھا تھا اور اس کی غلیظ[۵۲] لمبی داڑھی تھی اور ضعیف چہرہ بھوک کا مارا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف روپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے دو مصاحب یعنی داہنی طرف ظلم صاحب اور بائیں طرف بخل صاحب تشریف رکھتے تھے اور پانچ چھ افسران منتظم مثلاً بے ایمانی اور رشوت ستانی اور استحصال بالجبر اور فریب وغیرہ تھے۔ اور وہاں بہت سے بڈھے اشخاص قریب المرگ[۵۳] روپیوں کی تھیلیوں پر تکیہ لگائے ہوئے تھے، اور جوں جوں ان کی حالت جانکنی کی ہوتی تھی، اتنی ہی حسرت کے ساتھ وہ روپیوں کی تھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے

---

۵۱ تعلقات کا لفظ متعلقات کی جگہ لکھا ہے۔

۵۲ غلیظ سے مراد "گھنی" ہوگی۔ اگرچہ لفظ کے یہ معنی نہیں ہیں۔

۵۳ قریب المرگ کی غلط ترکیب اس قدر مستعمل ہے کہ اس کو علمائے زبان و ادب کے سوا سب ہی بولتے ہیں۔

جلدی پکڑ لیتے تھے۔ مگر دسے سب ایک بڑے زبردست جن سے جس کا نام افلاس ہے بہت کانپتے تھے۔ بعد اس طور پر صورت طمع اور اس کے تعلقات کے بیان کرنے کے ہمارے مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ جس وقت اس مقام پر افلاس داخل ہوا، سب لوگ خوف سے کانپنے لگے، مگر ہم نے آگے بڑھ کر اس سے اس طور پر التجا کی: اے افلاس تو مجکو کبھی دکھلائی نہ دینا اور اگر تو یہ میری عرض قبول نہ کرے تو اس بات کا خیال رہے کہ تیری دھمکی اور گیدڑ بھبکی سے مجھ میں کوئی بات ناشکرے پن یا غیر منصفی کی نہ آوے۔۔۔۔ اور اگر دولت میرے پاس مع اپنے ہمراہیان خودی اور طمع کے آوے تو اسے افلاس تو جلدی سے آکر مجکو بچا، مگر اپنے ساتھ اپنی دو بہنوں یعنی آزادی اور بے گناہی کو لا، جن کی صحبت میں تو ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

اس دَور کے مشاہیر ادب

اوپر جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا ان میں امیر مینائی کے علاوہ اور کسی کا تذکرہ کسی بڑے چھوٹے تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس طرح کے بے شمار مصنف ہیں، لیکن یہ سب لوگ کچھ خاص صاحب طرز نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سر سید کے اثر سے اور ان کے رفیقوں میں جو مصنف پیدا ہوئے، وہ اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نواب محسن الملک سید مہدی علی نام۔ میر ضامن علی کے خلف رشید۔ سادات بارہہ کے ایک شیعہ خاندان کے فرد تھے۔ اٹاوہ وطن و مولد ہے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو محض اپنے جوہر ذاتی سے مرتبۂ کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔

چنانچہ دس روپیہ کی تنخواہ سے تین ہزار روپیہ ماہوار تک ترقی کی، اور گمنامی سے بیرونِ ہند تک نام پایا۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اٹاوہ میں حاصل کی۔ پہلے کلکٹری میں ملازم ہوئے۔ مسٹر ہیوم کلکٹر تھے (جو انڈین نیشنل کانگرس کے محرک و بانی تھے)۔ انھوں نے ان کے جوہر پہچانے اور رتبہ بلند کر دیا۔ پھر غدر کے بعد پیشکار اور سررشتہ دار بنا دیا۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔ تحصیلداری کے زمانے میں انھوں نے اردو میں دو کتابیں لکھیں "قانون مال" اور "قانون فوجداری"۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے شیعہ سے سُنّی ہونے کا اعلان کیا، اور اس کے بعد ان اختلافات عقائد کے متعلق ایک کتاب آیاتِ بیّنات کے نام سے لکھنی شروع کی۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان مقابلہ میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان فرائض کے ساتھ بعض ریاستوں کا انتظام و مشورہ بھی ان کے سپرد رہا۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے شہرت سنی، پھر اتفاق سے کلکتہ جاتے ہوئے مرزاپور میں وزیر کی ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ سر سالار جنگ نے ۱۸۷۴ء میں ان کی خدمات حیدرآباد کے لیے لے لیں۔
وہاں اوّل بارہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ناظم بندوبست اور انسپکٹر جنرل صیغۂ مال مقرر ہوئے۔ پھر چند روز میں پندرہ سو روپیہ تنخواہ ہو گئی اور کمشنر بندوبست ہو گئے۔ اور نواب منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکریٹری (اعلیٰ معتمد مال) ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں سر سالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد فینانشل اور پولیٹیکل سکریٹری بنائے گئے۔ سہ ہزاری منصب اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور خطاب میں محسن الدولہ محسن الملک کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ریاست کے معدنیات کے متعلق کچھ معاملات حکومت اعلیٰ اور پارلیمنٹ سے طے کرنے کے لئے انگلستان بھیجے گئے۔
محسن الملک نے یہ خدمت نہایت حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ اور وہاں کے مشاہیر سے بھی ملے۔ جن میں سے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر گلیڈ اسٹن سے خاص تعلقات

قائم ہوگئے کہ بعد کو بھی رسم مراسلت جاری رہی۔

آخر میں سال ریاست کی خدمت نیک نامی سے انجام دینے کے بعد آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پر رخصت ہوئے۔ سرسید سے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شروع میں تو سرسید کے مذہبی عقائد اور آزاد خیالی سے بہت بیزار تھے۔ لیکن ملازمت مرزا پور کے زمانے میں سرسید کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تو پھر محسن الملک سے زیادہ سرسید کا عاشق کوئی نہ تھا۔ چنانچہ حیدر آباد سے آکر سرسید کے ساتھ علی گڈھ میں قیام کیا، اور باقی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ سرسید کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد سرسید کی وصیت تمنا کے مطابق ان کے صاحبزادہ سید محمود علی گڈھ کالج کے سکرٹری ہوئے۔ پھر ۳۱ر جنوری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک سکرٹری منتخب ہو گئے۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء ۱۳۲۵ھ کو شملہ میں انتقال کیا، وہاں سے علی گڈھ لاکر سرسید کے قریب دفن کئے گئے۔[۱]

---

[۱] خاکسار مؤلف نے آیۂ کریمہ سے تاریخ وفات کہی "اُولٰئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ یُرْزَقُوْنَ فِیْھَا" (سورہ مومن۔ رکوع ۵۔ پارہ ۲۴) ۱۳۲۵ھ نکلتے ہیں۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ میں نے نواب صاحب کا ایک مرثیہ بھی بصورت ترکیب بند اسی وقت لکھا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

تیرگی ملک پہ چھائی ہے سیہ بختی کی ۔۔۔ قوم کا ڈوب گیا آج ستارا افسوس

اور کیا اس سے سوا ہوگی تباہی اے قوم ۔۔۔ محسن الملک کریں تجھ سے کنارا افسوس

ان سے وابستہ تھیں امیدیں ہزاروں اپنی ۔۔۔ قوم کا ٹوٹ گیا آج سہارا افسوس

مولانا حالی نے اس موقع پر نہایت درد ناک قطعہ کہا تھا اور دسمبر ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے اجلاس کراچی میں (جس کے خود مولانا حالی پریسیڈنٹ تھے) سنایا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غمخوار ۔۔۔ سرگرم کے ہم، قوم کے کام آگیا آخر

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا ۔۔۔ اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۸۳ پر)

جس وقت کالج کا انتظام نواب محسن الملک کے ہاتھ میں آیا، کالج کی حالت بہت نازک تھی۔ سرسید کے آخری دنوں میں ایک لاکھ روپیہ کا غبن ہو جانے کے سبب سے کالج پر قرضہ کا بارگراں آپڑا تھا۔ اس کے علاوہ ابتک کالج پر ملک و قوم کو پورا اعتماد نہ تھا۔ نواب محسن الملک نے اپنے خلوص، ہمت، کوشش اور اثر سے چند سال میں تمام مشکلیں حل کر دیں، اتنا چندہ جمع ہوگیا کہ تمام قرضہ ادا کر دیا گیا، کثرت سے طلبا داخل ہونے لگے، اور اعتماد قائم ہوگیا۔ نواب صاحب کی تقریر نہایت پرجوش اور موثر ہوتی تھی۔ ان کے خلوص کا خاص طور پر اثر پڑتا تھا۔ اور ان کی تدبیریں نہایت کارگر ہوتی تھیں نواب صاحب نے سرسید کی زندگی میں اور ان کے بعد اپنی جیب سے ہزارہا روپیہ چندوں میں دیئے۔ جب لندن میں سرسید کو روپیہ کی سخت ضرورت پیش آئی تو نواب محسن الملک نے اپنی ایک مہینے کی پوری تنخواہ بھیج دی۔

نواب محسن الملک نے کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ دو قانونی کتابوں (جن کا پہلے نام لیا گیا ہے) اور دو تین مذہبی کتابوں کے علاوہ ان کی یادگار ادبی ان کے مضامین تہذیب الاخلاق اور لکچر اور خطوط ہیں، لیکن ان میں ایک خاص شان ادب پائی جاتی ہے۔ جوش و خلوص ان کی ہر تحریر کے نمایاں عنصر ہیں۔ طرز تحریر نہایت صاف، مدلل اور موثر ہے۔ بعض مضامین خالص ادیبانہ رنگ اور شاعرانہ تخیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ زبان و بیان میں کچھ قدامت کا اثر ضرور ہے۔ بعض تحریروں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں:-

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۲)

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوم کے فدائی | دنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری | کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حامد حسن قادری مؤلف

(۱) آیاتِ بینات۔ خالص مذہبی کتاب ہے۔ سب سے پہلے اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں مرزاپور کے مشن پریس میں ٹائپ میں چھپی۔ پھر لیتھو کے مطبع میں بھی چھاپی گئی۔ اس کی تحریر کا سلسلہ جاری تھا کہ نواب صاحب کے تعلقات سرسید سے قائم ہو گئے اور وہ خدمتِ قومی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آیاتِ بینات کا موضوع اس مسلک کے خلاف تھا۔ اس لئے تین جلدیں لکھ کر اس کو ناتمام چھوڑ دیا۔ اس کتاب میں نواب محسن الملک نے فرقۂ مخالف کے تمام عقائد و اعمال سے طویل بحث کی ہے، اور مدلل تردید کی ہے۔ وہی حصّے قابلِ نقل و اقتباس ہیں، لیکن ان کو معطلہ چھوڑ کر دیباچہ سے چند سطریں بطورِ نمونۂ عبارت درج کی جاتی ہیں:-

"پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور صرف توحید اور نبوت کے اقرار پر اپنے کو ناجی سمجھنا نہ چاہئے، بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلے کی تطبیق کتاب اللہ اور کتب رسول سے دینا ضرور ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے۔ وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے، اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے۔ ہاں جو کوئی پہلے سے سچائی کا طالب نہ ہو اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو اور رسوا سے مجادلے اور مکابرے کے اسے اور کچھ منظور نہ ہو اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً سچ جانتا ہو تو وہ بے شک اپنی گمراہی میں پڑا رہے گا، اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے کبھی پاک و صاف نہ کر سکے گا۔"

(۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ یہ مضامین نواب محسن الملک کا ادبی کارنامہ ہیں۔ سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس میں نواب صاحب نے بھی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی، اصلاحی مضامین لکھے۔ جن کا مجموعہ بعد کو شائع ہو گیا ہے۔

ایک مضمون تمثیلی رنگ میں بہت دلچسپ لکھا ہے۔ اس قسم کی طرزِ نگارش کا ذکر سرسید کے مضامین کے سلسلے میں آچکا ہے۔ نواب محسن الملک کے مضمون (موجودہ تعلیم و تربیت کی تشبیہ) کے مختلف اقتباسات انہی کے الفاظ میں مسلسل کئے جاتے ہیں:۔

"موجودہ تعلیم و تربیت کی تشبیہ۔ ایک روز خیال نے مجھے عالمِ مثال تک پہنچایا، اور اس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی تشبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصورِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے، دکھایا، درحقیقت میں نے اسے ویسا ہی پایا جیسا سنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ ...... میں نے وہاں ایک رفیق پایا جس کا نام خرد تھا۔ اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک ایسا پرفضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو...... میں چند روز اس باغ میں رہا، پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا ...... آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جدھر سے میں نکلا تھا مگر دروازہ کھلا ہوا اور دیوار شکستہ ...... میں نے اپنے رہنما سے پوچھا۔ اس نے کہا یہ وہ باغ نہیں ہے، دوسرا ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا، خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا...... جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامی رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا...... تب تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اس نے کہا کہ ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ و سبز و شاداب تھا جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر رہتے

سرکتے اب وہ چشمہ پر آگیا ہے۔ تب تو میں نے خیال کیا اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لیکر چلا۔ اگرچہ خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا اور پتھر سرکانے پر مجھ کو موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا..... میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا ہے ویسا ہی رہنے دوں۔ پر استقلال نامی ایک بزرگ نے میرا دل بڑھایا اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اس نے کہا میں نے ایمان نامی نقیب سے سنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے، وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اس کی راہ میں وادی معصیت کا ایک بڑا میدان لق و دق ہے جس میں سوا آگ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو ہوائی دریا ہی کے ساتھ سمندر رہتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کا ملتا ہے جہاں خدمت کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ دروازے کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے، تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور حاجت کا خلعت ملتا ہے..... پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اس نے تمہاری مدد کی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کر دے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے۔ سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے۔ .....

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہکر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدیدہ کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں، پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے، اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا

وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے، جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آ گیا ہے جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے، رسم و رواج کی پابندی، نیکی نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عالمانہ خود نمائی، فتنہ انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے۔" (چپ ہو رہا۔)

(۳) مسلمانوں کی تہذیب: نواب صاحب کا اصلاحی و اخلاقی مضمون ہے۔ اس کا موضوع پہلے ہی فقرے میں بیان کرتے ہیں:- "میرا یہ مضمون مسلمانوں کی تہذیب پر ہے کہ وہ پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے اور آئندہ کیسی ہو۔" بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی ہے۔ قدیم مسلمانوں کی مکمل تہذیب کا خاکہ کھینچا ہے۔ تمام علوم و فنون میں مسلمانوں اور عربوں کی اولیات اور کارنامے بیان کئے ہیں۔ اور پھر مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت کو بیان کرتے وقت ان ہی علوم و فنون میں سے ایک ایک کی حالت الگ الگ لکھتے ہیں۔ اور اس میں ظریفانہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ نواب محسن الملک کی تحریر کا مزاحی پہلو عام طور پر معلوم و مشہور نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ رنگ کم اور ہلکا ہے۔ لیکن جہاں ہے، دلچسپ ہے۔ ان فقروں کو دیکھئے:-

طبیعیات جاننے والے مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ اس فن میں کل کا بیان اس زمانے کے علما بس اسی قدر پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں۔ خاک، باد، آب، آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اوپر آب اور آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے۔ اور وہ بہت بڑا ناری کرہ ہے۔ آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے۔ مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے، اس لئے وہاں اشتعال بھی کم ہے۔ اور اس سبب سے اس کی شکل ہیلجی ہوئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ ہیلجی کی کیا شکل ہے تو استاد اپنی سرمہ دانی نکال کر دکھلاتے ہیں کہ ایسی بیچ سے موٹی اور دونوں

طرف سے تھی۔ پس اس زمانے میں عالموں کی یہ طبیعت ہو گئی ہے جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔"

"ہندسہ و حساب کچھ باقی ہے۔ اقلیدس کا ایک مقالہ اور خلاصۃ الحساب کی تحصیل اربعہ یا جذر تک فضیلت کی پگڑی بندھوا دیتی ہے، مگر طالب علم یہ سوچتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کے پڑھنے اور ان ٹیڑھی سیدھی شکلوں کے بنانے میں کیا فائدہ ہے۔"

"علم نباتات کی تحقیقات اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں نے لکھا ہے کہ سراندیپ میں ایک درخت ہے جس پر کلمہ لکھا ہوا ہے، نہ زمین پر اس کا پتا گرتا ہے، نہ کوئی جانور اسے کھا سکتا ہے۔ ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالموں کا اس پر یقین ہے کہ بعضی بوٹیاں ایسی ہیں جن سے سونا چاندی بن سکتا ہے۔"

"علم حیوانات میں بلاشبہ بڑی ترقی ہے۔ کیونکہ ہم اپنے ملک کے بڑے بڑے عالموں کو تقریر کرتے سنتے ہیں کہ اگر بکری کتے سے بچہ پیدا ہو تو اس کا کھانا درست ہے یا نہیں۔"

شادی بیاہ کے دستور کو لکھتے ہیں:-

"نہ مرد عورت کو دیکھنے پاتا ہے، نہ عورت مرد کو۔ یُؤمِنُونَ بِالغَیبِ پر نکاح کا مدار آرہا ہے۔"

(۴) مسلمانوں کی ترقی اور ان کے تنزل کے اسباب۔ یہ مضمون بہت طویل ہے۔ مسلمانوں کی ترقیوں کو تاریخی حوالے کے ساتھ بیان کر کے ان کے تنزل کے پانچ سبب بتائے ہیں اور تفصیلی بحث کی ہے۔ پانچواں سبب غلط مذہبی خیالات کو بتایا ہے۔ یہ حصہ بہت پرجوش لکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے خوب خوب استدلال کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

"غرضکہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادی کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو
انسان کی فطرت میں خدا نے رکھی ہے، وہ کام میں لائی جاوے اور دنیا و دین کی
ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن شریف کی سمجھی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں
ہم دنیاوی ترقیات کے لئے جکڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے وہ ان
بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے
روکنے کے لئے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اس جھڑکی پر جو رہبانیت اور جوگی
بننے کے لئے ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (کس نے خدا
کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لئے پیدا کی) پڑھو خدا کی یہ آیت جو
دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کے لئے ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ
وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں کھاؤ اور اچھے کام کرو) .....
دیکھو کیا عام اجازت ہے سب خدا کا دیا کمانے کے لئے۔ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (زمین پر پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو)۔ پھر
خدا اپنے اچھے بندوں کو یہ دعا سکھاتا ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ
فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے) یعنی دنیا اور
دین دونوں کی بھلائی۔ جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب معیشت اور تجارت اور
کسب حلال کے لئے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں، جیسا کہ ہمارے ہادی
نے طلب معیشت کے لئے فرمایا ہو۔ اِنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ ذُنُوْبًا لَا يُكَفِّرُهَا اِلَّا الْهَمُّ
فِي طَلَبِ الْمَعِيْشَةِ (بعض ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں
رنج اٹھایا جاوے) اور تجارت کے لئے ارشاد کیا ہو کہ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ يُحْشَرُ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَعَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ (سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں
اور شہیدوں کے ساتھ اٹھے گا) اور طلب دنیا کے لئے صاف صاف لفظوں میں یہ

خوش خبری سنائی ہو کہ "مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا تَعَفُّفًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْیًا عَلٰی عِیَالِهٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰی جَارِهٖ لَقِیَ اللّٰهَ وَجْهُهٗ کَالْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ" (جو شخص دنیا کو بطریق حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آل اولاد کے لئے کوشش اور ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے اس کا منہ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا ہوگا)۔ تو کیا ایسا مذہب دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ ان کے لئے خط آزادی ہے"۔

(د) ایک کھلا خط۔ نواب محسن الملک نے ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو بمبئی سے ایک خط سرسید کے نام لکھا ہے، جس میں ایجوکیشنل کانفرنس[1] کی اصلاح و ترقی کے لئے چند تجویزیں پیش کی ہیں اور سرسید سے درخواست کی ہے کہ اس خط کو کانفرنس کے دوسرے جلسہ میں (منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) کے منعقد ہونے سے پیشتر مع تجویزوں اور اس کی تائیدی تقریروں کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی طرح بصورت کتاب چھاپا گیا ہے۔ پہلی تجویز کا خلاصہ یہ تھا: "ہر شہر و قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوں اور وہ کمیٹیاں اپنی ماتحت کمیٹیاں مقرر کریں اور انجمن ہائے اسلامی جو بالفعل ہیں وہ اس کانفرنس کے مقاصد کی تکمیل اپنے ذمہ لیں"۔

---

[1] مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں بنگالیوں کی انڈین نیشنل کانگرس کے جواب میں قائم کی گئی تھی۔ اس لئے اس کے نام میں بھی "کانگرس" کا لفظ رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد رفع اشتباہ کے لئے کانفرنس کا لفظ تجویز کیا گیا اور پورا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ پھر اینگلو اورینٹل کی جگہ آل انڈیا کر دیا گیا۔ پھر گذشتہ جنگ عظیم کے بعد بیداری ہند کے اثر سے لفظ محمڈن کی ناموزونیت محسوس ہوئی۔ یہ لفظ اہل یورپ کی ساخت اور لفظ کرسچین کی تقلید تھی۔ اس لئے محمڈن کی جگہ مسلم کا لفظ نہ صرف کانفرنس کے نام میں بلکہ تمام تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہونے لگا۔

نواب صاحب کے خط کے چند فقرے یہ ہیں :-

"...... پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا اجلاس ہوگا، اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت اور اس میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لئے سوائے چند پرانے ارکان اور چند مدرسے کے طلبہ اور چند اور شریک کے بہت سے نئے لوگ نہیں آتے۔ علاوہ بریں اس کے کہ ریزولیوشن بہت کم پیش کئے جاتے ہیں اور ان پر تنگی وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی، لوگوں کے دل سرد ہوتے اور ان کے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑتے جاتے ہیں اور نظم و قصیدے نے اس مجلس کو ایک مشاعرہ بنا دیا ہے اور [illegible] کی آمد نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کر دیا ہے۔"

(۶) تقریر نواب محسن الملک۔ کانفرنس کی تقریروں میں نواب صاحب کی آخری تقریر انیسویں اجلاس میں ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی تھی۔ آیندہ اجلاس سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ تقریر بہت طویل اور نہایت پُرجوش ہے۔ اس کا مختصر اقتباس یہ ہے :-

حضرات، کانفرنس کے ابتک کامیاب نہ ہونے کا اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی حالت، اس میں بھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، نہ ان کی صلاح و فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے، اور ان کی قوتیں دن بدن منتشر و ضائع ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا سبب کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ قوموں کی صلاح و فلاح دو فرقوں پر منحصر ہے، اول علما،

دوسرے اُمرا، مگر علما اپنے اصلی فرائض کا خیال نہیں رکھتے اور زمانے کی رفتار اور زمانے کی ضرورتوں کو نہیں دیکھتے..... مثلاً اگر کسی عالم سے کہا جائے کہ اس زمانے میں جبکہ مسلمان مفلس اور تباہ ہو رہے ہیں اور علوم و فنون اور صنعت و حرفت سے ناواقف ہیں، ان کو علوم و فنون جدیدہ اور سائنس کی تعلیم کی ہدایت کیجیے، اور صنعت و حرفت سیکھنے کی ترغیب دیجیے، تو وہ یہ کہہ کر کہ یہ شرع اسلام کے مخالف ہے اور صنعت و حرفت دُنیا داروں کا کام ہے، ہماری بات کو نہایت نفرت سے سُنیں گے۔ اور اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَطَالِبُھَا کِلَابٌ[1] کہہ کر مسلمانوں کو اور نفرت دلائیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اور اس قسم کی ہدایت و نصیحت اس زمانے میں اُن پر فرض کفایہ ہے اور اس کے ادا نہ کرنے سے وہ خود گنہگار ہو رہے ہیں اور ساری قوم کو عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بوجہ ناواقفیت علوم اور نہ جاننے صنعت و حرفت کے وہ دنیا کی اور قوموں کے مقابلے میں ذلیل و خوار ہیں۔ مگر وہ ہرگز اس کی ہدایت نہ کریں گے۔ اور بجز نماز جنازہ و دفن میت اور جواب سلام وغیرہ کے ان باتوں کو فرض کفایہ نہ سمجھیں گے۔ ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم نے اس افسوس ناک حالت کو دیکھ کر نہایت رنج و غم سے یہ لکھا ہے کہ انھیں علما کا فرض کفایہ سے ناواقف ہونا اصلی سبب اس کا ہے کہ ساری قوم صنعت و حرفت کے فوائد سے محروم ہو گئی ہے ..... اس کی تائید میں وہ عالم لکھتا ہے کہ اس وقت جو شخص مسلمانوں میں کسی صنعت کے زندہ کرنے یا آلہ کے ایجاد کرنے یا کوئی کمپنی قائم کرنے یا صنعتی مدرسہ جاری کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا، تو شریعت کے حکم کے مطابق اس نیک کام کا، اور قیامت تک جو اس پر عمل کرنے والوں کا اس کو اجر ملے گا، اور یہ شخص قوم میں اعلیٰ درجے کا مصلح و مجدد

[1] دُنیا مُردار ہے اور اس کے طالب سگ مردار خوار

ہوگا۔ اسے لکھ کر وہ عالم صاف صاف کہتا ہے کہ مغربی علوم میں جو قرآن مجید کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں اور اسلامی علوم میں کچھ فرق نہیں ہے، کیونکہ وہ بقائے زندگی کا ذریعہ ہے، اور یہ روحانی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ بغیر ان دونوں کے اسلام اور ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی ....

حضرات! کتنے ایسے عالم اس وقت ہم میں ہیں جو ان باتوں کو سن کر غصے میں نہ آویں گے، اور ان باتوں کو نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے متنفر نہ ہوں گے، اور یہ سن کر کہ صنعت و حرفت کا سکھانا اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے۔ جب کہ بادیان طریقت کا یہ حال ہو، اور وہ خود سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں، تو قوم اور ملت کیونکر منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔

نواب وقار الملک مشتاق حسین[1] نام، امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے۔ ۱۲۵۷ھ/۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ تفضل حسین ہے۔

ان کے اجداد میں ایک بزرگ دیوان عبدالمومن خاں تھے، جو شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں دیوان تن کے عہدے پر ممتاز تھے۔ یہ عہدہ وزارت سے کم نہ تھا۔ شاہی بخشی اور منصب و جاگیر کی عطا و ترقی اسی عہدے سے متعلق تھی۔ نواب صاحب کمبوہ خاندان سے تعلق رکھتے

---

[1] مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی اے نے اپنے ترجمہ تاریخ ادب اردو میں نواب وقار الملک کو "خلافت علی گڑھ کا خلیفہ ثانی" لکھا ہے۔ اس تشبیہ کا ایسی کتاب میں جس کو مناظرہ و مظاہرہ مذہبی سے تعلق نہیں، کوئی محل نہ تھا خاص کر جبکہ ترتیب صحیح کی بناپر غلط بھی ہے۔ یعنی علی گڑھ کالج کے سکرٹریوں میں نواب وقار الملک کا چوتھا نمبر ہے۔ یاد رہے کہ سر سید کے بعد سید محمود باقاعدہ سکرٹری ہوئے تھے اگرچہ چند روز کے بعد ہی ان کو دست کش ہونا پڑا۔ اس لئے سید محمود کو شمار سے حذف نہیں کر سکتے۔

تھے۔ والد کا انتقال ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ والدہ نے تربیت کی۔ رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر سب سے پہلے اسی سرکاری مدرسے میں جہاں خود تعلیم حاصل کی تھی ۱۸۵۶ء میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں سخت قحط پڑا۔ جابجا محتاج خانے قائم ہوئے۔ امروہہ کے محتاج خانے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد عدالت صدر الصدور علی گڑھ میں سررشتہ دار اور پھر منصرم ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے۔ گورنمنٹ نے علی گڑھ کی میونسپلٹی کا ممبر بھی مقرر کر دیا۔ ۱۸۷۴ء میں سر سید کے ساتھ گورکھپور، بستی وغیرہ کے قحط کا انتظام کیا۔

نواب صاحب سرکاری ملازمت کے علاوہ سر سید کے ساتھ قومی کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ مفید الخلائق جاری کیا۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتۂ تعلیم کے ممبر ہوئے اور مدارسِ ضلع کے نگراں رہے۔ اسی سال نواب صاحب نے بطور خود کثیر چندہ جمع کر کے ایک یونانی شفاخانہ اور دواخانہ جاری کرایا۔ ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو اس میں مضامین لکھے۔ اور اکثر لکھتے رہے۔ ۱۸۷۱ء میں جب سر سید نے کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی طرف سے ایک مضمون لکھوانے کا اعلان کیا، جس کا ذکر سر سید کے حال میں صفحہ ۲۶۵ پر ہو چکا ہے تو نواب وقار الملک نے بھی مضمون لکھا اور اس پر دوسرے نمبر کا انعام دیا گیا۔ سوسائٹی اور اس کے پریس اور تہذیب الاخلاق کا انتظام بھی نواب صاحب کے سپرد تھا۔

۱۸۷۵ء میں حیدرآباد کے مدارالمہام سر سالار جنگ اول کو سلطنت دکن کے انتظام کے لئے بہترین مدبروں کی تلاش ہوئی۔ سر سید سے بھی مشورہ کیا۔ انہی کی سفارش سے نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک بھی حیدرآباد گئے۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ نواب وقار الملک نماز کے نہایت پابند تھے۔ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا، اٹھ کر نماز پڑھنے چلے جاتے۔ علی گڑھ میں جب یہ صورت پیش آئی تو مسٹر کالون کلکٹر نے روکا، نواب صاحب

نے نہ مانا، کلکٹر نے ضد کی، انھوں نے استعفا دیدیا۔ لیکن اس تصور پر برخاست کرنا مصلحت کے خلاف تھا، چھ مہینے کی رخصت دیدی۔ اس عرصے میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ۱۸۷۵ء کے شروع میں نواب صاحب حیدرآباد بلالئے گئے۔

نواب وقار الملک دو مرتبہ حیدرآباد گئے، پہلی بار ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک رہے۔ حیدرآباد میں مدار المہام (سر سالار جنگ)، صدر المہام (سر آسمان جاہ)، امیر کبیر (نواب رشید الدین خاں)، اور ریزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ) کے باہم تعلقات خوشگوار نہ تھے، اور نواب صاحب کو ان ہی افسروں سے سابقہ پڑتا تھا۔ نواب صاحب دیانت، فرض شناسی اور اخلاقی جرأت میں ایسا مضبوط کیرکٹر رکھتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو مرعوب نہ کرسکتی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے چاہا کہ نواب صاحب اپنی اصلی رائے کے خلاف سر آسمان جاہ کے سامنے ۔ سے ظاہر کریں۔ نواب صاحب نے انکار کردیا، سر سالار جنگ اس پر ناخوش ہوگئے، نواب صاحب نے فوراً استعفا بھیج دیا۔ اور لکھ دیا کہ میں کل ہی اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسے نواب وقار الملک متدین اور راستباز تھے، ایسے ہی سر سالار جنگ فراخدل اور قدرشناس تھے۔ استعفا دیکھ کر نواب صاحب کو بلایا، صاف طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا کہ بیشک مجھے کوئی حق نہ تھا کہ غلط بیانی پر مجبور کرتا۔ اس ملاقات میں دونوں پر رقت کا عالم طاری تھا۔ نواب صاحب نے استعفا واپس لے لیا لیکن امیر کبیر اور ریزیڈنٹ نواب صاحب کے مخالف تھے، انھوں نے کچھ عرصہ بعد موقع پاکر سر سالار جنگ پر زور ڈالا کہ اگر مولوی مشتاق حسین برخاست نہ کیے گئے تو ہماری آپ کی دوستی میں فرق آجائے گا نواب صاحب اُس وقت رخصت پر وطن آئے ہوئے تھے، ان کو اس بات کا علم ہوا تو فوراً سر سالار جنگ کو لکھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے سبب سے آپ لوگوں میں نااتفاقی ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے، آپ بے تامل مجھے خدمت سے سبکدوش کردیجیے، میں خوش ہوں گا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی۔ چنانچہ نواب صاحب کو علٰحدہ کردیا گیا، لیکن سر سالار جنگ نے سیکرٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کردیا،

اور نواب وقار الملک علی گڑھ میں بیٹھے ہوئے سرکار نظام کی خدمت انجام دینے لگے، اس عرصے میں قانون مال گذاری مرتب کیا اور دفتروں کے قواعد و ضوابط بنائے۔

ساڑھے تین سال کے بعد جب امیر کبیر کا انتقال ہوگیا اور سر رچرڈ میڈ ریذیڈنٹ چلے گئے، تو سر سالار جنگ نے نواب صاحب کو پھر بلایا۔ اس موقع پر سر سالار جنگ نے اپنے قلم سے خط لکھا (مرقومہ، ۶ جمادی الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء)۔ فارسی میں خط ہے، نواب صاحب کو "عدالت پناہ" القاب لکھا ہے۔ نواب صاحب فوراً چلے گئے، اور پھر دس بارہ سال خدمت کرکے سات سو روپیہ ماہوار پنشن پر واپس آئے۔

نواب وقار الملک نے حیدرآباد میں فلاح ملک، اصلاح سلطنت اور استحکام ریاست کے سلسلے میں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں وہ نواب محسن الملک کی شاندار خدمات سے کم نہ تھیں۔ کسی دوسرے ہندوستانی کا تو ان سے مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ان خدمتوں کے صلے میں اعلیٰحضرت نظام الملک آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں بہادر (مرحوم) نے نواب صاحب کو ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء میں "خان بہادر" اور "انتصار جنگ" اور ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء میں "وقار الدولہ وقار الملک" کے خطابات عطا کیے۔ پھر حکومت ہند کی طرف سے بھی "نواب" کا خطاب ملا۔ لارڈ منٹو نے اپنے ہاتھ سے سند دی۔

نواب صاحب حیدرآباد میں سرسید کے قومی کاموں میں اعانت اور خاص کر علی گڑھ کالج کے استحکام میں امداد کرتے رہے۔ ہزاروں روپے اپنے پاس سے دیے۔ جب ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا تھا تو پہلے مہینے کا اضافہ سرسید کو بھیج دیتے تھے۔ جب سرسید ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد گئے تو ان کے ساتھ دورہ کرکے وہاں کے امیروں سے چندہ دلوانے کے علاوہ ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی طرف سے بتقریب دورہ و دعوت پیش کیا۔ حیدرآباد سے آکر ہمہ تن کالج کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ کالج کی کوئی عمارت، کوئی شعبہ، کوئی مصرف ایسا نہ تھا جس میں نواب وقار الملک کی مالی مدد شامل نہ ہو۔

اسی طرح انتظامی معاملات نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ انجام دیئے۔ نواب صاحب حق گوئی میں اس قدر بےخوف تھے کہ سرسید کا احترام و محبت بھی ان کو اپنی سچی رائے کے اظہار سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۹ء میں سرسید نے اپنے بعد سید محمود کو سکرٹری مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تو نواب صاحب نے شدید مخالفت کی یہاں تک کہ سرسید کے دل میں ان کی طرف کشیدگی پیدا ہوگئی۔ لیکن نواب صاحب کا دل ویسا ہی صاف رہا، اور سرسید کی وہی محبت قائم رہی۔ آخر جب یہ تجویز منظور ہوگئی تو نواب صاحب نے بھی کثرت رائے کے فیصلہ کو تسلیم کرلیا، اور پھر جب سرسید کے انتقال کے بعد سید محمود سکرٹری ہوئے اور چند دنوں ہی میں ان کی مخالفت اور ان کی معزولی کی کوشش ہر طرف سے ہونے لگی، تو نواب وقار الملک پہلے شخص تھے جنھوں نے اس فیصلے کے احترام کو پیش نظر رکھا اور خود سید محمود کے اصلاحِ حال و خیال کی کوشش کی تاکہ وہ سکرٹری کے عہدے پر قائم رہ سکیں۔

نواب محسن الملک کے سکرٹری ہونے پر ان کے دست و بازو بن کر کام کیا۔ ۱۹۰۳ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی سرگرم کوشش کی اور اس کے پہلے سکرٹری منتخب ہوئے۔ لیکن جب نواب محسن الملک کے بعد کالج کے سکرٹری ہوئے تو مسلم لیگ کا عہدہ چھوڑ دیا، لیکن اس کے حامی و معاون رہے۔

۱۹۱۰ء میں جب ہز ہائی نس سر آغا خاں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی اور گورنمنٹ کی منظوری کی امید دلائی تو نواب صاحب نے اس کے لئے ایسی جان توڑ کوشش کی کہ ڈیڑھ سال میں تیس لاکھ روپیہ کے قریب چندہ جمع کرلیا۔ لیکن اس سخت جسمانی محنت سے ان کی صحت پر بہت بار پڑ گیا اور وہ اگست ۱۹۱۲ء میں ضعف و علالت کے سبب سے مستعفی ہوگئے۔ لیکن پھر بھی وہی دُھن لگی رہی۔ اور ۱۹۱۵ء تک ہر قومی و مذہبی تحریک و خدمت میں حصہ لیتے رہے۔ جنگ بلقان و طرابلس کے سلسلے میں مجروحین طرابلس کے لئے اپنے گاؤں کا ایک حصہ فروخت کرکے ایک ہزار روپیہ

چندہ دیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام، ایران میں روس کی مداخلت وغیرہ تمام واقعات پر بڑی آزادی اور دلیری کے ساتھ اظہار رائے کرتے رہے۔

آخر ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء روز شنبہ کو امروہہ میں انتقال کیا۔ اور ہندوستان، اسلام اور کالج کا محترم بزرگ، بے ریا خادم اور دردمند رہنما اٹھ گیا۔ علی گڈھ کالج کو یہ دونواب، محسن الملک اور وقار الملک یکے بعد دیگرے ایسی ہستیاں ملیں کہ تمام ہندوستان میں سے ان سے بہتر انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اگرچہ دونوں کی قوت طبع اور طریق عمل میں یک گونہ اختلاف تھا، لیکن منتہائے نظر اور منزل مقصود دونوں کی ایک تھی۔ اس لئے دونوں دوراستوں سے ایک ہی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ نواب محسن الملک کا مسلک یہ تھا کہ " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور نواب وقار الملک اس پر عامل تھے (بقول علامہ اقبال) کہ " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"۔

نواب وقار الملک اچھے لیڈر کے ساتھ اچھے ادیب بھی تھے۔ بے ریائی اور بے تکلفی سادگی اور صفائی ان کے دل، زبان اور قلم تینوں کے یکساں اوصاف اصول تھے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر و معاون تھے۔ اس کا مقصد علمی کتابیں ترجمہ و تالیف کرانا تھا۔ اس سلسلے میں نواب وقار الملک نے بھی ایک انگریزی کتاب " فرنچ ریولیوشن اینڈ نپولین " (انقلاب فرانس اور نپولین) کا اردو میں ترجمہ سرگذشت نپولین بوناپارٹ کے نام سے کیا، جو ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔ لیکن نواب صاحب اتنی انگریزی نہ جانتے تھے، اس لئے ان کے دو مددگار منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد انگریزی کا ترجمہ سناتے تھے اور نواب صاحب اپنی عبارت میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مذہبی و قومی مضامین لکھے، اور آخر عمر تک مختلف اخباروں میں حسب ضرورت لکھتے رہے۔ بعض تحریروں کے مختصر نمونے پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) ۱۸۸۹ء میں سید محمود کے آئندہ سکرٹری بنانے سے جب نواب صاحب

نے سرسید کی پُرزور مخالفت کی، تو اپنی رائے کے سلسلے میں لکھا تھا:-

میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے۔ انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو ان سے معذرت کر کے معافی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن قوم اور ملک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشوا تا پھرے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

(۲) جب ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار دہلی کے موقع پر گورنمنٹ کی طرف سے تقسیم بنگال کو منسوخ کیا گیا، تو مسلمانوں کو حکومت کی پالیسی سے ایسی مایوسی ہوئی کہ کانگریس میں شامل ہو کر ہندوؤں کا ساتھ دینے کا ارادہ کرنے لگے۔ اس موقع پر نواب وقار الملک نے یہ غلط قدم اٹھانے سے مسلمانوں کو روکا، اور گورنمنٹ کی بیدردانہ پالیسی کے متعلق اپنی بے لاگ رائے لکھی۔ فرماتے ہیں:-

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہیے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ اور خدا اس کے کہ وزراء سے سلطنت نے پیکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں۔ الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی۔"

آگے چل کر پھر اسی رائے کا اعادہ کرتے اور مسلمانوں کی ہمت بندھاتے ہیں:-

"یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اب مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسا کرنا چاہیے، لاحاصل مشورہ ہے، اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسا کرنا چاہیے، وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے،

اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل اپنا سے دشمن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے۔"

آخر میں پھر گورنمنٹ کی اسی پالیسی (دونوں بنگال کے الحاق) پر تنقید کرتے ہیں:-

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گذر گیا، بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کس کا مرا کوا اور کس کی زرد بلی، اور کہاں کا ایران، یہاں سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا چاہتا ہے۔"

مسلمانوں کو شرکت کانگریس سے روکتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کرکے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہوکر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔ ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیے۔ وفاداری خود غرضی ہے، وہ جوہر نہیں ہے، اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے۔ وہ جب تک اس بنیاد میں تزلزل ہوگا، وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہوگی۔ پس مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے اب تک علیحدہ ہیں، اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اغراض دینی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں، ان کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے......"

(۳) اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کی شکست کے سلسلے میں بقول نواب وقار الملک "ہنگامۂ محشر" برپا ہوا۔ یہی ان کے مضمون کا عنوان ہے جو انھوں نے اس واقعہ کے متعلق تھا، اس میں اپنی بے لاگ اور بے دھڑک رائے لکھتے ہیں:-

مولوی چراغ علی کو ابتدا سے عمر میں باقاعدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لیکن اپنے شوق اور محنت سے سب کمی پوری کر لی۔ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ کلدانی، لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ انگریزی زبان پر تو ایسی قدرت حاصل کی تھی کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ گویا عمر بھر طالب علم رہے۔ ایسا انہماک ہو جاتا تھا کہ ایک بار تہہ خانے میں آگ لگ گئی۔ یہ شہ نشین میں بیٹھے پڑھتے رہے، خبر تک نہ ہوئی۔ ریاست کے ایسے سچے خیر خواہ اور دیانتدار امین تھے کہ اپنے اصول کے مقابلے میں کسی کی سفارش نہ سنتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب وقار الامرا بہادر نے کسی کی سفارش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے تو ٹالا، پھر اُدھر سے اصرار ہوا تو نواب صاحب سے صاف کہہ دیا کہ "آپ اس لئے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹا دیں، آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے۔"

بے تعصب ایسے تھے کہ کسی فرقہ و مذہب سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ یہاں تک کہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے متعلق نہ تھا۔ چنانچہ مردم شماری کے موقع پر "فرقہ" کے خانے میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو "شیعہ" لکھ دیا اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے آگے صفر لکھ دیئے۔

۱۵ر جون ۱۸۹۵ء (مطابق ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ) کو ۵۰ برس کی عمر میں مرض ذیابیطس کے اپریشن کے بعد یکایک بمبئی میں انتقال کیا۔ "چراغ حق" (۱۳۱۲ھ) تاریخ ہے۔ جسٹس سید محمود (خلف سر سید) کو صنعت تاریخ گوئی بہت پسند تھی۔ انہوں نے ایک فقرہ نثر میں عیسوی سن نکالے۔ مولانا حالی نے اس فقرے کو قطعہ میں موزوں کر دیا۔ ان تینوں بزرگوں کی یادگار کے طور پر اس کو نقل کیا جاتا ہے:۔

زخمے از مرگِ چراغِ علی آمد بر دل — کہ از و خاطرِ افکار بصد غم شد جفت

از خرد سالِ وفاتش چو بجستم محمود — "شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا" گفت

۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا معروف و کثیر الاشغال انسان کیونکر اتنا وقت نکال سکتا تھا۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ مولوی صاحب کا پسندیدہ و محبوب موضوع اسلام و حقانیت اسلام تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں قانون اور فنانس سے بھی کافی شغف پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ زیادہ کتابیں اسی مضمون پر لکھی ہیں۔ اسلام پر بھی چند ضخیم کتابیں بڑی تحقیق کے ساتھ مجتہدانہ شان کی لکھی ہیں۔ جن کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ مثلاً

(۱) تحقیق الجہاد۔ عیسائیوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔

(۲) اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام۔ اسلام کی سوشل اصلاحات کے متعلق۔ اس کے پہلے ۴۸ صفحوں کا ترجمہ مولوی چراغ علی نے کیا تھا۔

(۳) محمد پیغمبر برحق۔ سیرت پاک پر محققانہ تالیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ غالباً نہیں ہوا۔

(۴) تعلیقات (اردو) ایک پادری کی کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں۔ یہ رسالہ مولوی چراغ علی کی سب سے پہلی تالیف ہے مطبوعہ ۱۸۷۲ء۔

(۵) اسلام کی دنیوی برکتیں۔ نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ بہت پسند کی گئی اور بار بار شائع ہوئی۔

(۶) قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ قرآن مجید میں جو اقوام قدیمہ کا ذکر ہے ان کا حال قدیم تاریخوں سے تلاش کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس اعتراض کو اٹھایا ہے کہ قرآن کی مذکورہ اقوام کا کوئی وجود کبھی نہ تھا۔

(۷) رسائل چراغ علی۔ مولوی صاحب نے بہت سے مضامین حیدرآباد آنے سے پہلے سیتاپور و لکھنؤ میں لکھے تھے۔ جو مسودے کی صورت میں رہ گئے۔ ان چھوٹے بڑے ۴۵ رسالوں میں سے چار رسالے مولوی عبداللہ خاں نے بڑی محنت سے مرتب و درست کر کے ۱۹۱۸ء ۱۳۳۶ھ میں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد سے شائع کئے۔ مولوی چراغ علی کے ہر مسودے

کے آخر میں ان کے دستخط اور مقام و تاریخ تحریر درج ہے۔ اس مجموعہ میں یہ رسالے ہیں:

(الف) تہذیب الکلام فی حقیقۃ الاسلام سب سے بڑا رسالہ ہے ۱۲۳ صفحوں میں شائع ہوا ہے۔ آخر میں ۲۳ اکتوبر ۱۸۸۰ء سیتاپور، ملک اودھ درج ہے۔ اس میں مولوی سید محمد عسکری تحصیلدار لکھنؤ اور مولوی محمد علی بچھرایونی تحصیلدار بلہری ضلع مرادآباد کے چند اعتراضات کا جواب ہے۔

(ب) مجموعہ روایات استرقاق و تسری۔ اس رسالے میں صحاح ستہ و دیگر کتب احادیث و سیر و مغازی سے چند ایسی معتبر روایتیں جمع کی ہیں، جن میں رسم غلامی کی بیخ کنی پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غزوات میں آپ کے عمل مبارک سے دکھائی ہے۔ مارچ ۱۸۷۸ء میں بمقام سیتاپور لکھا گیا۔

(ج) تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام۔ مولوی محمد علی بچھرایونی کے ایک مضمون مطبوعہ نور الآفاق کانپور کا جواب جس میں ثابت کیا ہے کہ فتح مکہ (۸ھ) کے بعد غلام بنانا قطعی موقوف کر دیا گیا۔

(د) تحقیق مسئلہ تعدد ازدواج۔ مولوی محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر رسالہ اشاعۃ السنۃ کے ایک مضمون متعلق نکاح و طلاق پر تنقید۔ اس میں یورپین مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب بھی آ گئے ہیں۔ یہ رسالہ ناتمام ہے اس لئے تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔

(۸) العلوم الجدیدہ والاسلام۔ یہ مولوی چراغ علی کی آخری تصنیف تھی؛ لیکن اس کی صرف تمہید رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں چھپی تھی کہ یکایک ان کا انتقال ہو گیا۔

مولوی چراغ علی صاحب کی فضیلت علمی اور کمال تحقیق کے سلسلے میں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مولوی صاحب کے کاغذات میں مرزا غلام احمد قادیانی[1] کے چند خطوط نکلے ہیں، جن میں مرزا صاحب نے اپنی تصنیف "براہین احمدیہ" کی تیاری میں مولوی صاحب سے

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی، قادیان ضلع گورداسپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ شروع میں عیسائی اور آریہ مخالفین اسلام سے تحریری و زبانی مناظرے کئے۔ اور متعدد کتابیں اسی موضوع پر لکھیں۔ ۱۸۸۰ء میں براہین احمدیہ شائع کی۔ اس کتاب میں سب سے پہلے اپنے (باقی حاشیہ صفحہ ۴۰۶ پر)

علمی اعانت چاہی ہے۔ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء میں مرزا صاحب نے کئی خط مولوی صاحب کو لکھے ہیں اور ان کی تحقیقات و مضامین کا اشتیاق و انتظار ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ اور میں نے ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے، تصنیف کی ہے، اور نام اس کا "براہین احمدیہ علیٰ حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ" رکھا ہے۔ اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں۔ اور اپنے مختصر کلام کو ان سے زیب و زینت بخشوں۔"

مولوی چراغ علی کا طریقۂ استدلال وہی ہے جو سر سید کا ہے۔ ہر مسئلے کے ایک ایک پہلو۔ بلکہ حسب ضرورت ہر حرف اور ہر لفظ پر بحث کرتے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ عقلی و نقلی سے اس پر دلیل لاتے ہیں۔ جو بات لکھتے ہیں نہایت متانت و قوت سے لکھتے ہیں۔ طرز تحریر و زبان سر سید کے مقابلے میں زیادہ صاف، رواں اور بامحاورہ ہے۔ سر سید، نواب محسن الملک، مولوی محمد علی وغیرہ اُس زمانے کے اکثر لکھنے والے الفاظ کی صحیح ترتیب کا خیال نہیں رکھتے۔ مولوی چراغ علی میں یہ بات نہیں ہے۔

نمونۂ تحریر یہ ہے :-

بقایا حاشیہ صفحہ گزشتہ

مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس سے پہلے سب مسلمان مرزا صاحب کے طرفدار تھے۔ اس دعوے سے سب چونک گئے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے پے در پے نئے قسم قسم کے دعوے کرنے شروع کر دیئے۔ مگر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ مسیح موعود اور مہدی معہود بن گئے۔ پھر کرشن اوتار ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں اپنا فرقہ "احمدیہ" الگ قائم کر لیا۔ مئی ۱۹۰۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ قادیان میں دفن ہوئے۔ مرزا صاحب بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے خیالات اور تحریروں پر سر سید کی آزادی رائے، تاویل آیات

(۱) اعظم الکلام کے ابتدائی صفحات جو خود مولوی چراغ علی نے اردو میں لکھے ہیں، ان کا مختصر اقتباس یہ ہے :-

"جدید قانون زن و شو کی وجہ سے، جس کی پیغمبر خدا نے اپنے پیرووں کو تلقین کی، اور بعض دانشمندانہ، عادلانہ اور سخت قیود سے، آپ نے طلاق کی سہولت کو بھی رفع کیا۔ یہ قیود بہت ہی معقول ہیں۔ اور ان میں طرفین کے فائدے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن میں اہل عرب کو نصیحت اور تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں خراب رسوم کو ترک کر دیں۔ آنحضرت صلعم نے غلامی کو موقوف کرکے لونڈیوں کے رکھنے کے رواج کو بھی موقوف کیا، اور اس وقت جو عورتیں غلامی کی حالت میں تھیں، ان سے عقد کرلینے کی تاکید کی۔ ورنہ وہ لونڈیاں بناکر رکھی جاتیں۔ شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدید احکام ہیں، اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ عقبیٰ میں اس کا بڑا عذاب ہوگا، اس طرح عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے دختر کشی کی رسم بالکل مٹ گئی۔ سب سے اول قرآن میں قانون وراثت ایسا قائم کیا گیا کہ اس میں عرب کی عورتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا۔"

(۲) رسائل چراغ علی میں سے تیسرے رسالہ (تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام) میں اپنا جواب اس طرح شروع کرتے ہیں :-

۱- مولوی محمد علی صاحب کی تقریر جو فاضلانہ تحریر کی پوری تصویر ہے، "نورالآفاق" نمبر (۵) مطبوعہ کانپور، مطبع نظامی میں چھپ کر میرے پاس پہنچی۔ جو تعلیم ہم مسلمانوں میں ان دنوں عمدہ اور کافی تصور کی جاتی ہے، اس کا یہ ٹھیک ٹھیک فوٹوگراف ہے۔

۲- آزاد اور خودمختار مخلوقات کا غلام بنانا ایک ایسی بدنامی اور ارباب دانش کی نظر میں حقارت و ذلت ہے جس کو ہر ایک شخص جو ادنیٰ سی بصیرت رکھتا ہو، اچھی

طرح معلوم کر سکتا ہے، اور اس میں کچھ شک ہی نہیں کہ خدا نے ہر ایک شخص کو آفرینش کی راہ سے ایک ہی سی حیثیتِ عقلی و جسمانی کا پیدا کیا ہے، اور تمام مخلوقات فطرت کی راہ سے باہم مساوی ہیں۔ پس اگر فطرت میں آزادی ہے تو سب کے سب آزاد ہونے چاہئیں یا اس کے بالعکس۔ ورنہ دراصل قدرتی فرق اور فطرتی تمیز آزاد اور غلام میں نہیں پائی جاتی۔

۳۔ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم ۳۰۔ آیت ۲۹) خدا کی بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہوسکتا۔

ایک بڑی مضبوط اور قوی دلیل ہے اس بنائی ہوئی حالت اور جبری و قہری صورت کے بطلان کی، جو ابتدا میں نامعقول حرکات والی زبردست قوم نے اپنے مغلوب قیدیوں کو غلام بنا کر جبریہ ان کو فطرتی حقوق، قدرتی اختیار، اور طبعی آزادی سے محروم رکھا تھا۔ پس غلام بنانا اور اس کی جان و مال پر تصرف کرنا خلقتِ الٰہی میں تغیّر کرنا ہے اور اسی بات کی پیشین گوئی شیطان نے پہلے سے کی ہے۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (النسا ۔۴۔ آیت ۱۱۸) اور ضرور ان کو یہ سمجھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ بدل دیں۔

اور جب غلامی کی یہ صورت ہو تو کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اسلام نے باوجود حق اور رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور تمام جہان کو تہذیب اور حکمت سکھلانے کے، پھر بھی ایسی رسمِ قبیح و مخالفِ فطرت کو کسی کسی صورت میں جاری رکھا ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اسلام اور استرقاق (غلام بنانا) دونوں جمع ہوسکیں۔

۴۔ آغازِ اسلام اور ابتدا سے وحی سے غلاموں کی حالت میں اصلاح اور غلامی کے انسداد کے لئے کوشش، ترغیب، اور کئی تدبیر کی گئی اور شروع ہی میں اخلاق اور موعظت کی راہ سے قیدیوں کی آزادی کی رغبت دلائی گئی۔

بعض تقصیرات کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا گیا۔ مثلاً:۔

مَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَۃُ - فَکُّ رَقَبَۃٍ (البلد ۹۰ - آیت ۱۳)	اے پیغمبر تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی کی گردن کا چھڑا دینا ہے۔

(الف) کفارۂ قتل خطا میں ارشاد ہوا۔ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ (النساء ۴۔ آیت ۹۲)

(ب) کفارۂ قسم میں ارشاد ہوا۔ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ (المائدہ ۵۔ آیت)

(ج) کفارۂ ظہار میں ارشاد ہوا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ (المجادلہ ۵۸۔ آیت ۴)

(د) مسلم نے کئی اسناد سے یہ حدیث نقل کی ہے:۔

من لطم مملوکہ او ضربہ فکفارتہ ان یعتقہ (مسلم ج ۲ ص۵۱ م مصر ۱۲۹۰ھ وغیرہ)	جو شخص اپنے غلام کو طمانچہ مارے یا زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے۔

اور جو غلام ان تحریص و ترغیب پر بھی بے آزادی کے رہ جائیں، ان کے لئے کتابت[1] کا حکم ہوا:۔

(یہاں سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۳ مع ترجمہ نقل کی ہے، جس کو ہم حذف کرتے ہیں)

اور قیدیوں اور غلاموں کو مال دینے پر بھی ترغیب دی گئی:۔

وفی الرقاب (البقرہ ۲ آیت ۱۷۷) اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں۔

عرب میں جب غلاموں کی آزادی کا بہت چرچا اسلام کی بدولت ہوا تو غلاموں کے مالکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ جیسی کہ اب غلامی کی حمایت کرنے والوں میں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے ''سیرت محمدی'' میں لکھا ہے:۔

---

[1] مالک غلام سے وعدہ کر لیتا تھا کہ اتنی رقم محنت مزدوری سے جمع کر کے دیدے تو پھر آزاد ہے۔ اس کو کتابت و مکاتبت کہتے ہیں۔

"جب محمدؐ نے غلامی کی آزادی کا اعلان کیا تو ان میں بہت جوش پھیلا حتّٰی کہ عبداللہ بن جدعان نے جس کے پاس بہت سے (۱۰۰) غلام تھے بنا چاری ان کو مکہ سے کہیں اور بھیج دیا کہ ایسا نہو وہ سب کے سب مسلمان ہو جائیں۔"

(سیرت محمدی صفحہ ۵۹ مطبوعہ الہ آباد ۱۸۵۱ء)

سبحان اللہ اس زمانہ میں تو اس طرح قولاً، فعلاً، موعظۃً اور شرعاً غلاموں کی آزادی کا حکم دینے اور آزاد کر دینے سے اسلام کی نیک نامی اور غیر مسلم اقوام کا حسن ظن حاصل کیا جاتا تھا، اور ایک یہ زمانہ ہے جس میں اگر کہیں ضمناً بھی غلامی کے عدم جواز کا ذکر آجائے تو بڑے بڑے مولوی صاحب اسلام کو بدنام کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں اور "نور الآفاق" کے اوراق سیاہ کئے جاتے ہیں۔

پانچویں دور کی نثر پر تبصرہ

(۱) زمانے کے لحاظ سے پانچواں اور چھٹا دور الگ الگ نہیں۔ دونوں کی ابتداء تقریباً ساتھ ساتھ ہے۔ بلکہ یہ تفریق نثر نگاری کی خصوصیات کے سبب سے کی گئی ہے۔

(۲) پانچویں دور میں جن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا انھوں نے باعتبار موضوع و مضمون مختلف قسم کی کتابیں لکھیں جن میں بعض مضامین اپنی نوعیت میں ادبیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سر سید، مولوی چراغ علی اور ان کے مخالفوں نے مذہبی مضامین جیسی جامعیت کے ساتھ لکھے، اس سے پہلے نہ لکھے گئے تھے۔ سر سید کی "آثار الصنادید" اور مضامین تہذیب الاخلاق اردو میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں شعرا کے تذکرے بھی بجائے خود دلچسپ اضافے ہیں۔

(۳) لیکن زبان وبیان کے لحاظ سے اور ایجاد اسالیب کے اعتبار سے ان تمام مصنفوں میں بجز سرسید کے، کسی کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے۔ طرز قدیم کا اثر سب میں ہے، کہیں قافیہ بندی کی حد تک، کہیں الفاظ کی بے ترتیبی، اور زبان ومحاورہ کی بے پروائی کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی مصنف "صاحب طرز" نہیں کہا جا سکتا۔

(۴) اسی امتیاز کو نمایاں کرنے کی غرض سے انیسویں صدی کے دوسرے اہل قلم کو علحدہ کو لکھا جاتا ہے۔ جنھوں نے مختلف قسم کے بالکل جدید، موزوں اور انفرادی اسالیب بیان پیدا کئے۔

(۵) پچھلے دور کے مصنف صرف طرز نگارش کے سبب سے ممتاز نہیں، بلکہ نئے نئے موضوعات تصنیف کے موجد بھی ہیں۔

(۶) اردو تصانیف میں ابتک جو کمی نظر آتی ہے وہ صحیح تنقید اور عالمانہ تحقیق وتدقیق کی ہے۔ کوئی مضمون وموضوع ہو، زبان وادب ہو یا تاریخ یا سیرت یا شاعری یا اور کچھ، اس کے لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ہر پہلو پر غور نہ کیا جائے اور ہر ممکن ذریعہ سے ایک ایک جزو، ایک ایک رخ کی تحقیق وتنقید نہ کی جائے۔ یہ کام گذشتہ دور میں صرف مذہب کے متعلق کیا گیا ہے۔ تصنیف وتالیف کی اور کسی شاخ کے لئے ایسی کاوش نہیں کی گئی۔

(۷) یہ نقد ونظر، تحقیق وتنقیح، موازنہ ومقابلہ آئندہ مصنفین کی امتیازی وانفرادی خصوصیت ہے۔

نثرِ اردو کا

چھٹا دور

(غدر کے بعد سے بیسویں صدی کے شروع تک)

مولوی محمد حسین آزاد والد کا نام مولوی محمد باقر ہے۔ شیعہ مجتہدین کے خاندان سے تھے۔ غالباً ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ آزاد کے والد نے ۱۸۳۷ء میں "اردو اخبار" دہلی سے نکالا تھا۔ جو اردو کا پہلا اخبار نہیں تو دہلی کا پہلا اخبار ضرور تھا۔ ان کے والد کے استاد ذوق دہلوی سے بڑے تعلقات تھے۔ اسی سبب سے آزاد ذوق کے شاگرد ہوئے، اور ان کے ساتھ دہلی کے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ آزاد کو اپنے استاد سے جیسی محبت تھی، اس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ آزاد نے قدیم دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی، جہاں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب ان کے رفقائے تعلیم تھے۔ استاد ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد آزاد نے حکیم آغا جان عیش سے کچھ دنوں فیض سخن حاصل کیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور دہلی دروازے کے باہر ایک میدان میں باغیوں کے ساتھ محصور و نظر بند کر دئے گئے۔ یہ حادثہ آزاد کے لئے کیا کم المناک و جاں گداز تھا کہ آزاد کو غایت محبت کے سبب سے اس حالت میں والد کی زیارت کا شوق ہوا۔ اس وقت دہلی کی ایسی فضا تھی کہ باہر چلنا پھرنا بھی خطرناک تھا۔ آخر آزاد کو فوج کے ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا جو ان کے والد کا دوست تھا۔ اس کے

---

[1] جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال ۷۷ سال کی عمر میں ہوا ہے۔ اس سے سال ولادت نکالا گیا ہے۔ اور کوئی ذریعۂ اطلاع نہ تھا۔

پاس گئے اور اپنی آرزو بیان کی۔ اس نے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ انھوں نے اپنے دل کی تڑپ کا اظہار کیا۔ آخر اس نے کہا کہ تم میرے سائیس کا لباس پہنکر میرے ساتھ چل سکتے ہو، اور کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ آزاد سائیس کے حلیے میں سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوسے اس میدان محشر میں پہنچے۔ جہاں قیدی اپنی زندگی کی آخری ساعتیں گذار رہے تھے۔ انہی لوگوں میں ایک طرف کو ایک مرد خدا عبادت میں مصروف تھا۔ چہرے پر اطمینان وسکون کے آثار تھے، یہی آزاد کے شفیق بوڑھے باپ تھے، جن کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا لاڈوں کا پالا جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گذری۔ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی۔ جب نظر نے یاوری کی، تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہوگئی، اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے۔ آزاد نے اس وقت لکھ ضبط کیا لیکن نہ ہو سکا۔ وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوسے اور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک شاہجہاں آباد کی یہ مظلوم روحیں قفس عنصری میں قید رہیں۔[۵] جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنادیا گیا تو آزاد اسی سکھ جرنیل کی مدد سے باہر نکلے۔ بغل میں استاد ذوق کی نظموں کا بستہ تھا، جس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

جب غدر کی دار وگیر سے کچھ امن کی صورت نظر آئی تو آزاد مع اہل وعیال لکھنؤ چلے

---

۵ یہ کیفیت بلکہ آخری سطریں (جو علامات اقتباس سے محدود ہیں) تقریباً بجنسہ رسالہ کتابی دنیا (شائع کردۂ کتاب گھر دہلی) کے ایک مضمون سے لی گئی ہیں۔ اس رسالے میں "آزاد کے مکمل سوانح حیات" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ اب تک آزاد کے مفصل حالات کہیں نہ ملتے تھے۔

گئے۔ لیکن وہاں بھی گردش تقدیر ساتھ رہی۔ آخر ایک مدت بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے۔ اور پنڈت من پھول میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سررشتہ تعلیم میں پندرہ روپیہ کے ملازم ہوگئے۔ اس زمانے میں میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ میجر صاحب بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی سے خاص اُنس رکھتے تھے۔ آزاد اور ماسٹر صاحب کے تعلقات نہایت دوستانہ و مخلصانہ تھے۔ آزاد نے ماسٹر صاحب سے فرمایش کی کہ میجر صاحب سے ہمیں بھی ملوا دیجئے۔ ایک بار موقع مل گیا۔ میجر فلر نے کوئی اردو کی تحریر لکھی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب کو دکھائی۔ اس میں میجر صاحب نے ایجاد کو مونث لکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اعتراض کیا کہ "ایجاد" مذکر ہے۔ میجر صاحب نے کہا کہ یہ تحریر مولوی کریم الدین صاحب سررشتہ دار کو دکھا لی ہے۔ مولوی صاحب بلائے گئے۔ انھوں نے اعتراض سن کر کہا کہ مذکر و مونث کی سند درکار ہے۔ ماسٹر پیارے لال صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے محکمہ میں جو مولوی محمد حسین دہلوی ہیں ان کو بہت سے شعر یاد ہیں۔ میجر نے آزاد کو بلا کر سوال کیا۔ آزاد نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھ دیا:-

نسخہ میں معجون زرِ زنباد سے نے ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے

میجر صاحب بہت خوش ہوئے اور آزاد کی قدر کرنے لگے۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک سرکاری اخبار "اتالیق پنجاب" نکلتا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے اڈیٹر تھے۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اس اخبار کا اسسٹنٹ اڈیٹر بنا دیا اور ۲۵ روپیہ تنخواہ کر دی۔ پھر اتالیق پنجاب بند کرکے اس کی جگہ پنجاب میگزین جاری ہوا، تو آزاد اس کے بھی سب اڈیٹر رہے۔ آزاد کے بعد حالی نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

آزاد ۱۸۶۵ء میں کسی سرکاری کام کے لئے کلکتہ گئے۔ اسی سال پنڈت من پھول کے ساتھ سرکاری سفارت کی غرض سے کابل و بخارا گئے۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ دوبارہ ۱۸۸۴ء

میں ایران گئے۔ ایران میں آزاد نے فارسی جدید میں مہارت پیدا کی۔ اور وہاں سے آ کر ایرانی فارسی کے متعلق کچھ درسی کتابیں بھی مرتب کیں۔ آزاد ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی و عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریا کے ۵۰ سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر آزاد کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء سے آزاد کے دماغ میں کچھ اختلال کے آثار شروع ہوئے۔ پھر یہ کیفیت بڑھ کر مستقل ہو گئی۔ اور زندگی کے باقی بیس برس اس حالت میں گزرے کہ کبھی جذب و مجذوبی نظر آتی تھی۔ کبھی جنون کی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء (مطابق ۹ محرم ۱۳۲۸ھ) کو رحلت فرمائی۔ خاکسار مولف نے تاریخ کہی

کہ از "غم خانہ کون و فساد"۔ آزاد شد بیروں
۱۹۱۰ء = ۱۲ - ۱۹۲۲

اردو شاعری پر آزاد کا احسان — جس زمانے میں آزاد پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں منسلک تھے۔ اور حالی بھی بک ڈپو کے اہتمام کے لئے وہاں ملازم ہو کر پہنچ گئے تھے۔ آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ کی تائید سے جدید شاعری کا دور شروع ہوا یعنی ایک بزم ادب انجمن پنجاب کے نام سے قائم ہوئی جس میں بجائے طرحی غزلوں کے مختلف موضوعات قومی و اخلاقی اور مناظر د

جدید اردو شاعری — اردو شاعری کی ابتدا سے شاعری کی جو قسمیں عام طور پر رائج ہیں، وہ غزل قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت وغیرہ تھیں۔ یہ قدیم شاعری اور ادبیات قدیم (کلاسیکل لٹریچر) کہلاتی ہیں۔ ان اصناف سخن کا موضوع و مقصود حسن و عشق، مدح و ہجو، قصص و حکایات، اخلاق و تصوف تھا۔ اس کے مقابلے میں جدید شاعری سے یہ مراد ہے کہ کسی جذبہ، منظر یا حقیقت یا واقعہ کے متعلق چھوٹی یا بڑی مستقل نظم لکھی جائے۔ اس میں یہ اقسام شامل ہیں۔ (۱) تخیلی شاعری یعنی محبت، عداوت، مسرت، غم، ایثار، خودداری وغیرہ میں سے کسی جذبہ کی تصویر کشی۔ (۲) منظر کشی یعنی کسی وقت، موسم، مقام یا اوضاع و احوال وغیرہ کی تصویر کشی۔ مثلاً صبح و شام، بہار، برسات، دریا، باغ، تیتری، کویل، اشنان، تیرتھ، دیوالی، عید وغیرہ کا منظر نظم میں بیان کرنا۔ (۳) بیانیہ شاعری کسی (باقی آئندہ صفحہ پر)

حقائق کے متعلق نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ چنانچہ آزاد کی مثنوی "زمستان"، "ابرِ کرم" وغیرہ اور حالی کی "حُبِ وطن" اور "برکھا رُت" وغیرہ اُسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اس جدت و ایجاد کا خیال سب سے پہلے آزاد کو آیا اور انھوں نے خود کہہ کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر جدید نظموں کو رواج عام دیا۔ اس لئے یہ انقلاب شاعری آزاد کی اولیات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ انجمن پنجاب کا سب سے پہلا مشاعرہ ۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا، اس میں آزاد نے "شام کی آمد اور رات کی کیفیت" پڑھ کر سنائی۔ یہ مشاعرہ صرف گیارہ مہینے جاری رہا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۵)

خاص واقعہ کو نظم کرنا۔ مثلاً حاتم کی سخاوت، سکندر و قزاق کی گفتگو، رام چندر جی کا بن باس (۴) تمثیلی یا رمزیہ شاعری، یعنی غیر ذی روح یا غیر ذی عقل چیزوں کو انسانی خواص و افعال دے کر ان کے قصے یا مکالمات لکھنا، جس سے کوئی اخلاقی پہلو ذہن نشین کرنا مقصود ہو۔ جیسے نظیر اکبر آبادی کی نظم ہنس پر یا حالی کا مناظرۂ دولت و وقت یا تاجر و طوطی کا مشہور واقعہ۔ (۵) وطنی و قومی شاعری یعنی ملک و قوم کی اصلاح و فلاح کے متعلق نظمیں۔

مختصر تاریخ (۱) پہلا دور۔ قدیم زمانے میں اس طرح کی نظمیں لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔ قصیدوں کی تشبیب، مثنویوں اور مرثیوں کے ضمنی مناظر میں ان جدید نظموں کی شباہت موجود ہے۔ اگر یہ ٹکڑے قصائد وغیرہ میں سے الگ کر لئے جائیں تو جدید شاعری کے ذیل میں آ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ قدیم زمانے میں بعض شاعروں نے الگ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء) کے قلمی دیوان میں متعدد نظمیں پھول پھل، ترکاری، شادی بیاہ، شب برات، ہولی، بسنت وغیرہ پر موجود ہیں۔ ایک نظم میں صراحی و پیالہ کا مناظرہ ہے۔ ان نظموں کی زبان دکھنی اردو ہے۔ دکن کے اور شاعروں نے بھی ایسی نظمیں لکھی ہیں۔

(۲) دوسرا دور۔ اس سے سو برس بعد دہلی میں مرزا سودا (۱۷۱۳ء۔۱۷۸۰ء) (باقی حاشیہ صفحہ ۴۱۷ پر)

آزاد کی تصانیف | سررشتۂ تعلیم پنجاب کی ملازمت کے زمانے میں کرنل ہالرائیڈ کی فرمایش سے آزاد نے اردو ریڈریں، فارسی ریڈریں، قواعد اردو، قصص ہند، (تاریخی کہانیاں) مرتب کیں۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوع کی بہترین کتابیں ہیں۔ بچوں کی دنیا میں اس سے بہتر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اور ان کے بعد بھی مولوی اسمعیل میرٹھی کے سوا کسی سے ان سے بہتر نہ بن سکیں۔ خصوصاً قصص ہند کی فصاحت و دلکشی اور لطف و تاثیر کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔ قند پارسی بھی فارسی جدید کے متعلق آزاد کی مفید کتاب ہے۔ نصیحت کا کرن پھول اخلاقی و تعلیمی قصہ ہے جو لڑکیوں کے لئے آزاد نے تصنیف کیا ہے۔ ان سے زیادہ عظیم الشان آزاد کے علمی و ادبی و لسانی کارنامے یہ ہیں:-

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۰) اور میر تقی میر (۱۷۲۴-۱۸۱۰ء) اور بعض دوسرے شاعروں نے مناظر قدرت، مظاہر فطرت، اور واقعات و حوادث کے متعلق نظمیں لکھیں۔ خصوصاً میر کی نظمیں آج تک اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

(۲) تیسرا دور میر و سودا کے زمانے میں لیکن ان سے عمر میں چھوٹے اور شاعری میں کم رتبہ ایک بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰-۱۸۳۰ء) تھے۔ یہ نظیر ہی جدید شاعری کے ایسے عجیب علمبردار تھے کہ ان کا نام سب سے الگ سمجھنے کے قابل ہے۔ گویا وہ اپنے دور میں اکیلے ہیں۔ نظیر فن شاعری کے اصول و قواعد کی کچھ بہت پروا نہ کرتے تھے اور جو موضوع اپنی شاعری کے لئے پسند کیا تھا وہ مقبول و رائج نہ تھا اگرچہ شاعرانہ حسن میں نظیر کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے صدہا نظمیں اپنے جذبات و تاثرات سے لکھیں جن میں قدرتی مناظر، فطری جذبات، اخلاق و نصائح، مشاغل حیات سب کچھ شامل ہے۔ آدمی نامہ، نظیر کی عید، برسات کی بہاریں، بنجارا، کی کا میلا، ہولی، دیوالی، بسنت، عید، عرس وغیرہ پر عجیب و غریب نظمیں لکھی ہیں۔ جو اس رنگ میں نہ پہلے لکھی گئی تھیں۔ نہ آج تک لکھی گئی ہیں۔

(۴) چوتھا دور۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے علم و ادب۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۴۱۸ پر)

۱- آبِ حیات (تذکرۂ شعرا)۔ ۲- نیرنگِ خیال دو حصے (رمزیہ یا تمثیلی مضامین)۔
۳- دربارِ اکبری (شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے کی تاریخ) ۴- سخندانِ فارس (فارسی علم اللسان)
۵- نگارستانِ فارس (تذکرۂ شعرائے فارسی)۔ ۶- دیوانِ ذوق (مع حالات و تشریحات)۔
۷- نظمِ آزاد (قومی و اخلاقی نظموں کا مجموعہ) یہ سب کتابیں آزاد کی زندگی میں شائع ہو گئی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ورثا نے قلمی مسودات سے بہت سی کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(بقایا حاشیہ صفحہ گذشتہ)
تہذیب و تعلیم، فکر و تخیل کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ نظمِ جدید کی اس تحریک و اشاعت کا مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ حالی کے سر سہرا ہے۔ ۱۸۷۴ء سے اردو میں یہ مستقل صنف شاعری شروع ہوگئی۔ حالی و آزاد کے ہم عصر انیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی محمد اسمعیل میرٹھی ہیں۔ جن کی نظمیں حسنِ شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔ قدامت و افادہ و کثرت میں حالی کو اسمعیل پر تفوق ہے۔ ان بزرگوں کے ساتھ اکبر الہ آبادی، بے نظیر شاہ، جوالا پرشاد برق، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی وغیرہ بھی امتیاز خاص رکھتے ہیں۔

(۵) پانچواں دور بیسویں صدی کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کی نشر و ترقی میں بعض ماہوار رسالوں نے بڑی مدد دی، مثلاً رسالہ مخزن لاہور (جاری شدہ ۱۹۰۲ء) اور رسالہ زمانہ کانپور (جاری شدہ ۱۹۰۳ء)۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی کے ان چالیس سال میں بے شمار رسالے جاری ہوئے اور ان کے ذریعہ سے ہزارہا جدید نظمیں شائع ہو گئیں۔ ہر مہینے بلا مبالغہ کئی سو نظموں کا اضافہ ہو جاتا ہے اس زمانہ کے چند ممتاز جدید شاعر یہ ہیں:- ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، چکبست لکھنوی، امجد حیدرآبادی، ظفر علی خاں، ونایک پرشاد طالب بنارسی، تلوک چند محروم، نادر کاکوروی، جوش ملیح آبادی۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ یہاں صرف چند نام لکھ دیے گئے ہیں۔ لیکن ترجیح بلا مرجح نہیں ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کی جدید شاعری ۱۹۰۱ء سے کچھ پہلے یا کچھ بعد (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۹ پر)

۸۔ تذکرۂ علما۔ (۴۰ مشاہیر ہند کا تذکرہ)۔ ۹۔ سیاک و نماک (آزاد کی مجذوبانہ تحریر)۔
۱۰۔ کائناتِ عرب (جغرافیہ واحوالِ عرب)۔ ۱۱۔ لغتِ آزاد (اردو لغات کے فارسی مترادفات)
۱۲۔ ڈرامۂ اکبر (فسانہ جہانگیر و نورجہاں) ۱۳۔ سیرِ ایران (سفرنامہ) ۱۴۔ فلسفۂ الٰہیات
(مجذوبانہ تصنیف)۔ ۱۵۔ جانورستان (حالاتِ حیوانات)۔ ۱۶۔ مکتوباتِ آزاد (مجموعہ خطوط)
۱۷۔ بیاضِ آزاد (آزاد کے پسندیدہ اشعار)۔ ۱۸۔ نظمِ آزاد (غزلیات و منظومات)۔

آزاد کا طرزِ تحریر

اگر کسی شخص کو آزاد کے سوانحِ زندگی، انقلابات و مصائب، افتادِ طبع اور جذب و جنون کا حال معلوم نہ ہو، اور وہ ان کی آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصصِ ہند، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس وغیرہ کتابیں جو آثارِ جنوں سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں، مطالعہ کرے، تو پڑھنے والا آزاد کے اسلوبِ تحریر کی جدت و دلکشی، اور آزاد کی ذہانت و لطافتِ طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ مصنف "خیالی بندہ" اور "عالمِ خیال" کا رہنے والا ہے۔ اس کی ذہنی فضا احساسات و تاثرات سے بھری ہوئی یا اس کے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوئے ہیں، جن میں اس کا دل اور دل کے ساتھ قلم اڑتا چلا جاتا ہے۔

علامہ آزاد کی تمام تصانیف میں "نظریہ" کی دلیں ہیں۔ صرف نیرنگِ خیال کے تمثیلی و رمزیہ (ایلیگوریکل) مضامین پر یہ قیاس قائم نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی مستقل

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

بعد شروع ہوئی۔ اب ان میں کتنے رحلت فرما گئے اور جو زندہ ہیں ان میں سے کسی کی عمر ۶۰ سال سے کم نہ ہوگی۔
(۶) چھٹا دور ان جدید شاعروں کا ہے، جن کی شاعری جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) اور تحریکِ آزادی (۱۹۲۰ء) کے بعد منظرِ عام پر آئی ہے۔ ان میں ایسے جوہر بھی موجود ہیں کہ تکمیلِ شاعری کے بعد ان پر اردو اور ہندوستان کو ناز ہوگا۔ لیکن اس زمانے میں کثرت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ علمی معیار کا قائم رہنا دشوار ہے۔ اندیشہ ہے کہ کمال سے پہلے زوال نہ شروع ہو جائے۔

کتابیں عربی و فارسی میں بھی لکھی گئی ہیں۔ اور اردو میں بھی۔ ایسے مضامین سرسید، محسن الملک، حالی وغیرہ نے بھی لکھے ہیں۔ اور وہ یقیناً "خیالی بندے" نہ تھے۔ نیرنگ خیال کے علاوہ آزاد کی "آب حیات"، میں ہر دور کی تمہید و خاتمہ، آب حیات، دربار اکبری، سخندان فارس، دیوان ذوق کے صدہا چھوٹے جملے اور بڑی عبارتیں، آزاد کی اس ذہنیت کی شاہد ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جو طرز نگارش سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آزاد اپنے تخلص (آزاد) کو جا بجا ضمیر متکلم کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ انداز کہیں کہیں قدیم مصنفوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس کثرت سے اور نہ اس طور پر، جیسے

(الف) "آزاد بندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔"
آب حیات کا سب سے پہلا جملہ)

(ب) "ایک سحر البیان، دوسرے گلزار نسیم، اور عجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت و سقم کا حال پوچھے۔" (آب حیات ذکر میر حسن)

(ج) "استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے، والد مرحوم شہید آرزو جمع کے میں بڑھا ہو گیا اب خطرہ ہے کہ امانت رہے، اور آزاد کو مسافر خانہ سے کوچ کا حکم آجائے۔" (دیباچہ دیوان ذوق کی پہلی سطریں)

(د) "ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے، نہ وہ رہے، نہ بیاضیں رہیں۔" (دیوان ذوق ص ۲۴۹)

(ہ) "آہ استاد، کہاں استاد۔ خیر آزاد، بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں۔۔۔" (دیوان ذوق ص ۲۵۳)

(و) "آزاد نے جو کچھ کیا، نیک نیت اور پاک عقیدت سے کیا ہے" (دیوان ذوق صفحہ ۴۵)

(ز) "کاغذی تختے ٹکڑا ر نظر آتے ہیں، مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ ٹنور کچھ نہیں، وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں" (سخندان فارس صفحہ ۶)

(ح) "جب ان کے چراغ خاندان سید خورشید علی نفیس بھی شعاع توجہ دریغ فرمائیں تو غیروں سے کیا امید۔ انھوں نے آزاد خاکسار کو آب حیات کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا" (آب حیات تذکرۂ میر انیس)

نام کا یہ استعمال عجب آزادہ روی کی شان اور دلکشی رکھتا ہے۔

(۲) دوسرا جدید اسلوب یہ ہے کہ جا بجا استعارہ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے مصنفوں نے کہیں اتفاق ہی سے کیا ہوگا۔ مثلاً

(۱) "قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑایا" (آب حیات تذکرہ میر تقی میر)

(۲) "فتحیاب اہل کے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے۔ ان کی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو نئی لغت کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا" (سخندان فارس۔ فارسی زبان میں انقلاب)

(۳) "اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشا پردازی بھی امیدوار آئی۔ انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا، بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیئے"

(سخندان فارس کا وہی مضمون)

(۴) "دیکھو تم صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا، وہاں سے سخاوت کا چشمہ بہہ نکلا" (دربار اکبری۔ تذکرہ بیرم خاں)

(۵) ایک مضمون میں اہل وطن کو "تم" اور "تمھارے" لفظوں سے خطاب کرتے کرتے یکایک تخاطب بدل کر فرماتے ہیں:۔

"اے خاک ہندوستان! اگر تجھ میں امرؤالقیس اور لبید نہیں تو نہیں۔ کالیداس ہی نکال۔ اسے ہندوستان کے فخر! اور دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دو"۔ (لکچر انجمن پنجاب ضمیمہ نیرنگ خیال حصہ اول)

(۲) "خان خاناں اور خان اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک کامل نمایش گاہ بنے ہوئے تھے، جن کے در و دیوار فصل بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے اور ہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا"۔ (دربار اکبری، جشن نوروزی جلال الدین اکبر)

(۷) استاد ذوق کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے کے ذکر پر لکھتے ہیں: "ادھر تو شعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا، اُدھر قسمت نے آواز دی کہ لکھنو نہ سمجھنا، یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں"۔ (دیوان ذوق)

یہ شاعرانہ فقرے اور تخئیلی انداز آزاد کی تمام تصانیف میں بڑی کثرت سے ہے اور بڑا مزہ دیتا ہے۔ یہ اسلوب مرزا غالب کے رقعوں میں تو پایا جاتا ہے، لیکن دور اصلاح و ترقی یعنی سرسید اور ان کے بعد کے مصنفوں میں نہیں ہے۔ صرف آزاد کی خصوصیت ہے۔

(۳) علامہ آزاد کی طبیعت میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خداداد تھی۔ فارسی زبان کی محبت و شغف نے اس جوہر کو چمکا دیا تھا۔ ظہوری اور نعمت خان عالی کی نثر کو پسند کرتے تھے۔ اور ان کی نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کا اثر دل و دماغ پر تھا۔ چنانچہ سخندان فارس میں لکھتے ہیں:-

"ان کے نازک خیال، خوبصورت استعارے، نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں، لفظوں کی عمدہ تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں، صنعتوں کے ہجوم، جواب نہیں رکھتے۔ ظہوری نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے، مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا، بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے: نکتہ ہائے برجستہ غنچہ ہائے سربستہ۔ (پھر کہتا ہے)

ہر صفحہ چمنے، ہر سطرے ابجنے، ہر حرف فش فصلے، ہر نقطہ عش اصلے۔ (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے) ابروان خجستہ، کلید دل ہاے بستہ"۔

اس کے بعد اس طرز تحریر کے استعمال کے متعلق ہدایت کرتے ہیں:۔

"بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔ انھوں نے خوبی الفاظ، اور نزاکت خیال، اور زور طبع کو بے مطلب دبے مزا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو، اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو گے تمھاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے"۔

چنانچہ آزاد خود اپنی تصانیف میں اس سے کام لیتے ہیں۔ اوپر جو مثالیں متفرق جملوں کی لکھی گئی ہیں، ایسا ہی اسلوب نگارش آزاد کے ہاں طویل و مسلسل عبارتوں میں بھی ملتا ہے۔ نمونے دیکھیے:۔

(الف) "اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا، اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے، اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا، اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ، تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا، اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا"۔ (آب حیات، زبان اردو کی تاریخ صفحہ ۴۹)

(ب) "جب وہ صاحب کمال (استاد ذوق) عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی، اور رنگ نے بقاے دوام سے آنکھوں کو

طروت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔" (آب حیات تذکرہ ذوق)

(ج) "نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (یعنی مرزا سودا) نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم (یعنی استاد ذوق) کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا، اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری، ظہیر، ظہوری، نظیری، عرفی، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں، لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہندی زمین کو آسمان کر دیا۔" (آب حیات و دیوان ذوق، قصہ مقدمہ دیباچہ)

(د) "حضرت عشق نے شادی کی تھی۔ اور نحبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا، بیویوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ تھا..... جو دھیو کا رخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے، قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔" (دربار اکبری ص۲)

(ہ) اسی کے آگے اکبر بادشاہ کی ولادت کا ذکر کرتے ہیں:-

"اس عالم میں ایک دن ملازم نے آ کر خبر دی کہ مبارک اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ تارا ایسے ادبار کے وقت جھلایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی۔ مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے تارے اس کی روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔" (دربار اکبری ص۲)

نثر میں شاعرانہ تخئیل و اسلوب بیان کی ایسی دلکش و برجستہ مثالیں آزاد کے ہم عصروں میں

کہیں نہیں ملتیں۔ یہ بھی آزاد کے "عالمِ خیال" کی تصویریں ہیں۔

(۴) خیالی طرزِ ادا کی ایک اور دلچسپ صورت آزاد یہ اختیار کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات و قیاسات، جن کو دوسرے مصنف واقعہ فرض کرکے واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں، ان کو آزاد قیاسی و احتمالی انداز سے لکھتے ہیں۔ مثلاً زبانوں کی ساخت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

(الف) "مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہوگی۔ اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہ کر بولتے ہوں گے۔ اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے۔ یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جدا ہوگئیں۔" (سخندانِ فارس ص)

(ب) کوٹھی کے لفظ کی اصل اور اس کے رواج کی صورت بیان کرتے ہیں:۔

ہندوستان میں صاحب لوگ نباس تجارت میں آئے تھے۔ چونکہ تاجروں کا رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا، اوّل اوّل معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں ہی سے ہوتے ہوں گے۔ عام مسافرت میں انھیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھیں سے لئے ہوں گے۔ عالی شان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں۔ چونکہ صاحب لوگ لباسِ تجارت میں تھے جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے، کوٹھی پر جا کرتے ہوں گے، وہ پوچھتے ہوں گے آپ کی کوٹھی کہاں ہے، یہ پتا بتا دیتے ہوں گے، اور سمجھتے ہوں گے کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں، کیونکہ مسافر تھے۔ ان کی دُکان اور کوٹھی ایک ہی تھی۔ ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے، یہ چیز ہماری کوٹھی پر لے آؤ۔ اور لوگ کہتے ہوں گے، یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ اُٹھا دیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہو گئے۔ جب سے

کوٹھی کا نام جو محاورہ میں آ گیا تھا، وہی رہا۔ اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔"

(سخندانِ فارس)

(ج) عبدالرحیم خانخاناں کے بچپن کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں:۔

"وہ تین برس کی جان (عبدالرحیم خانخاناں) کیا کرتا ہوگا، سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا، ڈرتا ہوگا، اتکہ کے پاس چھپ جاتا ہوگا، افسوس وہ بچارے یاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی! تیری پناہ! عجب وقت ہوگا، شامِ غریبا اسی کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی، دن ہوا تو روزِ محشر۔"

(دربارِ اکبری ص۵۶)

(د) "زبان اردو کی تاریخ" کے سلسلے میں ہندوستان کی قدیم تاریخ بیان کرتے ہیں:۔

فتح یابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے۔ پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے، اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے۔ کچھ بھاگے ہوں گے، وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے۔ کچھ فتحیابوں کی غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے، وہی شودر کہلائے ہوں گے، چنانچہ ابتک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔ (آبِ حیات ص۵)

(ہ) اسی طرح جن شاعروں کا ذکر آئندہ کرنے والے ہیں، ان کے کلام کی خصوصیات جب خلاصے کے طور پر پہلے بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی وہی پیرایۂ خیال دکھاتے ہیں۔ آبِ حیات کے ہر دَور کی تمہید میں اس طرح کے فقرے لکھے ہیں۔ مثلاً "دورِ سوم" پر تنقید کرتے ہیں:۔

"تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتاریں گے،

قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا، اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے، سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔"

(آب حیات تمہید دور سوم)

یہ اسلوب تحریر نہایت دلچسپ، لطیف اور پرتاثیر ہے۔ اور محاکات پیدا کرنے کا بالکل صحیح طریقہ۔ لیکن یہ بھی "خیالستان آزاد" کے جلوے ہیں، کوئی اور مصنف اس طرح نہیں لکھتا۔ آزاد کی ایجاد ہے۔

(۵) علامہ آزاد کی تحریر پر فارسی نثر کی کتابوں میں سے گلستان سعدی کی طرز تحریر کا اثر ہے۔ سخندان فارس میں ایک جگہ گلستاں کا ذکر لکھتے ہیں:-

"عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ اسی صدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا۔ اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا، اور گلستاں ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جس کا آج تک جواب نہیں ----- چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں، اور کٹری کٹری عبارت ہے، مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ صنائع و بدائع کی دستکاری نے اسے قلم نہیں لگایا، مگر سادگی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، اس کے ننھے ننھے فقرے، آیت اور حدیث کی طرح اپنی تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں، مزا یہ ہے کہ جو چٹخارا زبان کو نظم پڑھنے میں آتا ہے، وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اس کی قدرتی فصاحت نظم

نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔" (سخندان فارس، تیسرا لکچر ص۶۳)
اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے، پھر بھی منہ سے بول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کے فقرے گلستان کے فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے، تاہم ان کے پڑھنے میں زبان کو نظم کا سا چٹخارا ملتا ہے۔
یہی وصف طرزِ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی شان ہے، جس میں کوئی دوسرا مصنف ان کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، تشبیہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت سب مل کر سادگی و پُرکاری کا عجیب و نادر نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ اسلوب علامہ آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے۔ اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن لکھ کر دیکھئے تو نسخہ دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اسی اسلوب بیان کے سبب سے صاحبِ طرز کہلاتے ہیں۔ مذکورہ بالا سب چھوٹی بڑی عبارتیں اس کے نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ اور نمونے آزاد کی تصانیف کے سلسلے میں آئندہ آتے ہیں۔

طرزِ آزاد کا نقص

علامہ آزاد نے مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی ہیں: خیالی و تمثیلی مضامین (نیرنگِ خیال)، تذکرۂ شعرا (آبِ حیات)، تاریخ و سیرت (دربارِ اکبری)، فلسفۂ زبان (سخندانِ فارس)، تاریخی مایاں (قصصِ ہند) وغیرہ۔ ان میں سے ہر موضوع کے لئے الگ اسلوب بیان ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے ہر تصنیف اپنے خیالی رنگ میں لکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو تشبیہ و استعارہ میں بیان کئے گئے، وہ اگر صحیح و اصلی تھے، تب بھی ان میں افسانہ کا رنگ آگیا۔ اور درست و واقعی تنقید بھی جب مبالغہ کے انداز میں لکھی گئی تو خیالی ہو گئی۔ ان کی آبِ حیات میں نیرنگِ خیال کا لطف ہے، اور دربارِ اکبری میں قصصِ ہند کا مزہ۔ اسی لئے کہیں کہیں آزاد کی تحقیق تحقیق نہیں معلوم ہوتی، اور تنقید تنقید نہیں رہتی۔ لیکن کچھ نہ رہنے پر بھی انشاپردازی کا عجیب لطف و اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ آزاد

کے متعلق علامہ شبلی کی یہ رائے ہے :۔

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم ادھر اُدھر گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔"

آزاد کی طبیعت کا عجیب خاصہ

علامہ آزاد مورخ بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اور مورخ و نقاد کا پہلا فرض صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے۔ لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں، یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی مدح و ذم کی خاطر کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں، کبھی بر خلاف واقع نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس کام کے لئے اسلوب بیان بڑا دلچسپ و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں، اس کے جملہ محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گو بے تعصبی کے ساتھ انصاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن لکھتے لکھتے کبھی درمیان میں، کبھی اخیر میں چٹکی لے لیتے ہیں۔ آب حیات اور دربار اکبری میں اس کا زیادہ موقع تھا۔ وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ دربار اکبری تو صرف اسی غرض سے لکھی ہے۔ یہ تمام کتاب مُلا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف منتخب التواریخ پر مبنی ہے۔ بلکہ مُلا صاحب کی تردید و تضحیک کے لئے لکھی گئی ہے۔ علامہ آزاد کو اکبر بادشاہ کی ذات و حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں، اس کے اس لئے مداح ہیں کہ وہ ابوالفضل، فیضی، خانخاناں وغیرہ کا قدرداں ہے۔ اور چونکہ مُلا عبدالقادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و اسلام کشی کو صداقت و جوش اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے، اس لئے آزاد مُلا صاحب سے بیزار رہے۔ آزاد کی تصانیف سے چند مثالیں یہ ہیں :۔

(۱) آب حیات دور سوم میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کی جو مذمت آزاد نے کی ہے وہ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۸ پر درج ہے۔

(۲) آب حیات دور پنجم میں شاہ نصیر دہلوی کے حُسنِ اعتقاد کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آزاد کا حُسنِ ظن اور حُسنِ بیان مترشح ہے۔

(۳) آب حیات کی اشاعت اول میں آزاد نے حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اپنی ذاتی رنجش و کدورت کے سبب سے دانستہ ترک کر دیا تھا۔ ورنہ خلاف قیاس ہے کہ جب علامہ آزاد ۲۵ برس کی عمر تک دہلی میں رہے تھے مومن خاں کو دیکھا تھا، اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، ان کا کلام ان کی زبان سے سُنا تھا، تو ان کے حالات سے اتنی آگاہی نہ ہوتی کہ "آب حیات" کے لئے ان کا تذکرہ مرتب کر سکتے۔

(۴) دربار اکبری میں علامہ آزاد ہر موقع پر مُلا عبدالقادر بدایونی کو لعن و طعن کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ دل کا بخار نکالنے کے سوا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً مُلا صاحب نے ابوالفضل کے حال میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"تفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق و نکات قرآنی در اں خیلے درج شدہ دمی گویند کہ تصنیف والدش بود گذرانیدہ، عز تحسین یافت و "تفسیر اکبری" تاریخ آں شد"۔

(منتخب التواریخ جلد دوم ص۱۹۸)

اس پر علامہ آزاد "دربار اکبری (ص۴۹۳) میں مُلا عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مگر روئے حسد سیاہ! تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو یہی شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی سہی تو اس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا"۔

یہ ایک مثال ہے جس کے نمونوں سے تمام دربار اکبری بھری پڑی ہے۔

(۵) دیوان ذوق میں آزاد لکھتے ہیں:۔

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی

دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔
انھیں ساتھ لیکر استاد مرحوم (یعنی ذوق) کے پاس آئے۔ اور بڑے اصراروں
سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا..... ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد
نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا، کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے، مدتیں
گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا، حضور کی غزلیں فرصت کہاں
دیتی ہیں؟ پھر کہا، پھر کہا، خیر میں نے دو شعر سنا دیئے، انھیں دنوں میں ہوئے
تھے :- ؎

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے، ہندو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی، کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا، انھوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا، نہیں، یہی کہتے رہے۔ نجوم کا مرض
ایسا لگا ہے کہ ایک دم مذاقت نہیں کرتا، دل نہیں لگتا، چرچا جاتا رہا، وغیرہ وغیرہ
اس بیان سے بندہ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے، بے شک
ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے۔ مگر سخن سنج نکتہ شناس تھے۔
ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایک شعر کہ مطلع ہو، اور اس میں ثبات
مضمون ہمہ گیر دعووں سے قائم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ
وغیرہ۔ اسے سن کر جو پڑھتے تو اسی رتبہ کا مطلع پڑھتے، وہ زبان پر نہ دھرا تھا، اور
وہ ان لوگوں میں نہ تھے کہ شعر سنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے
تھے اور محل و مقام پہچانتے تھے"

دیکھئے علامہ آزاد کس قدر خوبصورت طریقے سے مومن خاں کی تنقیص کرتے ہیں کہ معلوم

ہوتا ہے مدح کر رہے ہیں۔

آزاد کی سخن سنجی عجیب بات ہے کہ علامہ آزاد نثر کے لفظوں اور فقروں، ترکیبوں اور بندشوں کے تناسب و ترنم اور صفائی وسلاست کے متعلق، اور تخئیل و طرز ادا کے لحاظ سے جس قدر ذوق صحیح اور طبع سلیم رکھتے تھے۔ نظم کی لفظی و معنوی خوبیوں میں اس کے بالکل برعکس مذاق پایا تھا۔ (اس عنوان پر تفصیل کے ساتھ اس وقت لکھا جائے گا جب آزاد کو بہ حیثیت شاعر کے پیش کیا جائے گا۔ یہاں ان کے خواص طبیعت کے سلسلے میں مختصر لکھا جاتا ہے)۔ (۱) اوپر کی مثال میں ذوق کے مطلع کی اس قدر تحسین خود آزاد کی سخن سنجی کی داد دے رہی ہے۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس مطلع کا اردو شاعری اور صنف غزل میں کوئی مرتبہ نہیں۔ یہ مضمون اور اس کے اثبات کے چاروں گواہ نہ شاعری کا شاہکار، نہ ذوق کا کارنامہ۔

(۲) آزاد نے آب حیات پہلے لکھی ہے۔ دیوان ذوق اس کے ایک عرصہ بعد مرتب کیا ہے۔ دیوان کی بعض غزلوں میں آزاد نے تصرف کیا ہے۔ اس کی توجیہ دیباچہ دیوان کے آغاز ہی میں کرتے ہیں:-

> "ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے، اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے، کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا جاننا، اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا، میرا کام نہ تھا، خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں، اور دن اندھیرے ہو گئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے۔"

یعنی علامہ آزاد کے جو کچھ جی میں آیا، اور جہاں جیسا مناسب سمجھا، لکھ دیا۔

آزاد کے مرتّبہ "دیوان ذوق" میں جو غزلیں دیوان مروجہ سے علیحدہ ہیں، ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو غزلیں خود آزاد "آب حیات" میں درج کر چکے تھے، ان کو دیوان میں درج کرتے وقت جو حک و اصلاح کی ہے، اس سے آزاد کے ذوقِ سخن کا پتا چلتا ہے۔

مثلاً آب حیات میں ذوق کا مطلع ہے :۔

مزے یہ دل کے لئے تھے، نہ تھے زباں کے لئے سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کے لئے

اس کو آزاد نے "دیوان ذوق" میں اس طرح لکھا ہے :۔

مزے تو دل کو ملے تھے، ہوسے زباں کے لئے یہ ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کے لئے

ذوق سلیم جانتا ہے کہ آزاد کے تصرّف نے دونوں مصرعوں کو سست اور مضمون کو پست کر دیا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر آب حیات میں یوں ہے :۔

اٹھی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا، کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اور دیوان میں اس طرح :۔

اٹھی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اس ترمیم میں دو عیب پیدا ہو گئے، ایک بندش کا، ایک مضمون کا۔ اور تعجب ہے کہ آزاد کی نظر ان پر نہ پڑی۔ پہلے مصرع میں (ہے) کا لفظ آنے سے تعقید پیدا ہو گئی جبکہ (ہے) کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ پہلی صورت میں (اُس صنم) سے اپنے محبوب کی تخصیص میں بہت لطف تھا جو دوسری صورت کی عمومیت سے جاتا رہا۔

اسی غزل کا ایک اچھا خاصا شعر تھا :۔

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجت ساماں اثاثہ چاہیے کیا خانۂ کماں کے لئے

اس کو آزاد نے اس طرح بدل کر مہمل کر دیا :۔

قد خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیب وبال اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔" (سخندانِ فارس، تیسرا لکچر ص۱۳)

اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے، پھر بھی منھ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کے فقرے گلستاں کے فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے، تاہم ان کے پڑھنے میں زبان کو نظم کا سا چٹخارا ملتا ہے۔

یہی وصف طرزِ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی شان ہے، جس میں کوئی دوسرا مصنف ان کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، تشبیہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت سب مل کر سادگی و پرکاری کا عجیب و نادر نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ اسلوب علامہ آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے۔ اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن لکھ کر دیکھئے تو منھ دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اسی اسلوبِ بیان کے سبب سے صاحبِ طرز کہلاتے ہیں۔ مذکورۂ بالا سب چھوٹی بڑی عبارتیں اس کے نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ اور نمونے آزاد کی تصانیف کے سلسلے میں آئندہ آتے ہیں۔

طرزِ آزاد کا نقص

علامہ آزاد نے مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی ہیں: خیالی و تمثیلی مضامین (نیرنگِ خیال)، تذکرۂ شعرا (آبِ حیات)، تاریخ و سیرت (دربارِ اکبری)، فلسفۂ زبان (سخندانِ فارس)، تاریخی مسائل (قصصِ ہند) وغیرہ۔ ان میں سے ہر موضوع کے لئے الگ اسلوب بیان ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے ہر تصنیف اپنے خیالی رنگ میں لکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو تشبیہ و استعارہ میں بیان کئے گئے، وہ اگر صحیح و اصلی تھے، تب بھی ان میں فسانہ کا رنگ آگیا۔ اور درست و واقعی تنقید بھی جب مبالغہ کے انداز میں لکھی گئی تو خیالی ہوگئی۔ ان کی آبِ حیات میں نیرنگِ خیال کا لطف ہے، اور دربارِ اکبری میں قصصِ ہند کا مزہ۔ اسی لئے کہیں کہیں آزاد کی تحقیق تحقیق نہیں معلوم ہوتی، اور تنقید تنقید نہیں رہتی۔ لیکن کچھ نہ رہنے پر بھی انشا پردازی کا عجیب لطف و اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ آزاد

کے متعلق علامہ شبلی کی یہ راے ہے :-

"آزاد کی کتاب آئی ، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ، تاہم ادھر اُدھر گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے "

آزاد کی طبیعت کا عجیب خاصہ

علامہ آزاد مورخ بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اور مورخ و نقاد کا پہلا فرض صداقت ، انصاف اور بے تعصبی ہے۔ لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی راے کی تائید میں ، یا اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی مدح و ذم کی خاطر کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں ، کبھی خلاف واقع نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس کام کے لئے اسلوب بیان بڑا دلچسپ و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں اس کے جملہ محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گویا بے تعصبی سے کام لے کر تو انصاف کرتے ہوئے ہیں۔ لیکن لکھتے لکھتے کبھی درمیان میں کبھی اخیر میں چٹکی لے لیتے ہیں۔ آب حیات اور دربار اکبری میں اس کا زیادہ موقع تھا۔ وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ دربار اکبری تو صرف اسی غرض سے لکھی ہے۔ یہ تمام کتاب ملا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف منتخب التواریخ پر مبنی ہے۔ بلکہ ملا صاحب کی تردید و تضحیک کے لئے لکھی گئی ہے۔ علامہ آزاد کو اکبر بادشاہ کی ذات و حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں اس کے اس لئے مداح ہیں کہ وہ ابو الفضل ، فیضی ، خانخاناں وغیرہ کا قدرداں ہے۔ اور چونکہ ملا عبدالقادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و اسلام کشی کو صداقت و جوش اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے اس لئے آزاد ملا صاحب سے بیزار رہتے ہیں۔ آزاد کی تصانیف سے چند مثالیں یہ ہیں :-

(۱) آب حیات دور سوم میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کی جو مذمت آزاد نے کی ہے وہ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۸ پر درج ہے۔

(۲) آب حیات دور پنجم میں شاہ نصیر دہلوی کے حُسنِ اعتقاد کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آزاد کا حُسنِ ظن اور حُسنِ بیان مترشح ہے۔

(۳) آب حیات کی اشاعت اول میں آزاد نے حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اپنی ذاتی رنجش و کدورت کے سبب سے دانستہ ترک کر دیا تھا۔ ورنہ خلاف قیاس ہے کہ جب علامہ آزاد ۲۵ برس کی عمر تک دہلی میں رہے تھے مومن خاں کو دیکھا تھا، اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، ان کا کلام ان کی زبان سے سُنا تھا، تو ان کے حالات سے اتنی آگاہی نہوتی کہ "آب حیات" کے لئے ان کا تذکرہ مرتب کر سکتے۔

(۴) دربار اکبری میں علامہ آزاد ہر موقع پر ملّا عبدالقادر بدایونی کو لعن وطعن کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ دل کا بخار نکالنے کے سوا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً ملّا صاحب نے ابوالفضل کے حال میں ایک جگہ لکھا ہے:-

"وتفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق ونکات قرآنی در ان خیلے درج شدہ ومی گویند کہ تصنیف والدش بود گذرانید: "عز تحسین یافت و "تفسیر اکبری" تاریخ آں شد۔"
(منتخب التواریخ جلد دوم صـ۱۹۸)

اس پر علامہ آزاد "دربار اکبری (صـ۴۹۳) میں ملّا عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"مگر روئے حسد سیہ و تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی سہی تو اس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا۔"

یہ ایک مثال ہے جس کے نمونوں سے تمام دربار اکبری بھری پڑی ہے۔

(۵) دیوان ذوق میں آزاد لکھتے ہیں:-

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی

دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انھیں ساتھ لیکر استاد مرحوم (یعنی ذوق) کے پاس آئے۔ اور بڑے اصرار وں سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا..... ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا، کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے، مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سُنا۔ میں نے کہا، حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا، پھر کہا، خیر میں نے دو شعر سُنا دئے، انھیں دنوں میں ہوئے تھے:-

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی، کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا، انھوں نے بھی کچھ سُنایا؟ فرمایا، نہیں یہی کہتے رہے، نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا۔ دل نہیں لگتا، جی چڑھ جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ اس بیان سے بندہ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے۔ بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے۔ مگر سخن سنج نکتہ شناس تھے۔ ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ یک ایسا شعر کہ مطلع ہو، اور اس میں ثبات مضمون ہمگر دا ہوں سے قائم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسے سُن کر جو پڑھتے تو اسی رتبہ کا مطلع پڑھتے، وہ زبان پر نہ دھرا تھا۔ اور وہ ان لوگوں میں نہ تھے کہ شعر سُنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے اور محل و مقام پہچانتے تھے"

دیکھئے علامہ آزاد کس قدر خوبصورت طریقے سے مومن خاں کی تنقیص کرتے ہیں کہ معلوم

ہوتا ہے مدح کر رہے ہیں ۔

آزاد کی سخن سنجی

عجیب بات ہے کہ علامہ آزاد نثر کے لفظوں اور فقروں، ترکیبوں اور بندشوں کے تناسب و ترنم اور صفائی و سلاست کے متعلق، اور تخئیل و ادا کے لحاظ سے جس قدر ذوق صحیح اور طبع سلیم رکھتے تھے۔ نظم کی لفظی و معنوی خوبیوں میں اس کے بالکل برعکس مذاق پایا تھا۔ (اس عنوان پر تفصیل کے ساتھ اس وقت لکھا جائے گا جب آزاد کو بہ حیثیت شاعر کے پیش کیا جائے گا۔ یہاں ان کے خواص طبیعت کے سلسلے میں مختصر لکھا جاتا ہے)۔ (۱) اوپر کی مثال میں ذوق کے مطلع کی اس قدر تحسین خود آزاد کی سخن سنجی کی داد دے رہی ہے۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس مطلع کا اردو شاعری اور صنف غزل میں کوئی مرتبہ نہیں۔ یہ مضمون اور اس کے اثبات کے چاروں گواہ نہ شاعری کا شاہکار، نہ ذوق کا کارنامہ۔

(۲) آزاد نے آب حیات پہلے لکھی ہے۔ دیوان ذوق اس کے ایک عرصہ بعد مرتب کیا ہے۔ دیوان کی بعض غزلوں میں آزاد نے تصرف کیا ہے۔ اس کی توجیہ دیباچہ دیوان کے آغاز ہی میں کرتے ہیں:-

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے، دیوان مروجہ میں کچھ چھپے، اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے، کبھی کچھ سنے۔ بعضے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حضور غائب لکھتا اور جمع کرتا کتنے پھیکے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا جانچنا، اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا، میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر در خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں، اور دن اندھیرے ہو گئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے۔"

یعنی علامہ آزاد کے جو کچھ جی میں آیا، اور جہاں جیسا مناسب سمجھا، لکھ دیا۔

آزاد کے مرتبہ "دیوان ذوق" میں جو غزلیں دیوان مروجہ سے علیحدہ ہیں، ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو غزلیں خود آزاد "آب حیات" میں درج کر چکے تھے، ان کو دیوان میں درج کرتے وقت جو حک و اصلاح کی ہے، اس سے آزاد کے ذوقِ سخن کا پتا چلتا ہے۔

مثلاً آب حیات میں ذوق کا مطلع ہے:۔

مزے یہ دل کے لئے تھے، نہ تھے زباں کے لئے سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

اس کو آزاد نے "دیوان ذوق" میں اس طرح لکھا ہے:۔

مزے تو دل کو ملے تھے، ہوے زباں کے لئے یہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

ذوقِ سلیم جانتا ہے کہ آزاد کے تصرف نے دونوں مصرعوں کو سست اور مضمون کو پست کر دیا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر آب حیات میں یوں ہے:۔

الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اور دیوان میں اس طرح:۔

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اس ترمیم میں دو عیب پیدا ہو گئے۔ ایک بندش کا، ایک مضمون کا۔ اور تعجب ہے کہ آزاد کی نظر ان پر نہ پڑی۔ پہلے مصرع میں (ہے) کا لفظ آنے سے تعقید پیدا ہو گئی جبکہ (ہے) کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ پہلی صورت میں (اُس صنم) سے اپنے محبوب کی تخصیص میں جو لطف تھا، وہ دوسری صورت کی عمومیت سے جاتا رہا۔

اسی غزل کا ایک اچھا خاصا شعر تھا:۔

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجت ساماں اثاثہ چاہیئے کیا خانۂ کماں کے لئے

اس کو آزاد نے اس طرح بدل کر مہمل کر دیا:۔

قدِ خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیب و بال اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

استاد ذوق کے بہت سے اشعار میں اس طرح کے تصرفات کیے ہیں۔

(۳) آزاد خود اپنی نظموں میں بھی جا بجا تعقید کا عیب پیدا کر دیتے ہیں۔ آزاد کی نظم (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) کے بعض شعر دیکھیے :-

زاہد مراقبے کا ہے دم سب کو دے رہا — اور آپ مارے نیند کے جھونکے ہے لے رہا
سونے کو بحر بھی ہے بہ خوابِ عدم گیا — دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا
دل دے رہا جو شیرِ محبت کے جام ہے — ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے

اوّلیاتِ آزاد
آزاد کا مرتبہ

آزاد ان "خداساز" ہستیوں میں سے تھے جن کو دنیائے زبان و ادب میں "پیغمبر" بن کر بھیجا جاتا ہے۔ ان کا ذہن زبان و محاورہ، الفاظ و بندش کے انتخاب کے متعلق ایسا صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا، اور ان کی طبیعت میں ندرت آفرینی و جدت طرازی اس درجے کی تھی کہ ان کا اسلوبِ نگارش سہلِ ممتنع ہو گیا ہے۔ زبان و بیان کی شیرینی و نرمی، لطافت و نزاکت اور تاثیر و دلکشی میں کوئی ادیب ان کا شریک نہیں ہے۔ صرف غالب کے رقعوں میں یہ شان ہے، لیکن وہاں نثر کی صرف ایک صنف مکتوبات ہے اور یہاں

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس سے آزاد اپنے زمانے کے **پہلے صاحبِ طرز** ہیں۔ آزاد کے طرز کو شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں بیان کیجیے تو کہہ سکتے ہیں کہ آزاد تنہا "طرحدار" ادیب ہیں۔ ان کی تحریر کا بانکپن سچ یہ ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ گویا "مزے یہ دل کے لئے ہیں، نہیں زبان کے لیے۔"

اسی جدت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ علامہ آزاد نے طرزِ عبارت کی ایجاد کے علاوہ مضامین و موضوعات کی ترتیب و تالیف میں وہ جدتیں پیدا کی ہیں جو ان سے پہلے موجود نہ تھیں، اور یہ **اوّلیاتِ آزاد** ہیں، مثلاً

(۱) شعرا کے تذکرے آزاد سے پہلے بھی بہت لکھے گئے، لیکن سب نہایت مختصر تھے۔ اکثر میں حروف تہجی کی ترتیب تھی، کسی میں زمانے کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تو مجمل اور سرسری طور پر، کسی میں حالات و کلام کے متعلق تحقیق و تفصیل نہ تھی، مقابلہ و موازنہ نہ تھا، زبان و محاورہ اور طرز کلام کا تجزیہ و ارتقا نہ تھا۔

آزاد کو سب سے پہلے ان تمام اجزا و لوازم تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے **آب حیات** میں یہ سب خامیاں رفع کر دیں۔ اور ایسی کتاب لکھ دی کہ آج بھی کوئی تذکرہ نویس آب حیات کے استفادہ سے بے نیاز نہیں ہے۔ پھر اس میں اگر کچھ غلط بیانیاں اور بیجا طرفداریاں بھی ہوں تو ان سے آزاد کے فضل تقدم اور آب حیات کی اولیت میں فرق نہیں آتا۔

(۲) زبان کی ساخت اور ترقی کے متعلق آزاد کی "**سخندان فارس**" اور "**مقدمہ آب حیات**" سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آزاد کی زباندانی، شوق تحقیق اور قوت بیان نے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصانیف پیدا کر دی ہیں۔

(۳) رمزیہ و تمثیلی مضامین اور ان کے اسالیب نگارش کا اس قدر تنوع اور ایسا کمال آزاد کی "**نیرنگ خیال**" سے پہلے نظر نہیں آتا۔ آزاد نے اس پیرایہ میں مسائل مذہبی و علمی و ادبی کی تحقیق بھی کی ہے اور نقد و تبصرہ بھی۔ طعن و طنز بھی کیا ہے اور اخلاق بھی سکھائے ہیں۔

(۴) اگرچہ مولانا شبلی کی تاریخ و سیرت کی تصانیف "الفاروق" وغیرہ کے سبب سے علامہ آزاد کی "**دربار اکبری**" کو اولیت کا درجہ حاصل نہیں ہے تاہم تاریخ میں ادبی شان پیدا کرنا اور افسانہ و ناول سے زیادہ دلچسپ بنا دینا آزاد ہی کا پہلا کمال ہے۔ خصوصاً اکبر بادشاہ کے حالات جس قدر حسن ترتیب اور سلیقے سے لکھے ہیں یہ بات اصل فارسی تاریخوں میں بھی نہیں ہے۔ اگرچہ آزاد نے اکبر کی بیدینی اور علما کی توہین کو بہت سراہا ہے۔

اس لحاظ سے **آزاد** کا مرتبہ **موجد** کا بھی ہے، **نقاد** کا بھی، **صاحب طرز** کا بھی۔

آزاد سب سے پہلے انشاپرداز ہیں، پھر مورخ، تذکرہ نویس، سیرت نگار۔ ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی انشاپردازی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بقائے دوام کے اعتبار سے آزاد بہ حیثیت انشاپرداز کے زندۂ جاوید ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی میں ان کی ہر کتاب سدا بہار گلزار ہے، مطالعہ و حوالہ کے لئے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے، لیکن تحقیق و تنقید کی نظر میں ان کی ہر کتاب پرانی ہو چکی ہے۔ آب حیات کے نظریے بدل چکے ہیں۔ اور بہتر تبصرے لکھے جا چکے ہیں۔ سخندان فارس کے تجزیے اور تعریفیں اب قول فیصل نہیں رہیں۔ دربار اکبری تاریخ کے طالب علموں اور استادوں کے لئے پہلے بھی کچھ عجوبہ نہ تھی، اب تو بہت با اصول، مفصل و مکمل تاریخیں موجود ہیں۔ نگارستان فارس (تذکرۂ شعرائے فارسی) صرف آزاد کے شغف و عشق فارسی کا ایک چھینٹا ہے۔ لیکن اتنا ہلکا پڑا ہے کہ خود آزاد کی تالیفات میں بھی اس کا کوئی درجہ نہیں۔ قدیم تذکرات، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی آتشکدۂ آذر، سرو آزاد، وغیرہ کے مقابلے میں بھی کچھ نہیں ہے، چہ جائیکہ مولانا شبلی در پروفیسر براؤن کی تالیفات سے مقابلہ ہو سکے۔ نیرنگ خیال آزاد کی دوامی کتابوں سے زندہ در پائندہ ہے، اس لئے کہ یہ نہ تاریخ ہے، نہ تذکرہ، نہ سیرت، نہ فلسفۂ زبان، بلکہ صرف انشا ہی انشا ہے۔ اگرچہ یہ طرزِ رمز و تمثیل مستقل مقالہ نگاری کی صورت میں رائج نہیں ہے لیکن یہ شانِ مجاز اور مصرفِ استعارہ شعر و ادب کا جزوی عنصر ہے۔ اور اب بھی افسانے اور ناول، مزاحیات و طنزیات، بلکہ تنقیدیں اور تبصرے، اور ادبیات و علمیات بھی نیرنگ خیال کے رنگ تحریر کے نمونے ضمنی و جزئی طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔

علامہ آزاد جدید شاعری کے پیشرو ہیں، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ یہ جز ان کی اولیات میں شامل ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا تذکرہ و تبصرہ ہماری کتاب کے "حصۂ نظم" کا حق ہے۔

تصانیف آزاد کے نمونے علامہ آزاد کی مختلف تحریروں کے بہت سے چھوٹے بڑے نمونے

پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ وہ سب آزاد کے اسلوب خاص کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تاہم ان کی تمام ممتاز تصنیفات سے ایک ایک دو دو اقتباسات ایسے درج کئے جاتے ہیں، جن سے آزاد کی انشائے خصوصی کے علاوہ مختلف مضامین و موضوعات میں ان کا طرز بیان اور قوت تحریر بھی نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

(۱) **آب حیات** کا مقدمہ کافی طویل لکھا ہے، جو خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں "بھاشا پر فارسی کا اثر" بھی دکھایا ہے۔ ایک جگہ اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ "ہند کی تشبیہیں جاتی ہیں، فارسی اور عرب کی تشبیہیں اور خیالات اُن کی جگہ قابض ہو گئے۔"

دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں، لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے، اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں: ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اڑنے سے تشبیہ دیتے تھے، فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آتی ہے۔ مگر بھونرے اڑ گئے، اور اس کی جگہ مشک، بنفشہ، سنبل، ریحان آگئے، جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں۔ مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے، اور زلف کو کوے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنپک برنی کہتے تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کی بہار دیتے ہیں، مگر چندر مکھ اور ماہ رخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور ممولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اردو میں آہو چشم رہے مگر ممولے ہوا ہو گئے، اور کنول کی

جگہ سِ غزلبریز اور نرگس شہلا آ گئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی ، بلکہ ترکِ چشم ، شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے ۔

رفتار کے لئے بھاشا میں ہتھنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے ۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اڑ گیا ، فقط کبکِ دری ، شورِ محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے ۔

پھر فارسی ، اُردو ، اور ہندی کی انشا پردازی کا حال بیان کرتے ہیں ۔ ایک طویل مضمون درمیان سے کچھ حذف کرکے آزاد ہی کے الفاظ میں مسلسل کرکے لکھا جاتا ہے :-

فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے ، اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے ، اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے ۔ وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے ، اس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے ، جو خاص اسی شے کے دیکھنے ، سُننے ، سونگھنے ، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے ۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی ، مگر سُننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آ جاتا ہے ۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں ، صاف اسی کی بُرائی یا بھلائی نہیں دکھا دیتے بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا بُرا سمجھا ہوا ہے ، اس کے لوازمات کو شے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے ، جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حُسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا ۔ اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے ۔ خواجہ وزیر ذرّیہ :-

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا ہو کے تو کیا ۔ روح میری گلِ عارض میں رہے بُو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں ، اور آنکھوں کے سامنے ہوں

تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر دور جا پڑیں اور بہت بایک پڑ جائیں تو دقت ہوتی ہے۔

ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عالم تصویر میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیاء بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں، بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں، ان بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں، جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے، تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینہ میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ دل تو کہہ کہ یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے، اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کریں اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے، وہاں ان کے فرضی ہما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بنانا دیکھئے، پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے، جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ وہ جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے، یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے، انہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا

کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشا پرداز ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں، اور دہانِ غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔

آبِ حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ خصوصاً شاعرانہ نوک جھونک، ذاتی رنجشیں اور سیرت و اخلاق کے لطیفے کوشش و تلاش سے درج کیے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں، اور ایسی بھی جو اُن کو اپنے اُستاد یا بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچی ہیں۔

شیخ قلندر بخش جرأت کے حال میں لکھتے ہیں:۔

جرأت، میاں جعفر علی حسرت[۱] کے شاگرد تھے۔ علاوہ فنِ شاعری کے نجوم میں ماہر تھے، اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے، چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی وہاں کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں، چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا:۔

بسکہ گمیں تھے سدا عشق کے ہم بستان کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی، حسنِ طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا:۔

---

[۱] اس پر آزاد خود ہی یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں: حسرت بھی نامی شاعر تھے، مگر اصلی پیشہ عطاری تھا۔ دیوان موجود ہے۔ پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے۔ مرزا رفیع (یعنی سودا) نے انھیں کی شان میں غزل کہی ہے، جس کا مطلع ہے:۔

بھدا نہ کا ہندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر ہے مرغ ساکو کے ہوا اسیر ہوا پر

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم — کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے، ”تا خدا ندہد سلیماں کے دہد۔“

میاں جرأت کے حال میں، بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا، مگر استاد مرحوم (یعنی حضرت ذوق) نے ایک دن فرمایا کہ بھئی زمانہ کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدر دانی سے دیکھا، بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی، اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے، بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضیٰ ہے خود اندھے بنے، رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔

تفصیل اجمال بہ عبرت احوال۔ بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے، دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی، دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخرا پن کی حد سے گزری ہوئی تھی، اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل، سید انشا کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے، سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴۔۵ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے، وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جائیں، آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں، بہت خوش ہوئیں، اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سنیں گے۔ گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ۔ پردے چلمنیں چھٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں، باہر یہ بیٹھے، چند روز کے بعد خاص خاص بی بیوں

کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا نشانہ اگر ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں، اور دہانِ غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔

آبِ حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ خصوصاً شاعرانہ نوک جھونک، ذاتی رنجشیں اور سیرت و اخلاق کے لطیفے کوشش و تلاش سے درج کئے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں، اور ایسی بھی جو اُن کو اپنے اُستاد یا بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچی ہیں۔

شیخ قلندر بخش جرأت کے حال میں لکھتے ہیں :-

جرأت، میاں جعفر علی حسرت[۵] کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر تھے۔ اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے، چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں، چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا :-

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی، حسنِ طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا :-

---

[۵] اس پر آزاد خود ہی یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں :- حسرت بھی نامی شاعر تھے۔ مگر اصلی پیشہ عطاری تھا، دیوان موجود ہے۔ پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے۔ مرزا رفیع (یعنی سودا) نے انھیں کی شان میں غزل کہی ہے، جس کا مطلع ہے :-

بھڑا نہ کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر ہر مرغ سے کھا کے ہوا اسیر ہوا پر

اسے طرح کہ آندھی میں ساری دُکان کا خاکہ اُڑا دیا ہے۔ (حاشیہ آبِ حیات صفحہ ۲۲۶)

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم — کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے
فارسی کی ضرب المثل ہے، "تا خدا ندہد سلیماں کے دہد"۔

میاں جرأت کے حال میں (بلکہ ساری کتاب میں) افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہوگئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا، مگر استاد مرحوم (یعنی حضرت ذوق) نے ایک دن فرمایا کہ نہیٔ زمانہ کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدر دانی سے دیکھا، بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی، اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے، بعض ضرورتوں سے کہ شوخیٔ عمر کا مقتضیٰ ہے خود اندھے بنے، رفتہ رفتہ اندھے ہی ہوگئے۔

تفصیل اجمال بہ عبرت احوال۔ بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے، دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی، دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخراپن کی حد سے گزری ہوئی تھی، اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل، سید انشا کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے، سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴،۴ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے، وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جاتے ہیں، آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ راتیں ان کی نغمے، دن چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں، بہت خوش ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سنیں گے۔ گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھوٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں، باہر یہ بیٹھے، چند روز کے بعد خاص خاص بی بیوں

کا برائے نام پردہ رہا، باقی گھروالے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا، نانا، کوئی ماموں، چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔ چند روز ضعفِ بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں مندد رہ گئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہلِ حُسن کے دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں، نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سوکر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر کہا۔ اس نے کہا بیوی جا ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے مُنہ سے نکل گیا کہ "غضب کی دوانی ہوئی ہے، سامنے تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں۔" بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ "اوئی بیوی، یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے، یہ تو خاصہ سُوجھتا ہے، ابھی میرے ساتھ یہ واردات گذری۔" اُس وقت یہ راز کُھلا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔

مزن فالِ بد کآورد حالِ بد مبادا کسے کو زند فالِ بد

آزاد نے آبِ حیات میں اپنے استاد ذوق کا حال سب سے طویل، ۶۰ صفحوں میں لکھا ہے۔ ان کے ساتھ آزاد کی محبت و عقیدت کا حال پہلے لکھا گیا ہے۔ اسی حُسنِ ارادت کے ساتھ ہر بات کی تفصیل کی ہے۔ ابتدا اس طرح کرتے ہیں :۔

ملک الشعرا خاقانیِ ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پہ رکھا گیا تو آبِ حیات اس پہ شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا، اور اس کے

طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا، وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے، نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔۔۔۔ ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے، مگر کیا کروں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں۔ اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں، اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات ان کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

چنانچہ آزاد نے استاد ذوق کے حالات کا ایک حرف نہیں چھوڑا۔ لیکن بعض باتیں بڑی عجیب لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ بہادر شاہ ظفر اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے کلام کو ذوق کا کہا ہوا بتایا ہے۔ بادشاہ کے کلام کے متعلق آزاد کا یہ دعویٰ مشہور ہے اور اس پر رد و قدح ہو چکی ہے۔ معروف کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:۔

ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے، جس میں ردیف دار (۱۰۱) مطلع ہے، اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام "تسبیح زمرد" رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پرو دی تھی۔

دوسرے، ذوق کے مذہب کو چھپایا ہے اور اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ انھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، علما، اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا۔

حالانکہ آزاد کے والد اور استاد دونوں ہم عمر و ہم مکتب تھے۔ اور (بقول آزاد) "وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور آخر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا" آزاد اکثر سارا سارا دن ذوق کی خدمت میں گزارتے تھے۔ ان کے وضو، نماز، وظیفے سب کا ذکر کیا ہے۔ اس پر بھی آزاد کو اور اہل دلی کو ان کے مذہب کا حال نہ کھلا کہ سُنی تھے یا شیعہ!!

حالات ذوق کا ایک دلچسپ اقتباس یہ ہے:-

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں، اور ان کے تنکے جو گرتے تھے، انھیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے، عالم ہے

حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ کی آیت پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا، بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اکبر کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمھارے سر پہ آ سے۔

استاذ ذوق کے کلام پر لوگ جو اعتراض کرتے تھے۔ ان کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں:۔

ایک دن میں اَوج (عبد اللہ خاں اوج) سے ملا، اور استاد کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، اور کہا

یاں جو برگِ گُلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے دھول دستارِ فلک پہ لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ "سحر ہو جائے" جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں، مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لا کر! میری طرف دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ، آخر شاگرد تھے، ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں استاد مرحوم کی خدمت میں گیا، اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بُجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بُجھ جائے۔ اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے، یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی، نہوئی، نہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا، بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا، قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو، وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل، عامیانہ۔ اب ثقہ، متین اور شریفانہ ہے۔

اس عبارت کا آخری فقرہ علامہ آزاد کی انشا پردازی کا دلچسپ نمونہ ہے۔ بظاہر

استاد کی زبان سے آدرج کے مضمون کو سراہتے ہیں، لیکن دراصل طعن و طنز مقصود ہے، یعنی آدرج کا محاورہ "ڈھول لگنے سے تڑکا ہو جانا" بتذل و عامیانہ ہے۔ اس سے تو ذوق ہی کا محاورہ "سحر ہو جانا"، متین و ثقہ تھا۔ لیکن حقیقت میں آزاد نے استاد کی طرف سے جو جواب دیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جب ہماری زبان میں پہلے سے ایک محاورہ موجود ہے کہ "ایسی ڈھول لگی کہ تڑکا ہو گیا"، تو پھر اس محاورے میں تڑکے کا کوئی عربی و فارسی مترادف استعمال کرنا جائز نہیں۔ اگر "ڈھول لگنے" کا مضمون نہ ہوتا تو جو چاہتے کہتے۔ اب سحر ہو جانے کو ثابت کرنے کے لئے مضمون کو طول اور پیچ دینا بات کی ترجیح اور طول امل ہے۔

ذوق کے حالات میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے، اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا، اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان مذکور ڈیوڑھی میں تھا۔ پانوں کی آہٹ پہچانتے تھے پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی، پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے: اجی ہمارا وہ شعر اس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پائخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لو جی ۴۲ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا، حضرت کیونکر؟ فرمایا، ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔ ع "کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ"۔ ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیئے، اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی، حضرت پھر کیا؟ فرمایا، ع "کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ"۔ کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی، پھر وہ کیونکر؟ ۳، ۴ مصرع الٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے:-

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

(۲) **نیرنگِ خیال**: ان خیالی و تمثیلی مضامین کے لکھنے کی تحریک پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ نے علامہ آزاد کے سامنے پیش کی تھی۔ انگریزی میں سوئفٹ اور جان بنین وغیرہ نے اس قسم کی مستقل کتابیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں۔ قدیم یونانی ادبیات اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی رمزیہ (ایلی گریکل) تصانیف موجود ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد مذہب، اخلاق یا حکومت کی اصلاح ہے۔ عقائد رائجہ یا سیاست حاضرہ پر در پردہ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ علامہ آزاد کا جدت طراز و خیال آفریں دماغ اس موضوع کے لئے نہایت موزوں تھا۔ کرنل ہالرائڈ نے ان تحریروں کے لئے خاکہ سا بتا دیا تھا۔ لیکن وہ اسلوب بیان یا موضوعات کے متعلق کچھ اشارے ہوں گے۔ مضامین اصل میں آزاد ہی کی اختراع بدیع ہیں۔ اور باوجود انگریزی نہ جاننے کے آزاد نے ان مضامین میں ادبیات انگریزی کی جیسی شان پیدا کر دی ہے، وہ تنہا آزاد کا کمال ہے۔

سیاست کا موضوع تو آزاد کے زمانے میں خارج از بحث تھا۔ اس پر تنقید و تبصرہ آزاد سے متوقع نہ تھا۔ مذہب، اخلاق، علم و فن اور شعر و ادب پر آزاد نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے، لطیف نکتے بیان کئے ہیں، اور عجیب عجیب پیرایے اختیار کئے ہیں۔ صرف اتنی کمی نظر آتی ہے کہ آزاد نے رمز و تمثیل کی صرف ایک شکل پسند کی ہے، اور ہر جگہ اسی سے کام لیا ہے۔ یعنی اشیاے بیجان اور قوا و اخلاق انسانی کو مجسم کر کے اپنے فسانوں کے شخاص و کردار پیدا کئے ہیں۔ ہر جگہ ایمان، دل، عقل، نفس، انصاف، ظلم وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو بار بار دیکھ کر جی اکتا جاتا ہے۔ تاہم آزاد نے اپنی ذہانت سے واقعات اور ان کی صورتیں نئی نئی پیدا کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نیرنگِ خیال ان کی فکر و خیال کی نیرنگیوں کا نادر نمونہ ہے۔

نیرنگِ خیال کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں تمہید کے طور پر ایک مضمون لکھا ہے:

"اردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات" اس میں مائتھالوجی (اساطیر یا علم الاصنام) کا ذکر کیا ہے، جس پر مضامینِ نیرنگِ خیال کی بنیاد ہے۔ لکھتے ہیں:۔

فارسی اردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمرِ رواں یا آبِ گذراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسنِ عمر کو کاٹ رہا ہے۔ اور یہ بھی ع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتشِ غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ "ہمچو مارِ سیاہ بخود پیچید"۔ اور کبھی جوشِ غضب کے لئے کہتے ہیں کہ "آتش از چشمش پرید"۔ "دود از نہادش بر آمد"۔ اور "ہمچو سپند از جا بر جست"۔ پس انگریزی میں میتھالوجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے، اور انہی سامانوں سے سجایا ہے جو ان کے لئے لازم اور شایانِ شان ہیں۔ مثلاً

غصہ۔ ایک عورت ہے، کالا رنگ، ڈراونی صورت، تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں۔ سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

عشق ایک موقع پر اسے نوجوان خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے، اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا۔ کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے۔ اس کی پناہ نہیں۔۔۔

افواہ یا شہرت۔ اس کی تصویر ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے، ساتھ ہی ساری

زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے دیبی عالم میں ایک ایک زبان پر آتی ہے۔

انگریزی میں انہیں گاڈز کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لئے مختلف گاڈز تیار کئے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا۔ اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لئے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کونسا صانع ہوگا جو ایسی دستکاری کر سکے۔ پھر دو سے کم تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے، تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لئے ایک ایک **ربّ النوع** فرض کیا جائے جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو، اور سب کا مالک **ربّ الارباب** جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک **فرشتہ موکل** مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے، ورنہ وہی دیبی یا دیوتا، وہی گاڈز، وہی ربّ النوع، وہی فرشتہ موکل۔

غالباً یہی باتیں ہوں گی جو انگریزی علم اساطیر کے متعلق کرنل ہالرائیڈ نے علامہ آزاد کے لئے بصورت خاکہ تیار کی ہوں۔

ایک مضمون "سچ اور جھوٹ کا رزمنامہ" ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی

نصیحتیں کی ہیں، تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑدیں۔ واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی۔ جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر دیا۔ تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اور اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلۂ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے۔ تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا، اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ہوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا، چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا، اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔

اس قسم کے مضامین میں واقعات و کیفیات کی رنگینی اور رنگا رنگی تو بہت ہے، اور خوب ہے۔ بے شمار واقعات بیان کئے ہیں اور تقریباً تمام فضائل و رذائل کو متشکل کر کے عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ لیکن پیرایۂ تمثیل یہی ہے جو اوپر دکھایا گیا۔

لیکن بعض مضامین میں زیادہ جدت و ندرت سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مضمون لکھا ہے: انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ

اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو ذرا بھی بالا تر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا، اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے۔ لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ (پھر اس انبار مصائب کی تفصیل لکھتے ہوئے کہتے ہیں)

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے جُبّہ میں ایک بھاری سی گٹھری سے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

اس کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دودو آدھی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ دبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح دردسے

آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جد و جہد سے سر ہلایا، مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔

دیکھیے آزاد نے عاشقوں کی کیا خوب لاج رکھی ہے۔ آگے لکھتے ہیں (درمیان سے عبارتیں حذف کر دی گئی ہیں):۔

بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی ..... اتنے میں ایک عیّاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا چلا آتا ہے۔ اس نے ایک گٹھری پھینک دی، مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک پچھتے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھی کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے۔ مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے .....

ہم اس انبوہِ پُرآفت پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم ہوا کہ اب سب کو اختیار ہے، جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف کو تبدیل کر لیں اور اپنے اپنے بوجھ لیکر گھروں کو چلے جائیں ..... چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بلب تھا، اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے

آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا
حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس
سے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لیجئے کہ میرا پہلا عذاب
اس سے ہزار درجہ بہتر ہے، مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔۔۔۔

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو
چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہوگیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی
جاتی تھی۔۔۔۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا
داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے
نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ
میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے موجب ہوتی
ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہوگیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے
سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے
اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے
دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر
رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انھیں مل
جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اتار کر پھینک دیا۔

ایک اور مضمون میں بھی پُر لطف جدت پیدا کی ہے۔ یعنی "**شہرت عام اور بقائے
دوام کا دربار**" قائم کیا ہے۔ جس میں تاریخ عالم کے اکثر مشاہیر کو لا کر بٹھایا ہے۔ چنانچہ
کالی داس، محمود، فردوسی، نظامی، چنگیز خاں، امیر تیمور، بوعلی سینا، اکبر، جہانگیر، شیواجی، مرزا
سودا، ناسخ، آتش، ذوق، غالب کو قرینے سے دربار میں کرسیاں دی ہیں۔ شروع میں لکھتے
ہیں:-

بقاے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں، اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے، یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے۔ لیکن میں اس دربار میں اُنھیں لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہاے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہاے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔

دربار کے حال سے مختلف حصے اقتباس کرکے لکھے جاتے ہیں:۔

جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی اور بقاے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نو دانے تاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ **راجہ بھوج** تھے اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ یعنی کتاب **سنگھاسن بتیسی** جو اُن کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ **کالی داس شاعر** تھا، جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

۔۔۔۔ دفعۃً **سکندر** نے آواز دی "انھیں لاؤ"۔ جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا۔ کہ مقیشی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصاے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا، اسکندر خود اٹھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا۔ اپنے برابر کرسی پر بٹھایا، اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ **نظامی گنجوی** ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا۔ اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔

..... اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسی کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جُز و کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اس لئے پرستش بھی ہوتی تھی۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ **جہانگیر** تھا اور یہ **بیگم نور جہاں** تھی۔

..... تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مُرقّع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کرکے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ **ہندوستانی شاعر** تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ **مرزا رفیع سودا** تھے۔

مرزا سودا دہلوی کی ہجو گوئی کو پھولوں کے کانٹوں سے تشبیہ دے کر کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

---

(۳) **سخندانِ فارس** کے دو حصے یکجا ہیں۔ پہلے میں فارسی زبان کی اصلیت اور ساخت کو بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایک درجن سے زیادہ لکچر ہیں، جو کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ پہلا لکچر ۹ر فروری ۱۸۷۲ء کو دیا گیا ہے۔ اور کئی سال میں یہ سلسلہ پورا ہوا ہے۔ اس حصے میں ایران کی قدیم زبان، اسلام کے بعد کی زبان،

اس کے تغیرات، ایران کی معاشرت و تمدن اور ان کا زبان پر اثر۔ انقلابات ملکی اور ان کا علم و ادب پر اثر، مصنفوں اور شاعروں اور ان کی تصانیف کا حال۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی کیفیت وغیرہ مختلف مضامین پر مفید و دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس موضوع کی کوئی تصنیف اردو کیا، فارسی میں بھی نہ تھی۔ علامہ آزاد کی رنگینیٔ تحریر اس میں بھی قائم ہے۔ بعض اقتباسات یہ ہیں:-

حصۂ اول میں الفاظ کی ولادت و نسل اور نوعیت و ساخت بیان کرتے ہیں:-

میرے دوستو، تم حیران ہو گے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جزو جزو کو الگ کرتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں؟ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے، ان کے نتائج کو بھی بہم پہنچاتا ہے، اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے، یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں، اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں۔ پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں۔ اور یہ غیر منقطع کام ہے۔ کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے، کبھی تنزل میں۔ مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے، اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لئے لکھتا ہوں:-

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ **بان** پر جو معلوم ہوا۔ اس نے **گرے** کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی **گلو** پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جز والے کا گلے پر قبضہ ہے، اس لئے اس کا نام **گریبان** رکھا ہو گا کہ ایک لفظ ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں **گریو** انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور **بان** سنسکرت میں **وان** ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مر گیا وہاں جیتا ہے۔

کلاتوں کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ **کلا** بہ کلاوہ (سوت کا لچھا) ۔ **آلتوں** ترکی میں **سونے** کو کہتے ہیں۔ وہی سنہرا لچھا۔ (سخندان فارس حصہ اول صفحہ ۱۵-۱۶)

ایران میں ساتویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک پانچ چھ سو برس جو زبان و ادب کا رنگ رہا اس پہ ریویو کرتے ہیں :-

سنہ ۶۲۹ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازان خاں شاہزادۂ چنگیزی کے لئے **تاریخ وصاف** لکھنی شروع کی۔ حقیقت میں بڑا زور مارا ہے، اور فارسی عربی زباندانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی، فارسی، ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں سَو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے، نثر میں بہت کم تھے۔ انھوں نے اس قدر رنگینیاں کیں کہ مطلب گم ہو گیا۔ عبارت کو مقفیٰ کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں، کہیں کہیں سطریں، آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خاں کی حکومت کنارۂ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاک عرب کا اثر ضرور ظاہر ہونا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے، ترک بچوں میں بیٹھ کر لکھتے تھے، اور ترک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے، اور چونکہ فاضل تھے، صاحب زبان تھے، آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے.....

میرے دوستو، یہ انشا پرداز منہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے، اور حق پوچھو تو یہ بھی بڑا کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملہ کو، مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے، یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے، یا بازاری دکانداروں

کی تعریف کو اس قدر لمبانا اور چوڑانا بغیر دو دمہ کے اُبال اُٹھانا ہے۔ اور یہ انہی کا کام تھا مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصوّر نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جُز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا، اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پُرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا، مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے؟ اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اُترے۔

(۴) **دربارِ اکبری** میں اکبر بادشاہ کے ذاتی، درباری، آئینی حالات اور سلطنت کے خاص خاص ارکان، وُزرار، علمار، اُمرار کے سوانح بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف تاریخوں سے جمع کئے ہیں، جن میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" کا عنصر غالب ہے۔ صفحے کے صفحے اسی تاریخ سے ترجمہ کردئے ہیں۔ بعض مقامات کے مختصر نمونے یہ ہیں:۔

محبت کے ناز و نیاز ۔ اکبر بادشاہ توم کا ترک، مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے، مگر میں ان میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں۔ ذرا آپس کے برتاو دیکھو، اور ان سے دلوں کے حال کا پتا لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں (یعنی تیسری یلغار گجرات پر) راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا۔ اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ وہیں رہ گئی۔ دردخواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اُتروایا اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوا دی۔ وہ سلام کرکے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اُسے دیدیا۔ جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اس نے پوچھا بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سُنایا۔

رودبسی کی جو دیوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے، اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے۔ اس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی کھٹک ہے۔ فرمایا کہ خیر ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمہیں دی ہے کہ فتح کا تعویذ اور اقبال کا گنڈا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ رودبسی کے دل نے نہ مانا۔ اور تو کچھ نہ ہو سکا، اسلحۂ جنگ اتار کر پھینک دیے۔ اور کہا خیر میں میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا خیر ہمارے جاں نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہو سکتا کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائیں گے۔ راجہ بھگوانداس اسی وقت گھوڑا اڑا کر جے مل کے پاس گئے۔ اسے سمجھایا۔ بہت لعنت ملامت کی اور سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا۔ یہ بڈھے خاندان کا ستون تھا۔ اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہو کر پھر ہتیار سجے۔ راجہ بھگوانداس نے آکر عرض کی کہ حضور، رودبسی نے بھنگ پی تھی، اس کی لہروں نے ترنگ دکھائی تھی اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سن کر ہنسنے لگا اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اڑ گیا۔

تمام دربار اکبری آزاد کی انشا پردازی کا عجیب دلکش نمونہ ہے۔ بعض حصے اور بعض اقتباسات خاص طور پر موثر ہیں۔ ان میں سے ایک خان زماں علی خاں شیبانی کا حال ہے۔ اس میں سے کچھ اقتباس کیا جاتا ہے:۔

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جا کر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو بے خبرو، کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہنچے، اور دریا بھی اتر لئے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے، مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو پونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا، کچھ پروا نہ کی..... غرض

نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سُن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

۱۹ سنہ ۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن، عید قرباں کی پہلی تاریخ تھی۔ منکروال (سنگروال) علاقہ الہ آباد پر مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونو بھائی شیر ببر کی طرح آگے اور اپنے اپنے پرے جا کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زماں قائم ہوا۔ ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے پرے باندھے..... بادشاہ "بال سندر" ہاتھی پر سوار تھے، اور مرزا عزیز کوکہ خواصی میں بیٹھے تھے۔ ان کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ میدان کا رنگ بدلا۔ منظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور بہادروں کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں (خان زماں اور بہادر خاں) نے بھی تاڑا کہ ضرور بادشاہ اس لشکر میں ہے..... اب انھوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہوگئے۔ مگر تُرک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا، اور وہ پیادہ ہوگیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس حال کی خبر نہ ہوئی تھی سب کو بے حواس دیکھ کر خود آگے بڑھا اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف کو علی قلی خاں کی فوج پر پیل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونو لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے۔ علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونو بھائیوں پہ کیا گزری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوئی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

بات یہ ہوئی کہ ادھر سے "ہیرانند" ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جھکا۔ اُدھر سے مقابلہ میں "رودیانہ" ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلہ کی ٹکر ماری کہ رودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔

دلاور بڑی بے پروائی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا۔ اور ایسا بیڈھب لگا کہ ہرگز نہ سنبھل سکا، گرا اور سوار کو بھی لیکر گرا۔ ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا سامنے کیا۔ اتنے عرصے میں کہ وہ سوار ہو۔ ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہوا، بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خان زماں نے آواز دی، فوجدار ہاتھی کو روکنا، میں سپہ سالار ہوں، زندہ حضور میں لے جا، بہت انعام پائے گا۔ اس کمبخت نے نہ سنا، ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خان زماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اُڑتے تھے، اسے ہاتھی روند کر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا، اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ اللہ! جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے، جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے، وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا، جوانی سرہانے کھڑی سر پیٹتی تھی، وہ دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں خان زماں! یہ یہاں کا معمولی قانون ہے، تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹایا، آؤ بھائی، اب تمھاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمھیں سونا ہوگا۔

سرلشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہو گیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر ادھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر، بہادر خاں کو پائے آگے گھوڑے پر سوار کرکے لایا، اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا "بہادر کیونی؟" کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا۔ اس نے کہا "الحمد للہ علی کل حال"۔ بادشاہ کا دل بھر آیا، بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا "بہادر! با تشا چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر بروے ما کشیدید"۔ وہ شرمندہ و شرمسار سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا "الحمد للہ علی کل حال کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ کہ ماحی گناہان است نصیب شد"۔ آفریں ہے اکبر کے حوصلے کو!

گنہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچی کرلیں، اور کہا، "بمحافظت نگہدارید۔" اس نے پانی مانگا، اپنی چھاگل میں سے پانی دیا۔۔۔۔کوئی کہتا ہے بے اطلاع، کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کمبونے بے نظیر بہادر کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، مگر ملا صاحب کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام گرفتار ہو کر آتے تھے، اور مارے جاتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال خان زماں کا تھا، جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے۔۔۔۔ حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے، انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی، ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کمبخت ہندوستانیو! تمہارے سر کٹ کر بھی سستے ہی رہے! لشکر کے لوگ بے سر دیا اٹھ دوڑے۔ گودیں بھر بھر کر سر لاتے تھے، اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ ہر سر کو دیکھتے تھے، دکھاتے تھے، اور پہچانتے تھے۔ افسوس انہی سروں میں خان زماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ! جس سر سے فتح کا نشان جدا نہ ہوتا تھا، جس سے اقبال کا خود نہ اترتا تھا۔ جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی، اس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں، نحوست نے خاک ڈالی تھی، کون پہچانے، سب کو تردد تھا۔ ارزانی مل اس کا حامی اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اس نے سر کو اٹھا لیا، اپنے سر پر دے مارا، اور ڈاڑھیں مار کر رونے لگا۔ خواجہ دولت کہ پہلے اس کے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا، وہاں سے آ کر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں ہو گیا تھا، اس نے دیکھا، اور کہا، مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں طرف سے کھایا کرتا تھا، اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہو گئے تھے۔ دیکھا تو ایسا ہی تھا۔۔۔۔

جب اکبر کو یقین ہو گیا کہ خان زماں کا بھی کام تمام ہوا، تو گھوڑے سے اتر کر

خاک پر پیشانی کو رکھ دیا اور سجدۂ شکر بجا لایا۔۔۔ خانِ زماں! بل بے تری ہیبت، اور واہ رے تیرا دبدبہ! مرؔ ہو تو ایسا ہو! آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب و خوار ہوتی، مگر آقا کی جان نثاری میں ہوتی تو آب زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں کا منھ کالا کرے، جنھوں نے دو نو بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو رو سیاہی کر دیا۔ آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بد اعمالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے پھر بھی شکر ہے کہ رو سیاہی سے محفوظ رکھے۔ یہ نا اہل خود کچھ نہیں کر سکتے، اور دل کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں، اور مورچے باندھتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا۔ اپنے تئیں خدا کے اور انھیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کے اعمال ہی ان کو سمجھ سمجھا لیتے ہیں ؎

تو بد کنندۂ خود را بروزگار گزار　　　　که روزگار ترا چاکریست کینہ گزار

(۵) **مکتوبات آزاد**۔ علامہ آزاد کی اور چھوٹی تصانیف، "قصص ہند"، "نصیحت کا کرن پھول" وغیرہ میں ان کا وہی اسلوب نگارش موجود ہے، بعض کتابیں مثلاً تذکرۂ علما اس قدر سادہ اور طرزِ آزاد سے علیحدہ ہے کہ ان کی تصنیف ہی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک ایک دو دو صفحے کے نہایت مختصر و ناکافی حالات ہیں، جیسے کسی بڑی کتاب کی تیاری کے لئے نوٹس اور اشارے لکھے گئے ہوں۔ اس لئے باقی تصانیف کے نمونے ترک کئے جاتے ہیں۔ مکتوبات آزاد البتہ دلچسپ چیز ہے۔

علامہ آزاد کے یہ سب خطوط صرف ایک شخص میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی (برادر عزیز نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی) کے نام ہیں، جو انڈین میڈیکل سروس میں فوجی ڈاکٹر تھے، اور ایک زمانے میں بسلسلۂ ملازمت امرتسر میں رہے تھے۔ یہ مکتوبات اول سنہ ۱۹۰۶ء میں رسالہ مخزن لاہور میں بالاقساط اور پھر سنہ ۱۹۰۷ء میں بصورت کتاب شائع ہوئے تھے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ

کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح پایا، اسی کے دامن اقبال سے وابستہ کیا، وغیرہ وغیرہ۔ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ، وغیرہ وغیرہ۔
میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے، اور اس میں کچھ ہرج نہیں۔

۲۶ ستمبر ۱۸۸۲ء
محمد حسین عفی عنہ آزاد
لاہور مستی دروازہ

جس زمانے کے یہ خطوط ہیں، اسی زمانہ (۱۸۸۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، اور نظام تعلیمات میں رد و بدل ہو رہا تھا۔ علامہ آزاد کو اپنے کالج کے ٹوٹنے اور نوکری جاتے رہنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے متعلق چند خطوں میں میجر سید حسن صاحب کو لکھتے ہیں۔ بعض نثر سے مختلف خطوط سے نقل کیے جاتے ہیں۔

جناب من، تسلیم۔ آپ دیکھتے ہیں، یہ علم کی چڑیل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی۔ چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لیے ہم پکڑے جاتے ہیں.....

کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی، خواہ سررشتہ تعلیم میں، خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے، اس میں ۵۰ روپے آئیں گے، تو صورت حال کیا ہو گی، لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رزاقیت میں لو، تھوڑا کھاؤ، اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔ عہدہ کے لیے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ (مرقومہ ۳، فروری ۱۸۸۳ء)

میرے بارے میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، دل کو نہایت تشفی اور استقلال

حاصل ہوا ہے۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں گے تو اور کون ہے۔ پروردگار عالم اس خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرمائے۔ میں نے اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے اگر اسسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کر لوں گا، ورنہ پنشن لوں گا۔ تھوڑے پر قناعت کروں گا۔ اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کر کے پیشکش کرتا رہوں گا، اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔ ہاں جو خدمت فرمائیں گے، وہ بھی بجا لاؤں گا۔ کالج کا تغیر نہیں بھی ہوتا، تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں تو اب آپ صاحبوں کا ہو چکا ہوں۔

تم سنو یا نہ سنو۔ نالہ کئے جاؤں گا   درد دل کہنے سے مطلب ہے۔ اثر ہو کہ نہو
حشر پہ وعدۂ دیدار ہے، میں ڈرتا ہوں   بھیڑ ہووے گی، رخ یار ادھر ہو کہ نہو

(مرقومہ ۱۰ فروری ۱۸۸۳ء)

۔۔۔۔ نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے ہیں۔ یہ ہے کیا محبہ! آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت! اس غلام زاد کو آزاد کر کے دو دست بردار نہیں ہوگی، انشاء اللہ آپ دیکھیں گے اس سے بہتر صورت ہوگی، اور جہ جا بہتر ہوگی ۔۔۔۔ خوشا بحال آزاد کہ ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجا لائے گا، اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما در کار داریم، اکثرے درکار نیست

آہا۔ پھر انشاء اللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگی طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں

(مرقومہ ۲۰ اپریل ۱۸۸۳ء)

میرا حال یہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے گی۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے

ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت! یا نصیب!

(مرقومہ ۲۰ جولائی ۱۸۸۴ء)

سرسالار جنگ جی کے نام سے آزاد اپنی "دربار اکبری" کا انتساب کرنا چاہتے تھے، ان کا فروری ۱۸۸۳ء میں یکا یک انتقال ہوگیا۔ اور آزاد کی وہ تجویز پوری نہ ہوسکی۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

۔۔۔۔ مگر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈیڈیکیشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں یا اُسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثۂ جانکاہ پر عالم نے نالہ وزاری کے معمولی حق ادا کئے اور یادگار کے لئے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہوسکا۔ یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے ان کے سامنے پڑھتا اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے ہیں۔ ہائے سرسالار جنگ! سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔ ہائے سرسالار جنگ! مولیٰ اسد اللہ الغالب حاضر ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ آپ سے کیا اپنا حال کہوں۔ میرا دل کچھ اور دل ہے۔

(مرقومہ ۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء)

آپ نعیں پھر لکھ دیجئے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم مغفور کی ہو چکیں۔ خدا گواہ ہے۔ مجھے ان سے غائبانہ عشق تھا۔ پہلے کہتا تو خوشامد تھی۔ اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان میں معاملہ ہے۔ دیکھئے آج لوح روحانی پر ان کا خیال کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابل یقین ہرگز نہیں۔ لیکن اسے میں نے ایک بہلاوا اپنے دل کا کر رکھا ہے۔ رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیں

کرتا ہوں - اور یہ یقین آپ کریں کہ یہ ابنائے زماں اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں، ان سے تو اس کی باتیں بہر حال بہتر ہیں -

بسکہ از برخورد عالم عکس مطلب دیدہ ام
میپرم از آب داز آئینہ پنہاں می شوم

(مرقومہ ۱۰ مئی ۱۸۸۳ء)

علامہ آزاد کو عمر بھر پنجاب میں رہنے اور پنجابیوں سے گفتگو کرتے رہنے کے سبب سے پنجابی بول چال کی عادت ہو گئی تھی، کبھی کبھی اپنی تحریر میں بھی لکھ دیتے تھے - انھیں خطوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں: - "کیں میں نے پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے" "دہلی میں کہیں گے" "کر لیا ہے" "دربار اکبری میں بھی یہ بات نظر آتی ہے - آب حیات میں نہیں ہے -

(۶) **فلسفۂ الٰہیات** - یعنی علامہ آزاد کے "وہ حکیمانہ جذبات جو عربی، فارسی، سنسکرت سے اخذ کیے اور حالت بیخودی میں الہامی اردو کے انداز میں تحریر فرمائے"

شاید ساری دنیا کے مجنونوں میں تنہا آزاد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے عالم جنون میں بھی کتابیں تصنیف کی ہیں - ان کے اس دماغی اثر کا ذکر ان کے حالات میں آ چکا ہے - فلسفۂ الٰہیات میں علامہ آزاد کے پوتے آغا محمد طاہر صاحب نے آزاد کے ان حالات کے متعلق ایک دیباچہ شامل کیا ہے - اس کا اقتباس یہ ہے: -

جب مشاغل سے فارغ ہوتے تو جس طرح زبانوں کے کھوج نکالتے ہیں اس روحانی فلسفہ کے سراغ کے درپے ہوتے، اور مختلف ممالک کے فلسفوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست کرتے، چنانچہ اس بات کا کچھ ثبوت ناظرین کو اسی کتاب میں ملے گا - مگر یہ باتیں اکثر اکیلے میں ہوتیں اور خاص اپنی ذات کے لیے مخصوص تھیں، اوروں سے اس کا کچھ واسطہ نہیں -

ایک دفعہ ایک تختی لا کے جو شاید اب بھی ملتی ہو - وہ روحوں کو بلاتی تھی - روحیں

سوالات کا جواب پنسل سے لکھدیتی تھیں، مگر یہ بہت ابتدائی باتیں ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا، اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے کہ فلاں کی یا فلاں جگہ کی روح آئی ہے۔ پہلے خود سوال کرتے، پھر تھوڑی دیر خاموش رہتے۔ بعد ازاں تعجب کے لہجہ میں اس بات کا جواب دینے اور کہتے، "اچھا، تو یوں ہے!" معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر شخص بہت ہی آہستگی کے ساتھ ان سے کچھ کہہ رہا ہے، یا دل و دماغ میں ان باتوں کا جواب اُتر رہا ہے، جس کو یہ اپنے دل و دماغ کا نتیجہ نہیں سمجھتے، بلکہ کسی اور قوت کا اثر سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے۔ احباب و آشنا سے ملتے تھے۔ سارے کام حسب معمول کرتے تھے۔ بایں ہمہ طبیعت میں ایک لٹک سی پیدا ہو چلی تھی، اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی حال میں ۱۸۸۵ء کے آخر میں ایران کا سفر کیا۔ جہاں سے واپس آکر سخندان فارس مکمل کیا۔ سفر نامہ اور لغت کا مسودہ بنا کر لائے۔ یہ سب چیزیں تو دنیا داروں اور اہل ملک کے لئے تھیں۔ اپنے لئے جو کچھ لائے وہ دماغ میں محفوظ تھا۔ پھر کالج میں آکر لکچر دینے لگے۔۔۔۔ ظاہر میں یہ سب کچھ تھا، لیکن باطن میں دوسرا رنگ غالب آتا جاتا تھا۔ دیکھ دان مولانا کی ایک چہیتی اور لاڈوں کی پالی فاضلہ بیٹی کا انتقال ہوگیا، جو بقول مولانا ان کے علمی مشاغل میں ان کی مُشیر اور دست راست تھی۔ اس واقعہ نے قلب پر بہت اثر کیا، اور اس دنیا سے بالکل ہی اُچاٹ ہو گیا۔۔۔۔

آخر کار وہ دن آگیا جبکہ ساغرِ دل مختلف قسم کی شرابوں سے سرتاپا معمور ہو گیا۔ ع "پیمانہ بھر چکا تھا، چھلکنے کی دیر تھی"۔ سو اس کے لئے ایک بہانہ مل گیا۔ قدرت نے وہ سامان بھی پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے، جو کبھی سالک تھے اور کبھی مجذوب۔۔۔۔

مولانا کو بھی تقدیر ادھر لے گئی۔ بعد چندے راز و نیاز کی مجلسیں گرم ہونے لگیں۔ تخلیہ کی ان صحبتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا بہت جلد ظہور میں آگیا کہ مولانا باایں ہمہ علم و فضل دیوانگی و وارفتگی کے ہمدوش ہو کر محبت کے کوچہ و بازار میں رسوائی کا تمغہ لگائے پریشانی کا ٹیکا باندھے، جذب کامل کا علم ہاتھ میں لئے، بآواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے پھریں :۔

اگر رُکا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نوین کوٹ (سیدصاحب کی جائے قیام) چلے گئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب، سید دھیان شاہ چشتی) نے نظر اٹھا کر دیکھی، مسکرائے، اور فرمایا "جا محمد حسین جا تیرے لئے دلی کا حکم آیا ہے، دلی چلا جا" خدا جانے اس اک نگہ ناز میں کیا جادو تھا، اور اس ایک فقرہ میں کیا تاثیر تھی، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنا لیا۔

..... الغرض "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی بات ہو گئی۔ حضرت آزاد اسی وقت پیدل دلی کی طرف روانہ ہو گئے ..... دلی پہنچے مگر عجیب شان سے پہنچے، سر سے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد۔ حال حیران پریشان۔ ایک آن فانا میں تمام دلی میں شور مچ گیا۔ رشتہ دار منت سماجت کرتے کہ برائے خدا گھر چلئے، مگر یہاں کون سنتا تھا، کبھی قدم شریف، کبھی استاد ذوق کی قبر، کبھی شہر، کبھی جنگل، جہاں مستوں کا من کہتا، وہیں جاتے اور دن گذارتے .....

آخر دلی سے خبر آئی تو والد ماجد مرحوم دہلی گئے۔ ڈھونڈا، بہت کچھ سمجھایا مگر ایک نہ مانی ... اس عرصہ میں وہ جذبہ سکون کی طرف مائل ہو چلا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب مرحوم منا پرچا کر اپنے دولت خانہ پر لے آئے۔ تقریباً ایک سال تک مہمان رکھا، اور وہ وہ ناز برداریاں کیں کہ اس زمانہ کی

دوستی اور محبت ان پر قربان ہے۔ خود اور سارا گھر گویا ان کے حکم کے پابند تھے۔
اس عرصہ میں طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا تھا، اور سید دھیان شاہ والی کیفیت ہوگئی تھی، کبھی سالک تھے، کبھی مجذوب۔ چنانچہ والد صاحب دہلی گئے اور اپنے ساتھ لے آئے۔ اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا۔ درمیان میں پلنگ۔ ایک گوشہ میں چھوٹا سا بوریا، اس پر فرش۔ کاغذ قلم دوات سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ صبح و شام وہی پیتے۔ چار پانچ میل سیر کو جنگل یا باغوں میں جاتے، جہاں ہر پتہ ان کا مخاطب تھا، ہر درخت ان سے بات کرتا تھا۔ نسیم کا ہر جھونکا ان کے لئے نئی خبریں لاتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو خدا جانے کس کا پتہ دیتی تھی۔ غرض کہ صبح و شام کی تفریح ان کی زندگی تھی۔ راہ میں کوئی ملتا اور سلام کرتا تو جواب دیتے اور کھڑے ہو کر اس کے لئے دعا کرتے اور روانہ ہو جاتے۔
دونوں وقت گھر پر کھانا کھاتے۔ آم اور خربوزے سے بہت رغبت تھی ...... یہ تمام کیفیات گویا مولانا کی ذہنیت کے ابتدائی مراحل سے لیکر انتہائی معراج تک کی ایک مجمل مگر سبق آموز تاریخ ہے۔

سید جالب دہلوی نے بھی "مکتوبات آزاد" کے دیباچہ میں **حضرت آزاد** کے قلبی و دماغی میلان و رجحان کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جن کا آخری نتیجہ مستقل بیخودی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جالب صاحب لکھتے ہیں:۔

مولانائے موصوف نے سن رشد و تمیز کو پہنچتے ہی عملی فوائد پر خیالی دلچسپیوں کو ترجیح دینی شروع کر دی تھی، اور اوائل شباب ہی میں اپنی طبیعت کا یہ نرالا رنگ معاصرین و احباب پر ظاہر فرما دیا تھا، اور بیس بائیس سال کی عمر میں قدامت پرستی کو کھلم کھلا اپنا شعار خاص قرار دے لیا تھا۔ نیز صوفیائے کرام کے معتقدات میں جن دو عالموں جسمانی و روحانی یا سفلی و علوی کا الگ الگ آباد ہونا مذکور رہے،

ان کی دیکھ بھال اپنے لئے ضروری ٹھہرائی تھی، اور اپنے اوقات گرامی کا ایک حصہ روحانیات پر غور کرنے اور دونوں عالموں کے ظاہری و باطنی تعلقات کا پتہ لگانے کے لئے مختص کر رکھا تھا، اور ویدانت اور تصوف میں جو ریاضتیں تزکیۂ نفس و تصفیہ باطن کے لئے مقرر ہیں، وہ سنتوں اور درویشوں کی صحبتوں میں رہ کر سیکھی تھیں۔ متعدد اشغال و اذکار کو اپنا لازمۂ زندگی بنایا تھا۔ اور ذکر خفی و جلی اور وردِ ناد علی میں وہ مشق بہم پہنچائی تھی کہ آپ کے سانس کی حرکات بعض اوقات پاس بیٹھنے والوں کو چونکا دیتی تھیں ---- ایک طرف تو یہ خیالات تھے جنھوں نے سالہا سال کی پختگی سے عقائد کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اور دوسری جانب وجہ معاش میں بھی آپ کو تعلیم و تحقیق السنہ ہی سے واسطہ پڑا تھا۔ اور اس کام میں تو تین زبانیں فارسی، اردو، اور ہندی آپ کا سرمایۂ امتیاز تھیں، ان کے لٹریچر کا دارومدار صرف شاعری پر آکر ٹھہرا تھا۔ اس لئے آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی۔ اور شعرائے ہند و فارس کے نتائجِ افکار ہر وقت آپ کے انیس خلوت ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی محل تعجب نہیں کہ جب ارباب زمانہ کی ناقدری و بیوفائی اور دنیائے دنی کے مصائب و آلام کا ساکنان عالم خیال کی دلجوئی و مدارات سے مقابلہ پیش آیا، تو آخر الذکر طمانیت و یکسوئی کا گلزار سراپا بہار دکھا کر، اور سالہا سال بے غل و غش اس میں سیر کرنے کی امید دلا کر حضرت آزاد کی طبیعت کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے، اور مولانا سے موصوف جملہ تعلقاتِ دنیاوی سے منہ موڑ کر اور عقل و خرد کے ساتھ ملکی لٹریچر کو روتا چھوڑ کر یہ شعر پڑھتے ہوئے دیارِ تصور کے گلشن بے خزاں میں پہنچے۔

ز ہشیاران عالم ہر کرا دیدم غمے دارد
دلا، دیوانہ شو، دیوانگی ہم عالمے دارد

خمخانۂ جاوید (تذکرۂ شعراء) میں علامہ آزاد کی اس کیفیت کے ذکر میں لکھا ہے :-
راے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب فرماتے ہیں کہ جنون کے شروع میں ایک دن آزاد مجھ سے ملنے آئے، اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے باتیں کرتے رہے، مگر ان الفاظ کے بجز، اور کچھ زبان پر نہیں لائے کہ راے صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجیے، اور اس کے معنی آپ جو چاہیں، سمجھ لیں۔

پردہ در کعبہ سے اٹھا دینا ہے آساں ۔۔۔ پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی ہے کہ علامہ آزاد کی یہ حالت جذب و بیخودی صرف مصائب و آلام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ مادہ ان کے آب و گل میں خمیر تھا۔ اور بقول سید جالب کے: "آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی۔" یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت تھی کہ جب آخرکار ان کی یہ حالت ہونے والی تھی تو پہلے ہی سے ان کے دل و دماغ میں الٰہیات و تصوف کا شوق پیدا کر دیا تھا کہ اس عالم میں بھی بے کیف و بے فیض نہ رہیں۔ قاعدہ ہے کہ اس حالت سے پہلے جیسے خیالات دل و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں، وہی اس عالم میں جم جاتے ہیں اور زبان سے نکلتے ہیں۔ آزاد کو ہندوؤں کے فلسفہ و الٰہیات سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ ان کی اس عالم کی تصنیف **سیاک و نماک** میں بھی اس کا اثر ہے، اور یہ **فلسفۂ الٰہیات** تو اول سے آخر تک اسی رنگ میں ہے۔

فلسفۂ الٰہیات کو غور سے پڑھ کر دیکھا جائے تو آزاد کی بے ربطی اجزاے حواس میں بھی ایک قسم کی شیرازہ بندی نظر آتی ہے۔ زبان و انداز بیان سے قطع نظر کرکے دیکھیں تو مضمون موضوع کی صحیح ترتیب ہوش و حواس کا پتہ دیتی ہے۔ ابتدا میں تمہید ہے۔ اس کے بعد سات باب ہیں، جن کا نام طاپ رکھا ہے۔ ہر "طاپ" کا ایک عنوان ہے۔ کہیں عنوان کے نیچے موضوعِ باب کی تفصیل بھی لکھ دی ہے۔ پہلا طاپ اس طرح شروع کرتے ہیں :-

پہلا طاپ (اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنھیں ہم دیکھتے ہیں، اور دو ہیں۔

اور سوچتے ہیں اور پاتے ہیں کہ ہیں)

پہلے ان میں مادّہ ہے۔ وہ ہے، اور وہ معدوم نہیں ہوتا۔ اسے کیسا ہی رگڑ دو یا کاٹ کر چاہو کہ وہ ایسا ہو کہ سمجھو اب نہیں رہا، یہ نہ ہوگا۔ وہ ایسا ذرّہ ذرّہ ہو کر عالم اور آفاق میں پھیلا ہوا اُڑ رہا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا، اور وہ ہے! وہ کیا ہے؟ وہ ہیولی۔ اس کے ذرّے ایسے ننھے ننھے نہیں ہیں کہ کسی قوتِ حسی سے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کو بھی چاہیں تو ایک کو دو اور دو کو چار کر ڈالیں، تو وہ رہیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کہیں اب معدوم ہو گئے۔ اسی کو ہم نے عرب میں کہا کہ ہر جزو مُجزّی ہے، جزو لا مُجزّی محال ہے۔ اچھا تم ایک جزو لا مُجزّی لاؤ، ہم دوسرا ویسا ہی اور لیں گے، اور دو کو ملائیں گے، اور ایک تیسرا ویسا ہی اور لے کر ان دو کے اوپر رکھ دیں گے۔ ان دو کی درز جہاں ملی ہوئی ہے اوپر والے کی کسی جگہ پر ہوگی۔ وہیں سے کٹا اور دونوں ٹکڑے موجود۔ انھیں پھر چاہو تو پھر اسی طرح کاٹ لو، اور کاٹتے چلے جاؤ، معدوم نہ ہوں گے۔ اچھا، قرعِ عمیق میں ڈال کر تحلیل کر دو۔ وہ نہ رہے گا، اور صورۃً میں ظاہر ہوگا، معدوم نہ ہوگا۔ دھواں ہو جائے گا، ہوا ہوگا، نظر نہ آئے گا، پر ہوگا!

اس طویل عبارت میں کہیں بے ربطی نہیں محسوس ہوتی۔ اسی طرح اسی باب اول کا ایک دوسرا مسئلہ دیکھئے۔ کافی لمبا مضمون ہے اور بالکل مربوط۔ فرماتے ہیں۔

حرکتہ اسے نہیں کہتے کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے۔ مسافت طے ہوئی، یا پرندہ اُڑا، اور بلند ہوا، یا درخت اُگا اور بڑھتا چلا گیا، اور اسی طرح برعکس۔ حرکتہ ایک امر ہے معنوی کہ اندر ہے۔ وہ ظہور میں آتا ہے، تب حرکۃ اس کی معلوم ہوتی ہے۔ ارسطو نے اسے اور طرح بیان کیا ہے، اور عرب نے لیا ہے، اور کہا ہے، هُوَ الخُرُوجُ مِنَ الْقُوَّةِ اِلَى الْفِعْلِ۔ یہ ہے حرکۃ۔ حرکتہ کو جب ہم سوچتے ہیں تو وہ ایک محرک کی محتاج ہے ہر وقت۔ اسی واسطے ہم اپنے میں حرکۃ کے لئے ارادہ کو ضروری جانتے ہیں۔

اور یہ ان باتوں میں ہے جو اپنے اختیار میں ہیں - جو اپنے اختیار میں نہیں اور اپنے میں نہیں ان میں جو حرکۃ ہو حرکۃ بالغیر کہیں گے - محرک جب غیر ہو اور محسوس ہو تو قاسر ہے - اور نہیں تو قدرۃ الٰہی ہے - وہ اگر عادۃ میں نہیں ہے تو الٰہی ہے - اور نہیں تو طبیعی ہے - ہم طبیعی کو نہیں لیتے ، اور قسری کو بھی نہیں لیتے - ارادی کو لیتے ہیں -

ارادی حرکۃ ہماری دنیا کے کاموں میں ہمیشہ غیروں کی معاونۃ کو دیکھتی ہے ، کچھ بھی نہیں تو روپیہ ، اور پانی ، اور ہوا ، سردی میں گرمی ، گرمی میں سردی - یہ ضروریات تو بہت محتاج الیہ ہیں کہ بے ان کے گذارہ نہیں - ہم اپنی ارادی حرکۃ میں ایسے ایسے غیروں کے محتاج ہیں اگر ہم ایشور کی طرف متوجہ ہوں تو ہمارے کام ہمارے اختیار میں ہوں ، اور پھر جب ہم ایک طرف ہوں تو ایشور کی طرف ہوں - اس وقت جانو کہ ہماری ارادی حرکۃ کدھر کو ہونی چاہیے - بس وہ ارادہ ایشور کی طرف ہو - اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیے -

یہاں تک بالکل ہوش و حواس میں لکھنے کے بعد یکایک بہکنے لگتے ہیں - اس کے بعد یہ انداز پیدا ہو جاتا ہے :-

اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیے - ہم ہوں ادھر ، ادر ادھر ، ادر ادھر - وہ مقام نہیں معلوم ہوتا کہ ایشور کسی درجہ سے دنیا فرماتے ہیں - ہم کو ادھر کا دھیان اور ان کا دھیان ، ادھر کا دھیان اور ان کا دھیان ، ادھر کا دھیان اور ان کا دھیان باندھنا چاہیے - ادھر اور ادھر - وہ مقام پھر معلوم نہیں کہ کس نقطہ سے سری نارائن کی دنیا شروع ہوتی ہے - مگر ہوتی ہے ، اور اعتقاد رکھنا چاہیے کہ ہوتی ہے - وہ ہوگا تو ہوگی - اور رہوگی - اور ہوگی -

پوری کتاب میں ویدانت کی اصطلاحات فلسفہ و تصوف کی تشریح ہے - جہاں جہاں خدا سے

خطاب کرتے ہیں، ہر جگہ ایشور لکھتے ہیں۔ مسئلہ حلول و تناسخ کی طرف جابجا اشارے کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ایشور کا اوتار تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تمہید ہی میں لکھتے ہیں:۔

ہم ہیں اپنے کام میں، تم ہوئے ناکام۔ دیکھو یہ ہے ہمارا کام۔ ہم ہیں کہ کرتے ہیں پورا **فلسفہ الٰہی** کو، اور دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ تھے ہم **سری مہاراجہ جی چند** ہوئے ہم **پروفیسر آزاد**۔

کتاب کا خاتمہ عجیب لکھا ہے۔ بیہودگی میں خودی شامل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ہم نے **پتاکا جامیا** (اس کے معنی خود آزاد نے "راہِ آگاہی" بتائے ہیں) کو یہاں ختم کیا۔ دیکھ **سری جے چند** تو ہے راجوں کا راجہ۔ **مہاراجہ**۔ یہ ہم نے کیا ہے تجکو۔ آج ہے تو ایسا، جو حکم ہم دیتے ہیں، تو جاری کرتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ آج کے ہم ہزار برس بعد تو ہوگا **پروفیسر آزاد** اسی کتاب کو تو لکھے گا اپنی زبان میں۔ اسے **اردو** کہیں گے۔ **اردو** تیرا شکر ہے۔ زبان کا نام یہ ہوگا۔ ہم نے جو کچھ بتایا ہے وہی تو نے لکھا ہے۔ ہم اس وقت ان سب کو ظہور دیں گے۔ پھر بھی کافر ایسے ہوں گے کہ ہماری **قدرۃ** کو نہ مانیں گے۔۔۔۔۔ اب ہم تجھے کہتے ہیں، تو ہے **پروفیسر آزاد**۔ لکھ تو اپنی طرف سے۔ **سری مہاراج** میں کیا عرض کروں، جو حضور سے ارشاد ہو وہی ہو۔ اچھا ہم کہتے ہیں۔ اے میرے **ایشور** تو نے کہا، تو نے لکھوایا، مجھ میں کیا طاقت ہے۔ تو نے کہا بس، میں نے کہا بس۔ یہی خاتمہ ہوگیا۔ (ہاں **پروفیسر آزاد**) لکھ آج ہے ۲۲ ماگھ بدی سمت ۱۹۵۳ جنوری کی پہلی سنہ ۱۸۹۶ عیسوی۔ ربیع الثانی کی ۲۶ سنہ ۱۳۱۶ ہجری۔ دن ہے بدھ کا۔ سنہ مہینے۔ مہینوں کی تاریخیں۔ دن کسی میں فرق نہیں۔ یہ ہے ہماری **حکمۃ**۔ جب ہم اپنا فلسفہ کام میں لائیں گے، ٹھیک وہی وقت ہوگا۔ جو ہم وعدہ کر چکے۔ یہی ہے! یہی ہے! یہی ہے! بس!

مولوی ذکاء اللہ [illegible] ۱۸۳۲ء [illegible] میں پیدا ہوئے [illegible]
[illegible] ذکاء اللہ دہلی کالج میں داخل ہوئے [illegible] مولوی نذیر احمد صاحب
[illegible] ڈپٹی نذیر احمد صاحب [illegible] ان تینوں میں بڑے تعلقات قائم ہو گئے
مولوی ذکاء اللہ کو ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ ماسٹر رام چندر جی کا ذکر [illegible]
آ چکا ہے [illegible] ریاضی کے استاد تھے [illegible] خاص عنایت فرماتے تھے۔
ذکاء اللہ صاحب اکثر اول نمبر پر کامیاب ہوتے تھے اور قابلیت کے وظیفے حاصل کرتے تھے۔
دوسرے بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر حاصل کئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر
ہو گئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات سال تک معلم فارسی و اردو رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر
مدارس ہو گئے۔ گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر
ہوئے۔ تین سال کے بعد اورینٹل کالج کی نگرانی کے لئے پروانہ تقرر آیا۔ لیکن اتفاق سے اس کے
ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری بھی آپ کو پیش کی گئی۔ آپ نے الہ آباد کو ترجیح
دی۔ اور ۱۵ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی۔ پھر عمر کے
باقی ۲۴ سال خانہ نشیں رہ کر تصنیف و تالیف میں گذار دئے۔ اور ۷ نومبر ۱۹۱۰ء (شوال ۱۳۲۸ھ)
کو دہلی میں انتقال کیا۔

مؤلف احقر نے آیہ کریمہ سے تاریخ نکالی: وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۳۲۸ھ)
سورۂ بقرہ۔ رکوع ۱۶ – اور دوسری تاریخ کہی،

"کہ یافت قرب شفیع امم، ذکاء اللہ"

۱۳۲۸ھ = ۷۸۷ + ۵۴۱

ان کی وفات کے بعد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ایک مضمون ان کے متعلق رسالہ تمدن دہلی
(بابت اگست ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کے بعض خاص حالات
لکھے ہیں۔ اس لئے "سیر المصنفین" سے اس مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

منتہی ہو جانے کے بعد تمام عمر طالب علمی میں صرف کی، اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ وہ علم کو علم ہی کے لیے حاصل کرتے۔ یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا، نہ ان فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں۔ انھوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں، اور نوکری بھی سررشتہ تعلیم کی نوکری، از خود انگریزی کا شوق کیا، اور اپنے مطالعہ سے بے مدد استاد اس کو اس درجہ تک پہنچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے جھجکتے تھے، مگر ان کی ہر طرح کی معلومات جو انھوں نے انگریزی کی مدد سے جمع کی تھیں، اتنی وسیع تھیں کہ بڑے سے بڑا ایم۔ اے کو نصیب نہیں ہوتیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی بسیط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص اتنی بڑی کتاب لکھنے کے لیے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک ادا جس میں وہ منفرد تھے، ان کی مستقل مزاجی تھی۔ انھوں نے [illegible] سے [illegible] تحریر کا [illegible] نہیں بدلا۔ وہ [illegible] سمجھتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں پہنی۔ گرمی جاڑے [illegible] میں یہی [illegible] کے دنوں میں ان کو [illegible] [illegible]

غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع قطع [illegible] سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی کا ان پر کچھ بھی اثر ہے۔ تم مسلمان ہیں تو مذہب کے وہ بھی یقیناً مسلمان تھے، مگر ان کا دامن عقیدت [illegible] تعصب سے [illegible] پاک تھا [illegible] مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ سب سے خلوص کے ساتھ ملتے، اور ہر مذہب [illegible] سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے [illegible] خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ [illegible] مولوی ذکاء اللہ [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] دوسرے سے متعلق نہ تھی۔ مگر دونوں نے مذہب کی اہمیت کو سمجھی تھی اور ان کی باہمی محبت الحُبّ لِلّٰہ کی قسم سے تھی۔ مودۃ اہل صفا [illegible]

تصانیف اور ان کی قدردانی

مولوی ذکاء اللہ کو ابتدا سے تعلیم و تعلم اور خدمت علم و فن کا شوق تھا [illegible] آپ کو [illegible] بھی اسی شغل اور اسی [illegible] میں [illegible] سب سے [illegible] نسبت تھی تو سب سے زیادہ اسی فن کی کتابیں لکھیں۔ چونکہ ان کے [illegible] میں [illegible] زبان میں تھی اس لئے ذکاء اللہ صاحب کی ریاضیات و طبعیات کی کتابیں سرکاری نصاب تعلیم میں داخل ہوئیں اور اس خدمت کے صلے میں گورنمنٹ سے [illegible] اور [illegible] انعامات عطا ہوئے۔ ان کے [illegible]

[illegible]

مضمون	تصانیف مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم و ادب	۶	[illegible]	[illegible]
علم اخلاق	[illegible]	[illegible]	[illegible]
طبعیات و ہیئت	[illegible]	۲	[illegible]
سیاست مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۵	۱۸	۱۴۳

ان میں سے تاریخ ہندوستان کے [illegible] حصے ہیں جن کے مجموعی صفحات [illegible] ہیں۔

اس کے علاوہ سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، [illegible] نامہ، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ، تاریخ عہد انگلشیہ، آئین قیصری بہت سی کتابیں ایسی تصنیف کیں کہ ان سے پہلے ان موضوعات پر کسی نے نہ لکھی تھیں۔

ان ضخیم کتابوں کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ نے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بے شمار مضامین لکھے۔ تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، رسالہ حسن حیدرآباد وغیرہ مشہور پرچوں میں بھی لکھتے رہتے تھے۔ دارالسلطنت کلکتہ، منتخب بہار، بیدار وغیرہ غیر مشہور رسالوں کو بھی بے تکلف لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ کسی سے انکار نہ تھا۔

کثرت مشاغل اور کام میں ضبط و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت خانہ کی [illegible] میں ایک مخصوص جگہ پر دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔ اور کثرت سے اس جگہ بیٹھے کہ دیوار میں گڑھا ہو گیا تھا۔ مصنف نے بھی اس تکیہ گاہ علم و فضل کی زیارت کی تھی۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کے معاصروں میں کسی ایک مصنف نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ لیکن یہ حقیقت واقعہ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اب ان کی تصانیف کی طباعت اشاعت تدریجاً فنا ہو رہی ہے اور ان تک رسائی مشکل سے ہوتی ہے۔ ان کی تصانیف درسی تھیں اور اسی لئے ان کے زمانے میں شائع و مقبول رہیں۔ پھر جب تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم و تحقیقات انگریزی میں ہونے لگی تو ان کی ضرورت نہ رہی۔ تاریخوں اور جغرافیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، لارڈ کرزن وغیرہ ایسے اشخاص کی حیات ہیں جن سے عام دلچسپی بھی نہ تھی، اور انگریزی میں ان سے بہتر موجود تھیں۔ ان کی تاریخ ہندوستان سب سے ضخیم ہے، اپنی ضخامت و تفصیل و تحقیق کے سبب سے قابل قدر اور مستند ہے۔ لیکن اپنی ضخامت و گرانی قیمت کے سبب سے عام لوگ اس سے مستفیض نہ ہو سکے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی اکثر کتابیں خصوصیت تاریخی کے لحاظ سے نہایت معمولی ہیں اور اکثر جگہ ترجمہ ہیں، اکثر جگہ وہ بے احتیاطی سے غلط ہوتی ہیں، اور حسن ترتیب میں دلکش انشاء پردازی بھی نہیں۔ بجز اس کے ان کے مضامین

آتی ہیں جیسی کتابوں میں داخل نظر آتے ہیں، اور بس۔

مولوی ذکاء اللہ کا طرزِ تحریر

مولوی ذکاء اللہ صاحب کی طبیعت میں انتہا درجے کا ٹھہراؤ اور سنجیدگی تھی۔ اس لیے ان کی تحریریں جذبات کے طوفان اور روانی اور تفصیل و تجزیہ سے [illegible] زبان و طرزِ بیان کا کوئی حسن نہیں، بلکہ ان کی زبان میں محاورہ و روزمرہ بھی کم موجود نہیں ہے۔ ان کو غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی، اس لیے علمی، تاریخی، سیاسی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین پوری وضاحت کے ساتھ لکھے ہیں، لیکن مسرت و غم، غصہ و نفرت، شوخی و ظرافت سے کسی نوع پر ان کے الفاظ سے ان کا جوشِ طبیعت بہت کم ظاہر ہوتا ہے۔

ان کی اکثر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں [illegible] ان کی [illegible] ترجمہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں محاورہ [illegible] دوسرے [illegible] محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً [illegible] ہندوستان میں [illegible] سے [illegible] حصہ [illegible] سمجھتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

ذکاء اللہ صاحب کو الفاظ اور عبارت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ جو قلم سے نکل گیا نکل گیا۔ تاریخیں البتہ بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں۔ چنانچہ خود اپنا طریق نگارش بیان کرتے ہیں:

"میرا ارادہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ ایسی لکھوں [illegible] جو معتبر مورخوں [illegible] کی تصنیف ہوں، اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی ہوں۔ ان سے [illegible] اخذ کرتا ہوں، اور انگریزی مورخوں سے جن کا [illegible] سے پایا جاتا ہے بعض مقامات میں مقدم کرکے لکھتا ہوں [illegible] تاریخ ہندوستان جلد ہفتم۔

[illegible]"

[illegible] تاریخیں [illegible] ان میں مولوی ذکاء اللہ نے جتنی [illegible] ان کی تصنیفوں کو [illegible] صحیح اندرونی [illegible] میں [illegible] کی تصنیفوں میں [illegible] کام نہیں چلتا۔

تاریخ ہندوستان سے نمونہ — (۱) تاریخ ہندوستان [illegible] دس جلدوں میں [illegible] سے [illegible] لکھتے ہیں۔ ایک مقام کا اقتباس یہ ہے:

"[illegible] کہ وہ [illegible] میں آرام نہیں کر سکتا [illegible] اس کے بیٹے کے ساتھ [illegible] اس کے [illegible] بڑے ہیرے تھے، خود تھوڑے آدمیوں کے ساتھ [illegible] کہ وہ [illegible] ہوں اور [illegible] ان سے [illegible] اور [illegible] دشمنوں [illegible] سے بچ [illegible]۔

سلطان خرم نے کوہستان کی [illegible] میں [illegible] بھیج دیے تھے کہ جہاں [illegible] کی [illegible] میں [illegible] اس کے [illegible] کو لشکر روانہ ہو۔ [illegible] کانگڑہ کے [illegible] کی تخریب اور [illegible] چھوٹوں کی [illegible] کے لئے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی تاراج شروع کی اور بہت آدمیوں کو مارا اور قید کیا۔ [illegible] کی طرف گیا۔

وہاں راناکے اہل و عیال کا نشان اٹھا دیتے تھے اگر اس کے پہنچنے سے پہلے چتوڑ سے رانا
اہل و عیال کو دوسری جگہ لے گیا تھا اس نے عزیزوں سے سلسلہ ردت سے قتل و غارت
در اسیر کرنے اور مندر ان ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بخت خاں
یہ راجپوت بڑے دلیر تھے اور آخر کو جوہر کرکے مع اہل و عیال مرے۔ اس نے
نے۔ ہنود کے حقوق کا پاس کیا اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہیں کیا۔ بتوں کو جلا دیا
بتخانوں کو ڈھا دیا۔

بعد ازاں جیسا مہر [illegible] [illegible] کہ ہندو مذہب بہت ہی [illegible]
[illegible] خدمت سے جہاں میں راستے [illegible] کی [illegible] کا [illegible]
[illegible] اس کا درجہ [illegible] جہاں [illegible] ب [illegible] سے [illegible]
سے [illegible] کوئی [illegible] نہیں

[illegible] کے حال میں لکھتے ہیں۔

[illegible] سے [illegible] کیا تو اس [illegible] شریعت [illegible]
کا جس میں کچھ [illegible] تھا [illegible] ولی [illegible] حکم [illegible]
عظیم کا معبود [illegible] اور [illegible] کوئی دوسرے [illegible]
مدت [illegible] بری میں [illegible] کرنے کا [illegible] موقوف کیا۔
[illegible] معروض کیا کہ [illegible] نے [illegible] کے [illegible]
کو مرتبہ [illegible] میں [illegible] پیدا کیا ہے ایک کو اوج عزت و رفعت
[illegible] کیا۔ [illegible] مرتبہ والا [illegible] اور [illegible] بلند [illegible] گذری [illegible]
[illegible] پر [illegible] کیا اور [illegible] اور فرمانبرداری کے ساتھ
پیدا کیا اور ہر ایک کو استعداد کارکے [illegible] روزگار کے موافق اس کے
[illegible] اس کام میں [illegible] سے [illegible] مرتب عظیم [illegible]

[illegible] حضرت [illegible] موت کے سبب سے
سجدہ [illegible] کی [illegible] جس سے [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] مشہور کے [illegible]
[illegible] زمین پر ٹکا کے
پشت دست [illegible] میں بھی سجدہ کے
[illegible] کا نام [illegible] گئے۔
[illegible] عظیم [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] [illegible]
وقت [illegible] شکست [illegible]
[illegible]

۳ [illegible] تاریخ عہد انگلشیہ [illegible]
[illegible]

[illegible] خوبی [illegible] شکست نہیں [illegible]
اس میں [illegible] جس وقت [illegible]
[illegible] کا نتیجہ نہیں سوچتے [illegible] ظلم و تعدی [illegible] کا
[illegible] کی طبیعت کا خمیر [illegible]
تھا [illegible] وقت [illegible] نہیں سمجھتا تھا اور مروت و
فتوت کو [illegible] میں دخل نہیں [illegible] اور [illegible] پر عمل تھا۔ [illegible]
وہ خود [illegible] کے سبب سے [illegible] کی بھی حقیقت
نہیں [illegible] کا ایک [illegible] کسی کام کی اصل و
حقیقت کھلنے نہیں دیتا تھا۔ [illegible] کے [illegible] سے نقصان [illegible] اس کی

یہ تھی کہ وہ ہر کام کو بڑے تیقظ یا تیقن سے کرتا تھا۔ غرض اس میں جو خوبیاں تھیں وہ تحسین کے
قابل تھیں اور جو برائیاں تھیں وہ نفرین کے لائق۔ بہرحال تحفہ جیسے کہ رعایا پروری
سچائی کی دلداری لوگوں کو پسند آتی تھیں اور نہایت عبادات اور معمولی مدد کا خیال یہ سب
خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔
مگر بھی مکاری کی ایک شمہ اس کے سبب سے اس کی نجیبانہ آزادی دولت فزائی ایک
ایسی بلی سے جیسی تھی کہ وہ اس طوطی خوش رنگ کو نوچے ڈالتی تھی۔ مگر اس بلی کے بھنبوڑنے
کے سبب سے اس کا پر و بال بھی موجود تھا جو اس کی خود پرستی و خود رائی تھی۔ بعض
بے انصافیاں اور زیادتیاں اس سے ایسی ہو گئی تھیں جو اس کے بڑے کاموں میں بھی داغ
درست کام کر

یہ تشبیہ نہایت درست و موزوں اور پیرایہ کی ہے۔

(۴) **مضامین ذکاء اللہ** یا افادات: دوسری نثری تصنیفات سے کچھ
کم وقعت اور کم درجہ نہیں ہے۔ سر سید کی طرح مولوی ذکاء اللہ نے بھی مختلف ضروری مفید موضوعوں
پر بہت سے مضامین لکھے ہیں اور ہر مضمون کو تحقیق و تجسس کر کے لکھا ہے اور تفصیل و تشریح
سے اس قدر سمجھایا ہے کہ حقیقت میں حق ادا کر دیا ہے۔ بعض مضامین انگریزی سے تقریباً لفظی ترجمہ
ہیں۔ بعض انگریزی مضامین سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اکثر ان کی طبع زاد کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بیان
کی متانت و سلاست جو ان کی تصنیفات کی خصوصیت ہے یہاں بھی ہے۔ بعض مضامین میں جدت
تخیل اور لطف بیان ایسا ہے جو ان کی تاریخوں میں نہیں ملتا۔ چند مضامین سے مختصر اقتباسات
درج کئے جاتے ہیں

(الف) **ادب**۔ ادب کے معنی ہر ریاضت محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں
جس سے کسب فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو
بھی ادب کہتے ہیں۔

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کہ بے ادب اسے دیکھ کر با ادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے، وہ بے ادبوں کو اپنی ہی مانند بناتا ہے۔ جیسے آہوئے وحشی جو گلہ میں داخل ہوتا ہے، وہ اور آہوؤں کو بھگا لاتا ہے۔ جو اپنے خدا کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے اس کا گھر آراستہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے۔ تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مسرت ہو۔ نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں وہ خردمندوں کے نزدیک ایک بدمزہ مزاح ہے۔ اگرچہ تیری داڑھی کوّوں کے پروں کی سی سیاہ ہو تو بڈھوں کی بگلا کی سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم عین عارف اور کل عقلمند ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر مت ہنسو۔ کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصرف نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔

یہ عبارت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے خدا کی سی فارسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔ اب ذیل کا مضمون انگریزی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو مشہور مصنف بیکن نے لکھا ہے۔ یہ قریب قریب اس کا لفظی ترجمہ ہے۔

کتب کا مطالعہ۔ مطالعہ تنہائی و فراغت میں خوشی بخشتا ہے۔ گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا، معاملات کے فیصلہ و انتظامات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ جس مطالعہ سے حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات متفرقات تجربہ کار آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات و منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاحات کی تدبیر جیسی چاہیے، علم و فضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہو گے اور ان کی باتوں کی تردید کرو گے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کر لو گے نہ ہم خود بہت باتیں

بن جائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصود اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے، پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی ان پر عمل کریں گے۔

بعض کتابوں کا صرف مزا چکھا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض بالکل نگلی جاتی ہیں۔ یعنی کل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں۔ یعنی اول سے آخر تک بڑی توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب سے جو کتابیں بنتی ہیں، ان کا حال آب مقطر کا سا ہے۔

آج مولوی ذکاء اللہ کی نثر پردازی، قوت تخیل اور جدت آفرینی کا ایک دلچسپ نمونہ ذیل کا مضمون ہے۔ بعض حصے حذف کرکے شروع سے آخر تک نقل کیا جاتا ہے۔

آگ

اللہ جل شانہ نے اپنی مخلوق میں اپنی صفات کی نشانیاں عجب حیرت انگیز واسطے دکھائی ہیں کہ انسان ان نشانیوں کو ذی شان سمجھ کر اپنا معبود بناتا ہے۔ حقیقت تک عدم رسائی کی وجہ سے لوگوں میں یہ شکل موجود ہوتا ہے۔ ہم اس کی مثالی اسی کتاب میں آگ۔ کبھی کتابیں دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک نشان ہمارے دعوے کا ہے۔ معبود بننے کی خوشی سے آدمیوں کو اپنا بندہ بنا کر پوجا کرا رہی ہے۔ ہمہ دانی کی صفت سے اس کی ذات موصوف ہو رہی ہے، یہ وہ صفت ہے کہ اللہ ہی کی ذات سے مخصوص ہے) اس کی ذات کی نسبت وہ نکتے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے سمجھنے کے واسطے اعلیٰ درجے کی ذہانت کی ضرورت ہے۔

یہ مثل کہ "آگ میں موتو یا مسلمان ہو" بے محل بولی جاتی ہے، جہاں ہر طرح سے کام کرنے میں برائی ہی برائی ہو۔ آگ ہندوؤں کی معبود ہے، اگر اس میں موتے تو نرک میں پڑے، مسلمان ہو تو جہنم میں جلے۔ دونوں طرح سے خرابی ہی خرابی ہے۔ آگ ہندوؤں کی ایسی معبود ہے۔

زردشتیوں کی کتابوں میں آگ نورِ الٰہی کا ظہور دکھائی گئی ہے۔ آدمیوں کے سر اس کے آگے سجدوں میں جھکاتی رہی ہے، اس کی پرستش کے لیے آتشکدے بنوا رہی ہے، جن میں ہمیشہ درخشاں و تاباں رہتی ہے۔ .... ارسطاطالیس نے استقرا سے چار بسیط عنصر یعنی خاک، باد، آب، آتش قرار دیے۔ اگرچہ عنصر کو بسیط حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکا۔ آتش حالتِ بسیط میں زمین پر معدوم اور کرۂ نار میں موجود۔ انسان کرۂ نار میں پہنچ کر جو نمودار دیکھ سکتا ہے۔ خاک حالتِ بسیط میں زمین کے طبقہ ہائی در طبقہ طینیہ کے نیچے بیٹھی ہے۔ نفت اشیا میں جو اس کی زیارت ہو سکتی ہے جو انسان کے لیے ناممکن ہے۔ ہوا بسیط حالت میں کرۂ ہوا کے بلند حصوں میں موجود ہے۔ انسان اگر پہنچ سکے جیسے تو اس کی ادراک بھی کر سکتا ہے۔ مگر یہ کبھی ممکن نہیں۔ پانی تو ہمیں حالتِ بسیط میں مل ہی نہیں سکتا۔

بعض کے نزدیک ان چاروں عنصروں کا وجود یک جا ہے مگر محققین زمانۂ حال آگ کو ہیولیٰ سے خالی جانتے ہیں۔ اور اس کا وجود نہیں مانتے۔ حرکت سے کہتے ہیں کہ حرارت پیدا ہوتی ہے آگ بھی اسی حرارت کی ایک کیفیت ہے۔ اس بحث میں ہنگامۂ سخن گرم کرنے سے مجھے اندیشہ ہے کہ قلم دیا سلائی بن کر میرے ہاتھ کو نہ جلا دے .....

آگ عجیب نامبارک وجود ہے، پیدا ہوتے ہی ماں باپ کو کھا جاتی ہے۔ جن لکڑیوں کی زناشوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ انھیں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے .... آگ ہماری دشمن جاں سوز بھی ہے اور دوست دل فروز بھی۔ وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔ مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لیے ہماری رنج و تکلیف کے دور کرنے کے لیے آرائش و آرام کے واسطے صدہا ضروریاتِ زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔

ہمارے چولھے پر ہانڈی پکتی ہے اُسے کنڈے جلا کر روٹی دال پکاتی ہے۔ آگ
ہی نے انسان کو بچا رکھا ہے جس کے سبب سے وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے،
یعنی انسان حیوان ناطق کہلاتا ہے ایسا ہی آتش پرست حیوان۔ کیونکہ کوئی حیوان اپنی ہنڈیا
پکانے کے لیے آگ نہیں چڑھاتا۔ یہ تو حضرت انسان ہی عقل کے پورے ہیں کہ
پھونک پھونک کے آگ روشن کرتے ہیں، اور اپنی خوراک پکاتے ہیں، اور اس کی دھوئیں سے
آنکھوں کو اذیت پہنچاتے ہیں.....

جن ملکوں میں سردی کی شدت ہے اور برف کثرت سے پڑتی ہے، وہاں بغیر
آگ اور ایندھن کے آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا ہے..... انگلستان ایک سرد ملک
ہے۔ اس کے ہر مدرسے میں ایک آتش دان ہوتا ہے جس کے گرد گھر والے آگ
تاپتے بیٹھتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو طرح طرح کے سبق سکھاتے ہیں۔ وہ بچپنے کی
دن کے ساتھ ایسے بندھ جاتے ہیں کہ بڑھاپے تک ان کے دل سے ٹوٹتے نہیں
اور پھر وہ نقش ہو جاتے ہیں کہ کبھی دور نہیں ہو سکتے۔ وہ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں
استاد اور مدرسہ ان پر رنگ نہیں چڑھا سکتے۔ یونیورسٹی کے ڈگری پانے والے بہت تھوڑے
آدمی ہوتے ہیں، مگر آتش دانوں کے گریجویٹ سب ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں جو علم
تحصیل ہوتا ہے وہ ایک مدت کے بعد حافظہ میں پژمردہ و افسردہ ہو جاتا ہے، مگر ان
آتش دانوں کے گرد کا سبق پڑھا ہوا ہمیشہ زندہ و تازہ رہتا ہے۔

جاڑے کے موسم میں ہندوستان میں دیہات میں صبح شام رات کو دیکھو کہ ایک
الاؤ جلتا ہے جس کے گرد گنوار حلقہ باندھ کر خشک زمین پر گدڑی بچھا کر بیٹھتے ہیں، اور
چلم میں بہت سی آگ بھر کر ایک حقہ پر رکھتے ہیں اور اس کا دور لگاتے ہیں۔ ایک
ایک دو دو گھونٹ پی کر حقہ کی نے دوسرے منہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس وقت وہ
اپنی اولاد کے بیاہ شادی کرنے کی، گائے بھینس کے بیانے کی، بھیڑ بکری کے

پالنے کی اور کھیتی کے بگڑنے سنورنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجب دلچسپ اور دل ربا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ان کو سنے تو اس کو وہ علم حاصل ہو جو کبھی کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتا۔

اب تک ہم نے **آگ** کی دوستی کا بیان کیا۔ اب اس کی دشمنی کا ذکر سنو کہ جب یہ دودھاری ہم سے خفا ہوتی ہے تو خدا کی پناہ! اس کے آتش ناک غصہ کے سامنے ساری مخلوق بھاگتی ہے۔ مگر وہ جھپٹ کر سب کو جا چھوتی ہے۔ اس طرح پکڑ لیتی ہے جیسے بھاگتے ہوئے شکار کو دشمن پکڑ لیتا ہے اور فنا کر دیتا ہے۔ جس چیز کو چھوتی ہے چاٹ کر سیاہ کر دیتی ہے۔ کھیتوں کو اس طرح کاٹتی ہے جیسے کوئی قینچی سے داڑھیوں کو تراشتا ہے۔ جب درختوں کی رگڑ سے وہ پیدا ہوتی ہے تو جنگل کے جنگل جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ جب وہ بھڑکتی ہے اور اپنے شعلے ہوا میں اڑاتی ہے تو سمندروں کی لہروں کی کیفیت دکھاتی ہے۔ سمندر میں بھی وہ اپنی سطوت کی دشمنی کے جوہر خوب دکھاتی ہے جہاں آگ ہو کر گذر جاتی ہے وہ جگہ دھواں دھار ہو کر ریگ ہو جاتی ہے۔ وہ دشمنوں کا تاج سر پر لگا کے اور شعلوں کے بال بنا کے تاریکی کو دور کر دیتی ہے۔

غرض **آگ** بھی عجیب چیز ہے۔ زمین پر زور ہے۔ آفتاب میں نور ہے۔ آسمان پر بجلی ہے۔ لوہے اور چقماق میں شعلہ ہے۔ گرم ملک والوں نے جو جہنم بنایا ہے اس میں وہ گنہگاروں کی عزیز کے لئے ایک سخت عذاب ہے۔ سرد ملک والوں نے جو جنت بنائی ہے اس میں نکوکاروں کے تاپنے اور آرام کرنے کے لئے جان فزا ہے۔

خدا نخواستہ اگر آتش دنیا سے معدوم ہو جائے تو بہت سے کام دنیا کے ٹھنڈے ہو جائیں۔ نہ چونا پکے کہ اینٹ پتھر کو جوڑے۔ نہ ریت سے منہ دیکھنے کا شیشہ بنے۔ غرض عالم کے حسن کے بڑے حصے میں گرما گرمی اور دل فریبی نہ رہے۔ اس کا جوبن خاک میں مل جائے۔ اس کی بہار پر خزاں آ جائے۔

آگ اپنے تئیں کھاتی ہے اگر اس کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملے۔ اَلنَّارُ تَأْكُلُ نَفْسَهَا إِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَأْكُلُهُ۔ **آگ** خاکستر ہو کر بہت آدمیوں کو کھلاتی ہے۔ اَلنَّارُ كَثِيرُ الرَّمَادِ وَلَا تُطْعِمُ الْعِبَادَ

مرد آب و آتش را چہ آشنائی۔ آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، اس طرح اپنے دل کی آگ نکالتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس لئے کہ یہ عنصر انسان کے کاموں میں ہمیشہ زیادہ آئے، ہوا کو اس کا خدمت گار مقرر کر دیا ہے کہ اس پر پنکھا جھلا کرے۔

مولوی نذیر احمد والد کا نام مولوی سعادت علی صاحب۔ ۶ دسمبر ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲ رجب ۱۲۴۶ھ کو پیدا ہوئے۔ وطن تھا موضع ریہڑ تحصیل نگینہ ضلع بجنور۔ حضرت شاہ عبدالغفور اعظم پوری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں۔ اعظم پور ضلع بجنور میں ہے۔ شاہ صاحب اپنے زمانے کے مشاہیر اولیاء اللہ میں سے تھے۔ مولوی نذیر احمد کی ننھیال بھی علمی خاندان تھی۔ شاہی زمانے میں قاضی رہ چکے تھے۔ چار برس کی عمر میں والد کے ساتھ [illegible] گئے۔

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں اور کچھ والد سے حاصل کی۔ والد خود بڑے عالم تھے۔ ۹ برس کی عمر تک انھوں نے فارسی عربی پڑھائی۔ پھر مولوی نصراللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور سے پانچ سال تک عربی نحو، منطق، فلسفہ پڑھا۔ ۱۴ برس کی عمر تھی کہ والد ان کو لے کر دہلی آئے، اور مدرسہ مسجد اورنگ آبادی کے خاص مدرس مولوی عبدالخالق کے سپرد کر گئے۔ یہاں مولوی نذیر احمد نے بالکل طالب علمانہ زندگی بسر کی جس کا حال مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد صاحب کی زبانی اس طرح لکھا ہے:۔

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے

گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی، کسی نے قیمے کی کھدی ہی رکھدی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے قدم رکھا، ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی، نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے دنیا بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔۔۔۔ بہر حال مار دھاڑ سہہ کر روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔" (از مضمون مطبوعہ رسالہ اردو)

دلی کالج کی تعلیم

اس طالب علمی اور گداگری سے مولوی نذیر احمد خوش اور مطمئن نہ تھے، لیکن طلب علم کی خاطر گوارا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن دلی کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ تھا۔ یہ بھی اتفاق سے ادھر جا نکلے۔ تماشائیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ یہ گر پڑے اور چوٹ لگ گئی۔ حسن اتفاق سے کالج کے پرنسپل نے دیکھ لیا اور ان کو اٹھا کر بڑی ہمدردی و شفقت کی اور پوچھا کیا پڑھتے ہو۔ انھوں نے کہا شرح ملا اور ابوالفضل پڑھتا ہوں۔ جلسے کے بعد پرنسپل کے کہنے سے مفتی صدرالدین خاں صاحب نے شرح ملا میں مولوی نذیر احمد کا امتحان لیا۔ انھوں نے نہایت عمدہ جواب دیے۔ پرنسپل نے کالج میں داخل کر لیا اور چار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو بڑھتے بڑھتے چھ پیسہ ماہوار ہو گیا۔ اس وظیفے کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں:-

---

لے نذیر احمد صاحب کے کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۶ء ان کی سوانح عمری "حیات النذیر" میں اور اس سے "سیر المصنفین" وغیرہ تذکروں میں درج کیا گیا ہے۔ دو بہت تذکروں ... باقی حاشیہ صفحہ ۴۹۵ پر

"مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پایا دہے۔ جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور نہ صرف میں نے بلکہ ہمارے سارے خاندان نے اس کو سلسلۂ ملازمت کا آغاز سمجھا۔"

دہلی کالج میں مولوی ذکاءاللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ مولانا نذیر احمد کو ریاضی اور تاریخ سے دلچسپی نہ تھی لیکن وظیفہ کی خاطر پڑھتے تھے۔ کالج میں داخل ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا اور محنت سے پڑھنے لگے۔ آخر ۱۸۵۴ء میں آٹھ سال کی تعلیم کے بعد کالج چھوڑا۔ کالج کی تعلیم کے متعلق خود لکھتے ہیں:۔

"معلومات کی وسعت، مدرسے کی آزادی، آزادیٔ رائے (درگذر) گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی، اجتہاد علی البصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں، اور جو حقیقت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۴)

نے ان کا سال ولادت بھی ۱۸۳۱ء لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۹ برس کی عمر تک والد سے اور اس کے بعد ۵ سال مولوی نصراللہ خاں سے تعلیم پا کر بجنور سے دہلی آئے۔ اس حساب سے دہلی آنے کے وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی ہوتی ہے۔ تو ولادت کے سال مذکور کے حساب سے ۱۸۵۰ء میں دہلی آئے۔ پھر ۱۸۴۶ء کالج میں داخل ہونے کا سال کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس سال ان کی عمر ۱۴ سال کی ہوتی ہے۔ ان دونوں کی تاریخوں میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ مولانا کا سال ولادت ۱۸۳۶ء ہو۔ ان کی بڑی عمر میں ملازمت کی حالت میں کسی پنڈت نے ان کا جنم پتر بنا کر بتایا تھا۔ خود ان کو یہاں ولادت ۱۸۳۳ء بتایا، اور یہی سال انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست میں لکھا تھا۔ نیز دوسری عبارت سے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ سنہ ۱۲۴۹ھ اور ۱۸۳۳ء کے مطابق ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان عموماً قمری سال سے وفات کا حساب لگایا کرتے تھے۔ اس حساب سے مولانا جب ۱۲ سال کی عمر میں دہلی آئے تو سنہ ۱۲۶۱ھ یا سنہ ۱۲۶۲ھ ہوگا۔ اور یہ ۱۸۴۶ء کے مطابق ہے۔ اس طرح کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ہو سکتا ہے۔

شہر یار زندگی ہیں، ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا، مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، بزعم خود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"

جس زمانے میں نذیر احمد صاحب مولوی عبدالخالق صاحب سے پڑھتے اور ان کے گھر کا کام کیا کرتے تھے، ان کی خورد سال پوتی کو گود میں لیے پھرنا اور اس کی ٹہل کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ خوبیٔ تقدیر سے آگے چل کر بڑے ہو کر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ مفتی صدر الدین صاحب نے نکاح پڑھایا اور گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا۔ پھر زمانے نے ایک دوسرا نکاح اپنے سلسلے میں دوسرے شہر میں کر لیا۔ لیکن اس سے نباہ نہ ہو سکا۔ اور طلاق پر معاملے کو ختم کر دیا گیا۔

ملازمت

۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات پنجاب میں چالیس روپیہ ماہوار کے مدرس مقرر ہوئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور آ گئے۔ یہاں انگریزی تعلیم سے نفرت، اس لیے استعفا دے کر دہلی چلے گئے۔ ابھی دہلی پہنچے ہی تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر برپا ہو گیا۔ یہ بھی غدر کے مصائب میں مبتلا رہے۔ اتفاق سے اس ہنگامہ میں نذیر احمد صاحب نے ایک میم کی جان بچائی۔ غدر کے بعد اس خدمت کے صلے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد مقرر ہوئے۔

الہ آباد میں نذیر احمد صاحب منشی عبداللہ خاں صاحب امین عدالت کے مکان پر مقیم ہوئے۔ منشی صاحب انگریزی جانتے تھے۔ ان کی ترغیب سے انھوں نے بھی انگریزی پڑھنی شروع کی اور کافی قابلیت پیدا کر لی۔ مولانا نے ایک لیکچر میں انگریزی پڑھنے کے سلسلے میں کہا تھا:۔

"میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں کہ دلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی

پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول، مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔

اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ان کو قانون انکم ٹیکس کے ترجمہ کی خدمت سپرد کی۔ یہ ترجمہ بڑی قابلیت سے کیا۔ اس کے بعد تعزیرات ہند کے ترجمہ کا کام ملا۔ اور اس کے صلے میں کانپور کی تحصیلداری ملی۔ دو برس تحصیلدار رہے۔ ترجمہ ختم ہونے پر ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے۔ پھر ایک انگریزی علم ہیئت کی کتاب کا ترجمہ سموات کے نام سے کیا۔ اور یہ ترجمہ تنقید و نظر ثانی کی غرض سے ریزیڈنٹ حیدرآباد کے ذریعہ سے امیر کبیر مدار المہام ریاست کے پاس بھیجا گیا۔ امیر کبیر علم ہیئت و ریاضی کے بڑے ماہر تھے (اس داستان تاریخ اردو کے صفحہ ۲۵۸ پر ان کا ذکر آچکا ہے) مولوی نذیر احمد کا ترجمہ بہت پسند کیا گیا، اور ان کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت نے ایسا اثر پیدا کیا کہ سر سالار جنگ نے ان کو حیدرآباد بلا لیا۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی اور نواب محسن الملک کے خطوط مولوی نذیر احمد کے پاس آئے کہ سر سالار جنگ آپ کی خدمات حیدرآباد کے لیے منتقل کرانا چاہتے ہیں۔ پھر سر سید احمد خاں کے ذریعہ سے سرکار نظام کی طرف سے تحریر موصول ہوئی کہ بالفعل ۸۵۰ روپیہ اور پھر ایک ہزار بیس روپیہ ماہوار بحساب سکہ انگریزی ملیں گے۔ مولانا اس وقت اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ رخصت لیکر دہلی ہوتے ہوئے حیدرآباد چلے گئے۔ ۲۷ اپریل ۱۸۷۷ء کو وہاں پہنچ کر نواب محسن الملک کے پاس قیام کیا۔

حیدرآباد میں ترقی کرتے کرتے "بورڈ آف ریونیو" کے ممبر ہوگئے۔ سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگئی۔ سر سالار جنگ بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں بہادر نظام دکن نابالغ تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے سر سالار جنگ نے

مولوی نذیر احمد صاحب سے خاص طور پر نصاب تعلیم مرتب کرایا۔ لیکن یہ کتابیں شائع نہ ہو سکیں۔

قیام حیدرآباد کے زمانے میں نذیر احمد صاحب کو قرآن مجید حفظ کرنے کا خیال ہوا اور اپنے بیٹے بشیر حافظ کی مدد سے چھ مہینے میں پورا قرآن یاد کر لیا۔

سر سالار جنگ نے اپنے فرزند میر لائق علی خاں کو مولوی نذیر احمد کی شاگردی میں دیا۔ وہ اور مہاراجہ کشن پرشاد دونوں ان کے مکان پر پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ سنہ [illegible] میں سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد لائق علی خاں سالار جنگ ثانی ہوئے۔ چونکہ مولوی نذیر احمد ان کے استاد رہ چکے تھے بعض لوگوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مولوی صاحب شاگرد پر اثر ڈالیں گے۔ اس لیے ان لوگوں نے استاد کو شاگرد سے الگ کرنے کی کوشش شروع کی۔ ان کے کان میں جب اس کی بھنک پڑی تو مستعفی ہو کر پنشن لیکر دہلی چلے آئے۔ حیدرآباد میں خفیف [illegible] اب یہ ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

عزت و خطابات مراۃ العروس اور توبۃ النصوح پر ایک ایک ہزار روپیہ انعام گورنمنٹ سے ملا۔ [illegible] کتاب پر ایک گھڑی [illegible] ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ قرآن مجید کا ترجمہ چھپنے پر اس کی ایک جلد مولانا نے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کو انگلستان بھیجی۔ اس عظیم الشان علمی خدمت کے اعتراف میں ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری پیش کی۔ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری دی۔

[illegible] و تجارت مولوی نذیر احمد کی ابتدائی زندگی عسرت میں گزری تھی اس لیے ان کی طبیعت میں کفایت شعاری کا مادہ اور دولت کی قدر پیدا ہو گئی تھی

تجارت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لئے خود بھی تجارت میں روپیہ لگاتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو محض اعتبار پر روپیہ دیتے تھے۔ خود انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ "اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں"۔ اپنے روپیہ پر کھلم کھلا سود لیتے تھے۔ ایک روپیہ سیکڑہ شرح سود مقرر تھی۔ اپنی تصنیف الحقوق والفرائض میں مسئلہ سود پر بحث کی ہے اور اس کو جائز بتایا ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ نہایت جزرس اور کفایت شعار تھے۔ یہاں تک کہ بخیل مشہور ہو گئے تھے۔ اور دوسری طرف اس قدر سادہ مزاج اور صاحب مروت تھے کہ نہ جائداد کی نگرانی کرتے تھے۔ نہ تجارت کی دیکھ بھال، اور روپیہ بے تکلف قرض دیتے رہتے تھے۔ اس ترتیب سے بڑی دولت لوگوں نے اڑا لی۔ چنانچہ وفات کے بعد امید سے بہت کم روپیہ نکلا۔ حالانکہ صرف پنشن کا روپیہ ڈھائی لاکھ ہوتا ہے۔ بینک میں نقد روپیہ پچاس ہزار تھا۔ جائداد ملا کر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ کی مالیت نہ تھی۔

ذہانت

بچپن سے نہایت ذہین اور شوخ طبع تھے۔ یہی کیفیت آخر عمر تک رہی۔ بچپن میں چلبلی طبیعت کے سبب سے ایک وقت میں ایک جگہ بیٹھ کر جماعت نہ ہو سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور بھاگ گئے۔ پھر پڑھنے آئے اور جماعت بنی۔ بچپن میں مولوی عبدالخالق کے گھر کا مصالحہ پیسنے پر نوکری کیا کرتے تھے۔ پھر بڑے ہو کر نوکر ہوئے۔ اور قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ سپرد ہوا تو اس میں پنڈت شیو پرشاد انسپکٹر مدارس شریک ہو گئے۔ مولانا خود ہی ترجمہ کرنا چاہتے تھے لیکن پنڈت صاحب کے آگے کچھ نہ کر سکے تو ان کو پریشان کرنا شروع کیا۔ بامحاورہ ترجمہ بولتے۔ یہ لکھتے۔ درمیان میں انھوں نے پوچھا "کہو دیتے ہو" مولانا نے یہ لفظ بھی لکھوا دیا۔ انھوں نے پڑھ کر سنا تو یہ لفظ بھی پڑھ دیا۔ وہ خفا ہوئے اور کہا کہ "یہ داخل کتاب نہیں ہے"۔ انھوں نے یہ فقرہ بھی درج کر دیا۔ آخر انسپکٹر صاحب عاجز آ گئے۔

مولانا کے بعض لطیفے قابل ذکر ہیں۔ (۱) ایک مرتبہ سرسالار جنگ ثانی نواب لائق علی خاں بہادر شملے سے علی گڈھ جا رہے تھے۔ مولانا غازی آباد کے اسٹیشن پر جا کر ملے۔ انھوں نے باتوں میں یہ بھی کہا کہ آپ ناحق حیدرآباد سے چلے آئے اب بھی وہیں چلیے۔" مولانا نے فرمایا، "نمک خوار سرکار ہوں۔ مگر معافی کا خواستگار ہوں۔ اب جس حال میں ہوں وہی میرے لیے مناسب ہے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد جا کر تو پنشن پر نکالا گیا۔ اب دوسری مرتبہ جاؤں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پنشن بھی کھو آؤں۔" سرسالار جنگ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

(۲) حیدرآباد سے آکر دہلی میں قیام کیا تو انگریزی حکام ان کی خدمات اور کارناموں سے واقف نہ تھے۔ ایک مرتبہ دہلی میں کوئی جلسہ ہوا۔ ڈپٹی کمشنر نے اہل دہلی کو بلانے کے لیے ایک معمولی فہرست گشت کرائی۔ اس میں ان کا نام بھی تھا۔ انھوں نے فہرست کے حاشیے پر یہ لکھ دیا:

"اگر یہ سرکاری طلبی ہے تو سمن یا وارنٹ آنا چاہیے۔ دوستانہ بلاوا ہے تو چٹھی آنی چاہیے۔ اور یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں۔ اور جانا نہ جانا میری مرضی پر منحصر ہے۔ تو میں نہیں آسکتا۔"

ڈپٹی کمشنر اس تحریر کو دیکھ کر چونکا اور تحصیلدار سے پوچھا۔ جب ان کا حال معلوم ہوا تو تحصیلدار سے کہا کہ تم نے پہلے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ میں چٹھی لکھتا۔ چنانچہ اس نے الگ خط لکھ کر بھیجا اور زبانی معذرت کی۔

(۳) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ دہلی میں ہو رہا تھا اور مولوی نذیر احمد تقریر کر رہے تھے۔ اسی درمیان میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواج ہند جلسہ میں آئے، تھوڑی دیر بیٹھے، کچھ تقریر سنی اور رخصت ہو گئے۔ ان کے اٹھتے ہی مولانا پھر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے، اور ابھی لارڈ صاحب اسٹیج سے اترے ہی تھے کہ انھوں نے فرمایا:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق آیا باطل دور ہوا۔ ہاں باطل جانے ہی والا تھا) یہ سن کر سارا مجمع ہنس پڑا۔ لارڈ کچنر مصر میں رہ چکے تھے۔ عربی خوب جانتے تھے۔ دل ہی دل میں اس پھبتی کا مزا لیا ہوگا۔

(۴) اس کانفرنس کی صدارت ہز ہائینس سر آغا خاں نے قبول کر لی تھی۔ لیکن آنے میں دیر ہو گئی تھی اور جلسہ شروع ہو گیا تھا۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر ہو رہا تھا کہ سر آغا خاں آ گئے۔ وہ ایسے خوبصورت اور شاندار جوان تھے کہ اپنے جمال و وجاہت سے تمام جلسے پر چھا گئے۔ نواب محسن الملک نے مولانا کا سر آغا خاں سے تعارف کرایا۔ ان کے ہاتھ میں لکچر تھا۔ تعارف ہوتے ہی لکچر میز پر رکھ دیا اور بڑی متانت کے ساتھ آغا خاں سے خطاب کر کے فرمایا:

آفاق را گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

تمام جلسہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا۔ سر آغا خاں بھی منہ پر رومال رکھ کر ہنستے رہے۔ حاضرین نے مولانا سے بار بار پڑھوا کر سنا۔

(۵) ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ کابل ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آئے۔ عیدالفطر ۱۳۲۴ھ کی نماز دہلی میں پڑھی۔ جمعہ کا روز تھا۔ نماز کے بعد دربار کیا اور مخصوص شرفائے دہلی و ہند کو ملنے کے لیے بلایا۔ ان میں مولوی نذیر احمد بھی تھے۔ یہ جب امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو دیکھتے ہی عرب شاعر متنبی کا یہ شعر پڑھا؎

عِيْدٌ وَعِيْدٌ وَعِيْدٌ صِرْنَ مُجْتَمِعَهْ
وَجْهُ الْحَبِيْبِ وَيَوْمُ الْعِيْدِ وَالْجُمُعَهْ

(۶) حیدرآباد میں ایک ریویو بورڈ قائم ہوا تھا۔ اس کے تین ممبر تھے۔ مولوی دلیل الدین خاں، نواب اکرام اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد۔ ان میں سے مولوی دلیل الدین خاں بیمار ہو کر

تین عیدیں ساتھ جمع ہو گئی ہیں، روئے حبیب، یوم عید اور جمعہ۔

مشہور تھے۔ منشی اکرام اللہ خاں شوقین مزاج آدمی تھے۔ اور مولوی نذیر احمد کی کفایت شعاری بخل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے مولوی نذیر احمد سے بورڈ کے ممبروں کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا "ہم ارکان ثلٰثہ کُلُوا[۵] وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کے مصداق ہیں"۔

(۴) نواب محسن الملک عربی کے بڑے عالم نہ تھے۔ اور مولوی نذیر احمد اور نواب صاحب میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ایک روز حیدرآباد میں "مولویت" کا ذکر آگیا۔ کسی نے نواب صاحب کو مولوی مہدی علی کہا۔ مولوی نذیر احمد بولے کہ "اگر مہدی علی مولوی ہیں، تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خاں ہے"۔ چاند خاں ان کا قدیم ملازم تھا۔ لمبی داڑھی تھی اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔

قوتِ تقریر

حیدرآباد سے آکر مولوی نذیر احمد صاحب نے تصنیف و تالیف کے علاوہ قومی کاموں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ قدرت نے ان کو غیر معمولی قوتِ بیان عطا کی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی تقریر نے وہ اثر پیدا کیا اور مقبولیت حاصل کی کہ پھر ان کے بغیر کوئی مجلس گرم نہ ہوتی تھی۔ آواز، لہجہ، اندازِ بیان سب ایسے پائے کے تھے کہ ان کے جادو سے تمام جلسہ مسحور ہو جاتا تھا۔ اہلِ مجلس کو ہنسانا، رلانا ان کے قبضے میں تھا۔ چندے کی اپیل اس طرح کرتے تھے کہ حاضرین کی جیبیں جھاڑ لیتے تھے۔ کتنا ہی بڑا مجمع ہو ان کو چیخنے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف بلند آواز سے تقریر کرتے اور دور دور تک پہنچ جاتی۔ اکثر اپنی تقریر پہلے سے چھپوا لیتے اور اس کی مطبوعہ کاپی ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ لیکن تقریر میں تحریر کے پابند نہ رہتے۔ کہتے چلے جاتے اور سامعین کو بھی اپنی رَو میں بہا لیجاتے۔ سننے والے نفسِ مضمون سے زیادہ ان کے لب و لہجہ، فصاحتِ بیان اور طلاقتِ لسان کے گرویدہ ہوتے تھے۔ اور ان کے لطائف و

---

۵ یعنی کھاؤ پیو اور بے صرفہ نہ کرو۔

ظرافت کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ جب مولانا اپنی تقریر میں اصل مضمون کی طرف لوٹ کر آتے تو سامعین اس کے منتظر رہتے۔ وقت ختم ہو جاتا، مولانا بیٹھ جاتے اور حاضرین کو حسرت رہتی کہ

دامنے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

یہ بات ان کے ہم عصروں میں سے کسی میں نہ تھی۔ سر سید اور نواب محسن الملک اصول تقریر اور فن خطابت کے اعتبار سے مولوی نذیر احمد سے بہتر تھے۔ لیکن مجمع عام کے لئے ان کی تقریر ان سے زیادہ شاندار اور دلکش ہوتی تھی۔ سچ پوچھو تو یہ کہ سر سید و محسن الملک دونوں سے زیادہ بلکہ تمام مقرروں سے زیادہ مولوی نذیر احمد اپنی تقریر میں عربی کے ڈھلے ہوئے الفاظ اور محاورے، عربی کے فقرے، اشعار اور آیتیں جا بجا استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے طرز ادا، جوش بیان و فصاحت زبان کے سبب سے تقریر کی دلکشی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اس خداداد قابلیت سے بھی ملک و قوم کی بڑی خدمت کی۔ مولانا طبعاً بیباک اور ظریف واقع ہوئے تھے۔ صاف گوئی میں کبھی حد سے گزر جاتے تھے اور تلخ گوئی پر اتر آتے تھے۔ لیکن سامعین ان کی خاطر سے اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔

وفات

مرنے سے چند مہینے پہلے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ باہر آنا جانا، ملنا جلنا چھوڑ دیا اور علاج کی طرف بھی توجہ نہ کی۔ سمجھتے تھے کہ وقت آگیا ہے۔ آخر فالج ہوا اور چار پانچ روز بعد ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو جمعہ کے روز رحلت کی۔ خاکسار مؤلف نے قرآن مجید سے تاریخ وفات نکالی:۔

لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا [1]

(سورہ توبہ رکوع ۳) ۱۳۳۰ھ

---

[1] قرآن مجید میں خٰلدین بغیر الف ہے جس نے ایک عدد کو پورا کرنے کے لئے الف سے خالدین لکھ دیا ہے۔

دوسری تاریخ ہوئی " **یادِ فردوسِ خلد جایگہش** " (۱۳۲۰ھ)-

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے مولوی ذکاء اللہ صاحب کی کثرتِ تصانیف پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ وہ خود بھی بسیار نویسی اور زود نویسی میں کسی سے کم نہ تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن میں بعض ان کی اوّلیات میں شامل ہیں کہ ان سے پہلے اس طرز یا اس موضوع پر کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا، مثلاً زنانہ لٹریچر، اردو میں ناول کا طرز۔ ترجمۂ قرآن مجید کی سلاست اور تسلسل۔ الحقوق و الفرائض میں مضامین قرآن کی ترتیب۔ قانونی کتابوں کے ترجمے۔ یہ سب ان کی بے نظیر جودتِ طبع اور جدتِ فکر کے ثبوت ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف کا سلسلہ بڑے دلچسپ طریقے سے شروع ہوا۔ اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:-

"میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ... ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے مرآۃ العروس۔ چھوٹی کے لئے منتخب الحکایات۔ بشیر کے لئے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دئے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی چاٹ تھی کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے، اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ ورق کے لئے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم ہو گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا بے گمان تیار ہو جانا۔" (دربار اکبری لکچر ڈپٹی نذیر احمد)

اس کے بعد نذیر احمد صاحب ان کتابوں کی شہرت و اشاعت کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی عجیب اتفاق اور پُرلطف واقعہ ہے۔ یعنی ڈپٹی صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ

بشیر الدین کی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے کہیں ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو بشیر الدین نے مذکورہ بالا کتابوں کا نام بتایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے تعجب سے کہا کہ اردو میں ان ناموں کی تو کوئی کتابیں نہیں ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ یہ کتابیں ابا نے میرے اور آپا کے لئے لکھی ہیں۔ صاحب نے کہا اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور مرآۃ العروس، منتخب الحکایات اور چند پند کے قلمی نسخے لے آیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دیکھا اور مرآۃ العروس کو بہت پسند کیا۔ اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دیئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ اس پر ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی گھڑی انعام میں ملی۔ اس کے بعد تصانیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) ناول (زنانہ لٹریچر)

(۱) مرآۃ العروس مطبوعہ ۱۸۶۹ء

(۲) بنات النعش (مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ) جس میں لڑکیوں کو دستکاری اور عملی زندگی کی ترغیب دی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء

(۳) توبۃ النصوح جس میں سچی اسلامی زندگی کی تعلیم ہے۔ اس پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

(۴) محصنات یا فسانۂ مبتلا مطبوعہ ۱۸۸۵ء

(۵) ابن الوقت مطبوعہ ۱۸۸۸ء۔ غدر کے زمانے کا قصہ۔ انگریزی اور ہندوستانی اسلامی معاشرت کا مقابلہ۔

(۶) رویائے صادقہ۔ دہلی کے قدیم شریف خاندان کی زندگی۔

(۷) ایامیٰ۔ جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت اور فوائد بیان کئے ہیں۔

(۲) اخلاق

(۱) منتخب الحکایات۔ (۲) چند پند۔ (۳) موعظہ حسنہ

(۳) مذہب

(۱) ترجمہ قرآن مجید۔

(۲) الحقوق و الفرائض۔ ۳ حصے ۱۹۰۶ء میں لکھی۔

(۳) الاجتہاد۔ عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت ۱۵۰۸ء / ۱۳۲۴ھ میں لکھی

(۴) امہات الامہ۔ ازواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات

(۵) ادعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن مجید کی تمام دعائیں یک جا کر دی ہیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

(۴) منطق

(۱) مبادی الحکمت۔ اس رسالے میں علم منطق کی تعلیم کا جدید و دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے جو منطق کی مروجہ درسی کتابوں سے مختلف ہے۔ مثالیں بھی نئی نئی تلاش کی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مصنفہ ۱۸۷۱ء / ۱۲۸۸ھ

(۵) علم ہیئت

(۱) سماوات۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ گورنمنٹ نے اس پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ میں ترجمہ کی۔

(۶) قواعد

(۱) مایغنیک فی الصرف۔ (۲) صرف صغیر۔ عربی قواعد کے متعلق لکھیں۔

(۷) متفرق

(۱) رسم الخط۔ (۲) نصاب خسرو۔ (۳) فسانۂ غدر۔ (۴) مجموعہ لکچر۔ (۵) نظم بے نظیر نذیر (ان کی نظموں کا مجموعہ)

قانونی کتابوں کے ترجمے ان کے علاوہ ہیں۔ آخر عمر میں مطالب القرآن کے نام سے ایک ضخیم تصنیف کا آغاز کیا تھا لیکن تمام نہ کر سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا طرز تحریر

علامہ آزاد کی طرح مولانا نذیر احمد بھی **صاحب طرز خاص** ہیں اور ان کا طرز تحریر بھی سب سے الگ اور نرالا ہے کہ چند سطروں سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ ڈپٹی صاحب کی تحریر ہے۔ خالص دہلی کی زبان اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ زنانہ ناولوں میں شریف مستورات کی بہترین زبان ورنہ انداز اختیار کیا ہے۔ طرز بیان نہایت صاف، واضح اور زوردار ہوتا ہے۔ روانی و بیساختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ بات کو سمجھانے کے نئے نئے طریقے پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کی سی رنگین عبارت نہیں لکھتے، لیکن حسب موقع کبھی استعارہ و تشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک اجتماع اضداد عجیب ہے کہ ایک ہی تحریر میں کہیں نہایت مغلق و گراں عربی کے الفاظ و تراکیب و محاورات لکھتے ہیں، اور دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خاصکر لیکچروں میں انگریزی کے الفاظ اور محاورے بھی جا بجا لے آتے ہیں، گرچہ یہ اکثر بیجا ہوتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے طرز تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت جس میں ان کا کوئی ہمعصر شریک نہیں ہے، ان کی **ظرافت** ہے۔ ظریفانہ رنگ کا ناولوں اور تقریروں میں زیادہ موقع تھا۔ وہیں ہے اور بہت دلچسپ و خوشگوار ہے۔ ظرافت کو حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتے۔ اور صحیح موقع پر صرف کرتے ہیں۔

طرز نذیر احمد کی بے اعتدالی

ڈپٹی نذیر احمد بڑے ذہین و طباع تھے۔ بچپن سے طالب علمی شروع کردی تھی۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اخذ کرنے اور محفوظ رکھنے کی عادت تھی۔ زبان و محاورہ اور ادب و انشا سے فطری مناسبت و دلچسپی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ اصلی دہلوی نہ تھے اور دہلی کو وطن بنانا تھا۔ اس لئے دہلی کی زبان کو اہل زبان

کی طرح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لڑکپن اور آغاز شباب ہی میں پہلے طالب علمی اور
پھر شادی کے سبب سے دہلی کے شریف خاندانوں میں آمد و رفت اور ارتباط پیدا ہو گیا۔
ان کی ہمہ گیر طبیعت نے زبان دہلی کے تمام لوازم و محاسن بہت جلد حاصل کر لئے۔ پھر
تصانیف کے سلسلے میں اتفاق سے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کے لئے زنانہ
فسانے لکھے، اور ان میں ہو بہو زنانہ زبان لکھی۔ یہ زنانہ لٹریچر عرصہ تک پے در پے
تیار کرتے رہے۔ ہندی کی چندی اور بال کی کھال نکالنے کا طبعی شوق تھا۔ لڑکیوں
کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر کتاب میں ایک ایک بات کو نہایت تفصیل و وضاحت
کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب کی طبیعت و تحریر دونوں میں صاف بیانی،
گھریلو روزمرہ، زنانہ انداز بیان اور ٹھیٹ زبان راسخ ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ یہ
احساس جاتا رہا کہ یہ طرز تحریر ہر تصنیف کے لئے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے
بعد جب انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، مذہبی کتابیں، سیرت و سوانح مرتب کئے، تو
ان میں بھی عامیانہ بول چال، محاورے، کہاوتیں لکھ دیں۔ اور ایسا اسلوب بیان اختیار
کیا جو کہیں اس موضوع و فن کے مناسب نہ رہا، اور کہیں بزرگان دین۔ نبی کریم،
اصحاب کرام، اہل بیت اطہار (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی شان کے خلاف ہو گیا۔
اس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) الحقوق والفرائض میں سب سے پہلا فقرہ یہ لکھتے ہیں:۔

"کسی نے کیا اچھی تلی ہوئی، باون تولے پاؤ رتی بات کہی ہے کہ مَنْ
عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا تو اس
نے اپنے پروردگار ہی کو پہچانا) یعنی اپنے نفس کی معرفت خدا کی معرفت کی
دلیل ہے۔"

اس اقتباس کا پہلا جملہ حقوق و فرائض جیسے سنجیدہ موضوع کے لئے بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس کی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس تمام کتاب میں عقائد و اعمال، حقوق اللہ وحقوق العباد اپنی اسی بے تکلف اسلوب اور زبان و محاورہ میں لکھے ہیں، جس میں اس طرح کے مضامین زنانہ ناولوں میں فسانہ کے بڑے بوڑھے مردوں اور عورتوں کی زبانی لڑکوں لڑکیوں کے لئے بیان کئے ہیں۔ یہ انداز متانت موضوع کے لحاظ سے درست نہ سہی، لیکن اگر کوئی شخص ساری کتاب اسی رنگ میں لکھے تو اعتراض ہلکا ہوجاتا ہے۔ بہرحال فقرۂ مندرجہ میں کوئی سوء ادب نہیں۔ لیکن ڈپٹی صاحب کو یہ طرز بے محل اختیار کرنے میں بھی باک نہ تھا۔ مثلاً

(۲) الاجتہاد میں تذکرۂ ہجرت میں لکھتے ہیں :۔

"خدا کا کرنا، پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معدوم ہوگئی۔ اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے۔"

(۳) اسی کتاب میں پھر لکھتے ہیں :۔

"اب تم ان حالات حقہ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعوی رسالت کرکے کسی مفاد کی توقع کرسکتے تھے۔ اسی دعوے نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی کہ ؎

جھڑکی تو مدتوں سے مدارات ہوگئی — گالی کبھو جو دی تھی سو اب بات ہوگئی
باقی ہے مار کھانی تو سن لوگے ایک دن — اس کی گلی میں یہی یہ اوقات ہوگئی

اسی دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا۔" (الاجتہاد صـ۸۳)

(۴) امہات الامۃ میں اخلاق نبی کریم اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق یہ فقرہ لکھتے ہیں۔

"...... تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی
منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسے پیغمبر صاحب تیرہ برس
دشمنوں کے نرغے میں چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے۔ یہاں تک کہ آخر کو
ایسے ثبات جگہ سے اکھڑ گئے اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی۔"

اس بے ادبی و گستاخی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی "دستک گئے" "درگت ہوائی تھی" "چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے" جیسے محاوروں کا اس قطعے کے چسپاں کرنے کا یہ محل نہ تھا۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے ذہن سے فرق مراتب اٹھ گیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ ان کو ادب ملحوظ نہ تھا یا قصداً بے حرمتی کی۔ بلکہ اپنے طرز تحریر کی عادت کے سبب سے ان محاوروں کو ایسے موقع پر بھی وہ ادب و احترام کے منافی نہ سمجھتے تھے اور یہی ان کے نقص و عقل کا دھوکا تھا۔ ان رکیک اور سوقیانہ الفاظ سے اس ذات گرامی کو ارفع و اعلیٰ مقدس و اطہر سمجھنا چاہیے تھا۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس طرح کے الفاظ محاورے اور امثال جب ڈپٹی صاحب نے اوروں کے فرضی اشخاص کے یا اپنے متعلق لکھے ہیں تو ناموزوں اور ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً ایک لکچر کے آغاز میں اپنا حال بیان کرتے ہیں:-

"مجھ کو شعر گوئی کا شوق ہے اور نہ سلیقہ۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ناز و بہتیرا اچھل کود کرنا چاہتی ہے مگر ندوے نہیں بیٹھنے دیتے۔ جب جب کوئی صاحب مجھے لکچر دینے بلاتے ہیں اور بلانے والے تو بہت ہیں اس لئے کہ انجمنوں اور سالانہ جلسوں اور لکچروں کا تو در بہ کھل پڑا ہے۔ مگر نئے لکچروں کی ہوا نہیں لگنے دیتا کہ کھیلوں کھیلوں کام بڑھئی کا بگاڑتا پھروں......"

(لکچر ایجوکیشنل کانفرنس سنہ ۱۹۰۰ء بمقام رہتک)

یا مثلاً الاجتہاد میں اپنے آپ کو خطاب کر کے لکھتے ہیں :-

"تم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو۔ تو گدھی کمہار کی، تجھے رام سے کو کیا۔ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگوا تیلی۔"

لیکن جب ایسی باتیں خدا و رسول کی زبان سے نکلواتے ہیں تو نہایت نازیبا ہو جاتی ہیں۔ جیسے توبۃ النصوح میں اللہ تعالیٰ کا قول نصوح کے لیے لکھا ہے :-

"ذرا شفقت کر کہ ہم دو دن ... سے میری آنکھیں بچھی ہیں۔"

اسی طرح کی بے اعتدالیاں قرآن مجید کے ترجمہ میں کی گئی ہیں۔ اس طرز تحریر میں ایک ذرا سی بات تھی جس کو ملحوظ رکھنے سے یہ تمام تصنیفات بے عیب ہو جاتیں۔ اور جس کا خیال نہ کرنے سے یہ اعتراضات واقع ہو سکے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی ہر نوع و موضوع کی کتاب اپنے مخصوص بے تکلف اسلوب میں لکھنا چاہتے تھے۔ اس اصول پر اعتراض سہی لیکن بے اصولی کے علاوہ کوئی اعتراض نہ ہو سکتا اگر احترام و ادب کے موقع پر صرف سادگی و صفائی کو قائم رکھتے اور ابتذال و عامیت نہ برتتے۔ اور خدا و رسول اور بزرگانِ دین کے متعلق ایک محاورے نہ لکھتے۔ انھوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں۔ نثر کے فقرے صفحے کے صفحے بزرگوں کے تذکرے میں ایسے بھی لکھے ہیں جن میں قابلِ اعتراض زبان نہیں ہے تو ممکن و سہل تھا کہ وہ یہاں بھی نہ ہوتی جہاں ہے۔ اس سے ان کے اسلوب خصوصی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ ڈپٹی صاحب کو اس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔

دوسرا پہلو بے اعتدالی کا یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی کے الفاظ بڑی کثرت سے بالکل بے ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات تقریروں میں زیادہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بھی انھوں نے سامعین کی دلچسپی اور دل لگی کے لیے اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ان کی تقریریں اس کے بغیر بھی ہمیشہ دلکش ہوتی تھیں۔

انگریزی الفاظ کا استعمال سب سے پہلے سرسید نے شروع کیا تھا، لیکن ان کے ہاں ناگوار کثرت نہ تھی۔ مولانا حالی نے بہت زیادہ استعمال کیے، اور مولانا نذیر احمد نے تو انتہا کر دی۔ سرسید کچھ شُدبُد انگریزی جانتے تھے۔ حالی اتنی بھی نہیں۔ نذیر احمد اچھے خاصے ماہر تھے۔ ان کو اس نئی زبان سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت و ترغیب ان کے کانفرنسی لکچروں کا مقصود تھا۔ انگریزوں اور انگریزی دانوں کو خوش کرنے کا بھی شوق تھا۔ غرض انھوں نے اپنے ابتدائی لکچروں ہی سے انگریزی الفاظ کا استعمال شروع کر دیا۔ اور پھر اس کو اتنا بڑھایا کہ مفرد الفاظ کے علاوہ، مرکبات، محاورے، جملے، ضرب الامثال بھی بے تکلف لکھنے بولنے لگے۔ یہ ذکر بے ضرورت، بلا وجہ اور غیر مشہور الفاظ کا ہے۔ مثلاً

۱۔ خمرن یہ کوانٹیٹی[۱] یا کوالیٹی[۲] کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے درد کی کافی دوا نہیں۔

۲۔ یہ ایک زبردست ثبوت ان کی نیچر[۳] میں ہے۔

۳۔ جن صفتوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچرلی[۴] اس بات کے مقتضی ہیں

۴۔ اس امام کے ہاتھ پر فارملی[۵] بیعت کرو۔

۱۔ مقدار۔

۲۔ صفت

۳۔ حایت

۴۔ طبعاً یا فطری طور پر۔

۵۔ باقاعدہ

۶ - انگریزوں کی طرح کی ہائی لائف[۵۱] نہ رکھیں

۷ - انگلش ہیبٹس[۵۲] کا منہ چڑانے لگے ہیں

۸ - ...... مقلدین، غیر مقلدین، اور ہر ذات دو ذات کی لسٹ بڑے غل غپاڑے بڑے جوش و خروش سے نئی قسم کے مسلمان تجویز کی ہیں

(ماخوذ تقاریر لکچر ایجوکیشنل کانگریس منعقدہ ۱۸۸۹ء ... علی گڑھ)

۹ - اپنے تئیں خیر الاخلاف بعد السلاف[۵۳] و در حقیقت ... کی کوشش کریں۔[۵۴]

۱۰ - آڈینس[۵۵] قرآن سے اوور ڈوسڈ[۵۶] ہو گیا ہے۔ (لکچر ... مقام ...)

اسی طرح عربی کے الفاظ و مرکبات بالکل بے ضرورت، محض اپنے شوق و عادت کے سبب سے بے تکلف لکھتے ہیں۔ آیات قرآنی، عربی امثال و اشعار کا ذکر نہیں، وہ تو ڈپٹی صاحب کی تحریر کا خاص جوہر ہیں۔ بلکہ وہ عربی کے الفاظ و محاورات اجزائے جملہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ بغیر ان کے جملہ پورا نہیں ہوتا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً

۱ - جس کے افراد کے دلوں میں وہ لا کلام کہ الشاق[۵۷] ... کی ذرہ سی گدگدی بھی نہ ہو میں نہیں سمجھتا کہ اس قوم کا کوئی شخص بھی کسی بات پر بھی فخر کر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم مسلمانوں میں بالنسبۃ الی اقوام اخر[۵۸] تعصب قومی بہت کم ہیں ... گیا ہے۔

---

۵۱ اونچی شان دار زندگی   ۵۲ انگریزی طریقے اور عادتیں۔

۵۳ سب سے آخری لیکن سب سے کم وقعت نہیں۔

۵۴ یہ انگریزی جملہ عربی کی مترادف ہے۔ یعنی اپنے اسلاف کی شان کے لائق

۵۵ مجمع حاضرین   ۵۶ وہ مریض جس کو مقدار سے زیادہ دوا پلا دی گئی ہو۔

یعنی حاضرین جلسہ کو ضرورت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔

۵۷ ... کے لئے ... کا حکم ہے۔   ۵۸ دوسری قوموں کے مقابلے میں۔

۲۔ کچھ اس طرح کا ٹیڑھا وقت آ گیا ہے کہ اس زمانے کے اسلام اور خوشدلی میں مانعۃ الجمع کی سی نسبت قائم ہو گئی ہے۔ بعضٌ وقلیلٌ ما ھُم[ف۱] جن کو خوش ہونے کا موقع ہے، خدا کا فرمودہ اِنّمَا المومِنُونَ اِخوَۃٌ ان کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتا ہے۔

۳۔ یا ایک چھوٹا سا ضلع کَیْفَ مَا اتَّفَقَ[ف۲] اختیار کر دا ور تحقیقات کر کے ایسے لوگوں کی فہرست بنا ؤ جو صاحب زکوٰۃ ہیں۔ (جمہ اقتباسات از لکچر ۱۸۸۹ء)

تیسری بات یہ کہ ڈپٹی صاحب مضمون کی تکرار بہت کرتے ہیں، اور بات کو پیچ در پیچ فقرے کو بہت طویل کر دیتے ہیں۔ یہ انداز خطیبانہ ہے۔ خطبوں اور لکچروں کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈپٹی صاحب اپنی ہر تصنیف میں یہ طرز برتتے ہیں۔

چوتھے، ہر قسم کی تصانیف میں محاورات و امثال کی کثرت کے سبب سے متانت و وقار قائم نہیں رہتا۔ یہ چیزیں جہاں شوخی و بے ادبی کی حد تک نہیں پہنچتیں، وہاں بھی عبارت و اسلوب کا وقار کھو دیتی ہیں۔ یہ انداز روزمرہ کی بے تکلف گفتگو کا ہے اس لئے ناولوں کے علاوہ کسی کتاب میں اختیار کرنے کا نہ تھا۔ حد یہ ہے کہ ترجمہ قرآن مجید بھی میں کہیں کہیں پایہ متانت سے گر گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس طرزِ عبارت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے، اور وہی اس کی تاویل ہے۔ وہ یہ کہ نذیر احمد صاحب نے اپنی کتابیں مورخ و سیرت نگار اور مفتی و مفسر کی حیثیت سے نہیں لکھیں بلکہ ادیب نثار پرداز کی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے ناول و قصص اور فقہ و سیرت سب کا ایک رنگ بیان ہے۔ یہی توجیہ و معذرت مولوی محمد حسین آزاد کے

ف۱ بعض لوگ اور وہ تھوڑے سے ہیں۔

ف۲ جو کوئی ہو۔ یعنی کوئی ضلع ہو۔

طرز تحریر کے لئے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں دونوں صاحبوں کا مرتبہ صرف زباندان و انشا پرداز کا رہ جاتا ہے۔ مورخ و محقق کی شان باقی نہیں رہتی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی اولیات اور مرتبہ

(۱) ڈپٹی صاحب سے پہلے کا تمام اردو لٹریچر ہمارے سامنے ہے۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی کتابیں مفقود ہیں۔ نذیر احمد پہلے مصنف ہیں جنہوں نے زنانہ لٹریچر اس اہتمام و کثرت کے ساتھ مہیا کیا۔ یہ کتابیں اپنی جامعیت و حسن ترتیب میں اردو زبان اور نذیر احمد کی اولیات میں داخل ہیں۔ اور نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی آج تک بے مثال و ناگزیر ہیں۔ نذیر احمد کے بعد صرف راشد الخیری نے قدیم تہذیب و معاشرت کو اپنی زنانہ تصانیف میں زندہ رکھا ہے۔ اب عورتوں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔

(۲) اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی صاحب ہیں۔ بعید از قیاس داستانوں کی جگہ عملی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصہ کی صورت میں پیش کرنے کا انہی کے سر سہرا ہے۔ اردو کے دوسرے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ان کا فسانۂ آزاد دسمبر ۱۸۷۸ء سے اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اور ۱۸۸۰ء میں بصورت کتاب چھپا ہے۔ لیکن نذیر احمد صاحب کا پہلا ناول مرآۃ العروس فسانۂ آزاد سے دس برس پہلے ۱۸۶۹ء میں شائع ہو چکا۔ اور دوسرا ناول بنات النعش بھی سرشار کے فسانہ سے پہلے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔

(۳) ترجمۂ قرآن مجید ایسی سلاست، شگفتگی اور تسلسل کے ساتھ نذیر احمد کی ایجاد ہے۔ اور ترجمہ کو مقابل کے صفحے پر چھاپنا دلچسپ جدت۔ اب صرف ترجمہ کے صفحے کے صفحے بے تکلف پڑھتے چلے جائیے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلسل و مربوط کتاب پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات کسی قدیم ترجمہ میں نہ تھی۔ بعد کے ہر ترجمہ میں سبے

اور یہ نذیر احمد صاحب کا فیضان ہے۔

(۴) عقائد و مسائل اسلامی کا استنباط و ترتیب قرآن و حدیث سے جس طرح نذیر احمد صاحب نے الحقوق وغیرہ میں کیا ہے، یہ بھی انھیں کی اختراع ہے۔ بعد کو اس کی کبھی تقلید ہوئی اور ہو رہی ہے۔

(۵) زبان و انشا پردازی کا جو لطف و مزہ ان کی تمام تصانیف میں ہے وہ ڈپٹی صاحب کا انفرادی و امتیازی رنگ ہے جس میں بجز آزاد کے ان کے ہمعصروں میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ اور **شوخی و ظرافت** کے وہ تنہا مالک ہیں۔

اس لحاظ سے ڈپٹی نذیر احمد بھی **موجد و صاحب طرز** کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے احسانات اردو زبان و ادب پر نہایت گراں بہا ہیں۔

نمونہ تصانیف (۱) **مرآۃ العروس**: نذیر احمد کا پہلا تمثیلی قصہ ناول ہے۔ دہلی کے شریف خاندان کی معاشرت کا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے۔ یہ فسانہ اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کے افراد قصہ اصغری، اکبری اور ماما عظمت آج تک زبان زد ہیں اور مثال میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مرآۃ العروس کی مقبولیت کا ذکر ڈپٹی صاحب نے بنات النعش کے دیباچے میں کیا ہے:-

"مرآۃ العروس کو پہلے پہل چھپے ہوئے اب تیسرا برس ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے اسی دو برس میں اس کی کوئی آٹھ نو ہزار دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور ہر سمت سے طلب اور ہر طرف سے مانگ چلی آتی ہے۔ ایک بابو صاحب اپنی بنگالی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ایک پنڈت جی بھاشا کا۔ بس ورنہ میری استدعا و فرمائش سے، بلکہ اپنی آرزو و خواہش سے پسند و قبول کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی۔"

ان فسانوں میں مکالمہ کا طرز تحریر قدیم داستانوں سے جداگانہ ہے اور نذیر احمد صاحب نے اس کو پہلی مرتبہ اردو میں پیدا کیا ہے۔ یہ اسلوب انگریزی میں ناول کا نہیں بلکہ ڈرامے کا ہے کہ کسی فرد قصہ کا نام آغاز سطر میں لکھ کر اس کے آگے اس کی گفتگو لکھی جائے انگریزی ناول کا طرز مکالمہ نذیر احمد صاحب کے زمانے میں انگریزی زبان و ادب سے ناآشنا لوگوں میں مقبول ہونا دشوار تھا۔ اس لئے ڈرامے کا انداز اختیار کرنا مناسب تھا۔ یہ چیز ایسی مقبول ہوئی کہ شرر و سرشار سے لیکر اب تک اسی کی تقلید ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کے ادب جدید میں مختصر فسانے اور بعض ناول انگریزی مکالمے کے طرز میں البتہ لکھے گئے ہیں۔ اور اب عادت کے سبب سے نامانوس نہیں رہا۔

نذیر احمد صاحب کی ایک وضع خاص یہ بھی ہے کہ ناولوں میں طویل اخلاقی وعظ و تقریر ضرور داخل کرتے ہیں۔ مرآۃ العروس بھی اس سے خالی نہیں۔ اس کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

> لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ماں باپ سے الگ ہونے پیچھے ان کی زندگی کیونکر گذرے گی دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پر ہے دنیا میں کھانا کپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں اور یہ سب عقل کی روپیہ کا ہے۔ عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ کمانے اور روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں دیکھو مرد کیسی کیسی سخت محنت کرتے ہیں کوئی بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے کوئی گاڑی ڈھوتا ہے سنار لوہار ٹھٹھیرا۔ کسیرا۔ کندہ گر۔ زرکوب۔ دبکیہ۔ تارکش۔ ٹھپہ ساز۔ جڑیا۔ سلمہ ستارے والے۔ زردوز۔ چوب ساز۔ مینا ساز۔ تمغہ گر۔ سادہ کار۔ صیقل گر۔ آئینہ ساز۔ نقش دوز۔ خرادی۔ نعلبند۔ آئینہ ساز۔ کامدانی والا۔ سان گر۔ سیار

ڈھلیا۔ بڑھئی۔ خرادی۔ ناریل والا۔ کنگھی ساز۔ بنس پھوڑ۔ کاغذی۔ جلاہہ۔
رفوگر۔ رنگریز۔ چھیپی۔ درزی۔ دستار بند۔ علاقہ بند۔ نیچہ بند۔ موچی۔ مہرکن۔
سنگتراش۔ حکاک۔ معمار دیگر۔ کمہار۔ حلوائی۔ تیلی۔ تنبولی۔ رنگساز۔ گندھی
وغیرہ جتنے پیشہ والے ہیں سب کے کاموں میں برابر درجے کی تکلیف ہے۔
اور یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے اور اٹھاتے ہیں لیکن اس
بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عورتوں سے سوائے کھانے اور سو رہنے
کے کوئی کام دنیا کا متعلق نہیں ہے۔ بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں
مرد اپنی کمائی عورتوں کے آگے لاکر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے اس کو
ایسے بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اُٹھاتی ہیں کہ آرام کے سوائے عزت اور
نام پر حرف نہیں آنے پاتا۔ بس اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی جب تک ایک
پہیہ مرد کا اور دوسرا پہیہ عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی مردوں کو روپیہ کمانے کے
بعد اتنا وقت نہیں بچتا کہ اس کو گھر کے چھوٹے کاموں میں صرف کریں۔ اے لڑکو
وہ بات سیکھو کہ مرد ہو کر تم سے کام آئے اور اے لڑکیو وہ ہنر حاصل کرو
کہ عورت ہونے پر تم کو اس سے خوشی اور فائدہ ہو بیشک عورت کو خدا نے مرد
کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا ہے لیکن ہاتھ پاؤں کان۔ آنکھ۔ عقل۔ سمجھ۔ یاد
سب مرد کے برابر عورت کو دیے ہیں لڑکے انھیں چیزوں سے کام لے کر
عالم۔ حافظ۔ حکیم۔ کاریگر۔ دستکار ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشاق ہو جاتے
ہیں لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں بے ہنر
رہتی ہیں اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا
وہ مردوں کی طرح دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں جیسے نورجہاں بیگم۔
زیب النساء بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکہ وکٹوریہ یہ وہ عورتیں ہیں حقوق

نے ایک چھوٹے سے گھر اور کنبے کا نہیں بلکہ ملک اور جہان کا بندوبست کیا۔
(۲) **بنات النعش**۔ اس کا موضوع خود مصنف اس کے دیباچے میں بتاتے ہیں:-

"یہ کتاب اسی مرآۃ العروس کا گویا دوسرا حصہ ہے۔ وہی بولی ہے، وہی طرز ہے۔ مرآۃ العروس سے تعلیم اخلاق و خانہ داری مقصود تھی۔ اس سے وہ بھی ہے مگر ضمناً، اور معلومات علمی خاصۃً۔"

چنانچہ بنات النعش میں حساب کی دلچسپ باتیں، تاریخ، جغرافیہ، علم ہیئت، جسمانی ریاضت، حفظان صحت وغیرہ مختلف معلومات فراہم کی ہیں۔ اور فسانہ کے اندر اشخاص کے دوران گفتگو میں سمجھائی ہیں۔ مثلاً

(الف) **حسن آرا**۔ خیر اب وہ زمین کا گول ہونا ثابت کیجئے کیا آپ اس بات کو ٹالنا چاہتی ہیں۔

محمودہ۔ ہاں تو یہ انگنائی پچاس گز لمبی ہے اس سرے سے اس سرے تک پینتیس یعنی پانچ کم دو سو پھیرے کرو تو ایک میل ہوا اور دو میل کا ایک کوس ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ اوہو اتنا بڑا میل اور اتنا بڑا کوس ہوتا ہے۔

محمودہ۔ اب قطب صاحب کی لاٹ کو فرمایئے کہ کے ہزار کوس لمبی ہے۔

حسن آرا۔ میں تو جانتی ہوں کہ اس حساب سے پوری میل بھی لمبی نہ ہوگی

محمودہ۔ بیشک میل کیا میل کا دسواں حصہ بھی نہیں اور زمین بت دل مینوں کے حساب کتنی بڑی ہے چوبیس ہزار میل اس کا دور ہے مردوں میں بارہ کوس کی منزل مقرر ہے یعنی مرد لوگ جو سفر کرتے ہیں تو بارہ کوس روز چلے جاتے ہیں اور واقع میں آرام کے ساتھ

سفر کیا جائے تو بارہ کوس دن بھر کے چلنے کو بہت ہے اس حساب
سے اگر کوئی آدمی ناک کی سیدھ چلنا شروع کرے تو پانچ برس
میں جہاں سے چلا تھا وہیں آ کر کھڑا ہوگا اور اس کا صرف ایک پھیرا
پورا ہوگا۔

حسن آرا۔ اچھا تو کیا جب جو میں خیال کرتی ہوں تو زمین بہت ہی بڑی ہے
پھر تم نے کیوں کہا کہ تو پچیس ہزار میل کا دور ہے۔

محمودہ۔ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے محنت اٹھا کر برسوں سفر
کیا اور تمام دور ناپ ڈالا۔ خشکی کی راہ تو سیدھا چلنا مشکل ہے
کہیں کہیں بڑے بڑے دو دو تین تین کوس کے اونچے ٹیلوں
کی چڑھائی سخت دشوار گزار پہاڑ ہیں کہیں سیکڑوں کوس کے
جنگل ہیں جن میں نہ کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانا ہے نہ پانی کا آسرا نہ
راہ نہ سڑک مگر سمندر میں جہازوں پر لوگوں نے سفر کیا ہے اور
قطب نما کے سہارے سے سیدھ لگائے چلے گئے اور آخر کو
وہیں آموجود ہوئے جہاں سے چلے تھے کیا اب بھی زمین کے
گول ہونے میں کچھ شک و شبہ ہے۔

اب بنات النعش کے اصل قصہ کے آخری حصہ کا اقتباس یہ ہے: —

"جب اس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہنچی تو ہر چند گھر والوں نے اس کو
مکتب جانے سے روکا مگر اس کو مکتب سے ایسا کچھ انس ہو گیا تھا کہ ایک دم
مکتب سے جدا رہنا اس کو شاق تھا۔ حسب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں تک
کہ مانجھوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے تب ناچار سلطانہ بیگم خود
استانی صفوری خانم کے پاس گئیں سلام دعا اور مزاج پرسی کے بعد

سلطانہ بیگم بولیں استانی جی تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی آج جاؤں
کل جاؤں لیکن تمہاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر ہے۔ ایک دم کی چھٹی نہیں
ہے۔ سیتی میں نہیں پروتی میں نہیں مگر کام ہے کہ سمٹنے ہی میں نہیں آتا آخر آج
میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی سو کام کاج کا حرج کیا اور میں نے کہا کہ چلوں ذرا
کھڑے کھڑے استانی جی سے تو مل آؤں۔

استانی جی۔ درست ہے یہی تو کام کا وقت ہے آپ نے ناحق تکلیف
کی مجھی کو بلا بھیجا ہوتا۔ میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں
لگی رہتی ہوں جوڑے جو میں نے سینے اور مصالح ٹانکنے کو
آپ سے منگوائے تھے سب تیار ہیں۔ پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا
کہ جوڑے ماشاء اللہ بہت بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے
بیاہ کے گھر جانے والے ہیں ایسا نہ ہو یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں مگر
نہیں حسن آرا بیگم کی محبت سے لڑکیوں نے خوب تن جی لگا کر
سیا اور مصالح بھی بہت ہی صفائی سے ٹانکا اس جوڑی
گلبدن کے پاجامے میں جو میں نے پروں سلوا کر بھیجی ہے ذرا
کلیوں کا گوکھرو کھینچ زیادہ گیا ہے بہتیرا شہزادی کہتی رہی کہ استانی جی
ذرا ادھیڑ کر پھر ٹانک دوں میں نے کہا خیر رہنے بھی دو ادھیڑنے
سے گوکھرو خراب ہو جائے گا آئندہ اس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا پھڑک گئیں
اور کہنے لگیں پھر کہاں مردوں کی بنتی اور کہاں عورتوں کی۔

زینب۔ بھلا مردوں کو یہاں کیا ذکر۔

مغلانیاں۔ اے حضور یہ جوڑا میاں غنی جان درزی کے ہاتھ سے بھی نکلا ہو

معلوم ہوتا ہے اسی سے ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے تو لونڈیوں
کے عرض کرنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتوں کا کام کیسا ہی سچل کیوں نہ ہو
مردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں — کہاں کے علی جان اور کیسے مرد یہ جوڑا تو میری استانی جی کے
مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور انھیں نے اس میں مصالح ٹانکا
ہے یہ سن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی
تھیں اور کہتی تھیں حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں
کے ہاتھ میں یہ صفائی اور یہ ستھرا پن ہم نے تو نہیں دیکھا۔

استانی جی — خیر وہ جوڑوں کی سلائی مجھ کو بھی پسند ہے۔ پھر آپ نے
حسن آرا بیگم کے جوڑے بیس بیس دیے ہوتے لڑکیاں تو خوشی خوشی
سی دیتیں۔

سلطانہ بیگم — اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا مغلانیوں
سے تو میں نے صرف موٹا کام یعنی چاندنیاں ہوئیں گدڑیاں ہوئیں
دسترخوان ہوئے سوزنیاں ہوئیں تو بس ان سے۔ غلاف تکیے توشک
لحاف اس طرح کی چیزیں البتہ مغلانیوں نے سی ہیں۔ باقی شب خوابی
کے کپڑے باقی پہننے کے کپڑے اکثر تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے سے
جی اماں کے یہاں سے سی دیے گئے۔

استانی جی — آئی خیر سے حسن آرا بیگم کو ایک یہ ہزاروں اور گھس پس کر پہنائے
گی ہوں۔

سلطانہ بیگم (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں استانی جی دعا کیجیے اللہ نصیب
کرے۔ بیٹیوں کا بھی کچھ عجب نازک معاملہ ہے کن کن منتوں سے

پالو پرورش کرو اور پھر دھن پرایا کا پرایا۔ کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی
ورنہ میں حسنا کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ شہر میں ایک
سدھیانہ کرکے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی اور
کان اینٹھا ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی باتیں
حسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھی چڑھی۔ میں نے کہا
حاشا ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے گی میں شہر میں اب بیٹی نہ
دوں گی کالا منھ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے
سو استانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے خدا کے
ہاتھ شرم ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہیے اول تو جہیز والے خود بڑے
رئیس ہیں دوسرے خاک چاٹ کر رہتی ہوں آپ انشاء اللہ دیکھ
لیجئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام
ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو الٹا کہنا
دیکھئے گا کیا آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم
ہوتا۔

سلطانہ بیگم۔ فرق آپ کی عنایت سے زمین آسمان کا ہے آپ کے فیض تعلیم
نے خاک کو اکسیر تانبے کو کندن ذرے کو خورشید پتھر کو لعل
سفید جیوں کو آدم حسنا کو ماشاء اللہ حسن آرا بیگم بنا دیا اس کی
خوبی تقدیر کی یہی ایک بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی
اس کی استانی بنیں۔ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں
پر کیا ہے کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہون منت رہیں گے۔

مگر جب سے حسن نے پیاری کی تیاری ہوتے دیکھی ہے کچھ سہم سی گئی ہے یونہیں گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا اور بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے ارادہ تھا کہ پورے سینے بھر مایوں بٹھاؤں گی اس کی حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ برسوں سے بہتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے رنگت زرد ہو گئی ہے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں چہرہ دیکھو اداس صورت دیکھو غمگین میں کہتی ہوں اس کو اتنی عمر میں فکر کیوں ہے اس عمر میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح نادان نہیں ہیں ماشاءاللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا خیال رہا ہوگا۔

سلطانہ بیگم۔ گھر کی تو اس کو مطلق پرواہ نہیں البتہ مکتب اس کی جان ہے آپ کو دیکھے بغیر جی کا ڈر ہے گا۔

استانی جی۔ میں سمجھ گئی اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہوتا ہی ہے۔

(۳) توبۃ النصوح۔ ان فسانوں میں بہترین کتاب ہے۔ اس کا موضوع مقصود تعلیم دینداری ہے۔ اس کا قصہ، واقعات کا تسلسل، کردار اشخاص کی موزونیت، مکالمات کا تناسب و برجستگی، سب نہایت خوبصورت و دلکش ہیں۔ یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے انتخابات مدارس کے نصابات میں ہمیشہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے بعض حصے خاص طور پر بہت دلچسپ ہیں۔ ایک نصوح کا خواب، دوسرے نعیم و مرزا ظاہر دار بیگ کا معاملہ۔ دونوں بہت طویل ہیں۔ اس لئے صرف دوسرے

کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نصوح کا بڑا لڑکا کلیم ماں باپ سے روٹھ کر گھر سے نکلتا ہے اور اپنے ایک دوست کے گھر جاتا ہے۔

کلیم اور مرزا ظاہردار بیگ

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ باپ اس کا ۔۔۔ وہ بھی حقیقی نہیں ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب ریذیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ماں جاہ مہ کہ دو مہرے، بہ اعتبار منصب اردلی کا جمعدار تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی اس پر خود اس کی رشوت ستانی بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد اس کے روزگار سے سوا ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودے کہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمے لیا۔ جمعدار اپنی حین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی کا ملال کبھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اور گرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر گئے مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت محل سرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات
روپیہ کی کل کائنات اس پہ مرزا کی شیخی اور خود یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا
تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل
آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت
زبردستی اُن میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان کسی کو ماموں جان۔ کسی کو خالو جان
بناتا اور وہ لوگ اس کے ان عالی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔
ادنیٰ حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اُن کی دیکھا
دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں مگر امیرزادگی
نبھتی تو کیسے نبھتی۔ دوکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا
بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی۔ سر پر دوہری بیل
کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے اور شبنم یا ململ سی
تنزیب۔ نیچے کوئی ترحدار کا سا ڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بنات مگر سات
روپیہ گز سے کم کی نہیں۔ خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شانی ململ کی
آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل
ٹکی ہوئی سرخ نیفہ کا پاجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر
نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو
نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا ریشمی ازاربند
گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے تفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھو تو
مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے
چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ چند روز میں تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلاناغہ آتے اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے۔

کلیم ۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی ۔ کون مرزا۔

کلیم ۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی ۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنی کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرے کہ جلدی سے کلیم نے کہا کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟

لونڈی ۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم ۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ مولانا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی۔ ارے کمبخت یہ کہیں مرزا ماشے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں وہ جو ہے۔ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے جولاہوں کی تال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اُس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے اہا آپ ہیں معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ پہنیے گا کہاں میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ۔ تو چلئے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ سنے میں بھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک عمارت پرانی چھوٹی سی مسجد

ہے وہ بھی مسجد ضرار[ع] کی طرح ویران وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلا نہ طالب علم نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھڑنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار ناچار اسی مسجد میں ٹھیرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو کتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا [illegible] بطور دفع دخل مقدر [illegible] لگے کہ [illegible] کے گھر میں کئی دن سے طبیعت [illegible] ہے۔ خفقان کا [illegible] خفقان قلب کا روز ہے۔ جب جو میں آپ کے پاس [illegible] تو ان کو غشی [illegible] اس سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت [illegible] کی فرمانے کی [illegible] ہے۔ کلیم نے آپ کی [illegible] اپنا [illegible] جو کہہ سنا

مرزا۔ پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب [illegible] رہنے کا [illegible] تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیریت تب [illegible] آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ [illegible] جب [illegible] دیکھو [illegible] اور [illegible] وظیفہ کی [illegible] سے اجازت دے گا [illegible] کا [illegible] عدالت میں [illegible] مشہور ہے۔

کلیم۔ یہ جو کیا ہے [illegible] تھے کہ [illegible] یہاں دو ہری [illegible] محلہ [illegible] دیوان خانے کی بنیاد [illegible] حوض [illegible] حمام [illegible] اور [illegible] عمارت کی قسم سے

ع پیغمبر صاحب کے وقت میں بعض لوگوں نے ضد میں آکر دوسری مسجد کو اجاڑنے کے لیے ایک مسجد بنائی تھی۔ پیغمبر صاحب نے اُسے ڈھا دیا

کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے اُن سے ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہوا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل لوگ اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے صحبت نامناسب دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ بند و بست کا حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے اندر باہر دا و یلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھیرتا۔ اب آپ کو گھر سے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر کچھ دنوں بھی اد ان اور مریضہ کی تیمار داری کروں۔

کلیم ۔ خیر مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا ۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جاویں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی بہت کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہرچند کھانے کے نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض ہی نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا ۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم ۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا ۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔

دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک دکان کھلی بھی ہیں۔ تو باسی
چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر میں تو آج
آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم
ہوتی ہے دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔
ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے
گرما گرم خستہ چنے کی دال بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو
اور تم کو دونوں کو کافی ہوگی۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی تسنیم کچھ کہنے بھی نہیں پائی تھی کہ مرزا جلدی سے
اٹھ کھڑے ہوئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے
تو ٹکے کے لائے۔ بازار میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ تسنیم کے روبرو
دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ کھا سکتے۔

مرزا - یہ دیکھو بڑے خوش رنگ ہیں اس وقت جو بھاڑ میں گیا۔ ذرا دانہ چکھ تو
دیکھو کیسے چکنے پھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب
دلفریب ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے اس
دن میں کا حظ کیا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل
نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال یہی ہے کہ جیسے دیکھئے اتنی ہی قدرت کہیں
سے معلوم ہوئی کہ دکان پر تعبیر کی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق کیا
ہے کہ خورد سالی کے زمانے میں چھدامی کی دکان کا چنا ہاتھ لگ کر
جاتا ہے اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے
کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی
قسم سچ کہنا۔ ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی

کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اُس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ
پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت
دیکھیے کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما اور
صد ہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذت
کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے۔
فرمایئے۔

مرزا کلیم

مرزا۔ کہا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو رزاقی عہدہ کا
اہتمام سپرد ہے یہ استغاثہ کیا گیا کہ حضرت میں نے ایسی کیا تقصیر
کی ہے کہ گیہوں تو ایسی میں نے زمین سے سر باہر نکالا تیر ستم چلنے
لگا۔ کاکوات ادھی ہی میں گر جاتے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں
ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ ہی میری قطع و برید ہونے لگی ہے
میری کونپلوں کو توڑ توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے ستے کو کھا جاتے ہیں
جب ذرا گدر ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے سیکڑوں بیسیوں من کے چکوں
من بوٹ چبا جاتے ہیں۔ ان سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع
کیے۔ بچا تو شاخ و برگ سمیت بٹ کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم
کا ایندھن ہوا۔ ہر دانہ اس کا چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں بھاڑ
میں بھونیں بیسن بنائیں۔ گھوٹتے ہوئے پانی میں بھگوئیں گھونگنیاں
بنائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل
ہوتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح بے باکانہ
چٹر پٹر بولنا سُن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص
اس کے کھانے کو دوڑا چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر

رخصت ہوا۔ سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس کہ اس وقت تک مرچ بہم نہیں پہونچ سکتا ورنہ میر تدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں۔

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزیدار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمت گار مسجد میں اکیلا آپ بیٹھا تھا جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغِ نو گرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ کرتا اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجر دم باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار پڑی جوتی رومال چھڑی تکیہ دری یعنی جو چیز کہ کلیم کے بدن سے متماسک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چمپت ہوا۔

یوں بھی کلیم بہت دیر کو سوکر اُٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی میٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔

مسجد تھی ویران اُس میں پانی کہاں۔ صبر کرکے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آنکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں۔ یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔

اس میں دوپہر ہونے آئی بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا جوں ہی زینہ پر چڑھا تو کلیم اُس سے عرضِ مطلب کرنے کے لیئے لپکا وہ لڑکا اُس کی ہیئتِ کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا خدا جانے اِس نے اُس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام کرڈالی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سیدھا مرزا کے مکان پر گیا آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔

کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرکے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔

یہ سوچ کر اُس نے کہا کہ کیوں حضرت آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام ونشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے۔ اور بھوت اور مرزا ظاہردار بیگ سے بڑی دوستی

ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ دری کا نام سن کر تو کلیم بہت جھلایا اور ابھی جواب دینے میں تامل تھا کہ اندر سے آواز آئی مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو۔

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جا لیا۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

(۴) **رویائے صادقہ**: یہ ناول واقعات کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن نوعیت میں عجیب ہے۔ "اس کتاب میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ مذہب اسلام بالکل عقل کے مطابق ہے اور اس میں شکوک اور اشتباہات کو دخل نہیں ہو سکتا۔" قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک لڑکی سچے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جو دیکھتی ہے وہی پیش آتا ہے۔ اس لئے گھر اور باہر کے سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اس پر کوئی غیبی اثر سمجھتے ہیں۔ بالآخر اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ شوہر کے گھر جا کر وہ ایک طویل مذہبی خواب دیکھتی ہے۔ (جو کتاب کے ۱۰۰ صفحوں میں ختم ہوا ہے) کتاب کا مقصد یہی خواب ہے جو سوال و جواب کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ لیکن قصہ کی دلچسپی خواب سے اوپر تک رہتی ہے۔ آگے تو بس ایک مذہبی کتاب رہ جاتی ہے۔

رؤیائے صادقہ کی پہلی فصل بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے :-

پہلی فصل تمہید کے طور پر صادقہ کی تقریب اور اس کی خواب دیکھنے کی عادت

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور اصلی ایک بھی نہیں اُس کے میکے ہی میں لوگ **صادقہ** کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اُس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اس لئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اُس کو تعبیر کا ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اُس کی راے تیر بہدف ہوتی تھی یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لمحہ بھی بے کار نہیں رہ سکتا وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا۔ مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں۔ خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جانوروں میں سے اور جانوروں کا تو حال معلوم نہیں مگر گھوڑے کو جس کا جی چاہے آزما لے کہ تھان پر کھڑا سو رہا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ خراٹوں کی آواز چلی آتی ہے اور یکایک خاص طور پر ہنہنایا ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہے۔ تھان ہے تھان ہے کہہ دیا کرتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں۔ مگر کسی کو ٹھیک

پتہ نہیں ملا۔ کہ خواب ہے کیا چیز۔ اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں۔ ہم
بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے۔ جب سے صادقہ کا حال سُنا۔ یہ خیال ہی
چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے ع

خدا کی باتیں خدا ہی جانے

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح بنایا تھا وہ بڑے درجے کی ذہین
تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور
صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اُس کو
مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے سُنا۔ نہ لغزش نہ
لکنت نہ رکاوٹ۔ اُس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اُس کو اپنے بچپن کے اُن
دنوں کی باتیں جب کہ اُس کو کسی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی ایسے صاف
طور پر یاد تھیں کہ گویا کل کی بات ہے۔ ایک دفعہ کا اُس نے مذکور کیا کہ میں
جھولے میں پڑی ہوئی تھی۔ دیوار سے گری چھپکلی۔ اور اتفاق سے اُس وقت
کوئی میرے پاس نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں۔ مگر بولنا نہیں آتا تھا۔
ناچار رونے لگی۔ دادا نے سمجھا کر اُڑھایا۔ میں چُپکی تو ہو گئی۔ مگر جب پھر اُس
نے جھولے میں لٹانا چاہا تو میں ڈر گئی۔ دادا سمجھ تو گئی کہ جھولے میں نیند نہیں آتی
مگر اُس کا سبب کون سمجھ سکے۔ آخر اس جان کا ذہن منتقل ہوا اور کہنے لگیں
ارے ذرا نیچے کو تو دیکھو۔ جوں ہی نظر پڑی تو دیکھا چھپکلی کو دیکھ دوڑیں۔ انہوں نے
مجھے گود میں لے کر پیار کیا۔ اور اُسی وقت جھٹ پھیری بندھوا دی۔ تب میرے
دم میں دم آیا۔ وہ ایسی باتوں کے ایسے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم اور
تصدیق کے سوائے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ غالباً اُس نے خواب بھی اسی زمانے
سے دیکھنے شروع کئے ہوں گے۔ مگر اُس کا چرچا گھر میں اُس وقت سے

ہونے لگا۔ جب سے اُس کو بولنا آیا۔ جیسی اس کی عمر تھی جیسے اس کے خیالات
تھے ویسے ہی اس کے اُن دنوں کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اُس
کا بھائی کہ وہ بھی بچہ ہی تھا۔ اس سے کوئی دو سوا دو برس بڑا سویرے اُٹھ
کھانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ ماں نے کہا بچی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی
نہیں رہیں کچوریاں۔ سو ابھی تو ابھی دکانیں نہیں کھلیں۔ اور دوسرے وہی
ایسی کونسی خوبی بھری ہیں گھی کا نام اور آدھے سے زیادہ تیل اور پھر باسی
کی دال۔ نہیں صاحب ذرا دم لو۔ ابھی میں تم کو روغنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں
یہ چاہو کھانڈ سے کھانا۔ یا مربے کی یہ نکسے۔ مگر خدا کے لئے دیر سے
پانی نہ پی لینا۔ ایسا نہ ہو پھر رات کو آپ بھی مارے کھانسی کے بے چین رہو اور
ہم سب کی نیند بھی حرام کر دو۔ یہ سُن کر صادقہ بولی۔ اماں جان مربے کا مرتبان تو
گر کر ٹوٹ گیا۔

ماں۔ یہ کب اور کیونکر۔

صادقہ۔ کب اور کیونکر تو میں جانتی نہیں مگر میں نے خواب میں دیکھا ہے۔

خواب کا نام سُن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ [illegible] سننے
جلدی جلدی کر کے تو اچھا یا ٹکیا پکائی۔ جوں مربے کے لئے کوٹھری کھولی
ایک چھوڑ دو دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان زمین
پر ٹوٹا پڑا ہے۔ دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوئے۔ لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز
خواب دیکھتی اور جو دیکھتی ویسا ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔
صبح ہوئی اور سب نے پوچھنا شروع کیا کیوں بی آج کیا خواب دیکھا۔ نہ کبھی
ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو۔ اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو اور سچا
نہ اُترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں پھر محلے میں پھر تو سارے شہر میں ایک غل سا

بچ گیا۔ ادھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ اُدھر عمر کے ساتھ ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔ صادقہ کے خوابوں کے سلسلے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کسی علم کے مبتدی کو پہلے آسان آسان باتیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر بتدریج وہ مشکل کتابوں پر عبور کرتا ہے۔ اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے۔ یعنی جو بات ہوئی جیسی کی تیسی اُس کو خواب میں دکھائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کے خواب پیچیدار ہوتے چلے جو بدوں تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے تھے جیسے پہیلی، معمہ یا چیستان۔ مثلاً گھر میں کسی کو تپ آنے کو ہوئی تو اُس نے خواب میں دیکھا۔ کہ آگ جل رہی ہے۔ دو بڑے سے ہیں۔ پھر وہ دیکھنے لگی کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں۔ آگ سے تاپ رہے ہیں اور آخر کو ایسا معلوم ہوا کہ آگے دیگچی رکھی ہے اُس میں چار رنگ کے چاول ہیں گرم جیسے ہوتے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اُس کی تعبیر بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ گویا تعبیر بھی جزوِ خواب تھی۔ اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اُس نے بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔ ایک عجیب بات دیکھی کہ صادقہ کبھی فرمائشی خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے اُس سے درخواست کی جیسا کچھ ہونے والا ہو۔ صادقہ نے خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور بھلا یا برا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے ضروری اور اہم کے کئی خواب تعبیر سمیت روزنامچے

؎ دیگچی۔ معمہ: چار رنگ کے چاول صفرا، خون، بلغم، سودا چار خلطیں۔ تپ دلوں کا جلسہ ضلعوں کا فساد جس سے تپ آتی ہے۔

کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لئے تھے۔ اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ
ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔ اور ہم اس کو عن قریب چھپوانے والے ہیں۔ جب وہ
روزنامچہ مشتہر ہوگا تو قابل دید ہوگا۔ نہایت دلچسپ۔ اُس روزنامچے میں ایک
بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کودن سے کودن اور غبی سے غبی اس کو پڑھ لے اور
اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سمجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی
تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات تو چار و ناچار تسلیم
کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے علاوہ ایک عالم ارواح بھی ہے اور سوتے
میں ہم کو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم اس میں مشق و مہارت
پیدا کریں تو بہت سے اسرار قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی خواب جو ہم
ہر روز دیکھا کرتے ہیں اور کبھی ان کی پروا نہیں کرتے ان میں سے ہر ایک میں
بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے
کا سلیقہ نہیں۔

(۵) **ابن الوقت** : نذیر احمد صاحب کے دوسرے ناول محصنات اور
[illegible] کی طرح ہیں اور [illegible] بھی نہایت دلچسپ اور
ان کی مخصوص زبان و بیان کے عمدہ نمونے ہیں۔ ابن الوقت بالکل نئی وضع کا ناول
ہے۔ اس میں انگریزی معاشرت کی اندھی تقلید کے نتائج دکھائے گئے ہیں۔ ہندوستان کے ہندو
اور مسلمان [illegible] نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ ابن الوقت اس قصہ کا ہیرو
ہے جو ایک انگریز مسٹر نوبل کے زیر اثر آکر اپنی ہندوستانی و اسلامی معاشرت
چھوڑ کر انگریزی وضع اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ ڈپٹی صاحب نے الحقوق والفرائض
میں اشارہ دیا ہے کہ ابن الوقت سے مراد خود ڈپٹی صاحب ہیں اور یہ ان کا اپنا فسانہ ہے
لیکن حقیقت میں نذیر احمد صاحب نے اپنی وضع اس حد تک نہ بدلی تھی کہ ابن الوقت

ان کو سمجھا جا سکے۔ اس لئے لوگوں نے اس کو سر سید پر ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ سید محمود نے ڈپٹی صاحب سے شکایت بھی کی کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہا کہ میں نے تو انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کو گالیاں دی ہیں۔ اب جو چاہے اپنے اوپر لے لے۔ ابن الوقت کا مختصر اقتباس یہ ہے :-

ہم نے تحقیق سے سنا ہے کہ ابن الوقت نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے مگر میرا حال یہ ہے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ایک دن سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمتگار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بکنے۔ تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر رد تا تھا اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ، متنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کی کھچڑی، دھوئی ماش کی پھریری دال، امرودوں کے کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹھی چیزوں کو ترس گیا تھا۔

معلوم ہے کہ ابن الوقت بعد نے تبدیل وضع سے گھر بار چھوڑ کر بہ چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ بڑے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس تھی جیسی ایک بے بچے کی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی اس سے کہ اس کے تمام نوکر سلیقہ مند اور

مستعد تھے اور حقیقت امر یہ ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اس کی آئی
بات بھی بنا رکھی تھی۔ مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی مالک کی تائید
کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ
ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا صفائی کی نگرانی اور ہر
چیز کی خبرگیری کے لئے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی
مذاق سے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ
اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نخواہی اس کو
دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا
دونوں ہی خوش ہوتے ہیں مگر ابن الوقت کے ہاں کی دعوت اس کے حق
میں ایک مصیبت ہوتی تھی کہ کھانا تو کہیں جا کر رات کے نو دس بجے نصیب
ہوتا اور شام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو
کوئی ایسی دعوت یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اس کے بعد علیل
نہ ہوا ہو۔ پھر چھوٹے چھوٹے سے دعوت ہو تو خیر، یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے
دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں
کا کھٹراگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے
کو ایک سے ایک سخت مشکل درپیش تھی کہ وہ تو وہی بہت کا بور تھا کہ ان
آنتوں کو بری طرح یہ بھلی طرح چھپاتا رہا۔ دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا
اور پھر اس کا نام نہ لیتا۔ ہاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا، کچھ لڑکوں کا کھیل ہے؟"
ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصہ خوش حال تھا۔ ضلعے کی تنخواہ میں تو
تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام واکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا۔ ہمارے
اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز کم نہ تھی اور

ان کو سمجھ جا سکے۔ اس لئے لوگوں نے اس کو سر سید پر ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ سید محمود نے ڈپٹی صاحب سے شکایت بھی کی کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہا کہ میں نے تو انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کو گالیاں دی ہیں۔ اب جو چاہے اپنے اوپر لے لے۔ ابن الوقت کا مختصر اقتباس یہ ہے:-

ہم نے تحقیق سے سنا ہے کہ ابن الوقت نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے مگر میرا حال یہ ہے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ایک دن سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمتگار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بکنے۔ تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ، متنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھوئی ماش کی کھچڑی، ہری دال، امرودوں کے کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جیسی چیزوں کو ترس گیا تھا۔

معلوم ہے کہ ابن الوقت نے تبدیل وضع سے گھر بار چھوڑ کر [illegible] تب جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ ہوتے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس تھی جیسی ایک [illegible] کی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی اس لئے کہ اس کے تمام نوکر سلیقہ مند اور

مستعد تھے اور حقیقت امر ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اس کی آنی بات بھی بنا رکھی تھی۔ مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی۔ لک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر گیری کے لئے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق سے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نخواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش ہوتے ہیں مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اس کے حق میں ایک مصیبت ہوتی تھی کہ اگر کہیں چار رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی ایسی دعوت یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اس کے بعد علیل نہ ہوا ہو پھر جیسے چھ مہینے دعوت ہو تو خیر یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں کا کھڑاک اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل در پیش تھی۔ وہ تو وہی بہت کا یور تھا کہ ان آفتوں کو بری طرح یا بھلی طرح جھیلتا رہا۔ دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا اور پھر اس کا نام نہ لیتا۔ پھیوں کے ساتھ گئے تھا۔ یہ لڑکوں کا کھیل ہے۔

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصہ خوش حال تھا۔ تعلقے کی تنخواہیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام و اکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا۔ ہمارے اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز کم نہ تھی اور

غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ نہ سونا سو سو۔ [illegible] ایک دم سے
پانسو [illegible] آمدنی پر پہنچے سے اچھا کھاتے۔ اچھے سے اچھا پہنتے۔ غرض امیرانہ
خرچ رکھتے۔ اگر ہندوستانیوں کا سا ہوتا تو چند سال کے عرصہ میں اس کے پاس
معتد بہ سرمایہ موجود ہوتا۔ لیکن انہوں نے کمائی بھی انگریزوں کی سی۔ پورا برس
خیریت سے گزرنے نہیں پاتا کہ لگا دھڑ رکھ دیتے جس وقت ان کو جان نثاری
نے نمد دھڑ رکھے ہیں انگریزی کپڑے پہنے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور
بھی شان [illegible] دیکھ کر ان کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتے تھے
اور بھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر [illegible] ایک جیسی [illegible] تھے
سے ہوئے [illegible] آمدنی تک [illegible] عدے کے مطابق [illegible]
[illegible] نے صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ تھوڑا تو [illegible]
[illegible] کہ [illegible] پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ
[illegible] موجود [illegible] وقت آمد [illegible] کرنے کا موقع
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

۱؎ ایک انگریز جن کو [illegible] وقت سے [illegible] تھی اور ان سے [illegible] ہونے سے
[illegible] وقت سے ہندوستان کی تمدن کو چھوڑ کر یورپ کا تمدن اختیار کیا تھا۔ [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] وقت کے [illegible] تھے۔
۲؎ دہلی کے مشہور ساہوکار تھے۔

انھوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا یوں جنرل سپیڈر کا قول پورا ہوا لیکن ابن الوقت نے خرچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ جس نسبت سے اس کی آمد بڑھی تھی اگر اسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ پر اس نے بیٹھنے کے ساتھ ہی چادر سے باہر پاؤں پھیلا دیئے۔ اول سرے سے گھر کے ہوتے جوہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپیہ کا بنگلہ، بگھی، فٹن، ٹمٹم، ٹینڈم، براؤم، پالکی گاڑی، ہر قسم کی بگھیاں اور چار سے چار گھوڑے اور ایک زین سواری کا، باورچی، آبدار، بہشتی، جمعدار، چپراسی، فراش، مشعلچی، خدمتگار، بیرے، سائیس، گھسیارے، مالی۔ دو ڈھائی سو کے قریب تو تنخواہیں ان کی تنخواہیں اور تنخواہوں کے علاوہ روز روز اسی نسبت سے دوسرے مصارف بے تحاشا بڑھتے گئے۔ اس کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مہینے میں پہلے چند دن خرچ کے بھی ہوتے تو ساری تنخواہ ایسی نہ تھی جو کچھ بچ رہتی۔

ابن الوقت نے شروع شروع میں چند روز تو وقت پر ادا ہوں گی اس کے بعد تو تنخواہ بھی کئی کئی کے ساتھ معوق ہونے لگیں۔ سب تھوڑا دو دو مہینے کی دینے والے۔ جب ضرورت ہوتی مہاجن سے منگوا لیتے۔ تنخواہ دیتے وقت پہلے ادا ہوتے خزانچی سے ... اور زمیندار کی طرح ... کوٹھی میں چلا جاتا تھا۔ ان ہی کو صاحب بننے کی دھن میں کسی کی بھی پروا نہ تھی کہ ... ہوتا ہے۔ غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی دھن ہوتی ہے اسی طرح ابن الوقت کو صاحب بننے کی دھن تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری دھن اسی پر ختم ہوئی تھی کہ یورپ کے اوضاع و اطوار میں سے کوئی

وضع اور کوئی طرز چھوٹنے نہ پائے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تیرے پاس اتنا پیسہ بھی ہے جتنا ان کے پاس ہے۔ کمبخت آپ بھی برباد ہوا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنہوں نے ذرا سی انگریزی پڑھ لی تھی یا جو تھوڑے سے کسی قدر آسودہ تھے، تباہی کے پھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ ان کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی، نہ تو ہم دیکھتے تھے کہ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے۔ جو بات کسی ہندوستانی عہدے دار کو نصیب نہیں اس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظروں میں انگریزی وضع خود کے نفس سے جو کسی ایسے کی بھی ہو۔ کبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان کیا۔ دیانت پر نقصان بھی کیا، تو کسی قسم کا فائدہ تو ہوا نہیں۔ اور ہو تو کیسے ہو کوئی شخص آدمی بلند درجے کے ساتھ ہم سری کرنے لگے تو وہ کیونکر نبھ سکتا ہے؟

(۶) **ترجمہ قرآن مجید:** ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سب سے بڑی مذہبی خدمت اور ناولوں کے بعد اردو زبان و ادب کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے صرف دونوں شاہ صاحبوں شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب کے اردو ترجمے تھے۔ ان کی زبان سو برس کی پرانی ہو چکی تھی۔ ڈپٹی صاحب نے اپنے ترجمے میں نہایت ضروری و مفید اضافے کیے:

(۱) صرف زبان کو بامحاورہ نہیں کیا بلکہ خطوط ہلالی میں تشریحی الفاظ بڑھا کر عبارت کو مسلسل و مربوط کر دیا۔

(۲) حاشیے پر فوائد لکھے۔ ان میں شاہ عبد القادر صاحب کی تفسیر موضح القرآن سے مدد لی ہے بلکہ جا بجا ان کی عبارتیں نقل کر دی ہیں۔

(۳) لغات عربی کی تشریح الگ کی ہے۔ یہ عربی دان مبتدیوں کو خاص کر مفید ہے۔

(۴) مضامین قرآن مجید کی فہرست حوالۂ آیات کے ساتھ ایسی تفصیل و تجزیہ کے ساتھ مرتب کی کہ مطالب قرآنی کے اندازے کے ساتھ تنزیل الٰہی کی ضرورت و عظمت بھی بیک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بھی اردو میں عجیب و جدید تھی۔

نذیر احمد صاحب نے ترجمہ قرآن بھی اپنی بے تکلف زبان و محاورہ میں کیا ہے۔ مثلاً

آیت	ترجمہ
(۱) ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ	پھر عرش پر جا براجا
(۲) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	(اس پر) شیطان بولا کہ جیسی تو نے میری
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ	راہ ماری ہے میں بھی تیرے سیدھے
(اعراف پارہ ۸)	رستے پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں تو سہی
(۳) وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا	اور ان کے پروردگار نے ان کو پکار کر کہا
عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ	ہم نے تم کو اس درخت کے کھانے کی
(اعراف)	منا ہی نہیں کر دی تھی۔
(۴) قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ	ان کے باپ یعقوب نے کہنا شروع کیا
يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ	کہ اگر مجھ کو سٹھیا ہوا نہ بناؤ تو ایک بات
(یوسف پارہ ۱۳)	کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی مہک آ رہی ہے۔
(۵) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ	تو اے پیغمبر تمہارے پروردگار نے ان (سب)
اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ	پر عذاب کا کوڑا پھٹکارا بے شک تمہارا پروردگار
(فجر پارہ ۳۰)	نافرمانوں کی تاک میں لگا رہتا ہے۔
(۶) فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ	تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے
فَسَوّٰىهَا	بدلے ان پر ہلاکت نازل کی اور سب کو
(شمس پارہ ۳۰)	مار کے چوپٹ کر دیا

(۷) إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا — کیونکہ نماز صبح کا وقت نور ظہور کا وقت ہے۔ (بنی اسرائیل پارہ ۱۵)

اس آخری ترجمہ (نور ظہور کا وقت) پر نذیر احمد صاحب نے حاشیہ پر یہ فائدہ لکھا ہے :-

"مفسرین نے لفظ مشہود کے بہت سے معنی لکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انتظام دنیا کے لئے جو فرشتے آتے ہیں، دن کے فرشتے الگ ہیں، اور رات کے الگ ہیں، اس وقت ان کی بدلی ہوتی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں نمازی کثرت سے جمع ہوتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کا وقت حضور قلب کا وقت ہے کہ نماز میں جی خوب لگتا ہے۔ اور اس کے سوا اور بہت سے اقوال ہیں۔ ان سب تفسیروں پر نظر کر کے ہم نے ایک لگتا ہوا ترجمہ اختیار کر لیا ہے۔ اور قرآن الفجر کے معنی تو لفظ بہ لفظ ہیں "صبح کا قرآن" مگر اس سے مراد نماز صبح ہے۔"

ترجمہ کے نمونے میں انھی آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن کا شاہ صاحبان کے ترجمہ سے اقتباس ہو چکا ہے اور اس کتاب کے صفحہ ۵۰۶ پر درج ہے تاکہ اسلوبِ زبان کا باہم مقابلہ آسان ہو :-

(۱) اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں جس طرح ان پر تو نے (ان کے گناہوں کی پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا تھا دیسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگذر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے۔ تو ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں

ہماری مدد کر " (سورۂ بقرہ کی آخری آیت)

(ب) " پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے کہ اے گروہ جن و انس کیا تمھارے پاس تمھیں میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے ہمارے احکام بیان کریں اور تمھارے اس روز (قیامت) کے پیش آنے سے تم کو ڈرائیں۔ وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (یعنی اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور (واقع میں) دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا اور (اب) انھوں نے آپ ہی اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا) کہ بے شک وہ کافر تھے "

ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بعد کے مترجمین نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خصوصاً ہلالین کے تشریحی الفاظ تو بلا استثنا تمام مترجمین نے اپنے اپنے ترجموں میں بڑھا لیے۔ تفسیری حاشیے بھی اکثر نے لکھے۔ چند مشہور ترجمے یہ ہیں: مولوی فتح محمد جالندھری، مولوی عاشق الٰہی، مولوی احمد رضا خاں بریلوی، مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی محمود الحسن دیوبندی۔ ان سب کے ترجمے اپنے اپنے دائروں میں مقبول ہیں۔ لیکن یہ سب مولوی نذیر احمد دہلوی سے مستفیض ہیں۔ اگرچہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے نذیر احمد پر ترجمہ کی خامیوں اور زبان و محاورہ کی آزادیوں کے سبب سے کفر تک کے فتوے لگا دئے تھے۔ اس ہنگامہ آرائی کی حقیقت یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد باوجود وضع قدیم کے بہت کچھ آزاد خیال تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے تھے۔ اس لئے عقائد و اعمال میں بعض وہ باتیں بھی شامل تھیں جو مذہب جمہور کے خلاف ہیں۔ یہ بنائے فساد تھی۔ اور اس بنا پر علما کا ڈپٹی صاحب سے اختلاف بیجا نہ تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ جن مترجموں کے نام اوپر لکھے گئے ان میں سے بھی بعض بزرگ عقیدہ و مسلک کے

اعتبار سے باہم تخالف و تضاد رکھتے ہیں۔ اور ایک کا ترجمہ دوسرے کے نزدیک نامعتبر ہے۔ اس قسم کا اختلاف ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ہم کو اس وقت ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بحث ہے، اس میں ڈپٹی صاحب کا فضلِ تقدم مسلم ہے۔

(۶) **الحقوق والفرائض**: ترجمہ قرآن شریف کی مفصل فہرست مضامین بناتے وقت ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو خیال آیا ہوگا کہ یہ مضامین الگ کتاب کی صورت میں مرتب کر دئے جائیں جن میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کے حوالے بھی ہوں اور اپنی طرف سے ان مطالب کی تفسیر بھی۔ چنانچہ ایک ہزار صفحوں کے تین حصے تیار کر دئے۔ پہلا حصہ حقوق اللہ، دوسرا حقوق العباد، تیسرا اخلاق۔ تیسرے حصے کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" شامل ہے جو ڈپٹی صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لکھا ہے یعنی اس تاریخ تالیفِ کتاب ختم کی ہے۔ اس کے آغاز میں صورت تالیف یہ بیان کرتے ہیں:-

"جس جذبے سے ہم نے اس کتاب کے جمع کرنے کا منصوبہ باندھا اسی نے آخر کار ختم کی خوشی میں عجلت کی۔ ہم نے اس کو خدا کی خاص عنایت سمجھ کر ہم نے ایسی کتاب کی ضرورت کا احساس کیا۔ ہر چند جستجو کی عربی، فارسی، اردو میں اس طرح کی کتاب کا کہیں پتہ نہ لگا۔ مجبور اپنے بوتے سے بڑھ کر آپ اس کا بیڑا اٹھایا۔ شوق متقاضی کہ جو کام برسوں میں ہونے کا ہے مہینوں میں سر انجام پائے، مہینوں کا دنوں میں، دنوں کا گھڑیوں میں، گھڑیوں کا پلوں میں۔ اور ایسا بھی ہوا کہ مسودے کی سیاہی سوکھنے نہیں پائی تھی کہ چھپنے کے لئے دے دیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ چھاپے خانے والوں کے تقاضے سے مسودہ لکھا گیا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ کہیں ایسی مہتم بالشان تصنیفیں

اس عجلت سے بھی ہوئی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی عمر کا معتد بہ حصہ اسی شغل میں گزارا ہے تو اطمینان سے برسوں میں مسودے کئے ہیں۔ برسوں مسودے زیرِ نظر رہے ہیں اور اس پر بھی آخری پروف تک اصلاح و ترمیم ہوتی رہی ہے۔ تب کہیں جا کر کتاب کو حسنِ قبول حاصل ہوا ہے۔"[۱]

الحقوق والفرائض کی ترتیب اس طرح ہے کہ ہر عنوان کے نیچے قرآن و حدیث کے متعلقہ اقتباسات لکھے ہیں اور بالمقابل ان کا ترجمہ درج کیا ہے اور نیچے ضروری حاشیے دیے ہیں۔ پھر من المترجم لکھ کر اپنی تفسیر و تشریح لکھی ہے جو کہیں چند سطریں ہیں کہیں طویل مضمون اور کہیں رسالہ کا رسالہ۔ حقوق اور فرائض آداب کا ایسا احاطہ کیا ہے کہ اپنے نزدیک کوئی بات بھی نہیں چھوڑی۔ نمونے کے طور پر ایک چھوٹی سی فصل پوری نقل کی جاتی ہے:

---

[۱] ڈپٹی صاحب کا یہ مضمون دیکھ کر اس نوٹ کے لکھنے کا خیال آیا۔ یہ میری خام کاری کا اعتراف تو ہے لیکن اس تصنیفی عیب کا بھی ہے کہ میری یہ کتاب "داستانِ تاریخِ اردو" بھی اسی طرح لکھی اور چھاپی جا رہی ہے کہ ابھی مسودے کے چند ورق لکھتے ہی مطبع کو دیے گئے اور ابھی اِدھر مطبع کے تقاضے سے مسودہ لکھا گیا۔ لیکن مجھ میں اور ڈپٹی صاحب میں یہ فرق ہے کہ انھوں نے کتاب کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے دم لیا اور مجھے لکھتے ہوئے چوتھا برس ہے اور نہ ختم ہوا نہ چھپنا۔ ۱۹۳۸ء میں یعنی شروع کی اور کتاب کا ریختہ بھی اسی سال نکال لیا۔ اسی سال کتاب چھپنی شروع ہوئی لیکن ۱۹۳۹ء کے شروع میں تالیف و طباعت دونوں بند ہو گئیں۔ پھر آخر سال میں دونوں کام شروع ہوئے اور رک گئے۔ پھر ۱۹۴۱ء میں کتاب کے ۴۵۶ صفحے چھپنے کے بعد مسودہ ختم ہو گیا اور کام بند ہو گیا۔ اب ۱۹۴۲ء کے وسط میں پھر لکھنا اور چھپنا شروع ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فہرست مضامین بھی چھپتی جاتی ہے۔ اسی سال ختم کرنے کے ارادے سے اختتامِ تالیف کی تاریخ بھی سرورق پر لکھوا دی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ یہ مضمون دیباچے میں لکھنے کا تھا لیکن یہیں سہی۔ حامد حسن قادری

حقّے پان کے آداب

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ	ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ	اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کا بہترین
اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ	اسلام ان چیزوں کے چھوڑ دینے میں
(ترمذی)	ہے جو اس کے کام آنے کی نہیں۔

من المترجم۔ ہم اپنی جگہ یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ کتاب احکام شریعۃ اسلامی کے قاعدے کو کامل کر دے۔ بڑی چھوٹی کوئی بات اس سے رہ نہ جائے۔ ایک دن ہمیں بھی خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقے پان کی بابت کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ چیزیں ہم مسلمانوں میں اس کثرت سے پھیل رہی ہیں کہ اب ان ہی کی تواضع مدارات [illegible] ہم ہندوستانی [illegible] دونوں اس بلا میں مبتلا ہیں حقیقت میں تو حقہ پان تنباکو [illegible] اس کی وجہ سے ہم نے کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کے بیان میں ان کے ذکر سے تو تعرض نہیں کیا مگر ہو سکتا ہے حقے پان تمباکو کھانے پینے ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ کثرت استعمال اور تعمیم [illegible] ہم نے ان کا جدا [illegible] بہت ضروری [illegible] سے ایک نہایت ہی [illegible] ایک چوپ [illegible] سے مدد کی [illegible] وہ بھی خود غلط [illegible] [illegible] سمجھتا [illegible] آدمی کا [illegible] [illegible] العبد [illegible] حاجت [illegible] معاذ اللہ [illegible] [illegible] کی بدولت [illegible] ہے کہ ہم اس سے [illegible]

دین دونوں میں مدد لیں۔ اس کی ہدایت پر کاربند ہوں، اور عقل ہی کی وجہ سے ہم مکلّف بالشرائع بھی ٹھہرائے گئے ہیں۔ مگر غلطی کیا ہوتی ہے کہ ہم (ہر کس را عقل خود بکمال و فرزند خود بجمال) اپنی عقل کو عقل کامل سمجھ کر اس کو معصوم عن الخطاء مانے ہوئے ہیں۔ اور عقل سے فوق طاقت کام لیتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص چشم سر سے پس دیوار یا مسافت بعیدہ پر دیکھنے کا قصد کرے۔ پس یہ سب منشا گمراہی کا، اور اسی سے کہا گیا ہے کہ اَلْعَقْلُ حِجَابُ الْاَکْبَرُ۔ اب یہی معاملہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کا ہے۔ ہم نے سوچ کر حرمت کی دو وجہیں پیدا کیں۔ مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے لئے منافات تبرک، اور باقی محرّمات کے لئے ان کا از روئے طب انسان کی جسمانی و دماغی و اخلاقی صحت کے حق میں اور پر مضر ہونا۔ اس پر بھی اگر کسی خاص چیز کی حرمت کی وجہ شاید سمجھ میں نہ آئے تو قصور فہم کا اعتراف کر کے ہم کو چاہئے کہ حکم شارع کو بے چون و چرا تسلیم کریں۔ ہاں یہ بھی سبب ہے کہ بعض چیزوں میں شارع نے منتہائے اہتمام و احتیاط تغلیظ بھی کی ہے، تو وہ بھی مبنی بر مصلحت ہے۔ جیسے شراب کہ حدِ سکر کو نہ بھی پہنچے تو بھی حرام ہے۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا[۱]۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ[۲]۔ [illegible] کو ہم سمجھتے کا تو کچھ قصور نہیں [illegible] کرتے ورنہ بیان کا کروہ تنگ ہے۔ قصور جو کچھ ہے ہم کو کا ہے تو مولویوں کے

---

[۱] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ خلاف حکم کرنے سے بچیں۔ ۱۲

[۲] احقر کے اس حاشیے میں جو ترجمہ درج ہے اس میں [illegible] دوسری آیت کا ترجمہ نہیں ہے غلطی سے کسی اور آیت کا ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس آیت ومن یتعد … کا ترجمہ یہ ہے: "اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

جھگڑے میں کون پڑے۔ کوئی اس کو حرام بتاتا ہے۔ کوئی مکروہ تحریمی، کوئی مکروہ تنزیہی
اور بعض اس کی حلت کے بھی قائل ہیں۔ ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے ایک
لت لگا لینے کی تو بات ہی اور ہے۔ تمباکو کھایا جائے یا پیا جائے یا سونگھا جائے،
عادت سے بچے لایعنی تو ضرور ہے۔ اور مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ
کی رو سے تمباکو کا استعمال کسی طرح بھی پرہیزگاری کی شان سے بعید۔ جتنے کا
تمباکو ملک میں خرچ ہوتا ہے، صوبے صوبے میں یونیورسٹی، دارالعلوم بنا دینے کا تو
میں ٹھیکہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر خدا کسی قوم کی عقلیں گدی میں لگا دے تو وہ کیا فلاح
پا سکتی ہے۔ مولوی بیچارے حرمت نہیں کفر و ارتداد کے فتوے بھی دیں تو تمباکو
کا رواج رک نہیں سکتا کہ اب شرطِ زندگی ہو گیا ہے۔

نذیر احمد صاحب نے [illegible] میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کا طول کلام کا شوق
ظاہر ہے۔ اسی طرح ہر جگہ بات کو بڑھا کر کہتے ہیں۔ لیکن کمال یہی ہے کہ ان کا "درازتر"
کہنا بھی "لذیذ" ہوتا ہے۔

(۹) **الاجتہاد**: یہ ڈپٹی نذیر احمد کے آخری زمانے کی کتاب ہے۔ ۱۹۰۸ء
۱۳۲۴ھ میں تصنیف کی ہے۔ اور ان کے اسی مخصوص رنگ کی کتاب ہے۔ صرف وجہ
تالیف کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:

"ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے یہ خیال آیا کہ میں کیوں مسلمان ہوں؟ یہ خیال
کچھ ایسا پیچھے پڑا کہ ہر چند میں اس کو ٹالنا چاہتا تھا۔ ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔
یہاں تک کہ کئی سال متواتر میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں رہا۔ خیال نے
ایسی وسعت پکڑی کہ فی الواقع میں ایک طرح ایسا معلوم ہوا کہ ایک سے دو ہو گیا ہوں۔
ایک حیثیت سے سائل اور دوسری حیثیت سے مجیب۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا
خیال کبھی دوسرے مسلمانوں کو بھی آتا ہے یا نہیں، مگر آنا چاہیے۔ بلکہ

مسلمانوں کی خصوصیت نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کی ضرورت
کو سمجھ کر کسی خاص مذہب کا معتقد ہو، کبھی نہ کبھی اپنے نفس سے پوچھنا چاہیے کہ
وہ کیوں مثلاً ہندو یا عیسائی یا یہودی یا پارسی بنایا گیا ہے۔ ایسا خیال کرنے سے
قوی امید ہے کہ وہ حق کو دریافت کر لے گا۔"

چنانچہ الاجتہاد میں سوال وجواب کی صورت میں تمام عقائد مذہبی و اسلامی سے بحث
کی ہے، اور اسلام کو عقل کے مطابق ثابت کیا ہے۔

(۹) **مبادی الحکمۃ**: علم منطق کا رسالہ ہے اور نذیر احمد صاحب کی قدیم
تصانیف میں سے ہے۔ سنہ ۱۸۶۳ء (سنہ ۱۲۸۰ھ) میں لکھا گیا۔ اس کا سبب تالیف یہ بیان
کرتے ہیں:-

"اب وقت وہ پہنچا اور وہ زمانہ آگیا کہ مشکل سے مشکل مضمون اور پیچیدہ مطلب
پر بھی ہم اپنی ہی زبان میں مباحثہ اور مناظرہ کرتے رہیں۔ پس کیا ایسی حالت میں
زبان اردو منطق کی حاجت مند نہیں؟ بے شک حاجت مند ہے۔ دعوے کا اثبات
حق کا مطالبہ، استحقاق کی حفاظت، دلیل کی استواری، مطلب کی تائید، اعتراض
کی تردید، الزام کا دفعیہ، غیب کی پردہ دری، مغالطے کا کشف، حق کہ احقاق حق،
وابطال باطل منطق نہیں تو کچھ نہیں۔ یہی حاجت دیکھ کر میں نے اس رسالہ اردو
میں ضروری مسائل علم منطق جمع کئے۔ باتیں وہی قطبی اور اس سے فروتر کتابوں
کی ہیں۔ طرز ادا میرا ہے اور ایک انگریزی رسالہ منطق جناب افضل الحکماء
ایم کیمسن صاحب بہادر دام اقبالہم نے عنایت فرمایا تھا۔ کچھ اس سے اخذ کیا ہے
یوں عربی اور انگریزی مل کر ایک شان خاص پیدا ہو گئی ہے۔"

اردو میں اس سے پہلے بھی منطق کی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے بعض کے نمونے
پہلے آچکے ہیں۔ مولوی عبدالحق منطقی خیرآبادی نے اپنا رسالۂ منطق بالکل قدیم اصول و

طرز پر لکھی ہے۔ اور لوگوں نے کوئی جدت پیدا کی تو اختصارِ مضمون اور قدامتِ زبان
کے سبب سے اس میں لطف پیدا نہ ہوا۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی جدت طرازی سے
کام لیا۔ اور اردو میں بالکل نئی چیز پیدا کر دی۔ لیکن علماء و مدرسین کی قدامت پرستی نے
نذیر احمد صاحب کے "مبادی الحکمۃ" سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں
میں بھی منطق کی تعلیم جاری ہے، لیکن وہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس لئے ڈپٹی
صاحب کی یہ کتاب آگے نہ چل سکی۔ ان کے بعد مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی مرحوم
نے ایک منطق کی کتاب "الاستدلال" کے نام سے بھی اچھی لکھی۔ اس میں عربی
و انگریزی دونوں اصطلاحیں بھی ہیں اور طرزِ بیان شگفتہ و دلچسپ ہے۔ **مبادی الحکمۃ**
کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

حدِ اوسط۔ قیاس کے دونوں مقدموں میں حدِ اوسط کا مکرر ہونا استخراجِ نتیجہ
کے لئے شرطِ اعظم ہے۔ اس میں کبھی کبھی مغالطہ بھی واقع ہوتا ہے، اور اس
کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بادی النظر میں تو حدِ اوسط مکرر معلوم ہوتی ہے۔ جو لفظ صغریٰ
میں ہے وہی کبریٰ میں ہے۔ مگر ایک میں اس لفظ کے حقیقی معنی مراد ہوتے
ہیں۔ دوسرے میں مجازی۔ یا ایک میں لغوی دوسرے میں منقول۔ یا یہ کہ وہ
لفظ مشترک ہے ایک میں کچھ دوسرے میں کچھ۔ متوسط شعرا تمام تر اسی طرح
کے مغالطات سے بھرے ہوتے ہیں۔ مثلاً

آن درد نہ سازی طول۔ نزدک عرضِ من بشنو
کہ این را قصہ می نامند۔ باید مختصر کردن

شاعر پہلے صاحب کو تقلیلِ عبارت کی رائے دیتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بیان
کرتا ہے کہ یہ قصہ ہے اور جتنے قصے ہیں ان کو مختصر کرنا لازم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ
اس عبارت کو مختصر کرنا لازم ہے۔ یہاں لفظ قصہ مشترک ہونے سے مغالطہ ہے کہ اس کے

معنی لغوی بے شک کم کرنے کے ہیں ۔ مسافر کا قصر صلوٰۃ کا قصر، یا یوں کا قصر بلکہ تصور بمعنی خطا سب اسی مادّے سے ہیں ۔ لیکن قصر کے دوسرے معنی حویلی اور محل کے بھی ہیں ۔ پس لفظ قصر مشترک ہوا ۔ صغریٰ میں ایک معنی مراد لئے اور کبریٰ میں دوسرے مثلاً

گر آپ کے پھرے شیخ جی کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

پھرنا مراجعت اور واپس آنا ایک معنی تو یہ ہیں ۔ اور ایک چیز سے بد عقیدہ ہو جانا دوسرے معنی یہ ہیں ۔ اور اللہ کے گھر سے پھرنا نکلنے سے نوبت پا کر سلامت نکل آنا تیسرے معنی یہ ہیں ۔ یا مثلاً

ہوس میں کعبہ کی کیوں شیخ بت خانے سے گھر بیٹھے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے

"اللہ ہی اللہ ہے" دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے یا یہ کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں ۔ دوسرا یہ کہ کچھ بھی نہیں ۔

(۱۰) اُمّہات الاُمّہ (یعنی اُمت کی مائیں) اس کے دو ایک فقرے مولوی نذیر احمد صاحب کی بے اعتدالیوں کی مثال میں پہلے درج کئے گئے ہیں ۔ اس کتاب میں "اُمّہات المومنین" ازواج نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات اور تعددِ ازدواج کے دواعی و اسباب بیان کئے ہیں ۔ مقصد یہ تھا کہ اس ضمن میں معترضین اسلام کو جواب دیا جائے ۔ یہ مقصد صحیح و درست تھا ۔ سر سید نے بھی کسی عیسائی کی کتاب "اُمّہات المومنین" کا جواب لکھا تھا ۔ لیکن بد قسمتی سے نذیر احمد صاحب نے اپنی حسب عادت اس کتاب میں بھی وہی بے تکلف زبان و اسلوب اختیار کیا ، اور ازواجِ مطہرات و اہل بیت کے تذکرے میں "تڑا چڑ" "سوکنوں کی باہمی کٹا چھنی"

"کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو" وغیرہ عامیانہ و مبتذل محاورے استعمال کیے۔ اس سے پہلے
ڈپٹی صاحب کی تحریروں میں بے ادبی کی ایسی صریح مثالیں نہ تھیں۔ امہات الامہ
کے شائع ہوتے ہی عام پبلک کی طرف سے اور خاص کر علما کی جانب سے اعتراض و
احتجاج کا ہنگامہ برپا ہوگیا اور کفر و بے دینی کے فتوے صادر ہونے لگے۔ اول تو مولانا
ہنس ہنس کر ٹالتے رہے لیکن جب مولویوں نے حملہ کردیا اور کتاب کی تمام جلدیں حوالے
کرنے اور جلانے کا مطالبہ کیا، تو بہت چیں بہ جبیں ہوئے۔ دلیلیں کیں کیونکہ دس ہزار روپیہ
کا نقصان ہوا جاتا تھا۔ مگر آخر کو مان لینے ہی میں رفع شر نظر آیا۔ گھر پر اور مطبع میں جتنی
کتابیں تھیں سب علما نے قبضے میں کر لیں۔ اور کانپور کے جلسہ علما میں پیش کیں۔
اس کا حال نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی نے
لکھا ہے کہ ایک رات کو ۲ بجے تک اس کتاب پر مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر بکثرت رائے
سوختنی قرار پائی۔ چنانچہ سب جلدیں ایک جگہ ڈھیر کی گئیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں نے
خود اٹھ کر مٹی کے تیل کی بوتل لا کے کتابوں پر چھڑکا اور دیا سلائی لگا دی۔ یہ واقعہ
ہندوستان کی تاریخ ادب میں شاید پہلا اور آخری ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے
بعد کسی اور کتاب کا یہ حشر سننے میں نہیں آیا۔

بعد کو عرصے تک اس واقعہ پر موافق و مخالف رائے زنی اور داد فریاد ہوتی رہی۔
ان میں اکثر نئی تہذیب کے آزاد خیال نوجوان تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ
مولوی عبدالحق صاحب دہلوی سکریٹری انجمن ترقی اردو بر ہم اور برافروختہ
ہوئے۔ ہم نے یہ کتاب شائع ہوتے ہی ہنگامہ آرائی سے پہلے دیکھ لی تھی۔ ۳۰ برس
سے زیادہ ہوگئے۔ جب سے اب تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان
زبان و ادب کی محبت کو رسولؐ و آل رسولؐ کی محبت پر کیونکر مقدم رکھ سکتا ہے۔

ایک عرصے بعد ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ مولوی بشیر الدین صاحب نے

امہات الامہ کو دوبارہ شائع کیا۔ اور بعض قابل اعتراض الفاظ نکال دیئے۔ مختصر نمونہ یہ ہے :-

"لوگ بیان کرنے میں جو اعتراض مدنظر رکھتے ہوں۔ ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے۔ اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے، ہر ایک منصف کا دل گواہی دے گا کہ پیغمبر صاحب نے جو بی بی کی، اسلام کا مفاد مدنظر رکھ کر کی۔ کیسی نفس کی خواہش اور کیسا حسن و جمال اور کیسی دولت، ان کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہم اس کی ضرورت تو سمجھتے نہیں کہ مناکحت کو خلاف شان پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں فقدان قوت کے قائل ہوں۔ ایسا سمجھنا ان کے کمال انسانیت کو بٹا لگانا ہے۔ سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحت میں اس قوت کو بھی دخل ضرور تھا۔ مگر اسلام کی دھن کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں، بشری اغراض مغلوب تھیں۔ ہر نکاح میں اول اور مقدم اسلام اور اسلام کی دھن میں دوسری اغراض۔ اور یہی وجہ تکثیر ازواج کی بھی ہوئی کہ شادی کے وقت سارے کے سارے قبیلے کو جھنڈ پڑتا ہے، اور یہی اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی ضرورت تھی۔ یہاں تک کہ جب اسلام کو خدا نے غلبہ دیا اور اعوان انصار کے ہم پہنچانے کی ضرورت نہ رہی تو لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ[۵] سے ممانعت کر دی۔"

(۱۱) **ڈپٹی نذیر احمد کے لکچر**۔ ان کی قوت تقریر اور کمال خطابت کا پہلے ذکر کیا گیا۔ لکچروں کا بڑا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر دو لکچروں میں سے اقتباس کیا جاتا ہے۔

(الف) آغاز اسلام کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں :-

ف۵ اے پیغمبر اس وقت کے بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں۔

ان کے زمانے میں اور ان کی کوششوں سے اسلام کا ترقی پانا، یہ ایسا زبردست ثبوت ان کی فیور[۱] میں ہے کہ کسی احتمال مخالف کو جمنے ہی نہیں دیتا۔

جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے، اسی طرح مسلمان کامل افضل الناس ہے۔ صرف دین کے اعتبار سے نہیں، بلکہ میرا نہایت مستحکم عقیدہ ہے کہ جن صفتوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچرلی[۲] اس بات کے مقتضی ہیں کہ دنیا میں بھی مسلمانوں ہی کو فضیلت اور برتری ہو۔ بلکہ میں تو دنیاوی ترقی و تنزل کو اسلام یعنی دین اسلام کے کامل و ناقص ہونے کا معیار قرار دیتا ہوں۔ وہ مسلمان بڑی غلطی پر ہیں، اور افسوس ہے کہ ایسے بہت ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کی رسالت کا مقصود یہ تھا کہ چند جوگیوں اور سنیاسیوں یا عیسائی راہبوں کی قسم کا ایک گروہ تیار کیا جائے، نرے خدا پرست، دنیا سے بے نصیب محض۔ اگر پیغمبر صاحب کا یہ مقصد رہا ہو، اور میں کہتا ہوں کہ نہیں رہا، وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ نہیں رہا، ہرگز نہیں رہا، تو معاذ اللہ پیغمبر صاحب کی رسالت کی نسبت فیلیور[۳] ٹوٹل فیلیور کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ پیغمبر صاحب نہیں چھوڑ کر مرے خدا پرست جوگی، خدا پرست سنیاسی، خدا پرست راہب، خدا پرست آجکل کے سے ملنگ گدے، بھیک منگے، ملا اور مشائخ۔ بلکہ خدا پرست امپررز (شہنشاہ)، خدا پرست کنگز (بادشاہ)، خدا پرست منسٹرز (وزیر)، خدا پرست ایڈمنسٹریٹرز (مدبران ملک)، خدا پرست کمانڈرز (سپہ سالار)، خدا پرست تجار، خدا پرست آرٹیزنز (صناع)، خدا پرست مرچنٹس (سوداگر)، خدا پرست دنیا دار آف اوری کائنڈ اینڈ پروفیشن (ہر ایک پیشے اور ہر ایک شغلے کے) اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ

[۱] حمایت، طرفداری۔ [۲] قدرتی طور پر۔

[۳] ناکامی، پوری ناکامی۔

حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۔

(لیکچر ایجوکیشنل کانگریس جلسہ چہارم منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء بمقام علی گڑھ)

ان چند سطروں میں انگریزی الفاظ بولنے کا شوق قابلِ دید ہے۔ یہ تقریر نذیر احمد صاحب کے ابتدائی لیکچروں میں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زمانۂ آغاز کی تقریروں میں سے ہے، جب کہ اس کے نام میں کانفرنس کی جگہ کانگریس کا لفظ ہندوؤں کی انڈین نیشنل کانگریس کی تقلید میں تھا۔ اسی لیکچر کا دوسرا اقتباس یہ ہے:-

(ب) "ہم یہ کہنے کو موجود ہیں کہ "لیکچر" پڑھنے والوں اور اردو لٹریچر کے [illegible] کرنے کے کام سے دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ سید احمد خاں کے عمل شروع ہونے سے قومی مرثیہ خوانوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک لکھنؤ میں دربار رہی مرثیہ خوانی کا بڑا زور شور تھا۔ اور اسی مرثیہ خوانی کو انیس اور دبیر نے حقیقت میں معراج ہی کی حد تک پہنچا دیا۔ نہ کسی نے ان جیسا کہا اور نہ کوئی ان جیسا کہہ سکے گا۔ اب جو نئی قسم کے مرثیہ خواں پیدا ہوئے ہیں ان کے موجد ہیں ہمارے مولوی الطاف حسین صاحب حالی۔ انہوں نے ایک بڑی دھوم کا مسدس لکھ کر چھپوایا۔ [illegible] جتنے [illegible] موزوں طبع تھے سب کے سب ان ہی کی لے میں گانے اور گنگنانے لگے اور [illegible] یہ آپ کا اپنا منہ بھی ہے کہ شعر تو نہیں کہہ سکتا مگر گلے سے تک بندی [illegible] سب نہیں سمجھتا کہ مولوی الطاف حسین نے مسدس اس غرض سے کہا تھا کہ پیشہ ور شاعری میں ایک طرز جدید داخل کریں، بلکہ ان کی غرض تھی یہ تھی کہ سوتی ہوئی قوم جاگے اور دیکھے کہ تباہی کا سیلاب ان کے سروں پر آ پہنچا۔ مگر قوم ایسے [illegible] کہ اب تک بھی [illegible]۔ ان کے مسدس کا اب [illegible] کیا۔ کوئی اس کو اس لیے نہیں پڑھتا

کہ سمجھے اور عمل کرے۔ نظر پڑتی ہے تو وہی محاسن شاعری پر۔ اور
سید احمد خاں صاحب برا نہیں تو بانیں، قریب قریب یہی حال
ہے اس کانگرس کا۔ اکثر تو تماشائی ہوں گے۔ بعض اس کو ایک طرح
کی محفل مشاعرہ سمجھ کر شریک ہوئے ہوں گے کہ سر سید لکچر دیں گے،
مولوی الطاف حسین، مولوی شبلی، منشی احمد علی
شوق اپنے اپنے افکار تازہ پڑھیں۔ ذرا چل کر سنیں تو سہی کیا
کہتے ہیں۔ بعض صرف سید احمد خاں کے لبّیکی ہوں گے۔ اور بعض شہدا
ہوں گے۔ لڑنے بھڑنے کے نہیں، ہو لگے لینے کے۔ جو چاہتے ہیں کہ محض کانفرنس
میں شریک ہونے کی وجہ سے ان کا نام دردمندانِ قوم کی فہرست پر چڑھ جائے۔
جتنے صاحب شریک محفل ہیں سب سے بدتر میں ہوں۔ کہنے کو آندھی کرنے کو دھک
جب آدمی خود ایک بات کا عامل نہیں دوسرے پر اس کا اثر کیا ہو۔ غرض کیا مستمع
کیا لکچرار، ہیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ بھلا پھر ایسے مجمعوں سے کیا
فلاح ہونی ہے۔ سوتے آئے مرتے کی خبر لیتے چلے۔ قوم کا تو یہ حال ہے کہ ایک
ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کی دیر میں ہزاروں نہیں عمروں کا نقصان ہو رہا
ہے۔ اور یہاں ہنوز روز اول ہے۔"

(ج) یہ ڈپٹی صاحب کا اکتالیسواں لکچر ہے جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ
دسمبر ۱۹۰۰ء بمقام ریاست رامپور میں پڑھا گیا۔ یہ لکچر نذیر احمد صاحب کی زبان سے سننے
کا شرف ہم کو بھی حاصل ہے۔ شروع میں ایک طویل نظم اور اس کی "بین الاشعار"
تشریح ہے۔ نظم کا مطلع یہ ہے:۔

الٰہی دے مسلمانوں کو توفیقِ مسلمانی   کہ پھر آ جائے کشتِ مردۂ سدم میں پانی

اور مقطع یہ ہے:۔

تم اپنی نثر اور نظم کو چھوڑو، نذیر احمد کہ اس کے واسطے موضوع ہیں حالیؔ و نعمانی (یعنی شبلی)
نظم کے بعد فرماتے ہیں:-

عِبَادَ اللّٰہِ رَحِمَکُمُ اللّٰہ[1] میں نے نظم میں آپ کا بہت سا وقت لے لیا ہے کہ آپ کو قرآن سے اوور ڈوز ہوگیا ہے یعنی عادت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ مجھکو تمام آیتوں کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اب اس کی تلافی سوا اس کے کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ نثر میں کمی کروں۔ کہنا تو بہت ہے مگر میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں عرض کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے ... پس تعلیم کے مفید و غیر مفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسائش اور انسان کی مانیت۔ تو تعلیم کی دو قسمیں ہوگئیں۔ جو تعلیم انسان کے قوائے عقلی کو ڈیولپ[2] کرے اس کو ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے اور جو تعلیم انسان کی روحانی حالت کی اصلاح کرے اس کو دینی۔ یہ امر واضح بداہت ہے کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں اور ریل اور اسٹیم اور تار برقی اور انواع و اقسام کی مشینیں ان ہی زوروں سے نکلے[3] ہیں۔ ہم نے دو چار سیدھی سادھی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خدا معلوم ہے کہ ان کا کانسٹرکشن سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے ذہن ہوں گے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہوگا۔ اچھا تو یہ زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب و ہوا کو خواص تو کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ جب سے زمین و آسمان پیدا ہوئے ہیں آب و ہوا تو وہی ہے جو پہلے تھی۔ لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے زیادہ نہیں چار ساڑھے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی

---

[1] مجمع حاضرین۔
[2] ترقی دے، بڑھائے
[3] ترکیب و ساخت۔

وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے یا اور بہت سے ملک ہیں جن کی آب و ہوا یورپ کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے اور وہاں کے باشندے گندہ ناتراش ہیں۔ ہو نہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہل یورپ کو ہے، سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے، جو یورپ میں کمال کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ اور گورنمنٹ نے مال کیا ہی ہے اس کی بھی نیتوں کو بعد از شمار دیا ہے۔ فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ[2] صدّ عنہ میں ہم نصیب بد قسمت بدبخت مسلمان ہیں۔ وجہ یہ کہ اس جدید تعلیم کی طرف سے ہم پیش و پیش میں پڑے ہیں۔ ایسا ہی ہم کو تو خدا کی طرف سے فیض پہنچا، دیکھو کہ دنیاوی بہبود و فلاح تو بدون سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں۔ ان تشخیص تشخیصوں ان قوموں فقط وہی۔ مگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں۔ جب ان صندوقوں کا کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ۔ اور نہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے ہو، آگے اپنے ہاتھ سے جنس کی ہمدمی رو۔ پھر کیا سوجھتی ہے کہ ان تالوں کا ڈھکنا سیکھنا ہو جیتے تو بعینہ۔ مگر میری صلاح تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر ڈوب مرو

قسمت میں قوم کے ہے ابھی تک شرم موت
بے عزتی کے جینے سے بہتر ہزار موت

نذیر احمد صاحب کی ایک صنف تحریر ان کے خطوط بھی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی خاص "مکتوباتی جدت" نہیں ہے۔[3] ان کا ایک مجموعہ "موعظۂ حسنہ" ہے، جو انھوں نے اپنے صاحبزادہ مولوی بشیر الدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں تعلیمی ناصحانہ رنگ غالب ہے۔

---

[1] یعنی ہندوستانی لوگ۔

[2] لوگوں میں کوئی اس کتاب پر ایمان لایا اور کوئی اس سے رکا رہا۔

خواجہ الطاف حسین حالی

اردو میں مشاہیر و مصنفین کے خود نوشت حالات شاذو نادر ملیں گے۔ سب سے زیادہ مرزا غالب نے اپنے رقعات میں اپنے حالات لکھے ہیں۔ مگر یہ جابجا منتشر ہیں۔ تاہم ایسے ہیں کہ جمع و مرتب کرنے سے غالب کی خود نوشت سوانحعمری بن سکتی ہے ان کے بعد کسی کی ایسی تحریریں نہیں پائی جاتیں۔ اتفاق سے مولانا حالی کے حالات ان کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے سنہ ۱۹۰۱ء میں خواجہ صاحب سے فرمایش کی تھی۔ اس کی تعمیل میں لکھے گئے تھے۔ ہم اس تحریر کو ذیل میں نقل کرتے ہیں :-

میری ولادت تقریباً سنہ ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق سنہ ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے واقع ہوئی اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ "پیر ہرات" کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلۂ نسب ۲۹ واسطہ سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور ۱۸ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور دس واسطہ سے ملک شہزادہ شاہ ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس اور کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا پہنچتا ہے۔

چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم

اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما و شعرا و دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا۔ اس لئے اکثر اہلِ علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔

چنانچہ سلطان غیاث الدین نے انھیں عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سواد قصبۂ پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبۂ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات کے جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخِ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات سے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہداپور کے نام سے مشہور ہے بیٹی تھیں۔

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے اول سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور پیچھے نوابان اودھ کے دربار میں نہایت درجہ کا منصب یا خدمت حاصل کیا تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اپنی مدد معاش پر قانع رہے۔ جو ابتدائے سلطنت اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس کے جب سے آج تک کسی قوم سے ظاہرا کوئی خدمت نہیں لی۔ مگر انقلابوں کی سبب سے پچھلے بہت

باپ[5] نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے۔ اور فارسی لٹریچر اور تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا۔ انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ ان سے صرف و نحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔ اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارا تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا۔

---

[5] والد کا نام خواجہ ایزد بخش ہے۔ محکمہ نمک میں ملازم تھے۔

میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتب میں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں گرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلہ[۱] کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھے روز و شب رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبا کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر بھی دیکھنے تک نہیں۔ اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح سلم ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آکر ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

---

[۱] مدرسہ کے مقابلہ میں مجہلہ یعنی جہالت خانہ۔

۱۸۵۶ء میں مجھے حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا۔ اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذارے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور ان میں سے جب کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور خاص کر علم ادب کی کتابیں۔ شرح اور لغت کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوتا تھا مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر ان کے اردو و فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔ مگر اس زمانہ میں ایک دو

غزل سے زیادہ دلّی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی۔ اور آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اردو کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک کدورات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری

الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر
تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے
کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ پہلا
مصرع پڑھا "آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" اور کہا کہ انیس نے ناحق
مرثیہ لکھا۔ یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے
خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں
ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی
سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔
تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر
کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی
لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔
لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما
سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادہ کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء
میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے
لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون
کا عنوان شعرا کو دے دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس
طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے اسی زمانہ میں چار مثنویاں
ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر، اور چوتھی
حب وطن پر لکھیں۔

نظم کے سوا نثر میں چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء

میں ایک کتاب تریاق مسموم نیوٹ کرسچین کی کتاب کے جواب میں جو میرا
ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا لکھی تھی۔ جس کو اسی زمانہ میں
لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک
عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرینچ سے عربی میں کسی مصری فاضل
نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ
کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں یونیورسٹی
نے چھپوا کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس برس
پہلے کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے
مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں
غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم
کے متعلق قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی۔ جس پر
گورنمنٹ پنجاب نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ
بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ اور جو مدت دراز
پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب
بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان
کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے جس کے
دس بارہ ایڈیشن اب سے پیشتر شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک
مبسوط ایسے [illegible] مضمون بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ
شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی
فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری
پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف

موسوم بہ حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے جو امید ہے کہ
مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں
فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں۔ جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس
کے علاوہ بیس تیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں
لکھے جو تہذیب الاخلاق علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں
شائع ہوئے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور
عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہیں۔ جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے
ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اس
وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم
وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا
تھا اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ
کی وفات پر لکھی ہے۔ اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ ہجری میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا
نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے
سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم
کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت
علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین
ایک وظیفہ پچھتر روپیہ ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں
جبکہ سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیان
محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا اس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار
کا اضافہ کر کے سو روپیہ سکہ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کر دیا جو

اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے
اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

مولانا حالی کے باقی حالات و اخلاق ہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق دہلوی کے مضمون مطبوعہ "چند ہم عصر" سے مختصر کر کے نقل کرتے ہیں:۔

ایک واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب کہ غفران مآب اعلیحضرت مرحوم کی جوبلی بلدۂ حیدر آباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کئے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک اُن سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے مولانا سے ملنے آئے۔ ٹمٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دئے۔ مولانا یہ تماشہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا"۔ اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے

بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں" اس کیفیت سے جو کرب و درد مولانا کو تھا۔ وہ شاید اس بدنصیب سائیں کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔ اور یہی شان اُن کے کلام میں ہے۔ اُن کی سیرت اور اُن کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے جو کوئی اُن سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر اُن کے حُسنِ اخلاق کا مداح رہتا تھا۔ اُن کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔

ہندی اُردو کا جھگڑا اُن کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے عمر بھر اُردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اُردو کا رتبہ بہت بلند کر دیا، وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے۔ چنانچہ مُنشی نہ جادیہ کے تبصرے میں لکھتے ہیں:-

"کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں انھوں نے چند

مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو مقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف شگفتہ اور فصاحت بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ جو اردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گرامر کا دارومدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر پر ہے۔ عربی فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسما اس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بعینہٖ اس مثل کا مصداق بننا ہے کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔"

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب و محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔

ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بڑی کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے کھپ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اردو ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ کہنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ان کا ذوق شعر اعلیٰ درجے کا تھا جیسا کہ حیات سعدی، یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری سے ظاہر ہے۔ درحقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن وہ خود نمود اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

سرسید تو خیر اس زمانے میں مورد لعن و طعن تھے ہی، وہ ہر کس و ناکس اُن پر منہ آتا تھا۔ لیکن اُن کے بعد جس پر سب سے زیادہ

عجز و ندامت کی یہ چیز بڑی وجہ حالی تھے۔ ایک تو وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے بعید تھی اور شاعرانہ مذمت بن گئی تھی۔ اور مقدمہ شعر و شاعری نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔ اہل لکھنؤ اس معاملے میں پھولے نہ سماتے تھے، وہ ہمیشہ سے ان کی تنقید سے کبھی دو چار نہیں ہوتے تھے۔ یہ اب تم ہی سوچ لو کہ جب ہر طرف سے انھیں کی مخالفت میں کمر بستہ ہو گیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدائیں آنے لگیں، اودھ پنچ میں ایک مسلسل مضمون "مقدمہ" کے خلاف مدت تک نکلا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ حضرت سمجھتے تھے اور [illegible] غلط [illegible] پھکڑ و پھبتیوں [illegible] تک [illegible] تھی جن مضامین کے عنوان [illegible] جیسے

ابتر ہمارے حملے سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

[illegible] سے ان کے [illegible] کوئی ہوئی [illegible] سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے۔

نظم و [illegible] کے چند [illegible] ہیں

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں
تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں
دوسروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس
سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ
ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو
انھوں نے سو سے زیادہ طلب نہ کیے جس سے کچھ بہتر ہی
ہوسکتے ہیں [illegible] تک کچھ ہی ملتے رہتے [illegible] کا
انتظام [illegible] سست [illegible] سے معمولی آدمیوں کو پنشن قرار
دیئے جاتے ہیں وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھی۔ انھوں نے کبھی زیادہ
کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اس سے وہ بہت شکرگزار رہتے تھے۔

[illegible] انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب
کی [illegible] جس سے [illegible] ان کی تصنیف [illegible]
[illegible]
[illegible] نظر کی بات [illegible] خصوصیت [illegible] شخص کے لئے
جس کی آمدنی [illegible] بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

[illegible] جس سال حیدرآباد تشریف
لائے سرسید کی برسی کا جلسہ بھی انھیں کی موجودگی میں ہوا۔ ان
سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لئے سرسید
کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عمادالملک [illegible] صدر
تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لئے بہت اچھا مضمون لکھا تھا
مضمون [illegible] تھا پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی۔ اس لئے آخری حصہ

جھوڑ دیا۔ تیمارگاہ پر واپس آ کر فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک
ہو گیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اچھا ہوا اندھیرا ہو گیا ورنہ
اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت
وغیرہ کا سب انتظام تھا آپ نے کیوں نہ فرمایا اسی وقت پانی یا
شربت حاضر کر دیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے
ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے
تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں
کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر
لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ پیسہ اخبار جب روزانہ ہوا تو
سب سے پہلے مولانا نے مبارکباد کا خط لکھا۔ مولوی ظفر علی خاں
کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ ہمدرد
اور مولانا محمد علی کی بہت ہمت افزائی کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی بات
دیکھتے جو قابل اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے
سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سمجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے
بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر

سنہ ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبد القادر صاحب نے لاہور سے رسالہ مخزن جاری کرنے کا اعلان [illegible]
کیا تو مولانا حالی بہت خوش ہوئے تھے جنھوں نے خبر سنتے ہی [illegible] مخزن کو [illegible]
[illegible] یہ شعر [illegible]

[illegible] | [illegible]

مؤلف

اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد، مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے چبھتے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابل تعریف تھیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم تو ان کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیر ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔ برکھا رت، حب وطن، نشاط امید اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو عزت ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ اس وقت سے ان کو رنج ایسا ہوا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثر نگار ہیں مگر شعر کے کوچے میں ان کا قدم نہیں اٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے۔ کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں:-

۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ناظم سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لیے جو ان دنوں اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لیا کہ یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو درکنار ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔" میں اور ایک اور صاحب موجود تھے۔ ہم یہ سن کر دم بخود رہ گئے۔ ان کو بھی یہ کہنا ہو تو بات تھی لیکن کتاب پڑھنے سے پہلے ہی رائے کا اظہار کر دیا گیا ہو تو بات زبان سے نکالنی چونکہ مناسب نہ تھا، بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیے۔ حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے گئے۔ ان دنوں میں وہ دکن ریویو نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا سختی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے بڑے شفقت آمیز پیرایے میں شکایت کی۔ اس کا ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے

۵۷

جب یہ پڑھ چکے تو مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔
تنقید بہت اچھی چیز ہے۔ اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری
اصلاح کیونکر ہوگی؟ لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث نہ کرو اور بغض
و عناد، تعصب و تنفر سے کام نہ لو۔

مولانا انگریزی کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ لیکن آپ [illegible] کہتے
کہ اردو کا کیا ہوگا۔ لیکن [illegible] کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے نقش
کو بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اس وقت بہت سے انگریزی خواں بھی یہ
سمجھتے تھے۔ ان کا [illegible] ان کی تصنیف [illegible] ہیں۔ [illegible]
سمجھتے تھے وہ اکثر کے [illegible] مسئلے [illegible] موجود ہیں
لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اس کا عشر عشیر بھی پیدا ہو۔
پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح [illegible] خیالی
شخص تھے [illegible] اور سمجھتے تھے [illegible] بھی تھے۔ [illegible]

۵۷ اس پر [illegible] ہے کہ مولانا حالی نے اپنے خط میں ایک صاحب کو جو رسالہ [illegible] کے ایڈیٹر رہ چکے تھے لکھا ہے:
"[illegible] آپ نے [illegible] سے [illegible] ہے۔ [illegible] یہ
تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں [illegible] کا [illegible] ہونے سے
نہایت تعجب ہوا۔ جس شخص کا [illegible] کے [illegible] کے بعد [illegible] ہیں
[illegible] بھی [illegible] ہے۔ اس [illegible]
کو [illegible] کرتے وقت [illegible] ہو [illegible] پسند نہیں کرسکتا۔"
یہ [illegible] مولانا حالی کی انصاف پسندی کے علاوہ ان کے [illegible] کی بھی ہے۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ [illegible]
[illegible] کے وقت مولانا شبلی کو بھول گئے ہوں۔ لیکن مولانا [illegible] سے کام لیا [illegible] سے
[illegible] کو مولانا شبلی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ مؤلف

مفکر بھی ہو اور عملی بھی ۔ ایسا شاذ ہوتا ہے ۔ تاہم مولانا نے اپنی بساط کے
موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں ۔ ایک تو انہوں
نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو اب حالی مسلم ہائی اسکول
کے نام سے موسوم ہے ۔ اور ایک پبلک اور نیشل لائبریری قائم کی جو
پانی پت میں سب سے بلند اور پرفضا مقام پر واقع ہے ۔ اس میں کتابوں
کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں ۔

جن لوگوں نے صرف اُن کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے
کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے ۔ اس میں شک
نہیں کہ اُن کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک
اٹھتا تھا ۔ مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے خصوصاً
اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے
تھے ۔ اُن کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک
نظر آتی ہے ۔

اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے
ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے
تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو
میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں ۔ یہ گفتگو
انہوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ
ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں لیکن سٹیج سے
واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے
مجبور ہیں ۔" (اقتباس از "چند ہم عصر")

مولانا حالی کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا جس کے وہ سالہا سال سے مستحق تھے۔ یہ تاخیر اس لئے ہوئی کہ وہ طبعاً جاہ پسندی اور نمود و نمائش سے بے نیاز تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء (مطابق ۱۳۳۳ھ) کو اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرمایا۔ مؤلفِ احقر حامد حسن قادری نے یہ تاریخِ وفات کہی :-

"تاریخ از کلام پاک" نَبَشِّرُهُ بِمَغْفِرَةٍ (سورۂ یٰسین)

۱۹۱۴ء ۱۳۳۳ھ

دوسری تاریخ سنہ ہجری میں نکالی: حُسْنُ الْعَاقِبَةِ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْن

۱۳۳۳ھ

مولانا حالی کی تصانیف نثر

مولانا حالی اردو کے عناصر خمسہ[1] میں دو ضروری عنصر تھے جس کے بغیر مزاجِ اردو صحیح و معتدل نہیں رہتا بلکہ جو علم و ادب کی نفس حیات کا جزو لاینفک ہے۔ حالی اور ان کے ہم عصروں نے ۲۰، ۳۰ برس کے اندر وہ لٹریچر پیدا کر دیا جس کے بغیر کسی زبان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اور جس کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہ تھا۔ حالی کی تصانیف سے پہلے سرسید مذہبی و اصلاحی مقالات، آزاد تذکرہ و تاریخ، نذیر احمد ناول شروع کر چکے تھے۔ سیرت و سوانح اب تک کسی نے نہ لکھے تھے۔ حالی پہلے سیرت نگار ہیں۔ تنقید شعر و ادب بھی اب تک اردو میں نہ آئی تھی۔ حالی پہلے تنقیدی مصنف بھی ہیں۔ شبلی نے سیرت و تنقید دونوں میں بڑا کام کیا۔ لیکن حالی کے بعد شروع کیا۔ حیات سعدی پہلی باصول سیرت ہے۔

مولانا حالی نے اپنے حالات میں بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصانیف نثر بہ ترتیبِ تصنیف یہ ہیں :-

---

[1] سرسید - آزاد - نذیر احمد - حالی - شبلی -

(۱) **تریاق مسموم**۔ حالی کی سب سے پہلی تصنیف کسی عیسائی کے جواب میں۔ (۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ) اب نایاب ہے۔

(۲) **طبقات الارض**۔ تاریخ زمین کی تصنیف عربی (فرانسیسی) ... عربی زبان سے اردو ترجمہ۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۶۹ء میں چھاپا لیکن اب نہیں ملتا۔

(۳) **اصول فارسی**۔ فارسی زبان کے قواعد (۱۸۶۸ء)

(۴) **مولود شریف**۔ طرز قدیم کی کتاب مجلس میلاد میں پڑھنے کے لئے ۱۸۶۸ء سے کچھ پہلے لکھی۔ اور بعد وفات شائع ہوئی۔

(۵) **تریاق محمدی پر منصفانہ رائے**۔ ایک عیسائی کی کتاب کی تنقید۔ (۱۸۸۰ء / ۱۲۹۵ھ) اب نایاب ہے۔

(۶) **شواہد الالہام**۔

(۷) **مجالس النساء** (دو حصے)۔ لاہور میں ۱۸۷۴ء میں عورتوں کے لئے اخلاقی قصہ لکھا۔ گورنمنٹ سے چار سو روپیہ انعام ملا۔

(۸) **سوانح عمری حکیم ناصر خسرو** (۱۸۸۲ء / ۱۳۰۰ھ) اب نایاب ہے۔

(۹) **حیات سعدی** (۱۸۸۶ء / ۱۳۰۴ھ)

(۱۰) **مقدمہ شعر و شاعری**۔ ۱۸۹۳ء / ۱۳۱۰ھ میں اپنے دیوان کے ساتھ یہ مقدمہ شائع کیا۔ لیکن یہ ایک مستقل تصنیف تھی اس لئے ... میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

(۱۱) **یادگار غالب** (۱۸۹۷ء / ۱۳۱۵ھ)

(۱۲) **حیات جاوید**۔ سرسید کی مفصل سوانح عمری۔ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔

(۱۳) **سوانح عمری مولانا عبد الرحمٰن**۔ یہ مولانا حالی کے استاد تھے۔

(۱۴) **مضامین حالی**۔ ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ سے ۱۹۰۱ء تک کے مضامین تہذیب الاخلاق ...

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، کالج میگزین، معارف[1]، اردوئے معلی، ندوۃ العلماء وغیرہ سے جمع کر کے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے مرتب کیے اور جناب مشتاق بخشی پانی پت نے ۱۹۰۲ء میں شائع کیے۔

(۱) **مقالات حالی**: ایک جلد میں حالی کے بعد دو حصوں میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیے۔

(۲) **مکتوبات حالی**: خطوط حالی دو حصوں میں۔ مولانا کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیے۔ اور عبدالحق صاحب دہلوی کا مقدمہ ہے۔

مولانا کی شاعری اگرچہ ادبیات نثر کے مباحث میں داخل نہیں ہے لیکن مولانا کے تذکرے ادبیات کے سلسلے میں مختصر طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا فن شاعری اور نقد شعر میں علی الخصوص صاحب نظر و صاحب ذوق تھے۔ ان کے دیوان غزلیات میں مومن اور غالب کی نزاکت و لطافت کا اثر بھی ہے اور درد و مصحفی کی سادگی و جذباتیت بھی۔

جدید شاعری کا آغاز اگرچہ آزاد کی کوشش و کاوش سے ہوا لیکن ان کے رفیق کار بلکہ شریک غالب حالی تھے۔ لاہور کے مشاعرے میں آزاد نے چار نظمیں پڑھیں اور مشاعرے کی تحریک آزاد نے کی لیکن حالی کی صرف دو نظمیں برکھا رت اور حب وطن آزاد کی سب نظموں پر بھاری تھیں۔ اس کے بعد حالی نے جو نظمیں لکھیں انھوں نے شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔

مسدس حالی (مدوجزر اسلام ۱۸۷۹ء) کی عظمت، قبولیت، تاثیر اور اشاعت کو قومیہ نظموں کی کوئی دوسری نظم نہیں پہنچتی۔ مناجات بیوہ (۱۸۸۴ء) خاص کر ہندوستان کی معاشرت و مذاق کی تصویر ہے۔ اور مولانا حالی کی عظمت شاعرانہ تسلیم کرانے کے لیے یہ نظم تنہا کافی ہے۔ نشاط امید (۱۸۷۴ء)، رحم و انصاف (۱۸۷۴ء)، شکوۂ ہند

---

[1] یہ "معارف" مولوی سید سلیمان ندوی کے زیر ادارت اعظم گڑھ سے بہت پہلے کا ہے۔

(۱۸۸۶ء)، حب کی داد (۱۸۹۰ء) بھی اپنے اپنے رنگ کی پہلی نظمیں ہیں۔ باقی چھوٹی بڑی نظمیں جو ایک ضخیم مجموعہ کی قدر ہیں، اور چند بار علیحدہ یکجا شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ رباعیات حالی اردو میں ایجاد جدید ہیں۔

مولانا حالی باوجود ماہرِ فن ہونے کے قواعد شاعری یا ضوابط استادی کے کچھ بہت پابند نہ تھے۔ شاعری کا سب سے مکروہ عیب تعقید لفظی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ آزاد و حالی دونوں اس کو قابل احتراز نہیں سمجھتے، اگر آزاد کے استاد ذوق اس عیب سے اجتناب نہ کرتے تھے، تو حالی کے استاد غالب و شیفتہ کے ہاں تو شاذ و نادر بھی نہ ملے گا۔

حالی کا شاعرانہ کمال زبان و محاورہ کی صحت، طرز بیان کی جدت و موزونیت، لب و لہجہ کا لوچ اور لطافت ہے۔ الفاظ کا انتخاب اس قدر صحیح و برمحل ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ شعر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مولانا حالی کی قدر دانی

اپنے ہم عصروں کی طرح مولانا حالی نے بھی اپنی تصانیف کی کامیابی و قدردانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ خاص کر ان کی نظموں اور نظموں میں بھی ایک مسدس کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ تمام اردو شاعری میں کسی دوسری نظم کو میسر نہیں آیا۔ لیکن اس خاص قدرشناسی میں مولانا واحد منفرد ہیں کہ ان کا جشن صد سالہ عظیم الشان پیمانے پر منایا گیا۔ سنہ ہجری کے حساب سے ۱۳۵۳ھ میں مولانا کی ولادت کو پورے سو برس ہو گئے۔ ۲۷ رجب ۱۳۵۴ھ (۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو مولانا کے وطن پانی پت میں جشن ہوا۔ جس کی صدارت نواب صاحب بہادر بھوپال نے کی اور حالی میموریل اسکول پانی پت کو بیس ہزار روپیہ عطا فرمائے۔ دوسرے قدرشناس اصحاب کے علاوہ گورنمنٹ پنجاب نے بھی ایک ہزار روپیہ دیے۔

ڈاکٹر اقبال نے اس جشن کے موقع پر اس قطعہ میں خراج تحسین ادا کیا تھا:-

آں لالہ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد / سید دگر او را نمے از اشک سحر داد

حالی ز نواہائے جگر سوز نیا سود / تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

نیاز مند مومن نے ایک قطعہ فارسی میں چند تاریخیں مرتب کیں۔ ایک تاریخ عربی میں کہی: وَاللّٰهِ ذٰلِكَ فَوْزٌ عَظِيم (۱۹۳۵ء)۔ دوسری ایک مشہور مصرع سے نکالی: "توقیع قبول روزیت باد" (۱۳۵۴ھ)

پیشکش اخلاص

۱۳۵۴ھ

سال میلادی جشن حالی ست / "منظر ملک عقیدت آئین" (۱۹۳۵ء)

سال ہجری چو بخواہند بگو / کہ "ز احباب خراج تحسین" (۱۳۵۴ھ)

ایک اور تاریخ مرزا داغ دہلوی کے مصرع میں تضمین کے ساتھ نکلی:-

قسمت سے مل گئی ہے یہ زینت بجلی / "ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے" (۱۹۳۵ء)

اس جشن صد سالہ کی یادگار میں رسالہ زمانہ کانپور وغیرہ نے حالی نمبر شائع کیے۔

زنانہ حالی کا طرز تحریر

مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "تریاق مسموم" وغیرہ مفقود ہیں کہ ان کے اسلوب تحریر کا اندازہ ہو سکے۔ سب سے قدیم کتاب "مولود شریف" اور "مجالس النساء" (۱۸۷۴ء) موجود ہیں۔ ان میں آخر الذکر "مجالس النساء" خاص چیز ہے یعنی عورتوں کے لیے اخلاقی و تعلیمی مسائل افسانے کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ اس سے پہلے مولانا نذیر احمد کی مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) وغیرہ شائع و عام ہو چکی تھی۔

سلہ فارسی جدید میں سنہ عیسوی کو سنہ میلادی کہتے ہیں۔

اس سے ان کو دیکھ کر مولانا حالی کو لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ چنانچہ وہی انداز بیان اور دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان لکھی ہے۔ لیکن نہ مولانا نذیر احمد کے مغلق الفاظ ہیں نہ عامیانہ محاورات و امثال۔

اس سے دس برس بعد حیات سعدی (۱۸۸۴ء) اور اس کے دس برس بعد مقدمہ شعر و شاعری لکھا۔ ان میں مولانا کی اصلی شان تحریر نظر آتی ہے۔ زبان و محاورہ کی صحت، طرز بیان کی بے تکلفی اور لب و لہجہ کی نرمی و روانی نمایاں ہے۔ ان کے ہاں سرسید کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور و شور اور ظرافت نہیں ہے لیکن دوست بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے۔ حالی کا طرز سرسید سے زیادہ دلکش ہے۔ حالی نے سرسید کے اسلوب اور زبان کی قدامت کو زبان حال کے مطابق کر دیا ہے لیکن سرسید کے جوش بیان اور تیزی طبع کا ایک دوسرا متنوع سبب کی جدت یہاں کہاں ہے۔ مولانا حالی بڑے ذہین مولانا تھے۔ ان میں زور و شور کی خاص کوشش نہ تھی۔ ان کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں گرمی اور تیزی نہ تھی۔ انہوں نے غور و فکر سے کام لے کر اردو زبان و ادب کا جائزہ لیا، اس کی خامیوں کو دیکھا، ضرورتوں کو سمجھا، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے جدید موضوعات کی کتابیں لکھیں لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے نئے دور پیدا نہ کر سکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید چھوڑ کر موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور نئی راہ نکالنا۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری آگ ہو اور اس کی طبیعت میں شوق و جوش ہو۔ اسد اللہ خاں مرزا غالب، سرسید، آزاد، نذیر احمد، شبلی کی ایجادیں اور اختراعیں اسی صفت کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی صاحب طرز نہیں ہیں۔

مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت، بیان کی صداقت، زبان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی، سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے، بلکہ بعض جگہ نادرہ و جدید بھی ہے۔ لیکن ان کی عبارت پڑھنے سے ذہنی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ انشا پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم ان کی [illegible] کی تحریر کا اثر ہوتا ہے۔ اس سے حالی کوئی خاص صاحب طرز نہیں ہیں۔ لیکن **صحیح و با اصول ادیب** ہیں۔

اسلوب حالی کی ایک لطیف خصوصیت انتخاب الفاظ ہے خصوصاً ہندی الفاظ کا استعمال اور ان کی بے ساختگی و برجستگی۔ مثلاً

(۱) "[illegible] باغ میں [illegible] خزاں شروع ہو گئی تھی [illegible] کچھ لوگ دنیا سے [illegible] جا چکے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔" ([illegible])

یہاں کہنا یہ تھا کہ اس باغ میں خزاں شروع ہو گئی تھی [illegible] مفہوم وہی رہتا لیکن بہت چھوٹا سا لفظ ہے لفظی مفہوم [illegible] کے اعتبار سے [illegible] کے اس قدر مناسب ہے کہ کچھ لوگ دنیا سے باہر جا چکے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔"

(۲) "[illegible] میں [illegible]"
(مقدمہ شعر و شاعری)

(۳) "[illegible] کہ اس نے اپنے [illegible] میں وہی [illegible] بعد دیے ہیں جو دلوں کو [illegible] کرتے تھے۔"
(مقدمہ شعر و شاعری)

یہ ہندی کے الفاظ اور محاورے حالی کی نظموں میں نثر سے بھی زیادہ تاثیر پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے۔ یعنی انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے؛ حالانکہ یہ انگریزی زبان سے محض ناآشنا تھے۔ چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) "اس کے ایک بند میں ایک پوائنٹ[1] عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے، لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

(۲) "ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل[2] قابلیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔" (حیات جاوید)

(۳) "جس کو پالیٹکس[3] کے دوستوں میں سے کسی نے عام مدبر سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز[4] خیال کیا جاتا ہے۔" (حیات جاوید)

(۴) "یعنی تخیل انفورمیشن[5] کو وسعت دے۔" (مضامین حالی)

اسی طرح میٹیریل (مواد، مسالہ)، امیجنیشن (تخیل)، فورکس، ڈیفینیشن (تعریف)، ججمنٹ (فیصلہ) وغیرہ کلمات بے تکلف لکھتے ہیں۔ یہ روش سب سے پہلے سرسید نے نکالی تھی۔ پھر حالی و نذیر احمد زیادہ اور شبلی و شرر لکھنوی کم اسی راہ پر چل نکلے۔ ان بزرگوں میں سرسید تو انگریزی پرستی کی دھن میں کسی بات کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ مذہب، معاشرت، زبان، تعلیم سب کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ نذیر احمد کوئی با اصول آدمی نہ تھے۔ انھوں نے مولوی ذکاء اللہ

---

[1] نکتہ، مطلب، بات۔ [2] جسمانی۔ [3] سیاست۔
[4] راست باز۔ [5] تخیل۔ [6] معلومات۔
[7] شرر لکھنوی کے فقرے میں: (۱) اس کے مثالیں بھی کم نہیں۔ مثلاً یہ اسی قسم کی مثالیں معلوم ہوتے ہیں (مضامین شرر، جلد ۔ صفحہ ۔)
(۲) فردوس (...) نے ... غزل خوانی کا چارج (منصب) اپنے ذمے لے لیا (مضامین شرر، جلد ۔ صفحہ ۔)

کے لئے لکھا ہے کہ "وہ سید احمد خان کے بھو تھے"۔ لیکن یہی لقب خود ڈپٹی نذیر احمد پر بھی صادق آتا ہے۔ پھر نذیر احمد ظریف طبع بلکہ "مسخرے" تھے اور انگریزی کی بھرمار بھی ان کے مسخرا پن کی ایک ادا تھی۔ حالی جیسے متین وبا اصول ادیب کے لئے اس طرز کو اختیار کرنے کا بجز تقلید سرسید کوئی سبب نہ تھا۔ لیکن اسی جذبے نے ان کو نہ سوچنے دیا کہ وہ اور ان کا زمانہ ادبیات جدیدہ کے لئے پیشوا و رہنما ہیں۔ ان کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہئے جو باقی و جاری رہنے کے قابل ہو۔

علامہ آزاد اور مولوی ذکاء اللہ تو قدامت پسند تھے۔ ان کا انگریزی الفاظ استعمال نہ کرنا کسی غور و فکر اور پیش بینی کی بنا پر نہ تھا۔ البتہ علامہ شبلی کے ذوقِ صحیح اور نباضیِ ادب و انشا کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے اس کج روی کو سمجھ لیا اور اس سے بچ کر چلے۔

مولانا حالی پر اعتراضات

سرسید کے رفقا محض جرم رفاقت و ہمنوائی کے سبب سے اور طعن و اعتراض کے نشانے بنائے گئے۔ ان میں مولانا حالی بھی تھے۔ ان کے مسدس کو اسلام سے بغاوت اور مسلمانوں کی توہین سمجھا گیا۔ اور ان پر بھی کفر و گمراہی کے فتوے لگائے گئے۔ ہم کو اس قسم کے اعتراضات سے بحث نہیں۔ یہ فوری جوش تھا جس غصے کے ساتھ اٹھا تھا اسی طرح بیٹھ گیا۔ ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا گیا۔ ۱۸۸۰ء تک تمام ملک میں پھیل گیا۔ اور اس پر غدر برپا ہونے لگا۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں جب مولانا نے مسدس پر دوسرا دیباچہ لکھا ہے تو اس میں لکھتے ہیں:-

> "بعض قومی مدرسوں میں مسدس کا تھوڑا تھوڑا حصہ بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔"

ہمارا بحث مولانا کے موضوعات تصنیف اور اسالیب نظم و نثر کی نکتہ چینیاں ہیں۔ ان کی حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی کے بڑے کارنامے دو ہیں۔ (۱) سیرت اور (۲) تنقید۔ ان دونوں موضوع پر اردو میں کوئی باصول تصنیف موجود نہ تھی۔ سوانح سعدی و غالب و سرسید اور مقدمۂ شعر و شاعری اردو ادب حالی دونوں کی اوّلیات ہیں۔ ان دونوں کی فنی خصوصیات اور مراتب تکمیل سے "اردو نویس" اور "اردو خواں" دونوں ناآشنا تھے۔ انگریزی زبان میں یہ علوم بالکل مکمل نہیں تو اعلیٰ پایہ پر موجود و مدوّن تھے۔ لیکن حالی انگریزی نہ جاننے کے سبب سے بلاواسطہ ان علوم کو حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ترجموں کے ذریعہ سے انھوں نے یورپ کے اصول تنقید دریافت کیے اور ان کو اپنے موضوع "مقدمہ" اور ہندوستان اور اردو زبان کے مناسب حال مرتب کیا۔ اس لیے حالی کی کوتاہیاں ان کے لیے عیب نہیں بلکہ محض "مقدمہ" کا لکھ دینا ہی ان کا ہنر ہے۔ پھر کسی نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ کا یہ لکھ دینا:

> "خیالات خواہ وہ کیفیت محدود و نظر سطحی ہی ہو، ایک معمولی غور و فکر کا نتیجہ ہوں، دماغ و شخصیت واسطہ یہ ہے حالی کی کائنات۔ سارے خیالات جن پر یہاں تنقید کی گئی ہے، وہ سب مغرب سے لیے گئے ہیں۔ دوسرے خیالات مشرقی ہیں۔ اور مقدمہ شعر و شاعری میں مغربی و مشرقی خیالات ایک جگہ منضبط و یکجا ہوئے ہیں۔"

نقادیِ ادب اور ادبِ نقادی دونوں کے لیے زمانہ تھا۔ مقدمۂ حالی تنقید کی فنی کتاب نہیں ہے، بلکہ تنقید کا مذاق پیدا کرنے کی پہلی کوشش ہے، جس کی نظیر اردو کیا فارسی و عربی میں بھی نہ تھی۔ اس میں خامیاں ضرور ہیں، اور وہ بعد کی بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اتنی وسعت و جامعیت کی بھی کوئی کتاب ان پچاس برس میں پیدا نہ ہو سکی۔

حالی کی تصنیفات سیرت (حیات سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید) پر یہ اعتراض ہے کہ مولانا نے ان کی سیرت نہیں لکھی بلکہ ہیرو مانکر ان کے کارنامے بیان کئے ہیں۔ مولانا شبلی نے "حیاتِ جاوید" کی صورت دیکھ کر کھولنے اور پڑھنے سے پہلے تو فرما دیا تھا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔" اور پڑھ کر فرمایا کہ "سرسید کی مدلل مداحی کی ہے۔" پھر اور لوگوں نے کہا کہ

"یہ کتاب شروع سے آخر تک یک اعتذار (اپولوجی) کا پہلو لئے ہوئے ہے۔"

یعنی مولانا حالی نے سرسید کی طرف سے گویا صفائی پیش کی ہے۔ مولانا نے کسی دعوی علم وفن کے ساتھ یہ کتابیں نہیں لکھیں۔ یہ "موران اسلام" یا "مشاہیر ہند وعجم" کے سلسلے میں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تینوں ہستیوں کے جوش محبت میں لکھی گئی ہیں۔ سعدی کے حالات سعدی کی مقبولیت اور ان کے عجیب و گوناگوں سوانح کے سبب سے لکھے۔ غالب کا تذکرہ صرف اپنے استاد کی یادگار قائم کرنے کے لئے لکھا، سرسید کی سیرت ان کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے اہتمام بالشان کارناموں کو پیش کرنے کے لئے مرتب کی۔ لیکن یہ تینوں چیزیں ایسی تھیں کہ ایران میں بھی ایسی سیرت سعدی موجود نہ تھی۔ وہاں حالی کی حیات سعدی کا فارسی جدید میں ترجمہ کیا گیا۔ غالب کے سوانح نگار آج بھی "یادگار غالب" کے استفادہ سے بے نیاز نہیں ہیں۔ "حیات جاوید" سرسید کے موافق ومخالف دونوں گروہوں کے لئے معلومات کا واحد ذریعہ ہے۔ ان تصانیف کی اہمیت اور مولانا کا کمال سب سے بڑھ کر یہی ہے۔

حیات سعدی پر ایک عجیب اعتراض یہ بھی ہے کہ مولانا نے شیخ سعدی کے لئے صیغہ واحد غائب لکھا ہے: "شیخ کہتا تھا"، "شیخ لکھتا ہے" اور اس کو سوءِ ادب سمجھا گیا ہے۔ یہ اعتراض اول تو مؤرخ پر نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں تاریخی ہستیوں کے لئے یہ طرز جائز رکھا گیا ہے۔ دوسرے، شیخ سعدی کے شیخ طریقت اور ولی اللہ

ہونے کی حیثیت اس قدر مشہور نہیں ہے، جتنا ان کا مصنف، شاعر، انشا پرداز اور ظریف ہونا۔ اور ان میں سے ہر حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ان کو اس طرح لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ آزاد نے بھی "سخندان فارس" میں شیخ سعدی کے لئے ضمیر واحد استعمال کی ہے:۔ "اس کے ننھے ننھے فقرے"، "اس کی نثر"، "اس کی قدرتی فصاحت"۔ (اس داستان اردو کا صفحہ ۲۴۲ دیکھئے) تیسرے شیخ سعدی اسی امر میں خاص طور پر قابل استثنا ہیں۔ ان کی مقبولیت و شہرت نے ان کے اندر ایک شان محبوبیت پیدا کر دی ہے۔ اور وہ بے تکلفی کا سبب ہو سکتی ہے۔ یہ بات خسرو، حافظ، جامی کسی میں سعدی کے برابر نہیں ہے۔

علامہ شبلی کا کارنامہ سیرت و تنقید میں مولانا حالی سے افضل و وسیع تر ہے۔ لیکن ہیرو پرستی و رجحان پسندی اور اپنے ناپسندیدہ شخص کی عیب پوشی و عیب کوشی بھی مولانا شبلی کی طبیعت میں ہے[1] جس کا ذکر ان کے حالات میں آئے گا۔ علامہ آزاد بھی اس سے بری نہیں ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ پر بھی "انگریز پرستی" کا الزام ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر بھی جانب داری سے خالی نہیں ہیں۔ یعنی ہندوستان کے سیرت نگاروں کو تحقیق و تدقیق و تجزیہ و تنقید کا سلیقہ تو آ گیا ہے۔ لیکن بے لاگ اظہار رائے کی اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہوئی۔ مولانا حالی تو "طبعاً نہایت بامروت، صلح پسند، بشاش و عیب پوش" تھے۔ انھوں نے اگر غالب و سرسید کی عیب جوئی نہیں کی تو علامہ آزاد اور علامہ شبلی کی تو بہیوں پر بھی پردہ ڈالا ہے۔ اور ان کی تاویلیں کی ہیں، جیسا کہ "مضامین حالی" کے ذکر میں آتا ہے۔

---

[1] تنقیدات شعرالعجم جو مختلف نقادوں نے لکھی ہیں، دیکھنے کی چیز ہیں۔ ہم نے اپنی تصنیف تاریخ مرثیہ گوئی زیر طبع (مرتبہ ۱۹۳۲ء) میں مفصل لکھ دیا ہے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کو ہیرو بنا کر ان کے مقابل میں مرزا دبیر کی خوبیوں سے کس طرح چشم پوشی کی ہے۔ مؤلف

تصانیف حالی کے نمونے

(۱) مجالس النساء، یہ کتاب مولانا حالی کی تصانیف میں ایک ہی ہے، اور ان کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ صرف ان کی قدرت زبان اور لطف محاورہ کے نمونے کے لئے مختصر اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"آتو جی سچ ہے یوں تو اشراف زادیوں نے کیسا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ کیسی ان گھروں پر جہالت چھا گئی۔ کیسا اُلٹ زمانہ آگیا۔ محمودہ بیگم ذرا سوچنے کی بات ہے۔ ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف کہلاتے ہیں، سب کے ہاں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، پر بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص اپنی بساط کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے۔ پر میں نہیں جانتی اس ملک کی برکت کہاں اُڑ گئی۔ جب دیکھا یہی دیکھا کہ سو میں سے دو چار بچے جو ایسے ہی صاحب نصیب اور ہونہار ہوئے، وہ تو کچھ پڑھ کر کسی قابل ہو گئے، اور باقی وہی کے دن کے دن رہے۔ ہاں اب انگریزی سرکاری مدرسوں میں پڑھنا لکھنا بے شک زیادہ ہو گیا ہے، پر آدمیت سی چیز وہاں بھی کم ہی جم آتی ہے۔۔۔۔۔۔"

"تم اپنے جی میں کہو گی تو سہی کہ بڑھاپے میں عورت کی عقل جاتی رہی ہے، پر مجھ سے جو پوچھو تو یوں ہے کہ خدا بیٹیوں کا بدلا لیتا ہے۔ ماں باپ نے یہ سمجھا تھا کہ بیٹوں کی کمائی میں تو ہمارا ساجھا ہے، اور بیٹیوں سے ہم کو کچھ لینا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہو سکے بیٹوں کو پڑھائیں جو کل کو ہمارے بھی کام آئیں۔ خدا کو یہ بات ناپسند آئی۔ اس نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے ان پڑھ رہی تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے۔"

(۲) حیات سعدی، یہ سیرت تحقیق، جامعیت، حسن ترتیب کے لحاظ سے اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ مولانا حالی نے ہر ممکن ذریعہ سے حالات جمع کئے ہیں۔

سعدی کی تصانیف سے حالات لیے ہیں۔ ابتدا میں سعدی کے وطن شیراز کا مختصر ذکر کیا ہے۔ پھر سعدی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کے لئے ہر جگہ صرف شیخ کا لفظ لکھتے ہیں۔ حالات کے بعد سعدی کی تصانیف پر نظر ڈالی ہے۔ دو سروں سے مقابلہ کیا ہے گلستان اور بوستان کا ان کی جوابی تصانیف کے ساتھ موازنہ کیا ہے چند مقامات سے مختصر انتخابات لکھے جاتے ہیں :۔

(۲) شیراز کے حال میں لکھتے ہیں :۔

"بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ جیسے یزد، بیضا، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علماء و فضلاء اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو عہد ساسان میں ایران کا پایۂ تخت رہا ہے۔ مسلمان مورخوں نے جس طرح قم کو "دار المومنین" اور یزد کو "دار العبادۃ" کا خطاب دیا ہے اسی طرح شیراز کو "دار العلم" کے لقب سے ملقب کیا ہے......

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت و خوش اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ و علماء و شعراء پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوتے ہیں۔ شیخ (یعنی شیخ سعدی) نے بھی بوستان کے دیباچہ میں اہل شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے وہ حالات سفر میں ملا تھا۔ شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعراء و مصنفین ابتدا سے آخر تک اٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں [illegible] ہے ان کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے

کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے۔ اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لئے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا۔

(ب) جس زمانے میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا۔ اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور اہل علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے۔ عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے امرا اور فرماں روا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امرا اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی۔ وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور پھر اسی آنکھ سے اس دار الخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایہ ہند اور یورپ اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا۔ اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت و اقتدار کا ہمیشہ کے لئے صفحہ روزگار سے مٹ جانا بچشم خود دیکھا تھا۔ شیخ نے وہ

تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم وستم بھی اس کی آنکھوں کے روبرو گذرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کئے۔ ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لئے ایک عمدہ سبق تھا جس نے اس کے دل میں قوم کی دلسوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خدا اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ابیات

(۱) آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں

(۲) اے محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک
سر برآور ویں قیامت در میانِ خلق بیں

(۳) نازنینانِ حرم را خونِ خلق بے دریغ
ز آستاں بگذشت و ما را خونِ دل از آستیں

ترجمہ

(۱) آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔

(۲) اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجئے۔

(۳) محل کے نازپروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک گیا۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا۔ تکبر اور غرور نے اس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اس کے بیٹے ابوبکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر اس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفرین سمجھو مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے مٹنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے یکبارگی ان میں تزلزل آگیا اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آب باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گئی۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو ان کو ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بہارے بعد بہت روئے ہم کو اہل وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

(ج) یہ واقعہ بوستان سے لیکر لکھا ہے۔ شیخ سعدی نے اپنے سفر ہندوستان کی ایک حکایت لکھی ہے۔ اس طرح شروع کرتے ہیں :-

بتے دیدم از عاج در سومنات مرصع چو در جاہلیت منات

مولانا حالی اس کا خلاصہ شیخ کی زبانی لکھتے ہیں :-

"جب میں سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لئے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بے جان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لئے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کردی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اس کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ نوواذ ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں اس لئے اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات مندر میں رہو تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لئے [illegible] بن گیا۔"

(۳) **مقدمۂ شعر و شاعری** مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں یہ "مقدمہ" اپنے دیوان میں شامل کرنے کے لئے لکھا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں شاعری کی تعریف اور شعر و شاعر کے لوازم و خصائص سے بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری اور شاعروں پر تنقید کی ہے۔ نمونے یہ ہیں:-

(۱) کمالِ شاعری کے لئے ضروری شرائط -

سب سے مقدم اور ضروری چیز جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوتِ متخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں امیجینیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جس شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کمالِ شاعری کے لئے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو اس کمی کا تدارک اس ملکے سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکہ فطرتی کسی میں موجود نہیں تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ ماضی و استقبال اس کے لئے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے وہ آدم اور جنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہئے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری عنقا اور آبِ حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کر سکتا ہے گو ذہن حقیقت کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوسکتے لیکن جب اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند

ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہونے لگتے ہیں مثلاً فیضی کہتا ہے ؎

سخت است سیاہی شب من
لختے ز شب است کوکب من

اس پر منطقی قاعدے سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے زیادہ تاریک کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور تمام کواکب ایسے اجرام ہیں جن کا وجود بغیر روشنی کے تصور میں نہیں آسکتا پھر ایک خاص کوکب ایسا مظلم اور سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کو کالی رات کا ایک ٹکڑا کہا جا سکے؟ مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔

(ب) **زبان کی درستی اور اس کا تحفظ**۔ جو لوگ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں۔ یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ ان کو اس بات پر فخر نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اور ہماری روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے ان کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے اس کے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں گے۔ اور اس کی نظم و نثر کو زمانے کے مذاق کے ساتھ ترقی نہ دیں گے تو ان کی زبان کا وہ حصہ جس پر ان کو فخر ہے جو ان کی اور تمام ہندوستان کی اردو میں مابہ الامتیاز ہے وہ حرف غلط کی طرح صفحہ روزگار سے محو ہو جائے گا۔ اور یہی بری بھلی اردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعہ ملک میں پھیل رہی ہے۔ اور جس کو وہ اب تک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نصف صدی

میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پا جائے گی۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ عرب میں جب سے انشا کی سرد بازاری ہوئی۔ اور عربی نظم و نثر کے مالک غیر ملکوں کے باشندے ہو گئے رفتہ رفتہ وہ کلیسکل[1] عربی جس پر عربوں کو ناز تھا لٹریچر کی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور وہی بگڑی[2] زبان جس کو عرب عربا[3] حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام عربی لٹریچر پر غالب ہو گئی اور شام۔ روم۔ مصر و بربر اور سوڈان وغیرہ میں عموماً پھیل گئی۔ یہاں تک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی انجام دلی اور لکھنؤ کی زبان کا اگر اس کی خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دلی جس کو اردوے معلّی کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہیئے وہاں مصنف اور ناظم پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں۔ پرانے لوگوں میں سے چند نفوس جن کو چراغ سحری سمجھنا چاہیئے باقی رہ گئے ہیں ان کے بعد بالکل سناٹا نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلی سے بہت زیادہ سننے میں آتا ہے۔ وہاں سے ناول[4] اور ڈرامے برابر ملک میں شائع ہوتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا قدم زمانے کی رفتار کے متوازی نہیں اٹھتا جس قدر وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی قدر ترقی کے رستے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی و فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور

---

[1] انگریزی کا لفظ ہے یعنی مستند عربی۔ [2] خالص عرب

[3] یہ پنجابی کا لفظ ہے۔ یہاں ''ناول'' رائج ہے۔

تمام حروف اور غالب حصہ اس کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا سے متعلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کی بنیاد پر گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا اور محض مادری زبان کے بھروسے اس کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔

اس اقتباس میں مولانا حالی کا آخری مشورہ آجکل اردو ہندی کے قضیہ میں قابل توجہ ہے۔ مولانا اردو شاعری کے لئے عربی و فارسی اور ہندی دونوں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور خود اسی پر عامل ہیں۔ ان کے کلام میں ہندی کے وہ الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں جو دوسروں نے استعمال نہیں کئے اور ان سے مولانا کے کلام میں عجب لطف و اثر پیدا ہو گیا ہے۔

(۳) **یادگارِ غالب** ۔ مولانا حالی نے یہ کتاب یہ سوچ کر لکھی ہے کہ اس عجیب و بے نظیر ہستی کی یادگار باقی رہنی چاہئے۔ غالب کے حالات اس سے پہلے "آب حیات" میں مختصر طور پر تھے۔ نواب شیفتہ کے "گلشن بیخار" میں اتنے بھی نہ تھے۔ رقعات غالب کے سوا اور کہیں ان کے حالات نہ مل سکتے، پھر مولانا حالی سے بہتر کون لکھ سکتا تھا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب بہ حیثیت انسان، دوست، استاد، شاعر، انشا پرداز، ظریف، کے عجیب و غریب شخص تھے۔ اس لئے کسی نوجوان نقاد کا یہ اعتراض:-

"کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں

کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے۔ یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر حیاتِ انسانی میں کسی نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں؟ ..... "مرزا کے حالات زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔"

صرف جوشِ مخالفت کی تراوش ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کوئی سبق رکھ سکتی ہے، تو غالب کی زندگی بھی رکھتی ہے۔ بلکہ غالب کی زندگی وہ بابِ اخلاق وا کرتی ہے، جو ہندوستان کے نوجوانوں کی مادی اور "تجارت رنگ" زندگی پہ بند ہے۔ غالباً اسی وجہ سے معترض کو مرزا کی وضعداری، سیرچشمی اور زندہ دلی میں کوئی سبق نظر نہیں آیا۔ اسی معترض کی یہ خواہش بیشک درست ہے:۔

"یادگارِ غالب کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور، ان کے معاصرین میں ان کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں ان کے کمالات پیش کئے جاتے۔"

لیکن مولانا حالی کو مرزا غالب کی ذات سے بحث تھی۔ اور ان کے کمالاتِ سخن سے صرف اس قدر کہ ان کی عظمت فی الجملہ واضح ہو جائے۔ مولانا اس مسلک کے آدمی نہ تھے کہ مومن و ذوق اور ناسخ و آتش یا فارسی میں قتیل و شہید اور شیفتہ و تجربہ رد و قدح کرتے۔ بہرحال ایسا نہ ہونے سے موجودہ یادگارِ غالب مولانا کے یا اردو کے لئے باعثِ ننگ و عار تو نہیں ٹھرتی۔ لیکن معترض نے کچھ اسی رنگ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یادگارِ غالب۔ کے مختصر نمونے یہ ہیں:۔

(۱) ناقدردانی کی شکایت | وہ اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے چنانچہ اس بات کی انھوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے

نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانہ کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حُسنِ اتفاق سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسّر آجاتا تھا تو اُس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانہ میں کول میں سررشتہ دار تھے، اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے، جب وہ دلی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ اُن کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درمان اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہنا جانتا ہوں۔ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے، آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصّے میں آیا ہو گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی

کی بدولت زمانہ کی دشمنی سے بے فکر ہوں۔ اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔

اپنے عجز کا اقرار مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئے گا۔ بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اردو میں جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُن کی بہت تعظیم کرتے تھے اور اُن کے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔ اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حد کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا؛ مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

بند

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیان شہ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیئے۔ اور عرض لکھ بھیجی کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لئے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں؛ یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔ ان کا قول

تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔"

(۲) مرزا نے بعض اردو خطوں میں اور خاص کر اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلف بارد میں شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اردو جو بمقابلۂ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے بہت محدود زبان ہے۔ وہ اس قسم کے تصنع اور خشکی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اس پر یہ گرفت مشکل سے ہوسکتی ہے۔ عربی و سنسکرت زبانوں کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلہ میں دوسرا فقرہ بہ سبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہوجاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے۔ جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر ان خطوط میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادھی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سید یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دوا کا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کسے کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ۔"

(۵) حیات جاوید (سرسید کی سوانح عمری) مطبوعہ ۱۹۰۱ء۔ اس کے دیباچے میں مولانا حالی لکھتے ہیں :-

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کامل طریقہ سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اس سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ جنھوں نے اس موج خیز اور پرآشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے ان کو سب نے بھلا جانا۔ کیونکہ ان کو کسی کی

بھلائی یا برائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے۔ کیونکہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے علماء و مفسرین کو لتاڑا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے، تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راستباز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے سرسید کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے

دیکھا ہوگا۔ لیکن ان کی نکتہ چینی اس طرح کی ہے۔ (ایک مضمون کو درمیان سے کچھ حذف کرکے مولانا کے الفاظ میں مسلسل کرکے نقل کیا جاتا ہے)۔

سرسید کی ترقی کے اسباب۔ اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی، اور اس کے سوا تمام طاقتوں کو مضمحل کرنے والی ہے، اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی، اس نے ایشیا کی کسی قوم، بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔۔۔۔ جان اسٹوارٹ مل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لئے کچھ نہ کرسکے، تو اس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی۔۔۔۔ البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاصکر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔۔۔۔ مگر یہ بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو، طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اس میں جتنی باتیں طرز حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں، وہ رواج پاتی ہیں، اور باقی حصہ ناقابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی، اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن سے نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے، یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا، جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دور ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں، آپ بھی آنکھیں بند کرکے اسی

شاہراہ پر ہو لیتے ہیں - دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے - مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنا پڑتی ہے ، اور مذہب کا وہ متروک حصّہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے ، اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے - زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانیِ مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے - اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے ، جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے -

یہیں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے **سرسید** سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں - ہمارے نزدیک جہاں تک کہ ان کی تالیف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان کے حالات ، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ، ان کی تمام ترقیات کا منبع ، ان کے کل مقاصدِ عالیہ کا محرّک ، اور ان کی ہر منزل کا رہبر **مذہب** کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی -

اسلام کی حقیت کا یقین اور بانیِ اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی ..... مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا ، مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا - وہ انھیں سنّت و بدعت اور تقلید و عدمِ تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے - اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو ، اور یا خاص شخص کو پہنچتا ہے - مگر آخرکار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں ، اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیت کی نسبت ان کی گھٹی میں پڑا تھا ، ان کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا - جو باتیں دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف

معلوم ہوئیں، ان کو چھوڑا، اور جو اس کے مطابق پائیں، ان کو پکڑا۔ اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملے میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا، اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا۔ اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا، اس کو سر پر رکھا۔

"حیات جاوید" کے ایسے ہی مقامات ہیں، جن کو لوگوں نے "سرسید کی مدلل مداحی" سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نے یہ حصہ اسی لئے انتخاب کیا ہے کہ تصنیف و مصنف اور سیرت و صاحب سیرت کا کمزور پہلو سامنے آجائے۔ مولانا حالی نے جو کچھ لکھا ہے، یہی ان کا اعتقاد تھا۔ انھوں نے سرسید کا محرک عمل متعین کرنے میں اپنے نزدیک بالکل صداقت سے کام لیا ہے۔

مولانا کی رائے میں "سرسید کی تمام ملی و قومی خدمتوں کا محرک مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی"۔ لیکن اصل میں سرسید کی ملکی و قومی خدمتوں کا محرک اسلام نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ بظاہر ان دو باتوں میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ لیکن غور کیجئے تو بڑا فرق ہے۔ سرسید غدر کے بعد مسلمانوں کی تباہی سے نہایت متاثر تھے۔ ان کو زیادہ تباہ ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کے دل سے مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی دور کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان و علوم، انگریزی تہذیب و معاشرت، انگریزی اخلاق و آداب سکھا کر ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ غرض مسلمانوں کی دنیا سرسید کے پیش نظر اور مقصود عمل تھی۔ لیکن ان اصلاحوں اور ترقیوں کی راہ میں مسلمانوں کے قدیم و راسخ عقائد و اعمال اور علما سے اسلام کا اثر حائل تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہر اصلاح، ہر تحریک، ہر ترقی کے لئے اسلام کا حکم یا اجازت ثابت کی جائے۔ سرسید نے یہی کیا۔ یہ کام صرف ایک حد تک بجا و درست تھا۔ لیکن سرسید حد کے اندر رہنے والے آدمی نہ تھے۔

ایک آندھی اور طوفان کی کیفیت تھی۔ انھوں نے تمام نظام اسلام کو بدل دینا چاہا۔ اس میں کلام نہیں کہ "اسلام و بانیٔ اسلام کی محبت سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔" انھوں نے بہت سے کام خالص اسلام کی محبت سے کیے۔ سر ولیم میور کی "سیرت محمدی" کا جواب، "خطبات احمدیہ" کے اکثر مضامین، کسی پادری کی "امہات المومنین" کا رد، وغیرہ محض اسلام کے اعلان صداقت و احقاق حق کے لئے تھا۔ جس میں "دنیا" شامل نہ تھی۔ لیکن اگر بہت سی باتوں میں ان کی لغزش کا سبب بقول مولانا حالی کے یہ تھا کہ "آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رائے پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہوگیا تھا۔"

حیات جاوید کے پہلے حصہ میں سرسید کے حالات اور دوسرے میں ان کے قومی و ملکی کارنامے ہیں۔ سرسید کی راستبازی اور اخلاقی جرأت کے چند واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے کسی دیہاتی مدرسہ کا معائنہ کیا۔ وہاں گائے بندھی ہوئی دیکھی اور مدرس وطلباء کو غیر حاضر پایا۔ رپورٹ میں یہ واقعہ لکھ دیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدرسوں کی یہی حالت ہے۔ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے سرسید کی رپورٹ پڑھ کر ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ سرسید کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ در مسٹر بریلی سشن جج علی گڈھ سے شکایت کی۔ جج صاحب نے لفٹنٹ گورنر کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے جج صاحب کو جواب لکھا کہ ان کو سرسید کے معائنہ کی صداقت سے انکار نہیں، بلکہ ان کے نتیجہ نکالنے سے اختلاف ہے۔ اس کے بعد سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں ولایت چلے گئے اور چونکہ لفٹنٹ گورنر کی طرف سے دل صاف نہ تھا اس لئے ان سے مل کر نہ گئے۔ جب اکتوبر ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آئے، اس وقت بھی سر ولیم سے جا کر نہ ملے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے پرائیویٹ سکرٹری کا خط سرسید پاس آیا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ سے

مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے، اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔" باقی حال مولانا حالی کی زبانی سنیے:۔

سر سید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی، اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی۔ سر ولیم نے نویں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

مائی ڈیر سید احمد، آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں، اب بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہ راست کیوں نہ لکھا، آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ نہ کیا۔ جس کی میں آپ سے اُمید کرتا تھا اور شاید اُمید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

مسٹر برکلی نے اُردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح بہ ضرورت ہو استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اُس کے شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کیپٹن منگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجۂ بالا خط و کتابت کے حوالے سے آیندہ لکھیں گے۔ اس وقت میں صرف اتنا لکھوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔"

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اٹھ گیا۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شایع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لئے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی نہایت سُبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گذرا جب سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو

اُس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے بُلایا گیا تھا ۔ اُن کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علی گڈھ کی طرف سے ایامِ غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے ۔ اس لئے وہ افتتاح کی رسم میں اُن کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ شریک ہوے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا "یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اُس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اُس کو شریک نہ کیا جاے" انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے ۔ آخر مسٹر بریلی نے جو علی گڈھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے ۔ بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُن کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی سرسید کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ اُن کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک و صاف جانتے تھے"

(۶) **مضامینِ حالی** ۔ مولانا کی مقالہ نگاری کا سلسلہ سرسید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) کے ساتھ جاری ہوا ۔ غالباً ان کا پہلا مضمون وہ ہے جو "مولوی سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی" کے عنوان سے "اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ" میں ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا ہے ۔ اس کے بعد سرسید کے رسالہ و اخبار میں اور ہندوستان کے مختلف پرچوں میں آخر عمر تک لکھتے رہے ۔ مولانا کے مجموعہ مقالات میں ہر نوع کے خیالی ، اخلاقی ، اصلاحی ، مذہبی ، تنقیدی مضامین موجود ہیں ۔ ان کی روش تحریر یہاں بھی "موجِ نرم خیز" کی طرح جاری ہے ۔ ہر مسئلہ کی تحقیق اور ہر مطلب کی تشریح

نہایت وسعت نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہت سی کتابوں پر ریویو کئے ہیں۔ مولانا ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان"، مولانا آزاد کی "آب حیات" اور "نیرنگ خیال"، مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان"، مولوی سید احمد کی "فرہنگ آصفیہ" وغیرہ سب کتابوں پر نہایت کشادہ دلی کے ساتھ تنقیدیں لکھتے ہیں۔ ان کے عیوب کو قابل گرفت، اور اپنے اختلاف کو لائق ذکر نہیں سمجھتے۔ مثلاً نیرنگ خیال میں کچھ خامیاں دیکھتے ہیں، لیکن ۵ صفحے اس کی تعریف میں لکھ کر اتنا لکھ دیتے ہیں:۔

"اگرچہ اس عام قاعدہ کے موافق کہ الصفو والکدر توامان، انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً تصنیف اور تالیف کا دشوار کام جس کا بے عیب ہونا محال ہے۔ لیکن ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے..... اس وقت ایسی کتابوں میں خورده گیری کی نظر سے خوض کرنا کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالات اہل وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے، اور کیا باعتبار خورده گیروں کی نیت کے، ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔"

(ریویو نیرنگ خیال مطبوعہ اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۰ء)

معلوم ہوتا ہے آب حیات شائع ہونے کے بعد علامہ آزاد نے اس کی کوئی جلد مولانا حالی کو نہیں بھیجی، اور انھوں نے بطور خود کہیں سے لے کر اس کو پڑھا۔ ریویو میں لکھتے ہیں:۔

"ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اس وقت ملا جبکہ بہت سے اردو اخباروں میں اس پر ریویو لکھے جا چکے تھے۔"

اس کے بعد بہت طویل مضمون میں آب حیات اور اس کے مصنف کی بے حد مدح کرتے

ہیں، اور اپنی فراخ حوصلگی سے علامہ آزاد کی ایک بہت بڑی فروگذاشت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں :-

"اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا، جیسے طبقہ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین ممنون۔ لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دورہ کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس نے ہر دورہ میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کر لئے ہیں، اور اس سے ان تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورہ میں زبان اردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اردو کا حال بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محل اعتراض ہوتا۔"

(ریویو آب حیات مطبوعہ اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۱ء)

اسی طرح علامہ شبلی کی "سیرۃ النعمان" کی تعریف ایسے شرح صدر اور وسعت قلب کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی محل اعتراض پاتے ہیں تو یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں :-

"جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں، ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے، نہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کتاب کا عنوان بیان کیسا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریقۂ استدلال مذاق وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی جو غایت مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہئے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے، وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

یعنی مولانا حالی بعض مسائل میں علامہ شبلی کی رائے کو درست نہیں سمجھتے۔

لیکن اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی وغیرہ نے "سیرۃ النعمان" پر بڑے اعتراضات کئے۔ مولانا "سیرۃ النعمان" میں کچھ کمی بھی پاتے ہیں لیکن اس کی طرف صرف ایک اشارہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کر دیتے ہیں :-

"باایں ہمہ جس طرح دریائے نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا، اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب (ترجیح فقہ حنفی) کی تکمیل کے لئے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے۔"

مضامین حالی میں سے مختلف موضوعوں کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) یہ مضمون تمثیلی رنگ کا لکھا ہے، اور اس طرح کا یہ ایک ہی مضمون ہے :-

زبان گویا ۔ اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیریں بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے۔ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے! کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا مدنہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیر کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے جو جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی۔ اور کہیں اپنی تیزی سے دلوں کو فگار ......

اے زبان تو دیکھنے میں ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر

اور اس زیور کو زنگ نہ لگے۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ جو ملہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے منتفع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے؟ نہیں ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور گوہروں کے زمروں میں جگہ پائے گی۔ ورنہ گُدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی ۔۔۔

الہی اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے اور اگر دل پر کچھ اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

(۲) ذیل کا مضمون بھی مولانا کے قدیم مقالات میں ہے، اور خوب لکھا ہے۔ اپنے موضوع کو مختلف تاریخی، مذہبی، معاشرتی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ہم مختلف مقامات کو مسلسل کر کے مختصر طور پر درج کرتے ہیں :۔

"جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ" زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلوّن مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا، وہ ہمیشہ ایک چال نہیں چلتا۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہ اس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکایا جائے ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرہ پر کھل جاتا ہے۔ وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے اس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے ---- مبارک وہ ہیں جنھوں نے اس کے تیور پہچانے، اور اس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لیے۔ اور جدھر سے اس نے رخ پھیرا، اس کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا، اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا، اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بدنصیب وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا، اور اس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی چمکی، پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اتارے، اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا، پر انھوں نے کروٹ نہ بدلی، اور خواب شبینہ سے بیدار نہ ہوئے۔ اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا، اور منزل تک کون پہنچا۔

جو لوگ زمانہ کی پیروی نہیں کرتے، وہ گویا زمانہ کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں، اور چند جھاڑیاں ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لئے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ مَا دَارَ۔ یعنی زمانہ جدھر کو پھرے اس کے ساتھ پھر جا۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ صِرْ هَيُولِىٰ لِكُلِّ صُوَرَةٍ۔ یعنی اپنی ذات میں ایسی ہیئت پیدا کر کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کرلے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب

سے خالی نہیں رہتا۔ اور اس کا مقابلہ انسان ضعیف البنیان سے نہیں ہو سکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے۔ تاکہ زمانہ کا کوئی انقلاب اس کو سخت نقصان نہ پہنچا سکے.....

الغرض دنیا کی بہبودی یا دین کی کامیابی مقتضائے وقت کی موافقت بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ مگر اس موافقت سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ مثلاً بیدینی و الحاد کے زمانہ میں دین و مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں۔ یا عیش و عشرت کے زمانہ میں جفاکشی اور محنت سے دست بردار ہو جائیں۔ یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوشامدی بن جائیں۔ اور جہاں مسخراپن کا زور ہو وہاں غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھ دیں۔ نہیں بلکہ ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ کوئی برے سے برا زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں مقتضائے وقت کے موافق کوئی نہ کوئی جائز طریقہ کامیابی کا موجود نہ ہو۔

ہندوستان کی اکثر قومیں جو روز بروز تنزل مند ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی قوم جو تباہی کے بھنور اور ذلت کی دلدل سے کسی طرح نہیں نکلتی، اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لوگ اپنی حالت کو زمانہ کے موافق بنانے میں بالکل اپنی وضعداری کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اس تمہید سے ناظرین کو ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہم آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے کی، انگریزی کھانے کی، کوٹ پتلون پہننے کی، چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دیں گے۔ کیونکہ فی زمانہ حال یہ مقتضائے وقت معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان کو یاد رہے کہ ہماری مراد اس تمہید سے یہ ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جس بری حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی جو سیدھی راہ انہیں نظر آئے اسی راہ کو اختیار کریں۔ اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں۔ کیونکہ زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ مَنِ استویٰ یوماہ فہو مغبون یعنی جس کے دو دن یک

حالت میں گزرے وہ خسارے میں رہا۔ اور در و دیوار سے یہ صدا آ رہی ہے کہ
"قدم سعی بیشتر بہتر"

اے مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو اُبھرنے نہیں دیتی، وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے، وہ کون سی بندش ہے؟ یاد رکھو وہ تمہاری بیہودہ تقلید ہے، جس نے تم کو مذہبی امور ہی میں مجبور اور بے اختیار نہیں کیا۔ بلکہ تجارت میں زراعت میں علم و ہنر میں، حرفہ اور پیشہ میں غرض ہر کام میں تمہاری عقلوں پر پردہ اور ہر راہ میں تمہارے پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے۔ اور تم کو اس پرند جانور کی طرح بے بس کر رکھا ہے، جس کے پر کٹے ہوں، اور آنکھیں سی ہوئی ہوں۔ نہ تم میں طاقت پرواز ہے، نہ نگاہ دور بیں ہے۔ تقلید نے تم کو تمام دینی اور دنیوی ترقیوں سے فارغ البال کر رکھا ہے، اور تمہارے کانوں میں یہ پھونک دیا ہے کہ جو کچھ تمہارے بزرگ کر گئے، اب اس سے زیادہ کرنا غیر ممکن ہے۔

تم صرف انھیں لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن سے تم کو حسن عقیدت ہے، بلکہ غیر مذہب میں جو لوگ ہیں ان کی نسبت بھی یہی رشتہ ہے کہ ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اسی قدر ضروری جانتے ہو جس قدر مذہب میں امام اعظم رحمۃ اللہ کی تقلید تمہارے نزدیک واجب و لازم ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں شک ہو تو نکاح بیوگان کے مسئلہ میں غور کرے اور دیکھے کہ اس کا مجوز کون ہے؟ اور مانع کون ہے؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں کو نبی کے حکم کی تعمیل کرنے سے کس نے روک دیا ہے؟[1] اسی تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے جس نے تمہاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی اور تم کو بالکل ہی ناکارہ کر دیا۔ پوچھو وہ کیا

---

[1] یعنی اسلام نے بیوہ عورتوں کے نکاح کی اجازت دی ہے، لیکن ہندوؤں کے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی اطاعت چھوڑ کر ہندوؤں کی پیروی کی۔

ہے؛ وہ خانہ خراب وضعداری ہے جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون مزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے والوں کو کمالِ نفسِ انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضعداروں کی یہ رسم ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کرے اس کو آخر عمر تک ترک کرنا نہیں چاہیے۔ جوانی میں اگر ڈاڑھی چڑھانے کی عادت ہو جائے تو اس کو شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضروری ہے اور بچپن میں اگر کمر و ٹوپی پہننے کا پٹا پڑ جائے تو بڑھاپے کے گھر پانے تک بھی اس سے محروم رکھنا نہیں چاہیے۔ چنانچہ معتبر راویوں سے سنا گیا ہے کہ دو بزرگوار جن کا سن شریف ساٹھ برس ہونے سے متجاوز ہو گیا تھا اور نہایت متقی اور متورع آدمی تھے۔ جو جمعہ جمعہ کو بعید و بڑے صاحب کے دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب بھی ان کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ باوجود تقدس دونوں حضرات ڈاڑھی منڈواتے تھے۔ بعضے نوجوان آدمیوں نے جو ان پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں۔ مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی طرح ایک شہر نور کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے۔ مگر عشا کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو یہ فرمایا کہ بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے۔ جوانی میں لہو و لعب مانع رہا۔ اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی جھجکتا ہے۔ خیر ہم اپنے قدما کی اس رائے پر اعتراض نہیں کرتے۔ کیونکہ اس وقت زمانہ کا مقتضا یہی تھا۔ سلطنت مغلیہ پر زوال آ چکا تھا۔ ترقی کی راہیں فتنہ و فساد کے سبب چاروں طرف سے مسدود تھیں۔ طبیعتوں پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی

تھی۔ ایسے وقت میں تنزل کے جس قدر آثار مسلمانوں میں پائے جاتے تھے تھوڑے تھے۔ مگر ہم کو اپنے ہم عصروں کے حال پر بے اختیار رونا آتا ہے جو اس امن و آزادی کے زمانے میں بھی وضعداری کے حصار سے باہر نہیں نکلتے اور مقتضائے وقت کو نہیں دیکھتے۔ نہ آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ نہ اوروں کی ترقی پسند کرتے ہیں۔ جو شخص اپنی پست حالت سے نکل کر اچھی حالت میں آنا چاہتا ہے۔ اس کو نہ متلون مزاج یا بے استقلال ہی نہیں بتاتے۔ بلکہ اس پر انواع و اقسام کی رائیں لگاتے ہیں۔ جن میں سب سے ہلکی کفر کی پیش گوئی ہے (منقولہ تہذیب الاخلاق بابت ۱۲۹۲ھ)

۳۔ سید کی تحریروں میں کہیں کہیں لطیف ظرافت بھی ہے۔ ان کا مضمون (زمانہ) بھی اس سے خالی نہیں۔ ایک اور مضمون **اخبار نویسی اور اس کے فرائض** میں لکھتے ہیں:۔

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ بہت بڑا ہو نہ چھوٹا۔ تند کا ہو نہ بہت سست قدم کا۔ جب رستہ صاف ہو تو اچھا کودتا چلے اور جب رستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے۔ نہ دیوار و درخت سے ٹکرائے نہ گدھا بن درختوں میں سوار کو گھسیٹتا چلا جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھر دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چپکا بنا چلے اور جب لگام نہ پکڑی ہو تو کان نہ ہلائے۔ سوداگر نے کہا۔ چند روز صبر کرو۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا۔

اگر آج کل کوئی ہم سے یہ سوال کرے تو اس کو قاضی کی جگہ **اخبار نویس** کا نام لینا چاہیے۔ کیونکہ قاضی میں دو صفتیں ہونی ضروری ہیں۔ ایک قانون کی واقفیت

جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے۔ دوسرے انصاف۔ بخلاف اخبار نویس کے کہ
اس میں اپنے کام کے فرائض ادا کرنے کے لئے بیشمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔
ہمارے نزدیک کسی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے، گویا
اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود
ہے......

اخبار کے پست حالت میں رہنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ
ایڈیٹر میں اخبار چلانے کی لیاقت نہیں ہے بلکہ اس نے صرف یہ دیکھ کر کہ بہت سے
آدمی اخبار کے ذریعہ آسودگی کے ساتھ بسر کرتے ہیں اخبار کو محض ایک حیلۂ معاش
سمجھ کر جاری کر لیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایڈیٹر میں کافی لیاقت موجود ہے مگر چونکہ پبلک کا
مذاق صحیح نہیں ہے اس لئے وہ اپنی اصلی لیاقت کو کام میں نہیں لاتا۔ بلکہ پبلک
کے تیور دیکھتا رہتا ہے۔ جو لوگ جس بات کو پسند کرتے ہیں۔ اور جس بات کو
ناپسند، اور جو چیز ان کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے
پہلی صورت میں تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک بدآواز
موذن کو کچھ دیا کرکے اذان کہنے سے روکا گیا تھا۔ اسی طرح ایسے ایڈیٹروں
کے لئے لوگ چندہ کر کے کچھ تنخواہ اس شرط پر مقرر کر دیں کہ وہ مہربانی کر کے
آیندہ اخبار نہ نکالیں۔ انہوں نے اپنی طاقت کے اندازہ کرنے میں دھوکا کھایا
ہے۔ اور اپنے لئے پیشہ کا انتخاب کرنے میں ویسی ہی غلطی کی ہے۔ جیسی
کوّے نے ہنس کی چال چلنے میں کی تھی۔ لیکن دوسری صورت میں ایڈیٹر سخت
قابل الزام ہیں؛ وہ باوجودیکہ قوم کے ناصح ہیں اس کو گمراہ کرتے ہیں اور طبیب
ہو کر لوگوں کو مہلک غذا دیتے ہیں۔ ان کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو
بیماروں کو دوا اور پرہیز ان کی مرضی کے موافق بتاتا ہے اور ان کو خوش رکھنا

چاہتا ہے۔ نہ کہ تندرست کرنا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ معزز کاموں کا مقصد روپیہ اور دولت نہیں ہے۔ ایک گویا جو اچھی طرح گاتا ہے۔ ایک تماشا گر جو اچھی تماشا دکھاتا ہے۔ ایک خدمت گار جو ہوشیاری اور سلیقہ سے کام کرتا ہے۔ ایک طوائف جو اچھی طرح گاتی ناچتی ہے۔ ایک مسخرہ جو اپنے مسخرہ پن سے امیروں کو خوش کرتا ہے۔ روپیہ کمانے میں وہ علما اور حکما اور اہل کمال سے اچھے رہتے ہیں۔ ایک اڈیٹر جو ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ بھی صرف روپیہ کمانے کے لئے اپنے اخبار کو پبلک کے فاسد مذاق کا تابع رکھنا چاہتا ہے تو وہ مذکورۂ بالا اشخاص سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

(مطبوعہ اخبار رفیق ہند ۵ اکتوبر ۱۸۹۲ء)

مولانا نے چند **مذہبی مضامین** سرسید کی حمایت میں لکھے ہیں چونکہ مولانا کی تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اس لیے ہم نے بھی لکھ دی۔ ورنہ حمایت سے قطع نظر کر کے بھی وہ مضامین خود نہایت ضروری مسائل پر بہترین اسلوب کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایک مضمون اَلدِّیْنُ یُسْرٌ (مذہب اسلام میں آزادی ہی آزادی ہے) کے عنوان سے بہت طویل لکھا ہے۔ اس کو الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ ایک اور طویل مضمون کا عنوان ہے "**قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں**"۔ یہ پہلے مضمون سے بھی زیادہ کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ ان مضامین کے نمونے بخوف طوالت ترک کئے جاتے ہیں۔

(۴) ذیل کا مضمون ایک کتاب پر ریویو ہے۔ مولانا نے تنقید بھی خوب کی ہے۔ در اصل کتاب تو ایسی عجیب ہے کہ اردو نثر میں ایک ہی ہوگی۔ اسی ندرت و جدت کے سبب سے اس کے مختلف اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

کلیاتِ دلمیر پر ریویو۔ کلیات دلمیر ایک نئی قسم کا دیوان ہے۔

جس سے غالباً خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحب
دیوان ایک بزرگ منور خاں نام دلگیر تخلص رئیس میرٹھ ہیں۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں انہوں
نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیان دوآب و ہریانہ کے دیہات میں عموماً بولی
جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے حضور میں پیش کی تھیں۔
وہاں ان نظموں کی بہت داد دی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا۔ اس
قدردانی نے دلگیر کے خیالات پر وہی اثر کیا جو سلطان سنجر کے ملک الشعراء کا تزک
احتشام دیکھ کر اوحدالدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اسی گنواری زبان
پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا، جو
اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے، وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی
اردو ہے، جیسا کہ ہر ملک میں دیہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی
ہوئی زبان ہوتی ہے۔ پس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ جو فصیح اردو میں
ٹھیٹ طور پر مستعمل ہوتے ہیں، کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال
ہوتے ہیں۔ جیسے شوق اور شوک، جب اور جد، تیرے اور تھارے، بیچتے
بیچتے اور چیاں چیاں، تو نے اور میں نے، کیا اور کیتا، دیا اور دینا وغیرہ وغیرہ۔
ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس کی مادری زبان شہری فصیح اردو ہو، بگڑی
ہوئی اردو کا سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں۔ مگر جو بات
دشوار اور نہایت دشوار ہے، اور جس پر سوا اس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر
پیدا ہوا ہو، کوئی قادر نہیں ہو سکتا، وہ یہ ہے کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان
کیا جائے، اس کا پیرایہ بیان بھی گنواروں کے مذاق اور فطرت کی حد سے متجاوز
نہ ہو۔ ..... اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے جو دلگیر کے اصلی اور قدرتی شاعر

ہونے پر بہ آواز بلند گواہی دیتی ہے۔ جس طرح اس کی زبان گنواری ہے، اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے۔

ہے مرے کھوا تک آپ مرے مالک تو باپو ہم تیرے بالک

رب ہے حرف ندا یعنی اے۔ کھوا تک = خالق۔ باپو = باپ۔ خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہو سکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

مہارے حاکم تھارے سوائی جیّان چیّان تیری دُہائی
ہمارے بھرور

تیں بانی سوں مانس کینہ سو جھ بوجھ مت سدھ بدھ دینہ
تو نے سے آدمی بنایا دیا

تیرے سانچے انیک نرالے جن سانچوں لکھوکا ں ڈھالے
بے شمار لاکھوں جسم

خدا تعالیٰ کی صنعت بالغہ کو جو قرآن میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے کہ قد خلقکم اطوارا۔ اس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور انگنت ہیں ہر ایک سانچے کی صنعت دوسرے سانچے کی صنعت سے نہیں ملتی۔

انبر - دھرتی - سورج - چندر دانی - دیوتا - پیر پیغمبر
آسمان [illegible] پیغمبر

سب تیری ڈوڈھی سیس نواویں تجھے نے پوجیں تجھے نے گاویں
ڈیوڑھی سر جھکاتے ہیں تجھی کو تیرا ہی نام لیں

جے تو اپنا چہرہ دکھاوے — انبر دھرتی چھو ہو جاوے
اگر — غصہ

توں ہی مارے۔ توں ہی نواجے — تیرا دھونسا انبر باجے
نوازے — نقارہ آسمان پر بجتا ہے

چونکہ بادشاہوں اور امیروں کے نقار خانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تاکہ نوبت کی آواز دور دور پہنچے اور سننے والوں کو ان کی زبردست شان و شوکت معلوم ہو۔ اس سے عوام کے خیال کے موافق عظمت و جلالت الٰہی کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ تیرا نقارہ آسمان پر بجتا ہے......

(حمد و نعت کے بعد) اس مطلب کو کہ آپ کے چاروں یاروں نے دنیا میں اسلام کو پھیلایا۔ اس طرح بیان کرتا ہے۔

نبی صاحب کے چار سپاہی — جنہاں نے ملکوں دھوس اٹھائی
سب ہی — جنہوں نے دھوم مچائی

کر دیے تنھوں نیم کے بندے — نرمل ہو گئے مانس گندے
ایمان — پاک — آدمی

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آنحضرت صلعم کی پیروی نہ کی وہ تباہ ہوا۔ اس طرح ادا کرتا ہے۔

جو کوئی وا کی گیل نہ چالا — وا کا دو جگ مُہرا کالا
اس کے ہمراہ — دونوں جہان میں منہ

ڈوب گیو وہ کرموں ہینا — جن حضرت کا سنگ نہ دینا
وہ نصیبوں کا ہیٹا — جس نے حضرت — ساتھ

ایک شخص اپنے وطن اور اہل و عیال سے دور جا پڑا ہے۔ گویا وہ خدا

کی طرف مخاطب ہوکر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے۔

ہے مرے صاحب تُو کے کینا | مجھ نے دیس نکالا دینا
اے میرے مالک یہ کیا کیا | مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی دیدی
میں سکے تیری بھوری کھیدیں | جے مرے کالجے برچھی چھیدیں
میں نے کیا تیری بھوری بھینس نکال لی ہے | کہ تو نے میرے کلیجے میں برچھی چبھو دی ہے

پٹنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جو تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی ہے۔ چونکہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس لئے انھیں کے خیالات کے موافق خدا تعالیٰ سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلا لیا ہے۔ اس کے بعد کہیں جستی حقہ اور چوپڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے کہیں جاڑے کے دنوں سے بھنی ہوئی ترت لمحٹوں، گھر کی ڈھیر چھوں، ساون کی ندیوں، دودھ دہی کی کوری ٹھلیوں، سرسوں کے ساگ اور مکا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دیہاتی زندگی کے مناسب ہیں حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ دیکھنے کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہے کہ ظاہرا **دلمیر** سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدوّن نہیں کیا۔ اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں کبھی اس زبان میں بیان کئے گئے۔ اس میں حمد۔ نعت۔ منقبت۔ اخلاق۔ ہزل۔ عشق۔ ہجر۔ وصل۔ رشک۔ غرضکہ وہ تمام بیانات جو اردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ موجود ہیں۔ پس اردو کے شعرا جو کئی سو برس سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آتے ہیں ان میں اور **دلمیر** میں وہی فرق ہے جو مقلد اور موجد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جب مضامین مذکورہ بالا میں سے کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کے ادا کرنے کے لئے

سینکڑوں اسلوب بیان اور الفاظ و محاورات اور تراکیب اردو لٹریچر میں مہیا پاتے ہیں۔ ان کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار موجود ہے۔ جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے بے تکلف لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ برخلاف اس شخص کے جس کو اوّل غوطہ لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پہنچانی پھر ان میں سے موتی نکالنے ہیں۔ پھر ان کو جلا کرنا ہے۔ پھر بیندھنا ہے۔ پھر لڑی میں پرونا ہے۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل قوم کی زبان ہے جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے۔ باوجود اس کے دلمیر نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان کئے ہیں جن کا ایک گنواری زبان میں سمانا سخت مشکل ہے۔ مثلاً انگریزی عملداری کی تعریف میں نوایجادوں اور بندوقوں کا بیان۔ ریل۔ تار برقی۔ سڑکوں اور نہروں کا بیان۔ برف کی کل۔ واٹر ورکس کا بیان۔ دیا سلائی۔ گیس اور برقی روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا بیان میں سے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جُگ جُگ رہے پھرنگی راج یو راجے راجوں سرتاج
ہمیشہ ہمیشہ — فرنگی — یہ بادشاہ بادشاہوں کے سرتاج ہیں

راجا پرجا سکھی کسان یو راج پرجا کی جان
رعایا خوش

بڑے بادشاہ بڑے نسایکھ بڑے اکل ور بڑے سرایکھ
بادشاہ — انصاف — عقل ور — شراف

انگریجاں کا ملکوں راج راجا بڑے گریب نواج
غریب نواز

انگریجاں کی بانکی پھوج — جاں پر چڑھے سمندر موج

جس طرح

پڑے سمندروں گھنے جہاج — جامیں راکھیں بھر بھر ناج

جن میں

کھاوے پھوج۔ اگھاوے بھوج — میٹھی باجے بجاوے پھوج

سیر ہو

توپاں چلیں گھٹ گھنگھور — کاسوں ہو سرکار کی ہور

کس سے — برابری

توڑ لگے نہ دارو موکھ — آپو آپ چلیں بندوکھ

توڑا — بارود — بندوق

ہند بندوکھاں لمبی نال — داگی دگیں نہ دو دو سال

ہندوستانی بندوقیں — داغنے سے نہیں دغتیں

ہندو راج کھوئی تروار — گاجر سکے نہ سو سو مار

تلوار

راج پھرنگی رہے آنند — جدلگ انبر۔ سورج۔ چند

جب تک

ریل نگاڑی۔ کاڈھے تار — دن میں چالے میل ہجار

نکالی

تار کھبر سوں رتوں رات — لاکھو کوس سوں کرو بات

اچرج بڑی بریچھ کی کل — واسے گھوماوے کو نسانل

اچنبھا — برف — سکو — پھیرنا

کاگج دام چلاوے کون؟ ایسا ٹھاڈا آوے کون؟

کاغذ کے دام یعنی نوٹ

سڑک بناویں۔ کھودیں نہر کھیت کھیت پانی کی لہر

جاسے ہو لکھوں من ناج کدھیں رہیں نا ٹھالی چھاج

جس سے — کبھی — بیکار

ببے دیلے دھرتی نال گال تلے تے پانی کی چال

پانی کے نل زمین میں گلا دے

بڑے بڑے نال [illegible] سے نل جا میں آوے نرمل جل

گاؤں گاؤں میں

پانی [illegible] جیسں چراگ [illegible] بتی [illegible] تیل [illegible] آگ

[illegible] کوئی دیا [illegible] واڑا آپو آپ ہو جیے [illegible]

[illegible] تر کے جادو ہیں [illegible] [illegible] نا ہیں مجھ اور تجھ

بڑے بڑے پر جانو سکھ نا ہیں رہے اب دھرتی دکھ

بڑے بڑے [illegible] کو [illegible]

مطبوعہ [illegible] شائع

مولانا حالی کے مضامین میں مسدس کا دیباچہ بھی ان کے ادب و انشا کا نادر نمونہ ہے۔ مولانا نے نظموں کی طرح مضامین میں بھی انگریزی کے الفاظ لکھنے لگے تھے شد[illegible] [illegible] جو [illegible] نظر سے بندے ختیار کیا ہے اس کا مقتضی یہی ہے کہ [illegible]

ے [illegible] طرز تحریر۔

ے [illegible] لکھنے والا یعنی مصنف

اور ریڈر[1] دونوں کے لئے روز بروز زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہونا چاہیے۔"

(ریویو سیرۃ النعمان ۱۸۹۳ء)

حیاتِ جاوید اور اس کے بعد کے مضامین میں مولانا حالی کا اسلوبِ تحریر اور پیرایۂ بیان بہت رواں اور پختہ ہوگیا تھا۔

۷۔ مکتوباتِ حالی۔ مولانا کے خطوط ۱۹۲۵ء میں دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے مقدمۂ مکتوبات میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"ان خطوں سے شاعر کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بہ کثرت بے تکلف آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سر تا سر درد سے بھرا ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو، جو ہر بیمار کے مرض سے بے چین ہو تو سمجھو کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی۔ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں پیش ہوا ہے۔"

ایسے پاک دل کی تراوش کا ایک ذرا سا نمونہ یہ ہے:-

۱۔ مولانا اپنی پوتی (انیسہ خواجہ غلام الثقلین) کو خط لکھتے ہیں۔

تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پھپی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے۔

---

[1] ریڈر: پڑھنے والا یعنی کتاب کا مطالعہ کرنے والا۔

تمھاری دادی ہر وقت تمھاری صحت وسلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ مجھے امید ہے
کہ وہاں رہنے سے تمھاری صحت اچھی ہو جائے گی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے
ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین
دلاؤ کہ میں وہی ...... ہوں۔

ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دلای ہوکے نام بھی بھیجا
اور اس میں یہ لکھا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی
کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا، مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ
لینے دی۔

پہلے پیراگراف کا آخری جملہ محبت، لطافت اظرافت کا عجیب دلکش و موثر نمونہ ہے۔
دوسرے پیراگراف میں از راہِ شفقت حلیم اخلاق فرماتے ہیں۔ یوں ایک بزرگ
خاندان سے مل کر نہیں آتیں۔ ان کو شکایت ہو سکتی ہے اور ممکن ہے ان کو اس کا
خیال بھی نہ آئے۔ مولانا رفع شکایت کی صورت بتاتے ہیں۔

ب۔ بعض خطوں میں علمی و ادبی مسائل بھی ہیں۔ ان کا نمونہ یہ مختصر خط ہے جو
مولانا نے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ کو لکھا ہے:

جناب من۔ غفور با نون میں تشبیہ سے مقصود ہے لیکن اکثر اور بات
کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیہ کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگذاشتوں
کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کشتی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے
تھے لیکن ان کے اردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو باندھے ہوئے ہیں
بھی ہمیشہ ہاتھ کو بے تخلو ساکے اور لکھتا ہوں مگر قافیے میں بات باندھنا جائز
سمجھتا ہوں۔ زیادہ نیاز۔ خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت محلہ انصار
۲ فروری ۱۹۰۸ء

ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

مولوی سید علی صاحب[1] ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء کو بلگرام کے ایک شریف و معزز خاندان میں تولد ہوئے۔ ان کے بزرگ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں شہر واسط سے جو عراق عرب میں واقع ہے ہندوستان آئے۔ اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے جد امجد مولوی سید کرامت حسین صاحب وائسرائے کے دربار میں شاہ اودھ کے نمائندے تھے۔ والد اور چچا بھی انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔

ان کے والد سید زین الدین خاں اور چچا سید اعظم الدین حسن خاں دونوں علوم مشرقی کے فاضل و ماہر تھے۔ اور یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی۔ دراصل یہ خاندان مسلمانوں کے ان چند خاندانوں میں سے ہے جنھوں نے سب سے پہلے زمانے کی بدلتی ہوئی فضا کو پہچانا۔ اور ضرورت زمانہ پر عمل کر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کیا۔

مولوی سید علی صاحب اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب سید حسن بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ان کے بڑے بھائی تھے۔ مولوی صاحب بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ حافظہ نہایت عمدہ تھا جو بات ایک دفعہ پڑھتے یا سنتے پھر کبھی نہ بھولتے۔ پندرہ برس کی عمر تک علوم عربیہ و فارسی کی تعلیم مکمل کر لی سنہ ۱۸۶۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے میں آپ کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ بعد ازاں تین سال تک وہ قانون ہی کا مطالعہ کرتے رہے اور ایک سال بعد امتحان انجینئری سول سروس میں تمام صوبے میں اول آئے۔ اس کے بعد مسٹر سکاٹ

---

[1] یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مضمون مطبوعہ چند ہم عصر سے لئے گئے ہیں۔

باکردہ رڑکی کے انجنیرنگ کالج میں داخل ہوئے لیکن چھ مہینہ بعد ہی حیدرآباد کے مشہور وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے وہاں سے بلاکر اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کرلیا اور جب ولایت گئے تو انھیں بھی ساتھ لیتے گئے ۔ وہاں وہ شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل ہوئے اور دو ہی سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان پاس کیا اور علم طبقات الارض میں تمغہ حاصل کیا اس سے قبل وہ لنڈن یونیورسٹی کا امتحان میٹرکیولیشن بدرجہ اعلیٰ پاس کرچکے تھے اس امتحان میں ان کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں ۔

انگلینڈ سے واپسی پر انھوں نے فرانس ۔ اسپین ۔ جرمنی اور اٹلی کی سیاحت کی ۔ اطالوی زبان اور علوم سیکھنے کے لئے کچھ عرصہ اٹلی میں قیام بھی کیا ۔ حیدرآباد واپسی پر ریاست نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا کچھ عرصہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے ۔

مولوی سید علی عجیب قابلیت کے آدمی تھے ۔ لاطینی ۔ انگریزی ۔ جرمنی ۔ فرانسیسی ۔ عربی فارسی ۔ اردو ۔ سنسکرت ۔ بنگالی ۔ ہندی ۔ تلنگی ۔ مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے ماہر تھے سنسکرت نہایت عمدہ اور فصیح بولتے تھے ۔ مدراس یونیورسٹی کے ایم اے سنسکرت کے امتحان کے ممتحن کئی سال تک رہے ۔

مولوی صاحب آخر زمانہ تک معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے ۔ ۱۸۹۱ء میں سر آسمان جاہ بہادر کے زمانہ وزارت میں بعض انقلابات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے امتحان وکالت کی تیاری شروع کی اور باوجودیکہ امتحان میں صرف چھ مہینہ باقی تھے کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی ۔ ایل میں اول نمبر پر پاس ہوئے ۔ اس سے ان کی خداداد قابلیت کا پتہ چلتا ہے ۔ ۱۸۹۳ء میں سرکار نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عنایت کیا ۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد سے پنشن لیکر انگلستان چلے گئے وہاں سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہوئے اسی سال انڈیا آفس کے عربی فارسی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے پر مامور ہوئے۔ یہ نہایت مشکل کام خیال کیا جاتا تھا۔

مولوی سید علی صاحب مختلف علوم مشرقی و مغربی کے ماہر تھے لیکن وہ طبعاً محنت کے کاموں سے جی چراتے تھے چنانچہ علمی میدان میں ان کے کارنامے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ تقریباً سب ترجمہ ہی تک محدود ہیں۔ گو اس زمانے میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا بھی علم و ادب کی کافی خدمت تھی۔ ان کے تراجم کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) میڈیکل جورسپروڈنس یعنی اصول قانون طب (ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) سرکار نے اس پر پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔ اس میں انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

(۲) رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ اس میں مرحوم نے بڑی تحقیق سے اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب اصل میں کس نے اور کب اس لکھی اور پھر کہاں کہاں پہنچی اور ترجمے ہوئے۔ اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ رسالہ مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔

(۳) فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ

(۴) غار ہائے ایلورا کا گائڈ

(۵) حیدرآباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات

(۶) تمدن عرب۔ ڈاکٹر گستاولی بان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔

(۷) تمدن ہند۔ یہ کتاب بھی اسی مصنف موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۸) انھوں نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں کیا تھا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو گیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔

مولوی سید علی صاحب نے الحقائق نامی ایک سہ ماہی رسالہ عربی میں نکالا۔ اس رسالہ میں ملک کے نامور عالموں اور ادیبوں نے اچھے اچھے مضمون لکھے۔ دوسرا قابل قدر کام جو مرحوم نے کیا وہ نواب سر وقار الامرا بہادر کے عہد میں ایک سررشتہ علوم و فنون کا قیام تھا۔ مرحوم خود اس کے نگراں مقرر ہوئے اس کا مقصد اردو میں کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا تھا۔ مولانا شبلی اس سررشتہ کے ناظم مقرر ہوئے ان کی اور کئی کتابیں اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن بدقسمتی سے یہ سررشتہ قائم نہ رہ سکا گو ضرورت اس کی ہنوز باقی ہے۔

مرحوم کو کتابوں کا بہت شوق تھا تقریباً ہر علم و فن کی کتابیں آپ کے کتب خانہ میں تھیں لیکن اسلامی علوم و علم ادب سے خاص شغف تھا چنانچہ اس کے متعلق جتنا نادر ذخیرہ ولایت میں چھپا سب انھوں نے اپنے کتب خانہ کے لئے فراہم کیا۔ مولوی صاحب کو بیش قیمت اور نایاب کتابوں کے جمع کرنے کا نہایت شوق تھا چنانچہ بعض نادر الوجود کتابیں بڑی کوشش سے حاصل کیں۔ الوصایا ابی حاتم السجستانی کا صرف ایک قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبد القادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے کیمبرج میں تھا۔ کتاب بوسیدہ تھی اس لئے اس کا فوٹو لیا گیا اور دس کاپیاں تیار کی گئی تھیں۔ اور سب تقسیم ہو گئی تھیں۔ مولوی سید علی نے یونیورسٹی کے پروفیسر سے جس نے اس کا عکس لیا تھا بڑی کوشش سے اس کی ذاتی لائبریری کا نسخہ حاصل کیا۔ انھوں نے جمرۃ اللغۃ ابن درید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپیہ میں خریدی۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک معزز رئیس یہ کتاب ان سے مانگ کر لے گئے اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ڈیڑھ دو ہزار روپیہ کو فروخت کر دی۔

سید علی صاحب اس بات کو بھول گئے تھے۔ کئی سال کے بعد ایک روز معلوم ہوا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانے میں ہے۔ منگا کر دیکھا تو ان کا اپنا نسخہ تھا۔ جب اس کی فروخت کا حال سنا تو بہت رنج ہوا۔ آخر اس کی نقل اپنے لیے لے لی۔ اس کے بعد جب برلن (جرمنی) گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی۔ اس کو بہت پسند آئی۔ ان کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ پندرہ ہزار روپیہ میں اس کے ہاتھ فروخت کر دی۔ تزک بابری کا ترکی زبان کا نسخہ انھوں نے سر سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں دیکھا۔ اس کو اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت پسند کیا اور گیب میموریل فنڈ کی طرف سے اس کے عکسی نسخے شائع کیے گئے۔ انھوں نے اصل کتاب مع عکسی نسخے کے واپس کر دی۔

ان کو مستشرقین میں آسانی پیدا کرنے کی وجہ سے حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ کشف الظنون کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتابوں کو حروف تہجی پر تقسیم کیا ہے۔ یہ چاہتے تھے کہ مصنفوں کے ناموں کو حروف تہجی پر تقسیم کیا جائے اور ہر مصنف کے ذیل میں اس کی تمام تصنیفات درج کی جائیں تاکہ جس مصنف کا مطالعہ مقصود ہو اس کا تمام کارنامہ سامنے آجائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک آدمی مقرر رکھا جسے تقریباً دس برس تک پندرہ روپیہ ماہوار دیتے رہے لیکن افسوس یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اسی طرح وہ آگسٹس فلوجل کے مرتبہ نسخۂ قرآن میں ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ آگسٹس نے ہر سورت کے لیے ہندسوں کا نشان رکھا ہے۔ سید علی صاحب سورتوں کے نام لکھنا چاہتے تھے۔ یہ کام پورا ہو گیا تھا لیکن چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

مولوی سید علی صاحب عالموں کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے بلکہ اس کے درمیان میں کسی بڑے آدمی سے بھی ملنا پسند نہ کرتے۔ وہ اہل علم کے کاموں کی بھی بڑی وقعت کرتے اور کبھی تعریف و توصیف میں بخل نہ کرتے۔

مولانا حالی کی بڑی قدر کرتے تھے جب حیاتِ جاوید چھپی تو فوراً منگائی اور ختم کر کے چھوڑی۔ تمدنِ ہند کا ترجمہ کرنے سے پہلے چند صفحے حیاتِ جاوید کے پڑھ لیتے پھر ترجمہ شروع کرتے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمۂ قرآن کو بہت پسند کرتے اور وہی ترجمہ اپنے حوالوں میں لکھتے۔

شملہ میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگِ آصفیہ نے اپنی کتاب ارمغانِ دہلی کے بعض حصے پیش کیے۔ مرحوم نے بہت پسند کیے اور سفارش کر کے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ مولوی سید احمد موصوف پر ایک دفعہ کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی۔ آپ نے فوراً روپیہ ان کے پاس بھجوا دیا۔

مولوی صاحب بڑے بامروت آدمی تھے جب کبھی کسی دوست کا کام پڑتا مستعد ہو کر کوشش کرتے۔ اگر کوئی دوست آتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ بڑے مہمان نواز تھے عالموں کی مہمان نوازی سے ہمیشہ خوش ہوتے۔

مولوی صاحب اگرچہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور شیعہ تھے لیکن تعصب سے بالکل بری تھے۔ وہ شیعہ سنی جھگڑے کو ہمیشہ حقیر خیال کرتے تھے۔ ان کے نہایت وسیع کتب خانہ میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔ شیعہ کتب کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ محض بیکار ہیں اور ہرگز قابل استدلال نہیں۔

ایک مرتبہ مولوی سید علی کی کیمبرج یونیورسٹی میں ایک شیعہ طالب علم سے ملاقات ہوئی انھوں نے پوچھا کہ "تم حضرت عمرؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو" ایرانی نے کہا "ہم حضرت علی کی پیروی کرتے ہیں" اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں تو کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی تو اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کبھی نہ کرتے" ایرانی نے تعجب سے پوچھا کہ "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے" مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی

جو شیعہ عالم تھا لاکر دکھائی۔ ایرانی عالم اس واقعہ کو دیکھ کر تائب ہوا اور کہا اب کبھی میں حضرت عمرؓ کو برا نہ کہوں گا اور تعجب کیا ہمارے علما اس واقعہ کو کیوں چھپاتے ہیں۔

جب آپ سے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت قبول کرنے کو کہا گیا تو آپ نے انکار فرمایا اور کہا کہ میں سنہ ہجری کا شیعہ ہوں اس قسم کی کانفرنس کو ہرگز پسند نہیں کرتا جبکہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

مولوی صاحب صحیح بخاری اور ہدایہ کے بڑے مداح تھے اور کہتے تھے عربی سیکھنے کے لیے بہترین کتابیں ہیں۔

مولوی صاحب غیر متعصب اور وسیع المشرب تھے لیکن غیرت و حمیت قومی ان میں بہت تھی اور مولویوں کی جاہلانہ اور متعصب باتوں سے بڑے خفا ہوتے تھے۔ ہندوستان کے مروجہ پردہ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے اور حد درجہ وجاہت کے حامیوں کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مزاج میں مزاح بھی بہت تھا۔ ایک مرتبہ مولوی محمد سورتی نے جو عربی کے بڑے عالم اور قدیم کتابوں کے شوقین تھے ان سے ایک کتاب نقل کرنے کے لیے مانگی۔ کتاب نادر تھی۔ دینا نہ چاہتے تھے مگر مروت کے سبب سے انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی سورتی صاحب کے ہاتھ میں دیدی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب! خیال رہے کہ کتاب تو بیشک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سور کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لاحول ولا قوۃ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

مولوی سید علی صاحب نے انگلستان میں ایک مدت گزاری تھی لیکن انگریزی تہذیب و اخلاق کو بہت برا سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے متعلق ان کی رائے تھی کہ یہ [illegible] اور صرف [illegible] ان کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔

آخر زمانہ میں انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا جس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ انھوں نے [illegible]

میں سکونت اختیار کی لیکن جب وہاں سے علی گڑھ آنے جانے لگے اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں دلچسپیاں لینے لگے تو پھر ان کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کا وقت اب آیا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کا کانسٹیٹیوشن مرتب کرنے میں انھوں نے بڑا حصہ لیا۔ آخر ہردوئی میں دفعۃً قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ۳ مئی سنہ [illegible]ء (مطابق سنہ ۱۳۲۵ھ) کو انتقال کیا۔ نیاز مند راقم نے قرآن مجید کی آیت سے تاریخ نکالی:-

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّۃِ الْیَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰکِھُوْنَ[5]

(سورۂ یٰسین)

دوسری تاریخ یہ ہے:-

گلشنِ فردوس میں داخل ہوئے بلگرامی مولوی سید علی

۱۳۲۵ھ =

مولوی سید علی صاحب کی علمی خدمت صرف ترجمہ کی صورت میں ہے۔ اور وہ بھی صرف دو کتابوں کا شائع و مشہور ہوا، **تمدنِ عرب** اور **تمدنِ ہند**۔ لیکن صرف ایک تمدنِ عرب کے ترجمے نے ان کو امتیازی جگہ دلا دی۔ فرنچ مورخ ڈاکٹر لی بان کی کتاب اپنے زمانے میں بہترین مکمل اور مستند تصنیف تھی۔ سید صاحب نے اس کا ترجمہ بھی بہت اچھا کیا۔ اور تمدنِ عرب کو جیسے حسنِ طباعت کے ساتھ باتصویر شائع کیا وہ بھی اردو چھپائی میں شاید پہلی چیز تھی۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۹۸ء میں طبع ہوئی۔ یکی پریس۔ ویسے فی جلد قیمت تھی۔ مصنف کی زندگی ہی میں اس کی اشاعت ختم ہو گئی۔ اور پھر ۲۵ برس تک دوبارہ طبع نہ ہو سکی۔ اب چند سال ہوئے سلطان العلوم نظام دکن کے "جشن سیمیں" (۲۵ سالہ مسند نشینی) کے موقع پر شائع ہوئی ہے۔

---

۵ اس آیۂ کریمہ میں قرآن کا املا اصحٰب اور فٰکھون ہے۔ میں نے دونوں کے الف گھٹا کر عدد نکالے ہیں۔

سید صاحب کی جن کتابوں کا پہلے ذکر آچکا ہے، ان کے علاوہ بعض رسالوں میں انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے **ویدک لٹریچر** اور **فنِ طب** وغیرہ کے متعلق سلسلۂ مضامین جاری رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن طبیعت کے عدمِ استقلال کی وجہ سے ایک ایک دو دو مضمون لکھ کر رہ گئے۔

تصنیف مولوی سید علی کے نمونے

(۱) **تمدنِ عرب** کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

ہارون رشید کے عہد میں عربوں کا تمدن

جس کے زمانہ کی تصویر ہمیں الف لیلہ میں نظر آتی ہے ۷۸۶ء و ۸۰۹ء اور اس کے بیٹے مامون کے دورِ حکومت ۸۱۳ء و ۸۳۳ء میں بغداد نے علم سے اعلیٰ ترقی اور سرسبزی حاصل کی اور مشرق کے تمام شہروں میں سب سے نام آور بن گیا۔ اس وقت ہارون رشید کا نام کل ربع مسکون میں مشہور ہوگیا تھا۔ چین و تاتار و ہندوستان سے سفیر اس کے پاس آئے تھے اور شارلمین شہنشاہ فرانس نے بھی جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس کا ملک بحر بالٹک سے دریائے ایبرو تک وسیع تھا [illegible] جس کی حکومت جشیوں کی سی حکومت تھی ہارون الرشید کے پاس سفیر بھیجے اور نہایت ادب سے خواہش کی کہ زائرین بیت المقدس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو قبول کیا اور سفیروں کو بیش بہا تحائف دے کر رخصت کیا۔ منجملہ ان تحائف کے ایک ہاتھی تھا جس کی جھول بہت ہی بیش قیمت تھی اور یہ جانور اس سے پہلے کبھی یورپ میں نہیں گیا تھا۔ علاوہ اس کے موتی جواہرات، ہاتھی دانت، لوبان اور ریشمی انواع اقسام کے کپڑے تھے اور ان سب پر فوق ایک گھڑی تھی جو وقت بتاتی تھی اور گھنٹوں پر بجتی تھی۔ اس گھڑی نے شارلمین اور اس کے نیم وحشی مصاحبین

کو جن کے ذریعہ سے وہ بے چارہ بے فائدہ تمدنِ روم کی تجدید کی کوشش کر رہا تھا نہایت حیرت میں ڈالا۔ اِس کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو اِس گھڑی کے کیل کانٹے کو سمجھ سکتا ۔ ۔ ۔ ۔

ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا۔ آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے۔ اوّل ذاتی اور شخصی محصول دوم خفیف سا محصول مقبوضہ زمینوں پر سوم چُنگی کا محصول چہارم غیر مزروعہ اراضی کا محصول پنجم معدنیات کا محصول۔ مورخین عرب نے لکھا ہے کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی تقریباً دس کروڑ روپیہ تھی جو اِس زمانہ کے لئے بہت ہی خطیر رقم ہے۔

اِس مال گزاری کی نگرانی ایک خاص وزیر کے سپرد تھی جسے دیوان کہتے تھے۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ انتظام مال گزاری کا دیوان اِس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور بادشاہی حقوق کی حفاظت کرے، اور مداخل و مخارج میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اُس کی تنخواہ مقرر کرے۔ اِس دیوان میں بہت ہی باقاعدہ حساب رکھے جاتے ہیں اور اُنھیں منشیانِ دیوان کہتے ہیں۔ دیوان کے لفظ کا صدق اِس عمارت پر بھی ہے جس میں وزرا جمع ہوتے ہیں۔

ملک کا انتظام چار صیغوں میں منقسم تھا جو فی الواقع ہمارے موجودہ وزارتوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اوّل صیغۂ حرب دوم صیغۂ مال گزاری جس کا کام محصولات کا قرار دینا تھا۔ سوم صیغۂ شخصی جو محصولات کے وصول کرنے والوں کو مقرر کیا کرتا تھا۔ چہارم صیغۂ انتظامی جس کا کام مداخل و مخارج کی نگرانی کرنا تھا۔ خلیفہ کے کل احکام لکھے جاتے تھے اور اِس غرض سے دفتر میں رکھے جاتے تھے کہ خلفاے مابعد اُن کی طرف بآسانی رجوع کر سکیں۔ اِس ساری کل کی کُنجی ایک وزیر کے

ہاتھ میں رہتی تھی جو بطور مدار المہام ہوا کرتا تھا اور اکثر خلفا کل امورات ملکی کو اسی کے اختیار میں چھوڑ دیا کرتے تھے ۔

شہروں کی کوتوالی کا انتظام ویسی ہی عمدگی کے ساتھ تھا جیسا ڈاک اور محاصل و مخارج کا۔ تاجروں کی مجلسیں قائم کر دی گئی تھیں جن کا فرض یہ تھا کہ معاملاتِ تجارتی کی جانچ اور فریب و دغابازی کا انسداد کریں۔

خلفائے عباسیہ کے مداخل و مخارج کے انتظام نے انھیں بہت بڑے بڑے رفاہ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ ملک میں سڑکیں بن گئی تھیں اور کاروان سرائیں اور جابجا شفاخانے اور مدارس ہر طرف علی الخصوص بغداد و بصرہ و موصل میں کثرت سے قائم ہو گئے تھے۔

کاشتکاری اور زراعت نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ ریشم اور صنعتوں کی شہروں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی اور دور دور تک بھیجی جاتی تھیں۔ باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے موصل اور حلب و دمشق میں قائم تھے۔ گندھک سنگ مرمر سیماب اور سیسے کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں۔

دولت کی پیداوار معلوم تھی۔ ترقی تعلیم عام کا زینہ بھی ایک بہت وسیع اصول پر قائم ہوا تھا۔ تمام مملکت میں مدارس شہر بغداد اور اساتذہ مقرر کیے گئے تھے۔ علم ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی کہ وہ کام جس کو یورپ کی قوم نے بہ مشکل زمانۂ حال میں کیا ہے اس وقت ہو چکا تھا یعنی دائرۂ نصف النہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی۔ قدمائے یونان و روم کا کام علی الخصوص وہ کلام جو فلسفہ اور ریاضیات سے متعلق تھا ترجمہ ہو چکا تھا اور کل مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ زمانۂ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شائع ہوئیں عربوں میں عام طور سے جاری تھی۔

۲۔ تمدن ہند:-

ہندوستان کے قدیم تعلقات یورپ کے ساتھ

دارا بن ہستاسپ

قدیم قوموں میں سب سے پہلے ایرانیوں نے ہند سے تعلقات پیدا کئے۔ ہیرودوطس جس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا تھا بیان کرتا ہے کہ سندھ کی ندی کی سمت دریافت کرنے کے لئے دارا نے ایک سپہ سالار اسکائی لکس کو ہندوستان بھیجا۔ یہ اٹک کے قریب سندھ کی ندی میں ہوتا ہوا سمندر تک پہنچا اور پھر مغرب کی طرف تیس مہینہ کی جہازرانی کے بعد بحر احمر تک پہونچ گیا۔ اس کے بعد دارا نے [illegible] آکر شمالی ہند کو فتح کیا۔ لیکن جن ہندوؤں کا ذکر ہیرودوطس کرتا ہے اور جن کے متعلق خط میخی کی کتبوں میں یہ لکھا ہے کہ وہ شہنشاہ ایران کو خراج دیتے تھے وہ یا تو قبائل وحشی تھے یا وہ قومیں جو دریائے سندھ کے قرب و جوار میں آباد ہوئی تھیں۔ ان کی نسبت ہیرودوطس لکھتا ہے کہ جب ان کے دشمن بیمار ہوتے تو یہ انھیں کھا جایا کرتے تھے۔

دارا کے جانشین

یہ معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے جانشینوں کے تعلقات بھی ہندوستان کے ساتھ قائم رہے کیونکہ جس وقت ۳۳۰ سنہ قبل مسیح میں سکندر نے آخری شہنشاہ ایران دارا کوڈومن کو شکست دی تو اس کی فوج میں ہاتھی موجود تھے۔ سکندر کی چڑھائی کے بعد جس کا زمانہ ۳۲۷ سنہ قبل مسیح ہے ہندوستان کسی قدر یونانی حالات پر چھوڑ دیا گیا۔ اسکندر نے اس ملک پر قدم رکھا ہی تھا اور سندھ کی ندی سے آگے نہیں بڑھنے پایا تھا۔ اس کی واپسی کے بعد دس سال کے اندر ایک یونانی سپاہی بھی ہند میں نہ رہا لیکن اس کی فوج کشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک غیر معلوم دنیا کی طرف یورپ کی توجہ مصروف ہوگئی

تھوڑے دنوں وہ حکومتیں جن کو سکندر اپنے صوبہ داروں کے ماتحت قائم
کر گیا تھا خود مختار ہو گئیں اس کے مرتے ہی ان کا تعلق یونانیوں سے باقی
نہ رہا دس سال کے اندر اندر ملک یونانیوں سے خالی ہو گیا۔

یونانیوں کے تعلقات ہند سے

ہند کے تعلقات یونانیوں کے ساتھ تجارتی
یونانی حکومتوں کے ذریعہ سے مدت
تک باقی رہے جیسا کہ میگستھینز کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے۔ اس
یونانی سفیر کو سلیوکس نیکیٹار کے حاکم نے تقریباً تین سو سال قبل مسیح
پاٹلی پتر کو بھیجا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب کہ یورپیوں نے ہند کے اندرونی
حصے میں نفوذ کیا اس زمانے کی تاریخ کے لئے معلومات ہم رسانی ہیں اس
یونانی سفیر کے بیانات رہ گئے ہیں غالباً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میگستھینز
کی شہادت سے سلیوکس کی غرض یہ تھی کہ یونان نے جو تجارت یورپ سے
قائم کی ہے اس کو راستہ بدل کر موڑ دے اور اسکندریہ سے ہو کر مصر کو کر دیا
یہ وہ تجارت تھی جس نے مصر کے خاندان بطلیموس کو دولت مند بنا دیا تھا اور آگے
چل کر قاہرہ کے خلفائے اسلام نے بھی اس تجارت کی بدولت بہت بڑی
دولت حاصل کی نتیجہ یہ کہ یونانی حکومت کے تعلقات ہندوستان کے
ساتھ مدت تک قائم رہے جیسا کہ ہمیں شمال و مشرق ہند کی عمارات کے
مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

رومہ کا براہ راست ہندوستان کو پہنچنا

۳۰ سنہ قبل مسیح جس وقت مصر
حکومت روما کا ایک صوبہ ہو
گیا شہنشاہ آگسٹس نے اس خیال سے کہ عرب جو مصالح وغیرہ لاتے ہیں
اور جس کی وہ تجارت ہندوستان سے کیا کرتے تھے۔ خود ان کے ملک کی پیداوار

ہے ایک فوج کشی عربستان پر کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ شاہنشاہ کلاڈیس کے
وقت میں حسب اتفاق مخالف ہواؤں نے ایک جہاز کو جزیرۂ سیلون کے
کنارے جا پھینکا اور اس وقت یہ بات معلوم ہوئی کہ بہ عوض کنارے کنارے
جانے کے جہاز کھوپی ہوا راست ہند کو آسکتے ہیں۔ اس کے بعد رومی تجار
مصر سے براہ راست کویا کیپاٹس یا منگلور کو آنے لگے اور پلینی لکھتا ہے
کہ اس سفر میں صرف دو مہینے دس دن لگتے تھے۔ اس زمانے کے ایک
تاجر نے اپنا سفرنامہ لکھا جس کا نام اریتھرین سمندر کا پیریپلس تھا یہ کتاب آرین
کے پیریپلس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس میں بہت سی جغرافی اطلاعات
پائی جاتی ہیں۔

بطلیموس کا جغرافیہ بطلیموس کے جغرافیہ سے ہمیں قدیم قوم کی ان اطلاعات کا اندازہ ہو سکتا ہے جو انھوں نے ہند کے متعلق
حاصل کی تھیں یہ اطلاعات نہایت ہی ناقص اور زیادہ تر سواحل کے بیانات
پر محدود ہیں۔

عرب اور چینی سیاح سلطنت روما کے زمانۂ تنزل میں ہندوستان سے تعلقات اور بھی کم ہو گئے ہیں اور بالآخر جس
وقت عربوں کے خلفائے راشدین کے زمانہ میں سلطنت ایرانیہ کو فتح کر لیا تو
ان تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے ایک ہزار برس تک تو مانند سدّ کے
راستہ ہندوستان کی طرف بند رکھا اور اس زمانہ کے حالات ہمیں صرف
عرب سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتے ہیں۔ مسعودی دسویں صدی
عیسوی میں ہندوستان آیا اور ابن بطوطہ تقریباً ۱۳۳۰ء میں لیکن ان عرب
سیاحوں سے بہت پہلے بودھ مذہب کے چینی زوار اس ملک میں آچکے

آ چکے تھے اور ہیوئن تسانگ کا سفرنامہ ہمارے لئے ایک بڑا ذخیرہ اس زمانے کی معلومات کا ہے۔

(۳) تاریخ عرب۔ اس کے ترجمہ کا پہلے ذکر آچکا ہے کہ جب سید صاحب کو علم ہوا کہ موسیو سدیو کی اس تاریخ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوگیا ہے، تو انھوں نے اپنے اردو ترجمہ کو چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر اڈیٹر **مخزن** لاہور کی فرمائش سے رسالہ میں شائع کرنے کے لئے یہ ترجمہ لندن سے بھیجنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کی بھی تکمیل نہ ہوسکی۔
اگست ۱۹۰۷ء کے "مخزن" سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

عربوں نے اپنے آبا و اجداد کی قدیم رسوم و رواج کو قائم رکھا ہے۔ ان میں اوصاف اضداد جمع ہیں۔ وہ دغاباز بھی ہیں اور غایت درجہ فرماں بردار بھی۔ رحمدل بھی ہیں اور مغرور بھی۔ ان میں بوجہ اعتقادات اور کہانیوں سے بے انتہا شوق ہے۔ وہ گویا سدا جوان ہیں۔ اور جب کوئی نیا خیال ان کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے، تو ان میں بڑے بڑے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک طرف تو وہ آزاد اور فیاض ہیں اور دوسری طرف مغلوب الغضب اور ہیبت کی سے بھرے ہوئے۔ خاندان سیمیٹک کے کل اوصاف اور کل معائب اس ایک عرب میں موجود ہیں۔ یہی کل نتائج کو مہیا کرنے کی ضرورت نے اسے پھرتیلا اور چالاک بنا دیا۔ ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کرنے کی مجبوری نے اسے صبر دیا۔ آزادی کا وہ اس وجہ سے عاشق ہے کہ یہی ایک نعمت ہے جو اس کے حصہ میں آئی ہے۔ اور چونکہ اسے ہر قسم کے تکلّف سے نفرت ہے، اس لئے اڑیل پن اس کی فطرت کا جزو ہوگیا ہے۔ خود اپنی بدبختی کی عادت نے اسے دوسروں کے لئے بے رحم بنا دیا ہے، اور اس میں انتقام کی خواہش پیدا کردی ہے۔

ملک اور خیالات کے متحد ہونے نے کل قوم میں ایک ہی معیار عزت و آبرو قائم کر دیا ہے۔ اس کی ساری نام آوری تلوار اور مہمان نوازی اور فصاحت ہے۔ تلوار تو اپنے حقوق حاصل کرنے کی ضمانت ہے۔ اور مہمان نوازی ان کے لئے سارے قانون انسانیت کا لُبّ لباب۔ اور تحریر اور کتاب کی جگہ پر فصاحت ان تمام باہمی اتفاقیوں کو ختم کرنے والی چیز ہے جس کا فیصلہ ہتھیار سے نہیں ہو سکتا ہے۔

(۴) **ویدک لٹریچر**۔ سید صاحب کی یہ یادگار بھی شیخ عبدالقادر صاحب کی وساطت سے ملی ہے۔ یہ مضمون مولوی سید علی صاحب نے اڈیٹر مخزن کی تحریک پر لکھا تھا اور کیمبرج سے مخزن کے لئے بھیجا تھا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء کے پرچے سے تھوڑا سا نمونہ دیا جاتا ہے:

گرچہ رگ وید کا بہت بڑا حصہ عبادت اور خدا کی ستائش سے بھرا ہوا ہے لیکن بعض بھجن ایسے ہیں کہ جن سے تاریخی واقعات اور قدیم آریاؤں کی تمدنی حالت کا استنباط ہو سکتا ہے۔ مثلاً ندیوں کا جو بھجن ہے۔ اس سے آریہ لوگوں کا وسط ایشیا سے بتدریج پنجاب میں آنا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح دسویں کتاب کے بھجن نمبر نوّے میں جس کا نام پرش سوکت ہے چاروں ذاتوں کا یعنی برہمن۔ چھتری۔ ویش۔ شودر کا علیحدہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح شادی اور موت کے متعلق بھجن ہیں۔ غرض جدید تحقیقات سے نتیجہ یہی پیدا ہوتا ہے کہ رگ وید نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ کل فرقہ آریہ کی جس میں ایران اور یورپ کی بہت سی اقوام شامل ہیں۔ سب سے قدیم کتاب ہے۔

رگ وید کی زبان کی نسبت ایک امر اور بھی نہایت تعجب انگیز ہے۔ یعنی یہ زبان ایک درجے میں ژند اوستا کی زبان سے مشابہ ہے۔ یہاں اس درجے تک

ہے۔ کہ محض چند حروف کے تغیر و تبدل سے رگ وید کے بعض بھجنوں کو ژند وستا زبان میں اور ژند وستا کے بھجنوں کو قدیم سنسکرت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور اس وقت جرمنی کے مدارس میں جہاں وید کی تعلیم اعلیٰ درجہ پر ہے۔ رگ وید اور ژند وستا کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

(۵) طلسم اعضائے انسانی۔ مولوی سید علی صاحب کا یہ مضمون پہلی مرتبہ رسالہ حسن حیدرآباد میں ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۲۰ برس بعد ۱۹۰۷ء میں ایڈیٹر مخزن نے سید صاحب کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ تالیف اور آزاد عبارت ہے۔ اس کا اسلوب اور زبان اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ "تمدن" اور "تاریخ" کی عبارتیں اس کو نہیں پہنچتیں۔ وہاں باوجود ترجمہ کی خوبی کے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ترجمہ" ہے۔ لیکن یہاں ایسی اردو ہے کہ اس سے بہتر مشکل سے لکھی جا سکتی ہے۔ سید صاحب فزیالوجی خواص اعضا کی پوری کتاب اسی انداز میں لکھ دیتے تو عجیب چیز نکلتی۔ نمونہ یہ ہے:-

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْیَانِ[۵] - اگر اس حدیث کے مضمون کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اَلْعِلْمُ عِلْمُ الْاِنْسَانِ کیونکہ جس طرح علم الابدان میں انسان کی صورت ظاہری اور محسوسات جسمانی سے بحث کی جاتی ہے اسی طرح علم الادیان میں انسان کے محسوسات و کیفیات روحانی سے بحث ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اوّلیت اور اولویت دونوں میں علم الابدان کو علم الادیان پر فوقیت ہے۔ کیونکہ اول محسوسات جن کا ادراک انسان کو ہوا وہ محسوسات جسمانی ہی تھے۔ اور انھیں محسوسات کے ذریعہ سے انسان کو ذات حکیم مطلق کا پتہ لگا۔ جب ایک عضو اور پھر کُل موجود ہوا جس کی قدرت تامہ کا

---

[۵] علم دو ہیں۔ علم طب اور علم دین۔ ابدان بدن کی جمع۔ ادیان دین کی جمع۔

نمونہ ہے۔ اس کے بعد علم الادیان کی نوبت آئی۔ غرض علم الانسان عجیب جامع علم ہے جس کے مطالعہ اور تحقیق میں تمامی دنیوی و اخروی فوائد مجتمع ہو گئے ہیں۔

علم الانسان کے بے انتہا شعبے ہیں۔ بلکہ ایسا کم کوئی علم ہوگا جس کو انسان سے تعلق نہ ہو۔ کیونکہ اکثر علوم کی بنا خود انسان کی ذاتی ضروریات کی وجہ سے پڑی ہے۔ اس تحریر میں صرف علم الہیات کے چند مسائل بیان کئے جائیں گے جو علم الانسان کا ایک شعبہ ہے۔ علم الہیات وہ علم ہے جس میں اعضائے انسانی کے افعال سے بحث ہے۔ اور چونکہ یہ افعال حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔ اس تحریر میں صرف چند اعضائے انسانی لکھا گیا۔۔۔۔۔۔

جسم انسانی کی تشریح کرتے وقت پہلا جزو بدن جو نظر کے نیچے آتا ہے جلد ہے۔ انسان کا جلد ایک چیز ہے لیکن اس کی دو تہیں ہیں۔ اوپر والی تہہ سانپ کی کینچلی کی طرح ہمیشہ خشک ہو کر گرتی رہتی ہے۔ اس کو عربی میں بشرہ کہتے ہیں۔ نیچے والی تہہ جلد حقیقی ہے اور اس میں احساس کی قوت ہے اور اس میں سیکڑوں باریک رگیں ہیں جن کو ادنیٰ صدمہ پہنچتے ہی خون نکل آتا ہے۔ جلد کی دونوں تہوں کی فرق جراحت میں خوب معلوم ہوتی ہے۔ جب تک صرف بشرہ کو چھیلتے رہتے ہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی لیکن جہاں نشتر ذرا بھی بڑھا نیچے کی تہہ تک پہنچا اور خون نکل آتا ہے۔ جب کبھی ہاتھ زور سے چھل جاتا ہے تو یہ دونوں تہیں الگ الگ دکھائی دینے لگتی ہیں اور جو مواد جلنے والوں کے جسم سے جو آبلے نکلتے ہیں وہ بھی اوپر کی کینچلی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی "غدرِ ہند" کے زمانہ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ علامہ محمد شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڈھ میں وکیل تھے۔ خاندان عزت وجاہ اور علم و دینداری میں ممتاز تھا۔ علامہ نے ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ میں مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ پھر غازی پور جاکر مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے فیض تعلیم حاصل کیا۔ مولانا فاروق صاحب وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت میں صدر مدرس تھے اور علوم عقلیہ و ادبیات عربی و فارسی کے فاضل اجل تھے۔ استاد کو اس شاگرد سے اس قدر انس ہو گیا کہ وہ اپنے آپ کو دبستانِ دانش کا شیر اور شاگرد کو بچۂ شیر کہتے تھے اور سجع کہا تھا: انا اسد و انت شبلی[۱]۔

تحصیلِ علمی مولانا فاروق کے چشمۂ علم سے سیراب ہو کر علامہ شبلی نے تکمیل علوم کے لئے دور و دراز سفر کرنے شروع کئے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "میں اس خصوصیت میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لئے انہی علماء کے پاس سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔" چنانچہ غازی پور اور اعظم گڈھ میں مولانا فاروق سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کے بعد رامپور گئے۔ وہاں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ علم فقہ میں ان کے فضل و کمال کے بڑے مداح تھے۔ رامپور سے لاہور پہنچے۔ وہاں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اورینٹل کالج میں ادبیات عربی کے شیخ [illegible] غالب سے [illegible] غدر کا سنہ ہجری ۱۲۷۴ نکلتا ہے۔

[۱] میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر ہے۔ شبل (بالکسر) بچۂ شیر کو کہتے ہیں۔ مولانا فاروق صاحب کے فقرہ میں شبلی کے معنی میں "میرا بچہ"۔ اور حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر جن کے نام پر مولانا شبلی کا نام رکھا گیا تھا، شبلی ان کے وطن آبائی موضع شبلہ سے منسوب ہے۔

پروفیسر تھے، اپنے زمانے کے بہترین فاضل و نقاد تھے اور عربی شاعری کے صحیح مذاق اور نکتہ سنجی میں یکتا تھے۔ علامہ شبلی نے چھ مہینے ان کی صحبت میں رہ کر "حماسہ" پڑھا۔ مولانا کو فرصت نہ ہوتی تو کالج کے راستے میں آتے جاتے پڑھا دیتے۔ لاہور سے سہارنپور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی صاحب محدث سے حدیث پڑھی۔ ان کے اخلاق و سادگی طبع اور اتباع سلف کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

علامہ شبلی نے عربی سے پہلے فارسی پڑھ لی تھی۔ اکثر فارسی میں خطوط لکھتے تھے۔ فکر رسا اور ذوق سلیم فطری رکھتے تھے۔ ابتدا سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ مولانا محمد فاروق اور مولانا فیض الحسن جیسے ادیب و نقاد استاد ملے۔ ان کے اساتذہ میں یہ دونوں بزرگ شاعر بھی تھے۔ مولانا فیض الحسن بڑے صاحب ذوق، زندہ دل، بذلہ سنج، ظریف طبع تھے۔ سخن فہمی و نکتہ سنجی میں بے نظیر رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ قصائد عربی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں غزلیں اور نعتیہ قصائد[5] کے علاوہ ایک مثنوی "صبح عید"[6] بے زمانہ طالب علمی لکھی تھی۔ شرح حماسہ

---

[5] مولانا فیض الحسن صاحب کے ایک قصیدۂ نعتیہ کے دو تین شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔ دوسری نوٹ کے سے لکھتا ہوں پورا قصیدہ میرے پاس نہیں ہے۔ مولانا نے شہیدی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں قافیہ بدل دیا ہے:-

تمنا ہے کہ یک یک بال کی سو سو بلائیں لوں — جو قسمت سے ہاتھ آئے تری زلف معنبر کا
تمنا ہے کہ دامن پر ترے صحرا سے جا پہنچوں — اگر مجنوں کو بھی سودا ہے تیرے کوچۂ ابتر کا
یہ حوصلہ بے قراری ہے کہ گر تیغ ستم بسمل بھی — یہ حسرت ہے جو دیکھیں تماشا فیض مضطر کا

[6] مثنوی "صبح عید" مولانا فیض الحسن صاحب کی وفات کے بعد ۱۳۰۵ء میں لاہور میں چھپی ہے۔ تقریباً ۶۰۰ شعر ہیں۔ ایک داستان عشق نظم کی ہے۔ قصہ کچھ نہیں۔ لیکن نظم کے ٹکڑے بہت لطیف ہیں۔ یہ بھولی ہوئی چیز کی یاد تازہ رکھنے کے لئے چند شعر درج کئے جاتے ہیں (باقی صفحہ ۶۶۰ پر)

"تحفۂ صدیقیہ"، "روضۃ الفیض" ان کے علم و فضل کی یادگاریں ہیں۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں وفات پائی۔ لائق شاگرد شبلی نے مرثیہ کہا جس کے دو تین شعر یہ ہیں:—

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح | دلے بگذار تا در ماتم **فیض الحسن** گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد | ہنر بر خویشتن گرید چو من بے خویشتن گریم
دو تا غم دارم و ہر یک ز دیگر حسرت افزا تر | بمرگش گریم و آنگاہ بر مرگ سخن گریم

اسی کم عمری و نوجوانی کے زمانے میں ان بزرگوں کی صحبت نے علامہ شبلی کے اندر وہ ذوق اور وہ نظر پیدا کر دی جس نے ان کو اپنے زمانے کا بہترین نقاد و سخن سنج بنا دیا۔

(بقیہ حاشیہ ۶۵۹) مثنوی کو "تعریف عشق" سے شروع کرتے ہیں:—

عشق کیا کیا بلا ہے آفت ہے | شور ہنگامہ قیامت ہے | فتنۂ دو جہاں کو پیدا کرے | بند دست و پا کو جدا کرے
یہ کسی جی کو جیتے جی نہ رہے | دوست کیا دشمنوں کو بھی نہ لگے | فتنہ کیا ہے یہ وہ جو [illegible] | گھر کے گھر [illegible] جہاں [illegible]
عشق نے شوق بے خودی جا کی | ہوگئے دردِ دل کہ لوگوں کا | درد بے درد ہے دلِ درد کی | عشق آفت ہے شہر دلبر کی
یک یک عشق نے دم میں | جی چرانے ہیں جن کے بدلے | عشق ہے سب کا فتنہ انگیز | خانماں سوز و خانہ برہم ریز
حسن صادق ہے یہ [illegible] | جس کی سنت ہو تن کے [illegible] | رام ہوں تند خوں کے ہاتھ سے | چاک ہو جیب کی طرح جلے
کیوں نہ ہو یہ مری زبانی سب | گو یہ خود ہی غضب کا ذبح ہے | اپنی [illegible] | یہ سبب ہو عشق و شور جنوں
[illegible] | گریہ ان قسمتوں کا [illegible] | دل میں [illegible] | سینہ ان کا شتر دل [illegible]
دل زباں سے زبانہ آتش | حرف زنگیں ہے شعلہ سرکش | پھر یہ سب [illegible] کرتا ہیں | ورنہ کس کو نصیب یہ باتیں

واسطہ ان کے چند شعر یہ ہیں:—

آگئے سامنے سے قتل [illegible] | اگرچہ یہ [illegible] | شیشۂ جام دعوتِ باقی | [illegible] رہ گئے باقی

(باقی صفحہ ۶۶۱ پر)

سفر حج | علامہ شبلی کی ۱۹ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۷۶ء میں انھوں نے اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حج کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ نعتیہ قصیدہ کہا۔ مدینہ منورہ میں کتب خانوں کی سیر کی۔ فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو سامان وہاں نظر آیا کہیں نہیں دیکھا۔

شوق شعر و ادب اور شغف مذہبی | مولانا کی طالب علمی کا زمانہ سفر حج کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہاں سے آکر کتب بینی اور شعر و ادب کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ کا مشہور ظریف اخبار "**اودھ پنچ**" اور [illegible] غزلوں کا ماہوار گلدستہ "**پیام یار**" جاری تھا۔ مولانا بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتے اور خود بھی غزلیں کہتے تھے۔ مشاعرے منعقد کرتے تھے۔

مولانا کا دوسرا محبوب شغل غیر مقلدوں کی تردید تھی۔ حنفیت کا رنگ غالب تھا۔ ان کا قول تھا کہ آدمی بے دین ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر چند رسالے لکھے جن میں سے عربی کا رسالہ "**اسکات المعتدی**" [illegible] سے ہر جگہ مقبول ہوا۔ جب مولانا سفر شام و عراق کے لیے گئے تو وہاں سے ایک عالم نے اسکات المعتدی کے مصنف کی مولانا شبلی کے سامنے تعریف کی۔ اس کو خبر نہ تھی کہ مصنف یہی ہیں۔ مولانا کو اس تحسین سخن شناس سے بڑی مسرت ہوئی۔

اس زمانے میں علامہ شبلی مذہب کے نہایت پابند تھے۔ درس و تدریس کا شغل بھی جاری تھا۔ شاگردوں کو نماز کی سخت تاکید کرتے تھے۔ بعض اوقات شاگردوں

(بقیہ حاشیہ ...)

ہو گیا حسن [illegible] اور نکھر
[illegible] تو بیٹھے نظارے [illegible]
ایک تو سب کے پھولوں سے بلا دوش

[illegible] سے نگاہ رستے [illegible]
دل کھولوں کی [illegible]
سیہ پھولوں کی [illegible] گوش

[illegible] دشمنی سے ہوئی [illegible]
[illegible] دو پھول سے [illegible]
[illegible] نہ تھے

[illegible] سے ہو گیا مکان [illegible]
پھول کانوں کے پھولوں سے [illegible]
پھول پھولے نہیں سماتے تھے

کو نماز نہ پڑھنے پر اور پابندی کا وعدہ لینے کے لئے دو دو گھنٹے مارا ہے۔

وکالت و ملازمت

علامہ شبلی کے والد اور استاد مولانا فاروق صاحب وکیل تھے۔ والد نے ان سے بھی امتحان وکالت پاس کرنے کا اصرار کیا۔ علامہ بالطبع ادھر متوجہ نہ تھے، کہنے سننے سے امتحان پاس کیا اور وکالت شروع کی لیکن ابتدا ہی میں اس پیشہ کے کذب و افترا سے بد دل ہو گئے۔ اس زمانے کا ایک لطیفہ ہے کہ علامہ کے والد کے پاس کوئی ٹھاکر مُوکل آیا۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی کمسنی میں کر دی تھی۔ داماد جوان ہو کر خسر کو پسند نہ آیا۔ اُدھر رخصتی کا تقاضا ہوا، اِدھر سے انکار کیا گیا۔ شوہر نے مقدمہ دائر کر دیا۔ ٹھاکر نے جوابدہی کے لئے علامہ شبلی کے والد کو وکیل کیا۔ اُنھوں نے اِن سے کہا کہ اس کی جوابدہی تم دو۔ مولانا ٹھاکر سے قصہ سُن کر بولے کہ جب تم اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جا چکی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ جاؤ لڑکی کو رخصت کر دو۔ وہ ہنستا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے صاحبزادے سے فرمایا کہ بس آپ وکیل بن چکے۔ آخر انھوں نے خود مقدمہ لڑایا اور جیتا۔

علامہ شبلی نے بالآخر وکالت ترک کر دی اور امین دیوانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ دَورہ کا کام تھا۔ علامہ شدید گرمی میں روزہ کی حالت میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ آخر یہ کام بھی مزاج کے موافق نہ نکلا۔ چھوڑ کر گھر بیٹھ رہے۔ اور مضمون نگاری اور شاعری پھر شروع کر دی۔

علی گڑھ کالج کی پروفیسری

علامہ کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ سنہ ١٨٨٢ء میں یہ بھی وہاں گئے۔ سر سید سے ملے۔ باہم مبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ اتفاق سے وہاں پروفیسری خالی تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش

سے درخواست دی۔ سرسید نے فوراً للعلم بامواز تنخواہ پر ان کو رکھ لیا۔ اس زمانے کا ذکر مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی اپنے ایک مضمون[لہ] میں لکھتے ہیں:-

> علی گڈھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ، بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا اور بہت پُرسکون مقام تھا۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا ذوق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور موضوعہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لئے انھیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی و ذہانت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے، اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش و جستجو اور جذب روایات کے معتقد و معترف ہوتے گئے تھے۔

مولانا سرسید کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ مولانا کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے اور کبھی تھک کر انھیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔
کالج کے زمانہ قیام میں مولانا نے ایک مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھا۔ یہ بہت

[لہ] "سیر المصنفین" میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے علامہ شبلی کے حالات کے متعلق تین صاحبوں کی تحریریں نقل کی ہیں، مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی، خواجہ غلام الثقلین اور مولوی عبدالحلیم شرر کی۔ ہم سیرت مولانا کے مختلف عنوانوں میں ان تحریروں کے اقتباسات مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔ مولانا کے باقی حالات میں بھی "سیر المصنفین" سے مدد لی گئی ہے۔

پسند کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے قومی نظمیں لکھیں اور "المامون"، "الجزیہ"، "سیرۃ النعمان" شائع کیں۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ ان کو فارسی پڑھائی۔

مولانا کا سفر روم و مصر و شام

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڑھ کالج کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا۔ چنانچہ خود ایک قصیدۂ فارسی میں کہتے ہیں:-

ہر زمین فن و ہم پے تحصیل عبر — روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر

نہ رہ عزم زیارت چو مرا [illegible] — تو [illegible] سوے روم [illegible]

آرزو [illegible] رفیق است و ہم [illegible] — ہم ازین عرصہ بہ انگیختمی توسن سفر

گفتم این صحبت [illegible] — [illegible] سفر [illegible] بجاے [illegible] مختصر

چھ مہینے بعد [illegible] کی سیر کی۔ قسطنطنیہ [illegible] کتب خانے دیکھے۔ [illegible] کے لیے [illegible] لیکن کچھ نہ [illegible] سفرنامہ مرتب و شائع کیا۔

علی گڑھ کے بعد

سرسید کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے متعلق [illegible] ۱۸۹۸ء سے اعظم گڑھ میں [illegible] نیشنل اسکول قائم کیا۔ اس کی ترقی کی کوشش کی۔ [illegible] الفاروق مرتب کر رہے تھے کہ کشمیر جانا ہوا۔ وہاں علیل ہوئے۔ اور کئی مہینے علالت کا سلسلہ رہا۔ سخت علالت کی حالت میں الفاروق کی آخری سطریں لکھیں۔ اسی زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کے بعد صحت ہوئی تو مولوی سید علی بلگرامی نے ان کو حیدرآباد بلایا اور "نظامت علوم و فنون" کا عہدہ دیا۔ اس زمانے میں الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام، الکلام وغیرہ نہایت [illegible] تالیف کرکے شائع کیں۔ سید علی صاحب نے ایک محکمہ تصنیف و تالیف قائم کیا تھا۔ اس کی کتابیں سلسلۂ آصفیہ کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ مولانا شبلی کی بعض کتابیں بھی اسی

سلسلے میں بھیج دیا۔ حیدرآباد میں مولانا کا مشاہرہ ماہوار تین سو روپیہ تھا۔ چار سال وہاں رہے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق

بعض اہل الرائے ذی علم بزرگوں نے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں علماء کی ایک انجمن "ندوۃ العلماء" کے نام سے قائم کی تھی۔

اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح کی جائے، عام مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں، علمائے ہند کے باہمی اختلاف و نزاع کو رفع کیا جائے۔ اور ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں علوم قدیمہ کے علاوہ فنون جدیدہ اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے۔ سب سے پہلے مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر نے (جو بعد کو مدارالمہام ریاست رامپور ہو گئے تھے) یہ تجویز پیش کی۔ کئی علماء نے تائید کی اور مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری (خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف شہروں میں ہر سال اس کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب دہلوی مؤلف تفسیر حقانی اور مولانا شبلی نے اس کے قواعد مرتب کیے۔ ۱۳۱۵ھ میں مولانا شبلی کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ قائم ہوا۔ اس کے ناظم اول مولوی سید محمد علی صاحب تھے۔

علامہ شبلی علی گڑھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد ندوۃ العلماء سے خاص دلچسپی لینے اور اس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ مولوی سید محمد علی صاحب کی وفات کے بعد حیدرآباد سے آ کر اس کے ناظم ہو گئے۔ ندوہ کی حالت اس زمانے میں نہایت سقیم تھی۔ گورنمنٹ بدگمان تھی۔ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو چلا تھا۔ مولانا نے ایسی سخت محنت اور ایسی عملی خدمت کی کہ ندوہ کو از سر نو زندہ کر دیا۔ لیکن

علما، مولانا کے مذہبی خیالات و عقائد سے مطمئن نہ تھے۔ ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آخر ان کو بد دل ہو کر ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے دستکش ہونا پڑا۔ مولانا شرر لکھنوی اُسی مضمون میں لکھتے ہیں :-

"میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا اور اسی زمانے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ علما بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومین اُمت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس زمانے میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں، اس پر آیۂ کریمہ لَوْ کَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا[51] پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ کالج ہی ہے مگر انھوں نے نہ مانا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔ مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین اُمت ہی کے ہاتھ سے رکھا گئے جس کا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

نظامت ندوہ کے زمانے میں اتفاقیہ بندوق چل جانے سے علامہ شبلی کا ایک ملازک حادثہ کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ اور ڈاکٹروں کو ٹانگ کاٹنی پڑی۔ اس کے متعلق وہ خود شعر العجم حصہ اوّل کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو دفعۃً یعنی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی

---

[51] اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دو خدا ہوتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔

فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع "درید و برید وشکست و بہ بست" قلم کی زبان پر تھا۔

اس حادثہ پر تمام ملک میں افسوس کیا گیا لیکن خود انھوں نے اپنی تکلیف کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ ۵ ار جولائی کو مولانا اپنے خط میں شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر مخزن لاہور کو لکھتے ہیں: "اب تک ہاتھ پر قابو نہیں۔ خط سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک غزل[1] حاضر ہے۔ لیکن اپریل ۱۹۰۷ء کی ہے ورنہ آجکل یہ خیالات کہاں؟" اس پر ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہم مولانا کی ہمت و استقلال کی داد دیتے ہیں کہ ایسے جراحی عمل کے بعد کتنی جلدی انھوں نے علمی مشغلہ کی طرف رجوع کیا اور تمام زمانہ علالت میں مشغلے پر آنچ نہیں آنے دیا۔"

علامہ شبلی نے اس حادثہ کے متعلق ایک شعر عجیب و گداز کہا تھا ؎

شبلی نامہ سیہ را جزائے عملش
ببریدند و صدا خاست کہ سر می بایست

بعض احباب نے مولانا روم کے مشہور شعر میں ترمیم و تعمیم کے ساتھ اس واقعہ کی تاریخ کہی:—

---

[1] یہ علامہ شبلی کی طبعی زندہ دلی تھی کہ اس کرب و اذیت کی حالت میں جو غزل اشاعت کے لئے ارسال فرمائی، وہ نہایت رنگین ہے۔ [illegible] شعر کی غزل ہے۔ چار یہ ہیں:—

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چکنم — میل با مہ رخاں گر نکنم تا چکنم
بست و نہ سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش — گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقوی چکنم
این تقوی کہ بہ سی سال فراہم شدہ است — ارمغانش بہ نگارے ندہم تا چکنم
شاہد و بادہ و طرفِ چمن و جوشِ بہار — شبلیا خود تو بفرما کہ باینہا چکنم

از مخزن لاہور بابت جولائی ۱۹۰۷ء

یافتم در شعرِ ندا می حال آں　　　از سرِ الہام گفتم سالِ آں

پائے استدلالیاں چوبیں بود　　　پائےؔ چوبیں پائے بے تمکیں بود

٦٨٣　　٦٤　=　١٣٢٤،١ = ١٣٢٥ھ

دار المصنفین

ترکِ ندوۃ العلماء کے بعد لکھنؤ سے اعظم گڑھ آ گئے اور وہاں ایک ادارۂ علمی دار المصنفین کے نام سے قائم کیا۔ اور اس کے لیے اپنا باغ، مکان، کتب خانہ وقف کر دیا۔ افسوس کہ مولانا شبلی اس کی تکمیل و ترقی نہ دیکھ سکے۔ ہندوستان میں تالیف و اشاعت کے بہت سے بڑے بڑے ادارے جاری ہیں اور اپنی اپنی جگہ سب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر علم و ادب اور ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف دار المصنفین کو حاصل ہے کہ وہ اسلام و اسلامیات کا علمبردار ہے اور اسلامی کلچر کا اتنا عظیم الشان لٹریچر کوئی جماعت پیدا نہیں کر سکی۔ یہ بھی علامہ شبلی کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے کہ ان کو علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء جیسے جانشین مل گئے جن کے قالب میں علامہ شبلی کو ایک زندگی گویا کبھی زندہ جاوید مل گئی ہے۔

آخری تصنیف اور وفات

تعلیمی مہم کے بعد علامہ شبلی نے "سیرۃ النبیؐ" کا عظیم الشان کام شروع کیا۔ یہ کام بھی اتنا بڑا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسی میں زندگی ختم ہوئی جیسا کہ خود فرمایا تھا:—

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی　　　مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم　　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ایک جلد مکمل اور دوسری نامکمل چھوڑ کر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء (۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ) کو دنیا سے ملکِ بقا ہوئے۔ ۵۷ سال کی عمر پائی۔ راقم الحروف نے قرآن مجید سے تاریخ نکالی:—

ؔ اصل مصرع یہ ہے: "پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"

"تاریخ از کلام ایزد" لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ جَنّٰتُ[1] عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا

۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء

(سورۂ نحل۔ رکوع ۴)

دوسری ہجری تاریخ کہی:- بگو "شبلی نعمانی" ست اندر "رحمتِ سبحاں"

۵۶۳ + ۷۶۹ = ۱۳۳۲ھ

علامہ شبلی کے اخلاق و عادات

علامہ شبلی کے مزاج و عادات کے متعلق بہترین بیان مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا ہے۔ ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں:-

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ ان کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی۔ مزاج میں استغنا۔ حوصلے میں عزم تھا۔ مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں لیکن دوستوں کی مروت کبھی ان کو کسی تملق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے رو برو نہیں کرتے تھے مگر ان کے پس پشت بیان اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی برداشت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے اپنی رائے کے زعم کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا اخلاقی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا جس مسئلے پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر

---

[1] قرآن مجید کا مد جنت ہے۔ میں نے ۵ عدد لینے کے لئے ۃ کم کر دی ہے۔

آتی تھیں۔ عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی ان کے بیان کی زینت وہمدم تھی۔ جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی، بعض نادر اور نازک پہلو منور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے ان سے کبھی نہیں سنیں۔

اعزا کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو ان کی جان ہی لے گئی۔ احساس بہت شدید تھا۔ اس لئے رنج و الم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانے میں دہلی اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لازمہ تھا۔ مذاق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک تیز کھاتے تھے۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں اور قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور [illegible] سے کام [illegible] شیرینی کا کام ہے۔

سخنہائے شیریں بہ از قند نیست

ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں پٹنہ میں ان کا میرا ساتھ ہوا۔ اس زمانے میں تندرست تھے۔ قریب ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی۔ بتا کہ محض شیرینی ہونا کافی تھا۔ اس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے۔ جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اسی کے ساتھ سردی اور گرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے۔ متعدد رضائیاں

اوڑھیں تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں بمبئی کے سفر شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور کڑھی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے عادت میں سادگی تھی، باس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم کھاتے تھے آخر میں اس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

(اقتباس مضمون مولانا شروانی منقول از سیر المصنفین)

مولوی عبدالحلیم شرر علامہ شبلی کے خصائص طبع کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان میں باوجود انتہا درجے کے حذق کے خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت، علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے نہیں ابتدا اس حیثیت سے ملک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک ممبر بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری کو ٹھیس لگی۔ اس حیثیت کو اور اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو نا قابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلماء میں شرکت کی۔ اور سمجھے کہ اس ذریعے سے علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔"

خود علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور نذر دینے گیا تو اُن کے

لیڈی کاننگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ میں نے کہا یہ اوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر ردّ و بدل ہوئی۔ اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔"

(مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء از "سیر المصنفین")

علامہ شبلی کے مذہبی خیالات

پہلے لکھا گیا ہے کہ علامہ شبلی بڑے سخت حنفی، مقلد اور پابند شرع تھے۔ ان خیالات میں جو انقلاب جس طرح ہوا اس کو ہم مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کی زبانی بیان کرتے ہیں:-

"اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ سرسید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ میں تھے۔ بعض مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلدی سے ایک بڑی حد تک انھیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو کھٹک تھی وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انھیں حنفیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہٰذا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ غیر مقلدی کا کبھی رنگ نہ چڑھنے پایا، اور وہ بجائے سلف نمازی سے معتزلی بننے لگے۔ اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں۔ اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے جو حنفیت کو اشعریت کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں، انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی طلبہ ان کی باتوں سے خوش ہو ہو کر دینداری و خوش اعتقادی کے دھوکے میں معتزلی ہونے لگے۔ اور موجودہ علمائے حنفیہ سے ان کو سخت عناد ہو گیا ..... اسی جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انھوں نے سیرت النعمان لکھی تو امام المحدثین

محمد بن اسمٰعیل بخاری پر بیجا حملے کئے، اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہاں تک کہ امام ابو الحسن اشعری بھی محض اتباعِ حدیث کے باعث ان کے مورد مطاعن بن گئے تھے۔ لہ

خواجہ غلام الثقلین صاحب اپنے مضمون میں علامہ شبلی کے متعلق لکھتے ہیں:-

> انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ و لاپروا رہتے ہیں، اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اوّل جن میں مذہب غالب ہے، دوم وہ جن میں آزادی، قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے۔ میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔

علامہ شبلی مذہب کی طرح سیاست میں بھی آزاد خیال اور دلیر تھے۔ سرسید کے سیاسی خیالات کو وہ دانشمندی اور مفادِ ملکی کے منافی سمجھتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب مندرجہ بالا فقرہ کے بعد لکھتے ہیں:-

سیاسی خیالات اور قومی مفادات

> لیکن وہ آزاد خیال مذہب ہی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے، بلکہ آگے پالیٹکس تک پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ آخری عمر میں لوگوں نے ان کے پالیٹکس کو بولشویزم نہیں کہا۔ سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں بہت آزاد خیال تھے لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر اعتدال پسند یا کنزرویٹو واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی میں مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔

لہ اصل مضمون میں یہ دونوں عبارتیں مقدم و موخر ہیں۔ یہ ترتیب ہم نے قائم کر دی ہے۔

ان کے خیالاتِ سیاسی کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ سے بیزار تھے، اس کو بیکار سمجھتے تھے۔ اور کانگرس کے حامی تھے۔ اس نوع کے مقالاتِ شبلی الگ شائع ہو گئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار نظموں میں بھی کیا ہے۔ ایک نظم کو اس طرح شروع کرتے ہیں :-

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم — جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

مسلم لیگ کے متعلق بڑی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں لیگ کے مسلک پر طنز کرتے ہیں :-

جن مہمات میں درکار ہے ایثارِ نفوس — ان میں طرزِ عمل بوسہ و پیغام بھی ہے

اسی نظم میں مسلم لیگ کے دفتر کا ساز و سامان بیان کر کے آخر میں صدرِ مسلم لیگ سے کہتے ہیں :-

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہوا یہ — سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے؟

علامہ شبلی کی قومی خدمات بھی خواجہ صاحب موصوف بیان کرتے ہیں :-

مولانا شبلی نے تین بڑے کام انجام دینے کی کوشش کی اور ان میں ایک بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اوّل یہ کہ وقف علی الاولاد کا مسئلہ جس کو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا، انھیں کی کوشش سے طے ہوا۔

دوم مولانا کی یہ کوشش تھی کہ حالاتِ زمانہ سے باخبر، روشن دماغ اور مفید دینی عالم پیدا ہوں۔ اس کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ اور کچھ لوگ جو مولانا کے نام لیوا ہیں، اور انھیں کے طرز کا تحریر میں اتباع کرتے ہیں، ان میں تاریخ نویسی اور قومی عصبیت کے ساتھ روحانیت کا بھی مساوی پہلو ملا۔

تو ہم کہیں گے کہ یہ دوسری کوشش بھی کامیاب ہوئی

سوم، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں پر سے تاریخی الزامات رفع کئے جائیں۔ مولانا کو اس معاملے میں بھی خاص کامیابی ہوئی۔ ایک شخص کی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے اس کو سیکڑوں برس تک زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

خطابات و اعزازات

علامہ شبلی ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو سلطان عبدالحمید خان شہنشاہ ترکی نے "تمغۂ مجیدی" عطا کیا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومتِ ہند سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمن خان بادشاہ کابل نے "محکمۂ ترجمہ" قائم کیا۔ اس کے لئے علامہ کا انتخاب کیا لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ ورنیکل کانفرنس شملہ میں شریک ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں دہلی کی ورنیکل کانفرنس کی شرکت کے لئے مدعو ہوئے لیکن بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔ ۱۹۱۳ء میں سلطنت ترکی کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی کا قیام تجویز ہوا تھا۔ جو بوجہ جنگ عظیم عمل میں نہ آسکا۔ اس کا نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لئے علامہ شبلی کا بھی انتخاب ہوا تھا۔

تمام بلادِ اسلامیہ مصر، روم، شام وغیرہ و ممالک یورپ سے ان کے پاس علمی سوالات آتے تھے۔ مسٹر آرنلڈ، نکلسن، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر محمود حبیب وغیرہ بذریعہ مراسلت علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا نصاب تعلیم تجویز کرنے کے لئے بھی علامہ شبلی منتخب ہوئے تھے۔

حمایت و ترقی اردو

علامہ شبلی کی یہ خدمات علمیہ مذکورہ کے قابل ہیں کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تجویز کے مطابق انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو اس کے پہلے سیکرٹری علامہ منتخب ہوئے۔ یہ اس وقت حیدرآباد میں تھے۔ وہیں انجمن کا دفتر کھولا گیا۔ ان کے زمانے میں بعض بے نظیر کتابیں انگریزی و عربی سے ترجمہ کرا کے شائع کی گئیں۔ مثلاً

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا۔ اور علامہ ابن مسکویہ کے رسالہ فلسفۂ الٰہیات "الفوز الاصغر" کا مولانا الحکیم محمد حسن صاحب [illegible] نے "فوز اصغر" کے نام سے ترجمہ کیا۔

اردو کی ایک اہم خدمت علامہ شبلی کے ہاتھ سے یہ سرانجام ہوئی کہ ۱۹۱۲ء میں یوپی گورنمنٹ نے الہ آباد میں ایک اردو ہندی اسکیم کمیٹی اس غرض سے قائم کی کہ سکولوں اور کالجوں کے لیے دونوں زبانوں کا نصاب تعلیم ایسی زبان میں مرتب کیا جائے کہ ایک ہی عبارت کے ساتھ اردو ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکے۔ اور اس کے علاوہ اردو پڑھنے والوں کے لیے ہندی پڑھنا بھی لازم قرار دیا جائے اور رامائن تلسی داس کو نصاب تعلیم میں شامل کر دیا جائے۔

اس کمیٹی کے ممبر علامہ شبلی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بے نظیر دلائل سے یہ تمام تجویزیں مسترد کرا دیں۔ کمیٹی کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کو یہ خط لکھا تھا:

> میں [illegible] اردو ہندی اسکیم کمیٹی کی شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا۔ [illegible] سے چند ایسی خطرناک تجویزیں اردو کے حق میں پیش کی تھیں۔ ایک یہ بھی تھی کہ رامائن بھاشا [illegible] کے نصاب میں داخل کر دی جائے۔ اور [illegible] جو مدرسوں میں ہے وہ ایسی کر دی جائے کہ ہندی بن جائے۔ [illegible] منظور ہو گئے تھے۔ پنڈت [illegible] وغیرہ کمیٹی کے ممبر تھے [illegible] جلسے میں [illegible] سب تجویزیں نامنظور ہوئیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد نہیں دی [illegible] کے قابل ہی نہ تھے۔ شبلی

اردو زبان و ادب کے جس [illegible] کی تحفظ کی آج کوششیں ہو رہی ہیں اس کا راستہ علامہ شبلی نے پہلے ہی ہموار کر دیا تھا۔ ورنہ یہ دور [illegible] برس پیشتر ہی ختم ہو چکا

ہوتا۔ ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی یہ تجویز نامناسب نہ تھی کہ اردو کے طالب علموں کو ہندی سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ چنانچہ بعد کو اس پر عمل کیا گیا اور آٹھویں درجے تک اردو والوں کے لیے ہندی اور ہندی والوں کے لیے اردو یعنی ضروری ہو گئی۔ لیکن یہاں تجویز نہ جب تک زیر عمل تھی نامناسب ہے۔ جس کو علامہ شبلی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اردو جو درحقیقت میں سب سے وسیع اور ایسی زبان ہے جو ہندی سے ہم رشتہ ہے اس قدر البتہ کم تھا [illegible] گیا کہ عام بول چال کی آسان زبان میں کتابیں تیار کی جائیں اور ان کو ایک ہی قسم کے الفاظ کے ساتھ اردو ہندی دونوں رسم خطوں میں چھاپا گیا۔ لیکن یہ اردو ہندی دونوں کو ہندی اردو سکھانے کے لیے تعلیم [illegible] سکولوں [illegible] یونیورسٹیوں میں جو اردو کی تعلیم ہے اس کا فیصلہ قومی تہذیبی تقاضا لازم ہے ورنہ زبان کا [illegible] قومیت، کلچر کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

علامہ شبلی کی تصانیف

علامہ شبلی کے فن تصنیف اور عادت تحریر کے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> اردو نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرتے تھے اور اکثر تصنیف ہوتے رہتے تھے
> کسی دن بھی تصنیف کے دو تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ زیادہ وقت
> مطالعہ میں، زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی صفحے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ لکھنے
> [illegible] بہت کم ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک [illegible]
> میں چھوڑ کر لکھ کر لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا۔ آخر عمر تک
> خوشنویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی تذکرہ مصنف حروف کی خوبصورتی
> کی اس قدر پرواہ کرتا ہو۔

علامہ شبلی کی تصانیف ضخامت میں ان کے بعض ہم عصروں سے کچھ بہت زیادہ نہیں، لیکن عظمت و اہمیت میں بہت گراں پایہ ہیں۔ انھوں نے پہلے یہ تجویز کی تھی جیسا کہ

المامون کے دیباچہ میں لکھا ہے: کہ نامور فرماں روایانِ اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کریں۔ اس سلسلے کا نام انھوں نے سر سید کے "شوقِ انگریزی" کی تقلید میں ہیروز آف اسلام رکھا تھا۔ دس خاندانِ حکومت کے دس بہترین فرماں روا منتخب کر لیے تھے۔ مثلاً

(۱) خلافتِ راشدہ	میں	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
(۲) خلافتِ بنی اُمیہ	میں	ولید بن عبد الملک
(۳) خلافتِ بنی عباس	میں	مامون الرشید
(۴) بنو اُمیہ اندلس	میں	عبد الرحمٰن ناصر
(۵) سلجوقیہ ایران	میں	ملک شاہ

اسی طرح سلاطین دہلی و سلاطین روم وغیرہ میں سے پانچ اور تھے۔ سلسلہ تصنیف کو نمبر اوّل سے شروع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت کے لیے سامان جمع نہ ہوا۔ اس لیے پہلے خلیفہ مامون رشید عباسی بغداد کے حالات المامون کے نام سے مرتب کیے۔ اس کے بعد الفاروق شروع کی۔ لیکن یورپ سے بعض کتابوں کے چھپ کر آنے کا انتظار تھا۔ اس لیے بقول خود "چند روز کے لیے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی مختلف خاندان بن سکتے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی۔ اور امام ابو حنیفہؒ کو جو فقہ کے بانی ہیں، اس کا ہیرو قرار دیا۔"[۱]

امام صاحب کے سوانح (سیرۃ النعمان) لکھنے میں علم کلام کی بحث اور امام ابو حنیفہ کا اس سے تعلق سامنے آگیا جس کا خود علامہ شبلی کو بھی اس سے پہلے اندازہ نہ تھا۔ علامہ بالطبع "عقلیات" (فلسفہ و کلام) کی طرف راغب تھے۔ علی گڑھ میں سر سید کی

[۱] دیباچہ سیرت النعمان۔

حنفیت نے "آزاد خیالی" پیدا کردی تھی۔ لیکن اس کے لئے تقلید چھوڑنے کی ضرورت تھی۔ سرسید غیر مقلد تھے۔ شبلی کے لئے یہ مسلک اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اب انھوں نے دیکھا کہ امام صاحب خود بڑے آزاد خیال اور نادل پسند تھے۔ یہ بڑا سہارا مل گیا۔ علامہ شبلی نے تمام "کلام" اور "کلامیوں" کو مطالعہ کرنا شروع کردیا۔ اس دلچسپی میں وہ سلسلہ فرمانروایان اسلام ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ الفاروق بہت سی [illegible] چکے تھے، وہ تو پوری کردی۔ پھر اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ ورنہ بہت اچھا ہوتا "ملک شاہ سلجوقی" اور "نورالدین زنگی" وغیرہ کو لکھ بھی دیتے۔ تو بجز "تالیفِ شبلی" کے اور کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے۔ یہ بات اس سے معلوم ہوتی ہے کہ علامہ کی تمام تصنیف میں المامون سب سے کم پڑھی جاتی ہے۔

علامہ شبلی کی تصنیف علوم و فنون کے لحاظ سے اس طرح مرتب ہو سکتی ہیں:۔

سیرت و سوانح — المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سیرۃ النبی ۲ جلد

فلسفہ و کلام — علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم

ادبیات — موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم ۵ حصے

سفرنامہ — سفرنامہ مصر و روم و شام

تاریخ — تاریخ اسلام، [illegible] [illegible]

تعلیمات — مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

تقریرات — ندوۃ العلماء اور ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں

خطوط — مکاتیب شبلی ۲ حصے

مقالات — مقالاتِ شبلی ۸ حصے جن میں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، سوانحی مضامین الگ الگ مرتب کئے گئے ہیں۔

نظم اردو — مثنوی صبح امید، قومی مسدس، مجموعہ نظم اردو۔

عربی تصانیف — الانتقاد علی التمدن الاسلامی (مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان

کی کتاب ''تمدنِ اسلامی'' کی تنقید) بدء الاسلام، اسکات المعتدی

فارسی نظم — دیوانِ شبلی (جس میں دستۂ گل، بوئے گل وغیرہ مختصر مجموعے شامل ہیں)

علامہ شبلی کا طرزِ تحریر

علامہ شبلی پہلے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا۔ علامہ آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے طرزِ تحریر کی کوتاہیاں بیان ہو چکی ہیں۔ مولانا حالی پہلے اسلوب کی متانت اور ہمواری سے مختلف موضوعات کو نباہ لے گئے لیکن علامہ شبلی کے مقابلے میں ان کا طرز بھی بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ موقع و مقام اور موضوع و بیان کے مطابق اسلوب اختیار کرنے کے لئے صرف وجدان و ذوق کی مشاقی شرط ہے۔ فنِ بلاغت یا علومِ معانی و بیان بھی بغیر ذوقِ سلیم اور ذہنِ متوازن کے کام نہیں دیتے۔ علامہ شبلی بلا کا ذوقِ صحیح اور طبعِ لطیف رکھتے تھے۔ ہر موقع و محل کے لحاظ سے انہی کے مناسب طرزِ تحریر اختیار کرتے ہیں۔ لطیف و نازک استعارہ و تشبیہات بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی الفاظ کے انتخاب، مرکبات اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حسنِ تناسب ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کی عبارت میں نہایت دلکشی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ وسعتِ خیال، دقتِ نظر، صحتِ تحقیق، قوتِ استدلال سے مضمون میں ندرت و جدت اور تاثیر و دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ عظمت و اہتمام کے موقع پر شاندار الفاظ اور زوردار ترکیبوں سے شان و شوکت دکھاتے ہیں۔ دلائل اور شواہد کے انتخاب و ترتیب میں ان کا حسنِ نظر اور ذوقِ سلیم نمایاں ہے۔ جس موقع پر دوسرے مصنف عموماً سامنے کی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں وہاں علامہ شبلی نادر و عجیب مثالیں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

ان کی تحریر کے متعلق سرسید ''دیباچۂ المامون'' میں لکھتے ہیں:۔

''یہی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہو گا۔''

علامہ شبلی کی اوّلیات اور ان کا مرتبہ

مولانا حالی کے حال میں لکھا گیا ہے کہ اردو میں سیرت اور تنقید دو چیزیں با اصول و مستند نہ لکھی گئی تھیں۔ حالی نے ان کا آغاز کیا۔ شبلی کی بھی اکثر تصنیفیں انہی دو موضوع کی ہیں۔ چنانچہ سیرت و سوانح (مع غزالی و رومی کے) اور دو تنقیدیں "موازنہ" و "شعر العجم"۔ "شعر العجم" کی پانچ جلدوں میں تذکرۂ شعرا بھی ہے اور تنقید شعر و سخن بھی۔

آزاد کی "دربار اکبری" اور حالی کی "حیات سعدی"، شبلی کی "المامون" وغیرہ سیرت سے پہلی ہیں۔ اسی طرح آزاد کی "آب حیات" اور "سخندان پارس" اور حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری"، شبلی کے "موازنہ" و "شعر العجم" سے مقدم ہیں۔ اس سے آزاد و حالی کی اولیت مسلم ہے۔ با اصول تذکرۂ شعرا سب سے پہلے آزاد نے لکھا۔ با اصول سیرت سب سے پہلے حالی نے مرتب کی۔ با اصول تنقید و نمونۂ تنقید سب سے پہلے حالی نے پیش کئے۔ لیکن جب شبلی نے ان چیزوں پر قلم اٹھایا تو اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ اردو میں پہلی مرتبہ یہ بات نظر آئی کہ "الفاروق" "سیرۃ النعمان" سیرت اس طرح مرتب کرتے ہیں اور تنقید اس طرح لکھتے ہیں۔

اس خیال کام کے لحاظ سے سیرت و تنقید بھی گو علامہ شبلی کی "اولیات" میں شامل نہیں۔ آزاد و حالی اور شبلی کی کتابیں مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شبلی کو پیش روؤں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ "سیرۃ النبی" اور "الفاروق" کے سامنے "دربار اکبری" اور "حیات سعدی" نمونہ کا کام نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح "شعر العجم" کے پہلے تین حصے "تذکرۂ شعرا" اور "آب حیات" کی تقلید سے بے نیاز ہیں۔ اور چوتھا پانچواں حصہ "حقیقت شاعری اور صنف شاعری کی تنقید" "مقدمہ شعر و شاعری" کے اتباع سے بالاتر۔

علامہ شبلی کی "علم الکلام" "الکلام" اور اس فن سے متعلق "الغزالی" اور "سوانح مولانا روم"، اردو زبان کی وہ اوّلیات ہیں کہ ان ۴۰ برس میں "آخریات" بھی یہی ہیں۔ اس

میں شک نہیں کہ علم کلام کی طرف توجہ اور اس کا شوق علامہ شبلی کے اندر سرسید کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سرسید نے اور ان کی تقلید میں مولوی چراغ علی نے اسلام کے عقائد و اعمال اور احکام و شرائع کو عقل کے مطابق اور مصلحت زمانہ پر مبنی ثابت کرنے کے لئے علم کلام کے اصول برتے تھے۔ لیکن اس فن کی تاریخ و اصول اور اہل فن کا طریقۂ عمل سب سے پہلے علامہ شبلی نے پیش کیا۔

مثنوی مولانا روم سے علم کلام کے مسائل مرتب کرنا علامہ شبلی کی بے نظیر جودتِ طبع اور فکر رسا کا ثبوت ہے۔ مثنوی کا یہ وصف باوجود شارحین و شائقین مثنوی کی نگاہوں سے مخفی نہ تھا۔ عقائد و الٰہیات کے مباحث میں ''مثنوی مولوی'' کے اشعار پہلے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن مسائل کی یہ ترتیب جو سوانح مولانا روم میں ہے۔ علامہ شبلی کا کارنامہ ہے۔

تاریخ اسلام کے مختلف واقعات کی تحقیق اور ان کے متعلق غلط فہمیوں کی اصلاح جس کاوش و جامعیت کے ساتھ علامہ شبلی نے کی اس کی نظیر پہلے موجود نہ تھی ''جزیہ'' ''کتب خانہ اسکندریہ'' ''مضامین عالمگیر'' وغیرہ متعدد رسالے اور مضامین اپنی نوعیت کی پہلی چیزیں ہیں۔

ان تمام تصانیف میں زبان و بلاغت کلام جس حد تک ہے اس میں کوئی معاصر علامہ شبلی کو نہیں پہنچتا۔ اس لئے وہ ادیب و انشا پرداز اور مورخ و سیرت نگار ہر حیثیت سے ندرت و مرتبت میں بالکل منفرد ہیں۔

علامہ شبلی کی شاعری

علامہ فارسی و اردو کے شاعر تھے۔ فارسی سے طبعاً مناسبت تھی کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان اور شاعری کے نکتوں اور لطافتوں پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے ''فارسی گویان ہند'' میں کم سے کم اپنے معاصرین میں وہ کسی سے کم نہیں۔ خود ایک خط میں اپنے متعلق لکھتے ہیں: ''فارسی شاعری میں زبان کو اصول پر برتتا تھا یہ ''اصول

پر برتنا" غیر زبان والوں کو مشکل سے میسر آتا ہے۔ اہلِ ہند چھ سو، سات سو برس سے فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ امیر خسرو سے فیضی کے زمانے تک ہندوستان کے فارسی شاعروں کی بول چال بھی فارسی میں تھی، تصنیف و تالیف بھی، خط کتابت بھی، اور ایرانی شاعروں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس لئے اس زمانے میں یہاں کا شعر و ادب بھی بڑی حد تک ایرانی اسلوب پر رہا۔ اس کے بعد جب سے اردو، بول چال، تصنیف اور شاعری میں داخل ہوئی، ہندوستانی طرزِ ادا اور فارسی الفاظ و محاورات کا ہندوستانی استعمال فارسی شاعری میں آگیا جس کو اہلِ ایران "سبکِ ہندی" کہتے ہیں۔ پھر اہلِ ہند کے لئے اس طرزِ ہندی سے بچنا اور "سبکِ ایرانی" برتنا دشوار ہوگیا۔ اور اس کے لئے خاص ذوقِ سلیم اور نگاہِ تنقید کی ضرورت ہونے لگی۔ اس "ذوق و نظر" کا متاخرین میں مرزا غالب پر خاتمہ ہوگیا۔ غالب کے بعد پھر کسی کو یہ بات کمال کے ساتھ نصیب نہ ہوئی۔ تاہم کثرت سے اور اچھا کہنے والوں نے بے عیب بھی کہا اور "اسلوبِ ایرانی" میں بھی کہا۔ اسی وجہ سے اہلِ ذوق ایرانیوں نے بھی پسند کیا۔

علامہ شبلی کا زمانۂ علی گڑھ تک فارسی کلام سبکِ ہندی سے خالی نہیں، پھر بھی ان کی لطافتِ طبع اور حسنِ مذاق کا شاہد ہے۔ آخری زمانے کا کلام بہت منجھا ہوا اور معیار سے نہایت قریب ہے۔ الفاظ ترشے ہوئے اور مصرع ڈھلے ہوئے ہیں۔ خصوصاً بمبئی کی غزلوں میں بڑی دل آویزی ہے۔ اس زمانے میں ان سے زیادہ پُرگو اور بھی تھے، زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا۔

فارسی شاعری سے مناسبت و شوق رکھنے کے علاوہ علامہ شبلی "دلِ زندہ" اور "شیدۂ اہلِ نظر" بھی رکھتے تھے۔ ایک کی زندگی اور دوسرے کی "آبرو" کی خاطر فارسی غزل کہنے سے بہتر کوئی شغل نہ تھا۔[١٥]

١٥؎ بقول مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، "بمبئی کے سفر فارسی شاعری کے لئے یادگار ہیں" [illegible]

ان کا اردو کلام بہت مختصر ہے۔ "مثنوی صبح امید" اور "قومی مسدس" قیام علی گڑھ کی نظمیں ہیں۔ وقتی چیزیں تھیں۔ اس زمانے میں چند بار شائع ہوئیں۔ اب مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ ان کے بعد سالہا سال کوئی اردو نظم نہیں لکھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٨٣) اس یادگار کو باقی رکھنے کے لئے بمبئی کے متعلق علامہ شبلی کا کچھ کلام درج کیا جاتا ہے۔ یہ غزل بمبئی میں ستمبر [illegible] میں کہی تھی۔

غزل

شاد [illegible] بمبئی [illegible] دامنہ [illegible] / [illegible] مسند جمشید [illegible] خسرو [illegible]

[illegible] تموج بے [illegible] / گذشتن [illegible] دست [illegible]

[illegible] نگاہ [illegible] / ہم [illegible] ظلمت و نور

[illegible] جنت [illegible] / [illegible] گلگشت [illegible]

[illegible] شبلی [illegible] دیکھ [illegible] / [illegible] صد [illegible]

[illegible] شعر کے [illegible] قسمت [illegible] ذکر [illegible] اس مضمون کا ذکر کیا ہے [illegible] لوگ [illegible] میں [illegible] سے [illegible] چوتھا شعر [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہے۔

[illegible] جنت [illegible] / [illegible] گلگشت [illegible]

[illegible] نظم [illegible] جو [illegible] سب سے زیادہ [illegible] ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

[illegible] / [illegible]

[illegible] مقصود [illegible] / [illegible] طلب [illegible]

[illegible] / [illegible] آتش [illegible]

(باقی حاشیہ صفحہ ٦٨٥ پر)

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی اور اس کے بعد جنگ بلقان کا ہیجان پیدا ہوا تو علامہ شبلی نے "پولیٹکل کروٹ" بدلی۔ اور مضامین کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی لکھیں۔ جن میں سے بعض ایسی تیز و سخت تھیں کہ قابل ضبطی سمجھی گئیں۔ ان کے علاوہ تاریخ اسلام کے چند واقعات نظم کئے ہیں۔ اکبر و جہانگیر کے واقعات کی نظمیں نہایت مشہور و مقبول ہوئیں۔ یہ سب کلام شاعری کے کانٹے میں تلا ہوا اور نہایت پُر لطف ہے۔ سیاسی نظموں میں تو اگر نہیں تو ایک دور کے لئے امامت اور پیشوا کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے "سیاسی شعرا" میں مولوی ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار سے بہتر کوئی نہ تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۴)

آں شد کہ دست را بہ گرفتے پیرہن ‏ ‏ نقش [illegible] بہ ورق جاں زدہ ام

آں شد کہ دست را بدامن وہ چیں زدہ ‏ ‏ گہ دم ز صحبت آں دشمن جاں زدہ ام

من دامن ز دست [illegible] ‏ ‏ گہ بہ [illegible] تیغے دست بہ [illegible] زدہ ام

[illegible] گلشن [illegible] ‏ ‏ [illegible] بسکہ بر آں عارض خنداں زدہ ام

ان نظموں کے علاوہ ایک شعر اور بھی ہے ایسے ہی مضامین کے متعلق بہترین نمونہ دعویٰ کئے تھے ہیں:

[illegible] حدیث [illegible] ‏ ‏ گوید [illegible]

شبلی کی اس غزل کے دو شعر یہ بھی خوب ہیں:

[illegible] بت خود کام [illegible] ‏ ‏ [illegible] چند در آں زلف پریشاں زدہ ام

بے تو آں نالہ کہ من از مہ بے تیرے نیست
شبلی [illegible] نالہ جو مستاں زدہ ام

بمبئی سے واپسی پر ۲۲ ستمبر ۱۹۰۶ء کو غزل کہی ہے۔ مطلع و مقطع یہ ہے۔ مقطع کیا خوب فرمایا ہے:

دوستاں کار دلم [illegible] افتادہ بود ‏ ‏ غلغلے در گنبد فیروزہ طاق افگندہ بود

(باقی حاشیہ صفحہ ۶۶۶ پر)

علامہ شبلی پر اعتراضات

(۱) علامہ کے خیالات اور تالیفات پر ان کی زندگی میں اور بعد کو مختلف اعتراضات کئے گئے۔ تردید میں مضامین لکھے گئے۔ تصانیف کے جواب میں کتابیں چھاپی گئیں۔ تاریخی غلطیاں بتائی گئیں۔ تالیفی کمزوریاں دکھائی گئیں لیکن باوجود اس کے ان کے مصنف اور انشاپرداز کے مرتبے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اعتراضات کی بڑی بنیاد ان کے مذہبی خیالات و اجتہادات تھے۔ جہاں ان کے کمال کا یہ اعتراف کیا گیا:-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٨٥)

ز دل صد پارہ ات آگہ نیم شبلی ولے — شیشہ دیدم کہ ز بر سے طاق افتادہ بود

۲ اپریل ۱۹۰۷ء کو الہ آباد میں بیٹھے بمبئی کو یاد کر رہے ہیں:-

نہ ہے جاں بخشی آب و ہوائے بمبئی شبلی — کہ از دو ہفتہ دو شادو و افسردہ است اینجا دل

دو چار شعر اور بھی قابل دید ہیں:-

دامن عیش ز دستم نرود تا شبلی — دامن بمبئی ز کف ندہم تا باشم

شبلی غزل آراستہ ام در ہوسے بمبئی — تا ہم سفر یار نشستہ بہ جہت

ز ذوق صحبت شبلی من دراں روز دانستم — کہ ہنگامہ آشوب گاہ بمبئی در بازو یاراں را

بیا اینجا کہ ہر سو کاروان در کاروان بینی — بتان آذری را دوش بر دوش صنم دیگر بینی

یہ غزلیں شائع ہو جاتی تھیں اور ان مضامین کے چرچے ہوتے تھے۔ اس لئے ایک غزل میں اپنے مطالب غزل سے کہتے ہیں:-

(باقی حاشیہ صفحہ ٦٨٧ پر)

"آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔" (مولوی ظفر الملک ایڈیٹر الناظر، سیر المصنفین)

وہاں یہ بھی کہا گیا:-

"ہمارے مولانا پرستاران عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گذشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا نشا پورا نہو، لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہو جائے۔"

"مولانا کی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حامیان شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا، تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پونہچا دیا ہے۔" (وہی مضمون)

اس اعتبار سے ان کی حیثیت تقریباً سرسید کی سی تھی۔ فرق یہ تھا کہ سرسید باقاعدہ عالم، محدث، فقیہ نہ تھے، اور علامہ شبلی سب کچھ تھے۔ سرسید کی رایوں کو تو "داخل در معقولات" سمجھ گیا تھا، لیکن علامہ شبلی کے "اجتہادات" کی حمایت میں ان کے جبہ و دستار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۸۶)

چشم سعف ز تو باید ز آنکہ می دارم | گرمن از دام نگہ ہر تو نقصان کردم

اس غزل کا مقطع ہے:-

شبلی این فن نہ ہمین شیوۂ آئین بود است | پیش ازین کاہدے بود کہ من جان کردم

فن شعر گوئی یا فن عشقبازی؟

اس مجموعہ "بوئے گل" کی آخری غزل کا مقطع کیا خوب ہے:-

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی | حالیا شبلی شدم از غزل خوان نیستم

تھے، علمائے ملت کی برہمی و برافروختگی کا یہی باعث تھا۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سیرۃ النعمان پر اعتراض کیے گئے۔ وجوہِ اعتراض کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ معترضین میں مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی رئیس بھیکن پور (نواب صدر یار جنگ بہادر) بھی تھے، اور علمائے معترضین میں شاید سب سے کم عمر، لیکن فہم و فراست اور مذہبی جوش و پاسداری میں کسی سے کم نہ تھے۔ علی گڑھ کالج سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ علامہ شبلی نے تمام مخالفانہ مضامین میں سے مولوی صاحب موصوف ہی کے اعتراضات کا جواب لکھا۔ اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا:-

[illegible] خامہ گیری و حرف نگاری

(۲) سیرۃ النعمان کے بعد الفاروق پر اعتراض ہوئے۔ یہ دوسری قسم کے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ "مصنف نے اسلام کی تاریخ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ الفاروق پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی شائستگی اور اُس زمانے کے تمدن میں چنداں زیادہ فرق نہ تھا۔ جو اُصول اور دفاتر موجودہ طرزِ حکومت کے لازمی عناصر ہیں، کم و بیش وہ سب دورِ خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں جن کو درایت بھی تسلیم نہیں کر سکتی" (ڈپٹی نذیر احمد) اور اس پر یہ فیصلہ دیا گیا ہے:-

"جو درجہ حدیث و تفسیر و تاریخ کی کسی مستند کتاب کو حاصل ہے

الفاروق اس سے محروم ہے" (ڈپٹی نذیر احمد)

علامہ شبلی کی رجعت پسندی اور پیرو پرستی سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن اس میں ان کا وہ مبالغہ یا اہتمام ہم کو تسلیم ہے۔ ورنہ

تا نباشد چیزکے شبلی نگوید چیزہا

علامہ نے "الفاروق" کی ترتیب میں اس قول پر عمل کیا ہے کہ اثباتِ فضائل میں حدیث کا بالکل صحیح ہونا ضروری نہیں البتہ اس صحیح قول کی تردید نہ ہو اور کسی دوسرے کی منقصت

منقصت نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے انتظامِ حکومت کے متعلق جو بات جس تاریخ میں پائی لکھ دی۔ وہ تحقیق و تنقیح نہیں کی جو بعد کو سیرۃ النبی م کے لئے کی۔ لیکن الفاروق میں بھی کثرت سے واقعات صحیح بخاری و صحیح مسلم سے اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج سے اور اس طرح کی بعض اور مستند کتابوں سے لئے ہیں۔

معترضین نے کم سے کم یہ اعتراض تجویز نہیں کیا کہ مصنف الفاروق نے موجودہ طرزِ حکومت اور دربارِ خلافت میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھا۔ جس چیز نے ان کو دھوکا ہوا وہی علامہ شبلی کا کمالِ تالیف ہے۔ علامہ نے حصہ دوم میں جلی عنوانوں کی تفصیل کے لئے حاشیوں پر ذیلی سرخیاں قائم کر کے موجودہ طرزِ حکومت کے سب نہیں تو اکثر شعبے عہدِ خلافتِ فاروقی میں دکھائے ہیں۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ عنوان نظر آتے ہیں:۔

> صوبوں کی تقسیم، محکمۂ بندوبست، قانون، سزائیں، محکمۂ آب پاشی، مختلف قسم کے رجسٹر، مردم شماری، محکمۂ جاسوسی، پولیٹیکل تنخواہیں، پرچہ نویسی، فنِ جنگ، فوج کے خزانچی و محاسب، قلعہ شکن آلات، سفر مینا وغیرہ۔

لیکن ان کو پڑھ کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں بالکل ابتدائی حالت میں اور وقت و موقع کے مطابق تھیں۔ مثلاً فوجیں تھیں تو وہ کہیں رہتی بھی تھیں۔ ان مکانوں کا نام فوجی بارکیں لکھ دیا۔ معترض بے پڑھے یہ کیوں تصور کرلے کہ انگریزی فوجوں کے سے قطار در قطار باقاعدہ ویسے ہی کمرے، ہال، کلب گھر، اصطبل تھے۔ مردم شماری کے متعلق لکھا ہے:۔

> زکوٰۃ اور جزیہ کی تشخیص کی ضرورت سے ہر مقام کی مردم شماری کرائی گئی تھی ... خاص صنفوں کے لحاظ سے بھی نقشے تیار کرائے تھے۔ مثلاً سعد وقاص

کو حکم بھیجا تھا کہ جس قدر آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں ان کی فہرست تیار کی جائے۔
شاعروں کی بھی فہرست طلب کی تھی۔ (الفاروق صفحہ)

ثابت ہے کہ ہندوستان میں ابھی آغاز ۱۹۴۱ء میں جیسی مردم شماری ہوئی ہے، ایسی جب نہ
تھی۔ یہی دکھائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ معترضین نے یہ امر بھی فراموش کر دیا ہے کہ خلافت فاروقی عراق،
شام، مصر، ایران اور دور دور تک تھی۔ مصر و ایران وغیرہ پہلے سے متمدن و شائستہ ملک
تھے۔ وہاں یہ تمام اصول حکومت اور طرز سلطنت رائج تھے۔ فتح اسلام کے بعد بھی جاری
رہے اور اب یہ عہد فاروقی کے کارنامے اور الفاروق میں لکھنے کے واقعات
ہو گئے۔

(۳) موازنۂ انیس و دبیر پر بھی اعتراض ہوئے اور اس کے جواب میں
المیزان اور ردّ الموازنہ وغیرہ لکھی گئیں۔ ان دو کتابوں میں اضافہ کے لحاظ سے تو بہت
اچھا ہوا کہ یہ کتابیں لکھ دی گئیں۔ خصوصاً المیزان ایک بڑی ضخیم کتاب بن گئی ہے۔ ”موازنہ“
سے ذکی، اور مرزا دبیر کے حالات، خصوصیات کلام، انتخاب مراثی کے اعتبار سے
نہایت کارآمد۔ لیکن اس میں جواب موازنہ کی سعی لاحاصل ہے۔ ”موازنۂ شبلی“
لاجواب تھا۔ علامہ شبلی کی طبیعت میں جتنی باتیں مورخ و نقاد کی شان کے خلاف
تھیں ان کا ظہور ”موازنہ“ میں بھی ہے۔ صرف ان چند باتوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت
تھی۔ اس کام کے لئے چند صفحے یا ایک دو جزو کافی تھے ورنہ وہ شاعری میں اس قدر
تنقید فن اور نظر انتقاد رکھتے تھے کہ ان کی تنقیدوں میں مشکل سے کلام ہو سکتا ہے۔
بعض قابل اعتراض باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) علامہ شبلی کی عادت تھی کہ جس شے کو جتنا اہم سمجھتے تھے اتنی ہی اس کی
تحقیق کیا کرتے تھے۔ معمولی قرین قیاس باتوں میں صرف شہرت و سماعت کو کافی سمجھتے

تھے۔ انھوں نے "موازنہ" میں مرزا دبیر کے بعض شعروں اور مصرعوں کو خلاف بلاغت بتایا ہے۔ ان میں یہ بھی ہیں :۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبان سے مرزا دبیر نے یہ مضمون ادا کیا ہے :۔

محبوب ہوں خدا سے ذرا [illegible] ... [illegible] ہوں میں حسین علیہ السلام کو

آنحضرتؐ کی زبان سے امام صاحب کے لئے "علیہ السلام" کا لفظ کس قدر ناموزوں ہے۔ ایک اور مشہور مصرع ہے :۔

زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے" (دبیر)

مصنف المیزان کہتے ہیں کہ یہ دونوں مرزا دبیر کے نہیں ہیں۔ ان کے نام سے غلط مشہور کر دیے گئے ہیں۔ یہاں علامہ پر اعتراض صرف عدم تحقیق کا ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل مسئلہ مرزا دبیر کی عدم رعایت بلاغت ہے۔ وہ اور بہت سے مصرعوں سے ثابت ہے جو علامہ نے پیش کئے ہیں۔

(۲) علامہ نے صنعت "تنسیق الصفات" کی یہ تعریف بیان کی ہے :۔

"جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن و یک قسم کے برابر آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔" (موازنہ صفحہ ...)

اور اس کی مثالوں میں یہ شعر بھی لکھا ہے :

کوفہ میں یہی سوگ [illegible] ... [illegible] عمر آیا

یہ تعریف اور مثال دونوں غلط ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "صفات" کا لفظ ہے۔ اس سے تعریف نکلتی ہے کہ کسی شے کی صفتیں پے درپے لائی جائیں۔ صرف الفاظ یا اسماء کے پے درپے آنے سے "تنسیق الصفات" نہیں بنتی۔ "موازنہ" میں یہ مثال صحیح لکھی ہے :۔

اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی ... [illegible] بھی [illegible] بھی [illegible] بھی قضا بھی

(۳) علامہ شبلی پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا نام
تو "موازنۂ انیس و دبیر" رکھا ہے۔ لیکن اس سے مقصد تحسین انیس اور تنقیص دبیر ہے۔
موازنہ میں طرفین کے محاسن و معائب دکھانے ضروری ہیں۔ علامۂ ممدوح نے برائے
نام میر انیس کی خامیاں بھی بتائی ہیں، لیکن اکثر جگہ ان کی یہ تاویل کی ہے کہ کاتب کی
غلطی ہے۔ اور مرزا دبیر کے اغلاط میں کہیں یہ احتمال ظاہر نہیں کیا۔ "المیزان" میں
بتایا گیا ہے کہ یہاں یہاں کاتب کی غلطیاں ہیں، اس لئے علامہ شبلی کا اعتراض
درست نہیں۔

علامہ موصوف میں یہ وصف بھی ہے کہ وہ ایک کو اعلیٰ اور ایک کو ادنیٰ سمجھ لیتے
ہیں تو پھر یہ تلاش نہیں کرتے کہ ان کے ناپسندیدہ شخص میں کتنی خوبیاں ہیں، خواہ وہ پسندیدہ
شخص کے مقابلے میں کتنی ہی کم ہوں۔ ترجیح کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غیر مرجح شخص میں
کوئی خوبی نہ ہو، یا اس کی خوبیوں سے چشم پوشی کی جائے، یا ان کو کم کرکے دکھایا جائے۔
انھوں نے مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے:-

"فصاحت ان کے کلام کو چھو نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت
یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔"

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں
جاتیں، لیکن گفتگو قلت و کثرت میں ہے۔"

جب قلت و کثرت میں گفتگو تھی تو یہی بات کہنی چاہئے تھی۔ یہ الفاظ "چھو نہیں گئی، نام کو
نہیں، بالکل عاجز ہیں" لکھنے ہی مناسب نہ تھے۔ اس لئے کہ خلاف واقعہ ہیں۔ علامہ
شبلی نے صرف ایک واقعہ کے متعلق مرزا دبیر کے پانچ بند نقل کئے ہیں اور
لکھا ہے:-

"مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے، اور
جو دردانگیز سماں دکھایا ہے، کسی سے آج تک نہ ہو سکا۔"

لیکن ہم نے اپنی تالیف "**تاریخ مرثیہ گوئی**" میں مرزا دبیر کے مختلف مرثیوں سے طویل و مسلسل اقتباسات لکھ دیے ہیں جن میں وہ "فصاحت و بلاغت" جس کو علامہ ممدوح کہتے ہیں کہ دبیر کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، ایسی اعلیٰ ہے کہ اگر ان بندوں کو میر انیس کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچان مشکل ہے۔ موازنہ کا حق یہ تھا کہ علامہ مرزا صاحب کے کلام کا باستیعاب مطالعہ کر کے بجائے ایک دو واقعات یا چند اشعار کے وہ تمام یا اکثر حصے پیش کرتے، جہاں دبیر انیس سے بڑھ کر یا برابر کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوتا تو پھر ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی، اور "ترجیح انیس" کے متعلق ان کی رائے پھر بھی درست ہی رہتی۔

(۴) شعر العجم بھی مورد اعتراض رہا۔ مختلف لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھ کر اس کی تاریخی و تنقیدی غلطیاں دکھائیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی "مورخ" سے زیادہ "نقاد" تھے[1]۔ شعر العجم کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فارسی شاعری کی وسعت و جامعیت ثابت کی جائے اور تنقید و موازنہ کر کے شاعروں کے کمالات دکھائے جائیں۔ اس کام کے لئے فی الجملہ ملکی تاریخ اور شاعری کا ارتقا بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ اور شاعروں کے حالات بھی۔ لیکن ذاتی حالات یا ملکی تاریخ مقصود بالذات نہ تھی۔ اور علامہ کی یہ عادت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ وہ صرف اسی کام اور ضرورت کی قدر تحقیق کیا

---

[1] آگرہ یونیورسٹی کے ایم۔اے (فارسی) کے نصاب میں ساتواں پرچہ "تنقید" کا ہے۔ اس میں صرف شعر العجم کے پانچوں حصے داخل نصاب ہیں۔ ایک سال اس پرچے میں یہ سوال بھی تھا: "اس پر بحث کیجئے کہ شبلی مورخ سے زیادہ نقاد ہیں۔" مقصود یہ تھا کہ ان کی تاریخ نویسی کی خامیاں اور تنقید و تبصرہ نگاریاں دکھائی جائیں۔

کرتے تھے۔ ان کی جن تصانیف یا مضامین کا موضوع تحقیق ہے، وہاں انھوں نے کوئی پہلو اور کوئی ذریعہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور جہاں تاریخ و تحقیق ضمنی چیز ہے، وہاں وہ ہر روایت اور ہر تحریر کو معتبر سمجھ لیتے ہیں۔ اسی بنا پر شعر العجم میں شعرا کے سال ولادت و وفات، ان کا وطن، حسب نسب، کتابوں کا سال تصنیف، ان کا انتساب، تاریخ ایران کے سنہ اور اس قسم کی مختلف معلومات کہیں کہیں غلط لکھ دی گئی ہیں۔ اس سے کہ ان شاعروں اس کے گرد و پیش سے کوئی بحث و تعلق نہیں بلکہ شاعری اور اس کے ماحول سے بحث ہے۔

شعر العجم میں ان باتوں کی تحقیق بھی ہے بڑی نظر آتی ہے۔ لیکن سرسری سی۔ کسی بات کے متعلق چند کتابوں میں اختلاف نظر آیا۔ انھوں نے وہ اقوال نقل کر دیے۔ کبھی کسی قول کو ترجیح دے دی، کبھی بغیر فیصلہ کے چھوڑ دیا۔ اس سے علامہ شبلی پر بحیثیت تذکرہ نویس کی حیثیت سے یہ اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو یورپ کے طرز تحقیق کی عادت ہے، ان کی نظر میں علامہ کی یہ کمزوری زیادہ کھٹکتی ہے[1]۔

علامہ شبلی کی طبیعت میں یہ بات بھی عجیب تھی۔ وہ اپنے معاصرین کی تصانیف کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ خصوصاً جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھتے تھے اور جن کی کتابیں ان کی تالیفات کے ہم موضوع ہوتی تھیں ان کی کھلے دل سے داد نہ دیتے تھے۔

شعر العجم حصہ پنجم کے دیباچے میں علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

عجب اتفاق ہے کہ اس وقت [illegible] ہندوستان اور یورپ کے دو اور کامل مصنفین کی قلم [illegible] تھے۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد لاہور میں اور پروفیسر براؤن انگلستان میں [illegible] بصورت تذکرہ ایران پر [illegible] اور

---

[1] پروفیسر محمود شیرانی کا مضمون تنقید شعر العجم [illegible] اردو ۱۹۲۶ء دیکھنا چاہیے۔

بعد میں براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا شائع ہوئی لیکن شعر العجم کے مصنف کا معیار تنقید ان دونوں سے الگ رہا۔ مولانا شروانی کے خط میں مولانا لکھتے ہیں:

"براؤن کا سکنڈ پارٹ حصہ دوم نکلا احسان اللہ لیکن بحمد اللہ کہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

(مکاتیب شبلی حصہ اول ص [illegible])

اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں:-

"پروفیسر براؤن کو ایک دوست کے خط سے مولانا کی تصنیف کا حال معلوم ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بذریعہ خط جناب مولانا کو اور پھر مولانا نے اس کا جواب حسب ذیل دیا:-

جناب کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میں نے براؤن کی کتاب دیکھ کر شعر العجم لکھی ہو ... نہایت ممنون اور مشکور ہوں۔ بہر حال آپ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ براؤن صاحب خود بھی بہت ... دیکھی۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں جن میں اس کے انتخابات بھی شامل ہیں۔ ... صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعہ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ اس حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں۔ میں اس کا شکر گزار ہوں کہ آپ سے ... لوں گا۔"

پروفیسر براؤن کی "ادبی تاریخ ایران" کو تاریخ ادبیات ایران اور سوانح کہنا علامہ شبلی کی "سخن فہمی" کی عجیب و غریب مثال ہے۔ براؤن کی تاریخ اس درجہ کی کتاب ہے کہ علامہ شبلی اگر کوشش کرتے تو ایسی نہ لکھ سکتے۔ المامون اور الفاروق میں تحقیق و تلاش کی نوعیت اور تھی۔ کسی ملک و قوم کی تہذیب و تمدن اور اس کی روشنی میں زبان و ادب کی تاریخ جن اصول پر یورپ میں لکھی جاتی ہے اور علامہ ان اصول کے فہم و تشریح سے نابلد تھے جس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ وہ "برادر اسحاق سے بڑھ کر" اور "خود التفات کریں"

نہ دیکھ سکے کہ اس میں کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا کہ کیا نہیں ہے۔ علامہ شعر فہمی و نکتہ سنجی کے مرد میدان تھے۔ اس وقت فردوسی زیرِ مطالعہ تھا (جس پر ۵، ۶ صفحے لکھے ہیں)۔ اس لئے براؤن کے ہاں اسی کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ اس نے دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ساری کتاب پر ریویو کرنے کے لئے گویا یہ نظر ہی کافی تھی۔ پروفیسر براؤن نے علامہ شبلی کی یہ رائے دیکھی ہوگی تو مزہ لیا ہوگا۔

اس کے مقابلے میں پروفیسر صاحب کی انصاف پسندی اور کشادہ دلی قابلِ دید ہے۔ تاریخ براؤن اور تذکرۂ شبلی کی پہلی جلدیں ساتھ نکلیں۔ اس کے بعد دونوں اپنی اپنی کتابیں آگے لکھ رہے تھے۔ علامہ نے اپنی تصنیف پہلے ختم کر دی۔ پروفیسر بعد تک لکھتے رہے۔ انہوں نے شعر العجم دیکھی اور اپنی بعد کی جلدوں میں اس کی بڑی تعریف لکھی۔ اور علامہ کی سخن سنجی کی بہت داد دی۔ تیسری جلد میں جہاں فیضی، عرفی، نظیری، صائب وغیرہ کا پروفیسر صاحب نے تذکرہ لکھا ہے، ہر شاعر کے بیان میں سب سے پہلے علامہ شبلی اور شعر العجم کا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ مقابلۂ شعرا کے موقع پر لکھا کہ یہ کام شبلی نے نہایت عمدہ کیا ہے۔ چنانچہ بعض شاعروں کا موازنہ جو علامہ نے کیا تھا اسی کو اعتراف و شکر کے ساتھ بجنسہ اپنی کتاب میں درج کر دیا۔

علامہ شبلی نے جو کام کیا یعنی شعرا کا موازنہ، خصوصیات کلام کا مطالعہ، بہترین کلام کا انتخاب اور تنقید، یہ پروفیسر براؤن کے بس کا نہ تھا۔ [illegible] رہ کر [illegible] مختلف [illegible] بیان کیا۔ اگر کوئی یورپین جو فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کو مشکل سے سمجھ سکتا ہے، یہ لوگ صرف شاعری کے موضوع، نظم کے مضمون، اسلوب کے ظاہری فن، صنائع و بدائع کو سمجھ سکتے اور ان پر بحث کر سکتے ہیں۔ علم معانی سے جو خوبیاں متعلق ہیں ان کا سمجھنا ان کے لئے بہت دشوار ہے، الفاظ کی موزونیت، لفظ و معنی کا تناسب، روزمرہ کی نزاکت، محاورہ کی لطافت، بلکہ اکثر خیال کی پاکیزگی اور طرز ادا کی [illegible] مستشرقین یورپ میں سے کوئی شاذ و نادر ہی سمجھ سکا ہوگا۔

اس لئے اگر پروفیسر براؤن "شاہنامہ" کی شاعرانہ خوبیوں کی داد نہ دے سکے، تو اس پر علامہ شبلی کو طعنہ دینے کا محل نہ تھا۔ باقی علامہ نے یہ بات غلط لکھی کہ براؤن نے فردوسی پر دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ان کی ہسٹری کی پہلی جلد میں شاہنامہ کے تاریخی مضامین اور مآخذ ۱۱ صفحے میں لکھے ہیں، اور شاہنامہ کا منظوم انگریزی ترجمہ لکھا ہے، اور پھر دوسری جلد میں فردوسی و شاہنامہ کا ذکر ۲۱ صفحوں میں کیا ہے۔ یہ ۲۲ صفحے وسعت میں شعر العجم کے ۴۸ صفحوں سے کم نہیں ہیں۔

تصانیف شبلی کے نمونے

(۱) **المامون**۔ علامہ کی مستقل تصانیف میں سب سے پہلی ہے۔ اس کا سبب تالیف پہلے بیان ہو چکا ہے۔ "ہیروز آف اسلام" (نامور ان اسلام) کا سلسلہ اس کتاب سے شروع ہوا۔ علی گڑھ کالج کے زمانہ ملازمت میں لکھی گئی، اور ۱۸۸۹ء کے شروع میں کالج کی طرف سے چھاپ کر شائع کی گئی۔ اس قدر مقبول ہوئی کہ چند مہینے میں سب جلدیں فروخت ہو گئیں اور اسی سال اکتوبر میں دوبارہ چھاپی گئی۔ سرسید نے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ ۲ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو لکھا ہے۔ اس کی زبان کے متعلق سرسید کی رائے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ دیباچہ میں اس کے طرز بیان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناولوں میں تاریخی طرز کو ایسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کرتا ہے۔

ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے، اور باوجود تاریخی مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخی متانت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے، خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے، بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے، اور نہ

بھونڈی کہ نہ زیادہ بھونڈا۔ اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

(سید احمد خاں سکریٹری مدرسۃ العلوم)

"المامون" کے دو حصے کیے ہیں۔ پہلے حصہ میں خلافت عباسیہ کے قیام کا حال اور مامون الرشید خلیفہ ہشتم کے زمانے تک کی خانہ جنگیاں بیان کی ہیں، اور وہ اسباب لکھے ہیں جن سے بقول سرسید "یقین اس کا ہو جاتا ہے کہ امین اور قتل امین اور خود مامون تمام سلطنت اسلامی کا ایک مہذب اور شریف فرماں روا بن گیا"۔ دوسرے حصے میں بقول سرسید "انتظام سلطنت اور اس کی جزئیات کا بیان جہاں جہاں سے ملیں چن چن کر ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور مامون کی خصلت اور اس کی کوششیں علمی اور اس کی پرائیویٹ زندگی اس کے مشغلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے۔"

مولانا حالی کی "حیات سعدی" اس سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ وہ تاریخی تحقیق اور سیرت کی خوبی ترتیب کے لحاظ سے بلاشبہ اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ لیکن علامہ شبلی کا یہ پہلا کارنامہ تحقیق و ترتیب دونوں میں کچھ کم درجہ نہیں ہے۔ سرسید "المامون" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

> اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم و ترتیب سے ایک جگہ جمع کرنا بہت آسان کام نہ تھا۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی۔ اور مصنف کو کتنی نادر اور قدیم تاریخوں کے صفحے پلٹنے ہوں گے۔ اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کر کے نکالا ہے جن کی نسبت گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ ان میں مامون کے حالات ہوں گے، تو اس محنت کی وقعت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ کام حقیقت میں نہایت دشوار تھا، لیکن علامہ شبلی نے اپنے علم و فضل، وسعت مطالعہ

ہے اور اس سے زیادہ اپنے ذوقِ صحیح اور دقتِ نظر سے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اردو میں اس سے بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔ یہ اقلیمِ تحقیق المامون سے شروع ہو کر کبھی علامہ کے قلم سے نہ نکلی۔ اور اسی دشت کی سیاحی میں عمر گذر گئی۔ اس کے بعد جس کتاب کے لکھنے کو قلم اٹھایا وہ تحقیق ہی کا ایک نیا میدان تھا۔ یہ سیرۃ النبی تک یہی جولانی جاری رہی۔

المامون کی زبان و بیان کے متعلق سرسید کی جو رائے لکھی گئی وہ بالکل درست ہے۔ لیکن خود علامہ کی بعد کی تصانیف کے مقابلے میں اس کتاب کا اسلوب زیادہ پختہ اور منجھا ہوا نہیں ہے۔ "الفاروق" اور اس کے بعد کی کتابوں میں خصوصاً موازنہ، شعر العجم اور سیرۃ النبی میں اور اس زمانے کے مضامین میں زبان و بیان صفائی اور الفاظ و مضمون کا باہمی تناسب یعنی بلاغت ہے کہ ان کے اسلوب میں ایک تڑپ اور چمک پیدا ہوگئی ہے اور اسی وصف کے سبب سے وہ اپنے زمانے کے بہترین انشا پرداز ہیں۔

جس زمانے میں المامون لکھی گئی علامہ شبلی پر سرسید کا اثر غالب تھا۔ اس سے اس کتاب میں انگریزی کے الفاظ کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ورنہ جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے مولانا نے اس روش کی نازیبائی کو سمجھ لیا اور شروع کے مضامین و تصانیف کے بعد سے صرف انگریزی الفاظ نہیں لکھے۔ المامون سے دو ایک مثالیں لکھی جاتی ہیں:۔

(۱) "یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی خوشی کو زندہ رکھ سکتی ہے"

(دیباچۂ مصنف)

(۲) "مامون کی فیاضی [illegible] ہو سکتی ہے" (المامون ص[illegible])

(۲) "تاہم مامون نے وہی کیا جو سیچے کا اسٹینس کی رو سے اس کو کرنا چاہیے تھا" (ص[illegible])

المامون کے نمونے یہ ہیں:۔

(الف) طاہر ذوالیمینین خلیفہ مامون الرشید کا معتمد علیہ تھا۔ اسی نے مامون کے

بھائی امین سے جنگ کرکے اس کو گرفتار کیا تھا اور پھر قید خانہ میں قتل کیا تھا۔ اس طرح اسی شخص کے ذریعہ سے مامون کو سلطنت ہاتھ آئی تھی۔ اس کا ایک واقعہ علامہ شبلی لکھتے ہیں :۔

طاہر کا خراسان کی حکومت پر مقرر ہونا ۲۰۵ھ

اس سال ایک عجیب تقریب سے طاہر کو اپنے کارہائے نمایاں کا مناسب صلہ ملا۔ یعنی وہ کل مشرقی حکومت پر جس کی حد دارالخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی ہے نائب السلطنت مقرر ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک رات طاہر مامون کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ مامون بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ بے تکلفی سے اس نے دو پیالے طاہر کو بھی مرحمت کئے اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔ طاہر نے با ادب عرض کی کہ "میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے" مامون نے کہا "یہ قیدیں دربار عام کے لئے مخصوص ہیں بے تکلفی کے جلسوں میں اس قسم کی قواعد کی پابندی ضروری نہیں" طاہر آداب بجا لا کر بیٹھ گیا۔ مامون نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طاہر نے عرض کی کہ "اب کیا آرزو باقی رہی ہے جس کا حضور رنج کر سکتے ہیں"۔ مامون نے کہا "کچھ ایسی بات ہے جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف اور ظاہر کرنے میں ذلت ہے"۔ طاہر اس وقت تو چپ رہا مگر دل میں خلش پیدا ہوئی کہ آخر کیا بات ہے۔ حسین جو مامون کا ساقی اور ندیم خاص تھا۔ طاہر نے اسے دو لاکھ درہم نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس دن کے واقعہ کا سبب دریافت کرے۔ حسین نے موقع پا کر پوچھا۔ مامون نے کہا "اگر یہ بات آگے بڑھی تو سر اڑا دوں گا۔ سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو بھائی امین کا ذلت و بیکسی سے مارا جانا یاد آتا ہے۔ میرے

"تم سے ضرور کسی دن طاہر کو گزند پہنچے گا۔" طاہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو احمد بن ابی خالد الاحول کے پاس گیا (حسن بن سہل کے بعد وزیر مقرر ہوا تھا۔) اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں اور میرے ساتھ بھلائی کرنی فائدے سے خالی نہیں۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھ سے دور رہوں۔

احمد بن ابی خالد نے اس کا ذمہ لیا۔ اور دوسرے دن صبح کے وقت مامون کے پاس حاضر ہوا۔ چونکہ چہرے سے زردی اور پریشانی نمایاں تھی۔ مامون نے پوچھا "کیوں کوئی نئی بات ہے۔

احمد ۔ حضور مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی۔

مامون ۔ آخر کیوں۔

احمد ۔ میں نے سنا ہے کہ حضور نے خراسان کی حکومت غسان کو دی جس کے ساتھ مٹھی بھر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اگر ترکوں نے سرحد پر حملہ کیا تو کیا غسان ان کو روک سکے گا۔

مامون ۔ یہ خیال تو مجھ کو بھی تھا۔ اچھا تم کس کو تجویز کرتے ہو۔

احمد ۔ طاہر ذوالیمینین سے بہتر کون شخص انتخاب ہو سکتا ہے۔

مامون ۔ مگر اس کے خیالات تو باغیانہ ہیں۔ اور وہ نقض بیعت پر آمادہ ہے۔

احمد ۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔

مامون ۔ اچھا تم اپنی ذمہ داری پر مقرر کرو۔

طاہر طلب ہوا اور سند حکومت کے ساتھ ایک کروڑ درہم بھی جو عموماً خراسان کے گورنروں کو ملتے تھے۔ عطا ہوئے۔ طاہر نے ایک مہینے میں سازوسامان سفر درست کیا۔ اور ۲۹ ذی قعدہ ۲۰۵ھ کو خراسان روانہ ہوا۔ طاہر کا بیٹا اس کے بعد صاحب الشرطہ مقرر ہوا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی ذاتی لیاقت نے معمہ

کی گورنری تک پہنچا دیا۔ تقرر کے وقت مامون نے اس کو اپنے سامنے بلایا اور کہا "یوں تو ہر شخص اپنی اولاد کی نسبت حسن ظن رکھتا ہے، لیکن طاہر نے جو کچھ تمہاری تعریف میں کہا اس سے کم ہے جس کے تم دراصل مستحق تھے۔" طاہر نے جب یہ مژدہ سُنا تو بیٹے کو ایک نہایت مفصل خط لکھا۔ جو آئین حکومت، انتظام ملکی اور نظام رعایا کے متعلق ایک نہایت معرکہ کا دستور العمل تھا۔ یہ خط اس قدر مقبول ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ خود مامون نے اس کی بالتفصیل نقلیں عمّال حکام سلطنت کے پاس بھیجیں۔ اور کہا کہ طاہر نے دنیا و دین و تدبیر و رائے و سیاست و اصلاح ملک و حفاظت سلطنت و قیام خدمت کے متعلق کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔

(ب) مامون کے عیش و طرب کے جلسوں میں گو عیاشانہ رنگینی پائی جاتی ہے مگر انصاف یہ ہے کہ یہ جلسے علمی مذاق سے بالکل خالی بھی نہ تھے۔ اس قسم کے جلسے جو شاعرانہ جذبات کو پورے جوش کے ساتھ ابھار دیتے ہیں۔ اگر متانت اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو لٹریچر پر نہایت وسیع اور عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ مامون خود فن سخن اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ اہل مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے۔ بات بات پر شاعرانہ لطیفے پیدا ہوتے۔ کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی۔ کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعر کی طبع آز[illegible] کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزم عیش آراستہ تھی۔ بادۂ و جام کا دور تھا۔ بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس پہنے، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زناریں باندھے ہاتھوں میں گلدستے لئے ہوئے بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا۔ بیساختہ چند اشعار زبان سے نکلے۔ اور احمد بن صدقہ ایک مُغنّی کو بلا کر شعروں کے گانے کی فرمایش کی۔ احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنے کھڑی ہوگئیں۔ ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست

کرنے میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ دونوں میں بحث ہو گئی اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے قدموں پر تین ہزار اشرفیاں نثار کی جاویں۔ مامون کا چچا ابراہیم جس کے ادعائے نغمہ دانی کا حال پہلے حصہ میں گذر چکا ہے۔ اور جو موسیقی کا بڑا استاد اور اس فن میں اسحاق موصلی کی ہمسری کا دعویٰ رکھتا تھا۔ ایک دن بزم عیش میں حاضر تھا۔ مامون کے سامنے بیس باندیاں جو رودنواز تھیں ایک ساتھ عود بجا رہی تھیں۔ اسحاق بھی حاضر ہوا۔ اور آنے کے ساتھ ہی ٹھٹک سا گیا۔

مامون۔ "کیوں اسحاق، کوئی بے معمول آواز کان میں آ رہی ہے؟"

اسحاق۔ "حضور ہاں!"

مامون۔ ابراہیم کی طرف مخاطب ہو کر "تم اس سوال کا جواب کیا دیتے ہو؟"

ابراہیم۔ "نہیں!"

مامون نے اسحاق کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا "اب میں بہ تعیین بتا دیتا ہوں کہ اس صف میں کس تار پر غلط مضراب پڑ رہی ہے" ابراہیم نے اس طرف کان لگا کر سنا مگر تمیز نہ ہوئی۔ اسحاق نے ایک خاص کنیز کی طرف اشارہ کیا کہ وہ تنہا بجائے۔ وہ جب بجا رہی تھی تب ابراہیم سمجھ گیا اور اپنی ناواقفیت پر نادم ہوا۔

مامون نے کہا "ابراہیم! بیس سازوں کی یک رنگ و ہم آہنگ گونج میں ایک غلط صدا جس کے کان میں کھٹک جائے اور اس کو بہ تعیین بتا دے تم اس کی ہمسری کا کیونکر دعویٰ کر سکتے ہو؟"

شاید یہ پہلا دن تھا کہ ابراہیم نے صریح لفظوں میں اسحاق کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔

(۲) **سیرۃ النعمان**: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہے۔

۵ اردسمبر ۱۸۹۳ء کو علامہ شبلی نے علی گڈھ میں اس کو ختم کیا۔ تقریب تصنیف پہلے بیان ہوئی ہے۔ اس کے بھی دو حصے کیے ہیں۔ پہلے میں امام صاحب کے ذاتی حالات وفضائل ہیں۔ اور دوسرے میں ان کے اصول فقہ اور علم کلام سے بحث کی ہے۔ یہی حصہ علامہ کا اصلی کارنامہ ہے۔ یہ مسائل اس ترتیب سے اردو کیا فارسی وعربی میں بھی نہ تھے۔ ترتیب وتالیف میں علامہ کی جدت اور مسائل کے فیصلہ وحکم میں ان کا اجتہاد شامل ہے۔ یہی اجتہاد علامہ اور علما کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا تھا۔

دونوں حصوں سے ایک ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

(الف) **ذہانت وطباعی** ۔ امام صاحب کی ذہانت اور طباعی نمونۂ ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ ان کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے۔ تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ ذہبی نے عبر فی اخبار من غبر میں ان کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ تاہم اس فقرے کو نہ چھوڑ سکے کہ "کان من اذکیاء بنی آدم" یعنی وہ دنیا میں جو نہایت ذکی گذرے ہیں، امام ابوحنیفہ ان میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن اس تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ کتنے موقعوں پر ان کے ہم عصر جو معلومات کے لحاظ سے ان کے ہم سر تھے موجود ہوتے تھے ان کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا تھا اس سے مطابق کرکے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناخوش ہوا اور قسم کھا کر کہا "جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں بھی تجھ سے کبھی نہ بولوں گا" عورت تند مزاج تھی اس نے بھی قسم کھائی اور وہی الفاظ دہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت تو غصہ میں کچھ نہ سوجھا۔ مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو بہت افسوس ہوا۔ شوہر

امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی۔ سفیان نے کہا ''قسم کا کفارہ دینا ہوگا اس میں کوئی چارہ نہیں''۔ وہ مایوس ہوکر لوٹا اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ خدا آپ کوئی تدبیر بتاتے۔ امام صاحب نے فرمایا جو شوق سے باتیں کرو۔ کسی پر کفارہ نہیں۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے جاکر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتادیا کرتے ہیں۔ امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ۔ اس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے جو پہلے کہا تھا اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا کیونکر؟ فرمایا ''جب عورت نے شوہر کو مخاطب کرکے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہوچکی، پھر قسم کہاں باقی رہی''۔ سفیان نے کہا حقیقت میں آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں خیال تک نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ اپنے دو بیٹوں کی شادی کی۔ دلیمہ کی دعوت میں تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعۃً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہوگیا! لوگوں نے کہا ''خیر ہے؟'' بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانہ میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہوگا۔ مسعر بن کدام حضرت امام ابوحنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ شوہر تو دونوں میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ

جا کر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمہارے ساتھ رہی اوہی تمہارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے۔ دونوں نے کہا ہاں۔ امام صاحب نے کہا تو تم اپنی اپنی بیوی کو جن سے تمہارا نکاح بندھا تھا طلاق دیدو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی۔ سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا۔ کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رکھنا غیرت و حمیت کے خلاف ہوگا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کر لیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد نہ پیدا ہوگا جو ازدواج کا مقصود اصلی ہے۔ اور اس کے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے۔ کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں ابوحنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا۔ دیکھا تو بڑا ہجوم ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے۔ اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھ کر کہا "یا ابا حنیفہ (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو پہچانا) امام ابوحنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دیدیتا ہے۔ لونڈی خرید دیتا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمائیے کیا تدبیر کروں" امام ابوحنیفہ نے برجستہ کہا کہ "تم اس کو ساتھ لیکر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ۔ جو لونڈی پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ اسے آزاد کرے گا تو نہیں کر سکتا۔

کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔ طلاق دیگا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں تمہاری لونڈی نہیں گئی نہیں۔ سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب [illegible] حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا امام ابوحنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع بھی حاضر تھا۔ منصور سے کہا کہ حضور! یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار عبداللہ بن عباس کی مخالفت کرتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد ان شاء اللہ کہہ دے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا۔ اور قسم کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا۔ ابوحنیفہ اس کے خلاف فتوی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا۔ ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔ امام صاحب نے کہا امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔ منصور نے کہا کیونکر؟ امام صاحب نے کہا ان کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ سے رو برو بیعت خلافت کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں۔ گھر جا کر ان شاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں۔ جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔ منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ تم ابوحنیفہ کو نہ چھیڑا کرو۔ ان پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا۔ امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا کہ آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے۔ فرمایا۔ یہ تو تمہارا ارادہ تھا میں نے صرف مدافعت کی۔

اب ہم ان عام حالات کے بعد امام کی خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

ان سب سے مقدم اور نمایاں تر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے۔ وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں

شروع ہی سے دو فرقے قایم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبّدی
احکام ہیں یعنی ان میں کوئی اسرار و مصلحت نہیں مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف
اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔ اور خیرات و
زکوٰۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے ورنہ فی نفسہ
یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں۔ محدثین کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے۔
درحقیقت یہ اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعری نے جو سنیوں میں علم کلام کے بانی ہیں
علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔
البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن در
حقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں
پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کئے ہیں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔
لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا۔ تمام مہمات
مسائل کی مصلحت بصراحت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں
قرآن کا طرز استدلال عموماً انہی اصول کے مطابق ہے۔ نماز کی مصلحت خدا
نے خود بتائی کہ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ روزہ کی فرضیت کے ساتھ
ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔
اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور اشارے
موجود ہیں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول ان کے مسائل فقہ میں عموماً
ملحوظ ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور
کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے اس بحث میں

ایک کتاب لکھی ہے جو "شرح معانی الآثار" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق نظر سے ثابت کیا جائے۔ محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے۔ اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے لیکن مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث اور طریق نظر دونوں کے موافق ہے۔ امام محمد نے بھی "کتاب الحجج" میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود ہو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ اس دعوی سے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں۔ لیکن وہ نکتہ چینیاں کرتے ہیں ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے کہ امام شافعی کا مذہب امام ابوحنیفہ سے زیادہ صحیح ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے اور یہی اس کی صحت کی دلیل ہے کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں جن میں عقل و رائے کو دخل نہیں۔

بخلاف اور ائمہ عصروں کے امام ابوحنیفہ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا۔ دوسرے ائمہ جنھوں نے فقہ کی تدوین و ترتیب کی ان کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی جس کی ممارست نے ان کی قوت فکر اور حدت نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ متکلمین زیادہ تر جن مسائل کے سر کرتے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے۔ اس لئے امام صاحب کو بھی ان کے مقابلہ

میں انہیں اصول سے کام لینا پڑتا تھا۔ اور متنازع فیہ مسئلوں میں امام صاحب نے اسرار کی خصوصیتیں دکھانی پڑتی تھیں۔ اس غور و تدقیق، مشق و ممارست سے ان کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اس فن میں بھی وہی جستجو رہی۔ حنفی فقہ کے مسائل کو دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں۔ امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہئے، تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے یعنی خضوع، اظہار تعبد، اقرار عظمت الٰہی، دعا اور اس کے حاصل ہونے میں افعال کو کس نسبت سے دخل ہے۔ ان افعال کے مراتب مختلف ہیں بعض لازمی اور ضروری ہیں۔ کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقہ ادا میں ایک حسن و خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی۔ ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے۔ اور ان کو سنت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرض و

واجب و سنت کی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے اس لئے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز پر توجہ کی اور استنباط اجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کئے۔ اور ان کے جدا جدا نام رکھے۔ امام ابوحنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس باب میں ان کو اور ائمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا درحقیقت ان کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی، کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے۔ اس لئے اس قدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلم رہا کہ نیت، تکبیر، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی۔ لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ان ارکان کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دے دیا۔ حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہ ان کی فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سوا اور الفاظ میں بھی ادا ہوسکتی ہے۔ جو اس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم۔ اللہ اجل) امام شافعی کے نزدیک نہیں ہوسکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہوجاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہوجاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو شخص عربی زبان میں قرآن پڑھنے سے معذور

حنفیوں کا بھی فتویٰ اور عمل یہی ہے کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب (بغیر سورۂ فاتحہ نماز نہیں ہوتی) علامہ شبلی کو یہ بات لکھنی چاہیے تھی۔

ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہو سکتی۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ امام ابو حنیفہ یا کسی مجتہد نے صرف قیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات و اشارات سے استدلال کیا ہے چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابو حنیفہ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں۔ اسی طرح عقلی وجوہ بھی ان کی صحت کے شاہد ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار و مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

---

۵ امام محمد نے جامع صغیر میں جو روایت کی ہے اس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین نے امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن کی حقیقت و مفہوم میں نظم کو داخل نہیں سمجھتے یعنی ان کے نزدیک صرف قرآن کے معانی پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بے شبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فقہائے حنفیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا۔

(۳) **الفاروق** فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب خلیفہ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت ہے۔ یہ نامور فرمانرواؤں اسلام کے سلسلے کی پہلی کتاب تھی لیکن المامون کے بعد لکھی گئی۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۸ء کو علامہ نے مستقل طور پر الفاروق کی تالیف شروع کی اور کشمیر میں ماہ جولائی ۱۸۹۸ء کو بقول مرتبہ پورے بارہ برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قوم کے ماتھے پر چمکنے کے لئے آ موجود ہوئی۔ اس زمانے

میں مصنف سخت علیل تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں اس کی آخری سطریں لکھیں۔
علامہ کی تمام سیرت کی کتابوں کے دو دو حصے ہیں۔ ایک عام حالات کا اور دوسرا
کمالاتِ خصوصی کا۔ اس میں بھی ایسا ہی ہے۔ پہلے حصے میں حضرت عمرؓ کی زندگی
کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات، دوسرے میں ملکی انتظامات اور ذاتی کمالات۔
علامہ لکھتے ہیں کہ ”یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کا تماشا گاہ ہے۔“ اور حقیقت یہ ہے
کہ باوجود اعتراضات کے، جن کا ذکر کیا گیا، الفاروق ایسی جامع و مکمل کتاب تالیف
ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا۔ اس کے بعد اردو میں حضرت عمرؓ
فاروق کی تین چار ضخیم اور متعدد مختصر سوانح عمریاں لکھی گئیں اور وہ سب علامہ شبلی کی
خوشہ چینیاں ہیں۔ ایک دو کتابیں عمدہ لکھی گئیں، اور اچھی لکھیں، لیکن تحقیق کا گر علامہ
شبلی ہی کا سکھایا ہوا تھا۔ اسلوب بیان کی خوبی میں کسی کی تصنیف اس کو نہیں پہنچی۔
خود علامہ کی ادبیت ”الفاروق“ میں پہلی سب کتابوں سے بہتر ہے۔

”الفاروق“ علی گڑھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور حیدرآباد
کی ملازمت کے زمانے میں ختم ہوئی۔ اور ”سلسلۂ آصفیہ“ (قائم کردۂ مولوی سید علی بلگرامی
بہ سرپرستی سر وقار الامرا مدار المہام دولتِ آصفیہ) کی ایک کڑی قرار پائی۔ دونوں حصوں کے
نمونے یہ ہیں:۔

(الف) یہ حصہ خاص کر بیانِ رزم میں علامہ کا زورِ قلم دکھانے کے لئے انتخاب کیا
گیا ہے۔ عراقِ عرب کے مشہور شہر قادسیہ پر مسلمانوں نے ایرانیوں سے چند بار جنگ کی۔
اس کا ایک معرکہ یہ تھا:۔

یہ معرکہ یومِ عماس کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قعقاع نے یہ تدبیر کی
کہ رات کے وقت چند رسالوں اور پیدل فوجوں کو حکم دیا کہ پڑاؤ سے دور شام کی
طرف نکل جائیں۔ پو پھٹے سو سو سوار میدانِ جنگ کی طرف گھوڑے اڑاتے ہوئے

آئیں اور اکہرے رسالے اسی طرح برابر آتے جائیں چنانچہ صبح ہوتے ہوتے پہلا رسالہ پہنچا۔ تمام فوج نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور غل پڑ گیا کہ نئی امدادی فوجیں آ گئیں۔ ساتھ ہی حملہ ہوا۔ حسن اتفاق یہ کہ ہشام جن کو ابو عبیدہ نے شام سے مدد کے لئے بھیجا تھا۔ عین موقع پر سات سو سواروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ **یزدجرد** کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں اور برابر فوجیں بھیجتا تھا۔ ہشام نے فوج کی طرف خطاب کیا اور کہا "تمہارے بھائیوں نے شام کو فتح کر لیا۔ فارس کی فتح کا جو خدا کی طرف سے وعدہ ہوا ہے وہ تمہارے ہاتھ سے پورا ہوگا"۔ معمول کے موافق جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ ایرانیوں کی فوج سے ایک پہلوان شیر کی طرح ڈکارتا ہوا میدان میں آیا۔ اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر لوگ اس کے مقابلہ سے جی چراتے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق سے وہ ایک کمزور سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ایرانیوں نے تجربہ اٹھا کر ہاتھیوں کے دائیں بائیں پیدل فوجیں قائم کر دی تھیں۔ عمرو معدیکرب نے رفیقوں سے کہا کہ میں مقابل کے ہاتھی پر حملہ کرتا ہوں تم ساتھ رہنا۔ ورنہ عمرو معدیکرب مارا گیا تو پھر معدیکرب پیدا نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر تلوار میان سے گھسیٹ لی اور ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ لیکن پیدل فوجیں جو دائیں بائیں تھیں دفعۃً ان پر ٹوٹ پڑیں اور اس قدر گرد اٹھی کہ یہ نظر سے چھپ گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی رکاب کی فوج حملہ آور ہوئی اور بڑے معرکے کے بعد دشمن پیچھے ہٹے۔ عمرو معدیکرب کا یہ حال تھا کہ تمام جسم خاک سے اَٹا ہوا تھا۔ بدن پر جا بجا برچھیوں کے زخم تھے۔ تاہم تلوار قبضے میں تھی اور ہاتھ چلتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں ایک ایرانی سوار برابر سے نکلا۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی دم پکڑ لی۔ ایرانی نے بار بار مہمیز کیا لیکن گھوڑا جگہ سے نہ ہل سکا آخر سوار اتر کر بھاگ نکلا اور یہ اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھے۔

سعد نے یہ دیکھ کر کہ ہاتھی جس طرف رخ کرتے ہیں دل کا دل ہٹ جاتا ہے، ضخم و سلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع۔ عاصم۔ حمال۔ ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمہارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیج دئے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کر لیں۔ پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر ابیض سفید کی طرف بڑھے۔ عاصم بھی ساتھ تھے۔ دونوں نے یک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لیکر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا۔ وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا۔

اب بہادروں کو حوصلہ آزمائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکے کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یک جا کیا اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ۔ ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز۔ سعد نے حکم دیا تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کئے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اپنے رکاب کی فوج لیکر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی اصول کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل

تھی۔ تمام لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعد کے منہ سے بے اختیار
نکلا کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَانْصُرْہُ یعنی اے خدا قعقاع کو معاف کرنا اور اس کا
مددگار رہنا۔ قعقاع کو دیکھ کر بنو اسد اور بنو اسد کی دیکھا دیکھی۔ نخع۔ بجیلہ۔ کندہ
سب ٹوٹ پڑے۔ سعد ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اس کو معاف
کرنا اور یاور رہنا۔ اول اول سواروں کے رسالے نے حملہ کیا۔ لیکن ایرانی فوجیں
جو دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں۔ اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے
نہ بڑھ سکے۔ یہ دیکھ کر سب گھوڑوں پر سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔

ایرانیوں کا ایک رسالہ سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ قبیلۂ جعفہ نے اس
پر حملہ کیا۔ لیکن تلواریں زرہوں پر اُچٹ اُچٹ کر رہ گئیں۔ سردار قبیلہ نے للکارا۔
سب نے کہا زرہوں پر تلواریں کام نہیں دیتیں۔ اس نے غصے میں آ کر ایک
ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر کو توڑ کر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی
اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالہ کا رسالہ برباد ہو گیا۔

تمام رات ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔ لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے
اور نیند کے خمار میں تھے۔ دونوں بیکار ہوئے جاتے تھے۔ اس پر بھی جب فتح اور
شکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سرداران قبائل میں سے چند نامور بہادر
انتخاب کئے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رخ کیا۔ ساتھ ہی قیس، اشعث
عمرو معدی کرب، ابن ذی البردین نے جو اپنے قبیلے کے سردار تھے۔
ساتھیوں کو للکار کر کہا "دیکھو! یہ لوگ خدا کی راہ میں تم سے آگے نکلنے نہ پائیں"
اور دوسرے سرداروں نے بھی جو بڑے سحر زبان آور بھی تھے اپنے قبیلوں کے
سامنے کھڑے ہو کر اس جوش سے تقریریں کیں کہ تمام لشکر میں آگ لگ گئی۔
سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں۔

اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیرزان و ہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ چلا۔ ہلال نام ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آ گئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کودے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی اور تخت پر چڑھ کر پکارے کہ "رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا"۔ ایرانیوں نے دیکھا کہ سپہ سالار تخت پر نہیں ہے تو تمام فوج میں بھاگڑ پڑ گئی۔ مسلمانوں نے دور تک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔

افسوس کہ اس واقعہ کو ہمارے ملک الشعراء نے قومی جوش کے اثر سے بالکل غلط لکھا ہے۔

برآمد خروشے بکردار رعد　　زیک سوے رستم زیک سوے سعد
چو دیدار رستم بخون تیرہ گشت　　جوانمرد تازی بر او چیرہ گشت

ہمارے شاعر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سعد اس واقعہ میں سرے سے شریک ہی نہ تھے۔

ہمارے ملک الشعراء یعنی **فردوسی** پر قومی جوش کا نشہ کچھ یہیں نہیں چڑھا بلکہ ہر ایسے موقع پر چڑھ جاتا ہے جہاں ایرانیوں اور عربوں کا مقابلہ ہو۔ یہ شعر مشہور ہی ہیں۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسیدست کار
کہ تاج کیاں را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

شاہنامہ لکھتے میں فردوسی کو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ وہ مجوسی الاصل

ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ مسلمان ہے۔

علامہ شبلی کے اس بیانِ معرکہ کے ساتھ علامہ آزاد کا وہ بیانِ جنگ پھر پڑھ کر دیکھا جائے تو صفحات ۴۵۹ تا ۴۶۴ پر "دربارِ اکبری" سے اقتباس کیا گیا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے رنگ میں خوب لکھا ہے۔ ان کے استعارے ایک لطف پیدا کر رہے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آزاد "داستان" بیان کر رہے ہیں اور شبلی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

اب انتظامِ فاروقی کے "صیغۂ محاصل" کا مفصل تذکرہ لکھو سے۔ خراج لگان، بندوبست کا حال بیان کر کے لکھتے ہیں:-

قانونِ مالگزاری میں حضرت عمرؓ کی اصلاحات

البتہ یہ تحقیق کی نگاہ اس بات پر پڑ سکتی ہے کہ اس صیغے میں فتوحاتِ فاروقی کی خاص ایجادات اور اصلاحیں کی ہیں اور ہم اسی خاص پہلو پر نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑا انقلاب جو حضرت عمرؓ نے اس صیغے میں کیا اور جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوشحالی دفعۃً نہایت ترقی کر گئی یہ تھا کہ زمینداری اور ملکیتِ زمین کا جو قدیم قانون تھا اور بالکل جابرانہ تھا مٹا دیا۔ رومیوں نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر کچھ افسرانِ فوج اور کچھ اراکینِ دربار کو دے دیں۔ کچھ شاہی جاگیر قرار پائیں۔ کچھ کلیسا اور چرچ پر وقف کر دی گئیں۔ اصلی باشندوں کے ہاتھ میں ایک چپہ زمین بھی نہیں رہی۔ وہ صرف کاشتکاری کا حق رکھتے تھے اور اگر مالکِ زمین ان کی کاشتکاری کی زمین کسی کے ہاتھ منتقل کرتا تھا تو زمین کے ساتھ کاشتکار بھی منتقل ہو جاتے تھے۔ آخر

اخیر میں باشندوں کو بھی کچھ زمینداریاں ملنے لگیں لیکن زمینداری کی حفاظت اور اس سے متمتع ہونے کے لئے رومی زمینداروں سے اعانت لینی پڑتی تھی۔ اس بہانے سے زمیندار خود اس زمین پر متصرف ہو جاتے تھے اور وہ غریب کاشتکار کا کاشتکار رہ جاتا تھا۔ یہ طریقہ کچھ رومی سلطنت کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام دنیا میں قریب قریب یہی طریقہ جاری تھا کہ زمین کا بہت بڑا حصہ یا افسران فوج یا ارکان دولت کی جاگیر میں دے دیا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ملک پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی اس ظالمانہ قانون کو مٹا دیا۔ رومی تو اکثر ملک کے مفتوح ہوتے ہی نکل گئے۔ جو رہ گئے ان کے قبضے سے بھی زمین نکال لی گئی۔ حضرت عمرؓ نے ان تمام اراضیات کو جو شاہی جاگیر تھیں یا جن پر رومی افسر قابض تھے۔ باشندگان ملک کے حوالے کر دیا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمان افسروں یا فوجی سرداروں کو عنایت کی جاتیں قاعدہ بنا دیا کہ مسلمان کسی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہو سکتے۔ یعنی مالکان اراضی کو قیمت دے کر خریدنا چاہیں تو خرید بھی نہیں سکتے۔ یہ قاعدہ ایک مدت تک جاری رہا چنانچہ لیث بن سعد نے مصر میں کچھ زمین مول لی تھی تو بڑے بڑے پیشوایان مذہب مثلاً امام مالک، نافع بن یزید، ابن لہیعہ نے ان پر سخت اعتراض کیا۔ حضرت عمرؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اہل عرب کو جو ان ممالک میں پھیل گئے تھے زراعت کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ تمام فوجی افسروں کے نام احکام بھیج دیے کہ لوگوں کے روزینے مقرر کر دیے گئے ہیں اس لئے کوئی شخص زراعت نہ کرنے پائے۔ یہ حکم اس قدر سختی سے برتا گیا تھا کہ شریک غطفی ایک شخص نے مصر میں کچھ زراعت کر لی تو حضرت عمرؓ نے اس کو بلا کر سخت مواخذہ کیا اور فرمایا کہ میں تجھ کو ایسی سزا دوں گا کہ اوروں کو عبرت ہو۔

ان قاعدوں سے ایک طرف تو حضرت عمرؓ نے اس انصاف کا نمونہ قائم کیا جس کی نظیر دنیا میں کہیں موجود نہ تھی۔ کیونکہ کسی فاتح قوم نے مفتوحین کے ساتھ کبھی ایسی رعایت نہیں برتی تھی۔ دوسری طرف زراعت اور آبادی کو اس سے نہایت ترقی ہوئی۔ اس لئے کہ اصلی باشندے جو مدت سے ان کاموں میں مہارت رکھتے تھے عرب کے خانہ بدوش بدو ان کی برابری نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس تدبیر نے فتوحات کی وسعت میں بڑا کام دیا۔ فرانس کے ایک نہایت لائق مصنف نے لکھا ہے کہ "یہ بات مسلّم ہے کہ اسلام کی فتوحات میں خراج اور مال گزاری کے معاملے کو بہت دخل ہے۔ رومن سلطنت میں باشندگان ملک کو جو سخت خراج ادا کرنا پڑتا تھا اس نے مسلمانوں کی فتوحات کو نہایت تیزی سے بڑھایا۔ مسلمانوں کے حملوں کا جو مقابلہ کیا گیا وہ اہل ملک کی طرف سے نہ تھا بلکہ حکومت کی طرف سے تھا۔ مصر میں قبطی کاشتکاروں نے یونانیوں کے برخلاف مسلمانوں کو مدد دی۔ دمشق اور حمص میں عیسائی باشندوں نے ہرقل کی فوج کے مقابلے میں شہر پناہ کے دروازے بند کر دئے۔ اور مسلمانوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہاری حکومت کو بمقابلہ ہم مذہب رومیوں کے بہت پسند کرتے ہیں۔"

یہ نہیں خیال کرنا چاہئے کہ حضرت عمرؓ نے غیر قوموں کے ساتھ انصاف کرنے میں اپنی قوم کی حق تلفی کی یعنی ان کو زراعت اور فلاحت سے روک دیا۔ درحقیقت اس سے حضرت عمرؓ کی بڑی انجام بینی کا ثبوت ملتا ہے۔ عرب کے اصلی جوہر یعنی دلیری، بہادری، جفاکشی، ہمت، عزم اسی وقت تک قائم رہے جب تک وہ کاشتکاری اور زمینداری سے الگ رہے۔ جس دن انھوں نے زمین کو ہاتھ لگایا اسی دن یہ تمام اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کی حیثیتِ اجتہاد اور محدث و فقیہ ہونا

حدیث و فقہ کا فن درحقیقت تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ صحابہ میں اور لوگ بھی محدث و فقیہ تھے چنانچہ ان کی تعداد ۲۰ سے متجاوز بیان کی گئی ہے۔ لیکن فن کی ابتدا حضرت عمرؓ سے ہوئی اور فن کے اصول و قواعد انہی نے قائم کئے۔

حدیث کے متعلق پہلا کام جو حضرت عمرؓ نے کیا یہ تھا کہ روایتوں کی تفحص و تلاش پر توجہ کی۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں احادیث کے استقصاء کا خیال نہیں پیدا ہوا تھا۔ جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا خود آنحضرتؐ سے دریافت کر لیتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک شخص کو فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں۔ اس سے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی اور احادیث کے استقراء کا رستہ کھلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں چونکہ نہایت کثرت سے واقعات پیش آئے۔ کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نومسلموں کی کثرت نے سینکڑوں نئے مسائل پیدا کر دیے تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ انہوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرتؐ کے اقوال کے موافق طے کئے جائیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں جس میں اکثر صحابہ موجود ہوتے تھے، پکار کر کہتے کہ اس مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟ مثلاً جنازہ، غسل جنابت، جزیہ مجوس اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جن کی نسبت کتب احادیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجمع صحابہ سے استفسار کر کے حدیث نبوی کا پتہ لگایا......

یہ تمام بحث تدوین مسائل کی حیثیت سے تھی۔ لیکن فن فقہ کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصلی کارنامہ اور چیز ہے۔ انہوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ جزئیات کی تدوین کی بلکہ مسائل کی تفریع و استنباط کے اصول اور ضوابط قرار دیے جس کو آج کل اصول فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرت سے جو افعال و اقوال منقول ہیں وہ کلیۃً مسائل کا ماخذ ہوسکتے ہیں یا ان میں کوئی تفریق ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس بحث پر حجۃ اللہ البالغہ میں ایک نہایت مفید مضمون لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت سے جو افعال اور اقوال مروی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔ یعنی پیغمبر جو تم کو دے وہ لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔ دوسری وہ جن کو منصب رسالت سے تعلق نہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق خود آنحضرت نے ارشاد فرمایا۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من رایی فانما انا بشر

میں بھی آدمی ہوں اس لیے جب میں دین کی بابت تم کو حکم دوں تو اس کو لو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ آنحضرت نے طب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا یا جو افعال آنحضرت سے عادۃً سرزد ہوئے نہ عبادۃً یا اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً یا جو باتیں آنحضرت نے اس طرح بیان کیں جس طرح عام لوگ بیان کرتے ہیں مثلاً ام زرع کی حدیث یا خرافہ کی حدیث جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے لحاظ سے فرمائیں مثلاً لشکرکشی اور اسی قسم کے اور بہت سے احکام یہ سب اسی دوسری

قسم میں داخل ہیں۔ ارشاد و ولی اللہ صاحب نے احادیث کے مراتب میں جو فرق بتایا
اور جس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا، اس تفریق مراتب کے موجد در اصل
حضرت عمرؓ ہیں۔ کتب سیر و احادیث میں تم نے اکثر پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایسے
موقعے پیش آئے کہ جناب رسول اللہ صلعم نے کوئی کام کرنا چاہا یا کوئی بات ارشاد فرمائی
تو حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ جب
آنحضرتؐ نے عبداللہ بن ابی کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہی تو حضرت عمرؓ نے کہا
کہ آپ منافق کے جنازے پر نماز پڑھتے ہیں۔ قیدیان بدر کے معاملے میں ان کی
رائے بالکل آنحضرتؐ کی تجویز سے الگ تھی۔ صلح حدیبیہ میں انہوں نے آنحضرتؐ
کی خدمت میں عرض کی کہ اس طرح دب کر کیوں صلح کی جائے۔ ان تمام باتوں سے
تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت عمرؓ ان باتوں کو منصب نبوت سے الگ سمجھتے
تھے ورنہ اگر باوجود اس کے علم کے کہ یہ باتیں منصب رسالت سے تعلق رکھتی
تھیں ان میں دخل دیتے تو بڑے گستاخ ٹھہرتے اور ہم ان کو اسلام کے دائرے
سے بھی باہر سمجھتے۔

اس فرق مراتب کے اصول پر بہت سی باتیں جو مذہب سے تعلق
نہیں رکھتی تھیں یعنی دنیوی امور پر عمل کیا مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے زمانے تک امہات اولاد
یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد پیدا ہو جائے برابر خریدی و بیچی جاتی تھیں۔
حضرت عمرؓ نے اس کو بالکل روک دیا۔ آنحضرتؐ نے جنگ تبوک میں جزیہ کی تعداد
فی کس ایک دینار مقرر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے مختلف قوموں پر مختلف شرحیں مقرر
کیں۔ آنحضرتؐ کے عہد میں شراب کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے
اسی کوڑے مقرر کئے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں آنحضرتؐ کے قول و فعل اگر شرعی

حیثیت سے ہوتے تو حضرت عمرؓ کی کیا مجال تھی کہ ان میں کمی بیشی کر سکتے۔ اور خدانخواستہ وہ ایسا کرنا چاہتے تو صحابہ کا گروہ ایک لمحہ کے لئے بھی مسندِ خلافت پر ان کا بیٹھنا کب گوارا کر سکتا تھا۔

حضرت عمرؓ کو اس امتیازِ مراتب کی جرأت اس وجہ سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کے متعدد احکام میں انھوں نے دخل دیا تو آنحضرتؐ نے اس پر ناپسندیدگی نہیں ظاہر کی بلکہ متعدد معاملات میں حضرت عمرؓ کی رائے کو اختیار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو خود وحیِ الٰہی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ قیدیانِ بدر، حجابِ ازواجِ مطہرات، نمازِ برجنازۂ منافق، ان تمام معاملات میں وحی جو آئی وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آئی۔

اس تفریق اور تمیز کی وجہ سے عقائد اور مسائل پر بہت اثر پڑا۔ کیونکہ جو چیزیں آنحضرتؐ کے ارشادات منصبِ رسالت کی حیثیت سے نہ تھے ان میں اس بات کو وسعت باقی رہی کہ زمانے اور حالات موجودہ کے لحاظ سے ترمیم و فسخ ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ معاملات میں حضرت عمرؓ نے اور دلالت کی شہادتوں سے بہت سے قواعد وضع کئے جو آج حنفی فقہ میں بکثرت موجود ہیں۔ بخلاف اس کے امام شافعی کو یہاں تک تعصب ہے کہ ترتیبِ فوج، تعیینِ شعار، محاصل وغیرہ کے متعلق بھی وہ آنحضرتؐ کے اقوال کو تشریعی قرار دیتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے فعل کی نسبت کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے سامنے کسی کے قول و فعل کی کچھ اصل نہیں۔

(۴) **سفرنامہ روم و مصر و شام** — الفاروق کے بعد شائع ہوا۔ یہ کوئی علمی و فنی تصنیف نہیں، اس لئے مولانا کی تصانیف میں خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں۔ سب سے پہلے اس حیثیت سے کہ بقولِ مصنف "یہ سفر بالکل سیاحانہ سفر تھا" اور اس [illegible]

ذریعہ کا شاید پہلے ہندوستانی کا سفر تھا۔ یادگار چیز ہے۔ مصنف دیباچے میں لکھتے ہیں:

"علاوہ ان جزئی دلچسپ واقعات کے جو سفرنامہ بیان میں آگئے ہیں، قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ کے متعلق واقعات ذیل یعنی شہر کی عام اجمالی حالت، قابل دید مقامات، مشہور عمارات، سلسلہ تعلیم، دارالعلوم، مدارس، چھاپہ خانے اور طلبہ کی تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے، تجارت، اخبار و رسالے، مشہور پیشے اور ارباب کمال کی ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔"

علامہ شبلی نے رمضان ۱۳۰۹ھ میں ۲۰ اپریل ۱۸۹۲ء کو سفر شروع کیا تھا۔ ... مہینے میں واپس آئے۔ راستے میں کچھ دور تک علی گڑھ کالج کے پروفیسر آرنلڈ بھی رفیق سفر رہے۔ نمونے کے طور پر کسی عمارت، دارالعلوم، کتب خانہ کی سیر کے تمام مراتب میں جگہ جگہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر صرف وہ باتیں لکھتے ہیں جن کو مصنف نے جزئی دلچسپ واقعات قرار دیا ہے اور جو سفرنامہ بیان میں آگئے ہیں:

"چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کئے جاتے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تحریر کیا ہے اس کی تصدیق بھی کی ہے۔ میں نے دو تین روز تک پرندے کا گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے کہ اس جہاز پر پرند جانور ذبح کئے جاتے ہیں، گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے۔ چونکہ تنہا ان کی شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور اس کی تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا۔ وہ ذبح کرنے کے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا، صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا۔ اگرچہ حنفیوں کے ہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لئے میں شافعی بن گیا جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔"

"عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہو گئے تھے اس لئے ہم بڑے
لطف سے سفر کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا جس
نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو سخت پریشان رکھا۔ [illegible] کی صبح کو میں سوتے سے
اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور
جہاز کے ملازم تیزی سے پھر رہے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔
انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا اور جہاز بہت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔
ہوا سخت تھی۔ رفتہ رفتہ ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور
کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر [illegible] کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے
ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے؟
بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کچھ مضطرب نہیں؟ بلکہ یہ
کتاب دیکھنے میں مصروف ہیں؟ کہا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت
اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل خلاف عقل
ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد
انجن درست ہو کر بدستور چلنے لگا۔"

پورٹ سعید پر سفر کی حالت میں جو تغیر ہوا وہ یہ تھا کہ یہیں سے پورٹ سعید تک
جہاز پر [illegible] نظر آئے اور جو وقت میں [illegible]
سب جہاز [illegible] سے بڑے شوق سے ان [illegible]
دو مختلف نتیجے ہوئے جس شخص کے پاس [illegible] اس نے [illegible]
[illegible] کی طرف دیکھو اور [illegible] گفتگو [illegible] پر سخت تعجب [illegible]
[illegible] داڑھی [illegible] نہیں تھیں [illegible]
بھی مطلقاً [illegible] میں [illegible] صاحب تھے رخصت لیکر [illegible]

آئے تھے اور اب قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ وہ کبھی دل بہلانے کے لئے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ہم فنی کے ذریعے سے تعارف پیدا کروں۔ چنانچہ ان کے پاس گیا اور دخل در معقولات کے طور پر ادبی موضوعات پر بات چیت شروع کی۔ وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ میں اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔ لیکن مجھ کو یقین تھا کہ اس واقعہ کا منشا ترکوں میں عجیب ہے۔ اتفاقاً ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا۔ میں نے کہا "مسلم" بلکہ ولله الحمد اهل السنة یعنی میں سنی ہوں۔ انہوں نے کہا ہم بھی یہی تو پوچھنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی اور اس وجہ سے تمام عرب مجھ کو مجوسی سمجھتے تھے۔ یہ حجاب جس وقت اٹھ گیا میں نے ان لوگوں کے دل سے اس بدگمانی کو رفع کر دیا اور پھر وہ ایسے شیدا ہو گئے کہ ایک دم کو مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے تھے۔"

"قسطنطنیہ کا ذکر ہے، ایک دن شیخ محمد ظہیر ان جن کے ہاں ایک مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقادر سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ اور اتفاق سے رسالہ **اسکات المعتدی** جو میری تازہ تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں بھی دیکھا تھا۔ اور انہوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا "رحمۃ اللہ علیہ"۔ شیخ محمد ظہیر کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اور نہایت لطف سے کہا کہ مجھ کو اس بات سے کہ ایک ہندی کی تصنیف ایسی ہو اور دور دور لوگ اس کو قدر کی آنکھوں سے دیکھیں، نہایت مسرت ہوئی۔ اور سفر کی حالت میں میرا یہ ذریعہ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔"

"قسطنطنیہ کے احباب کا ذکر کرتے ہیں، شام کو ہم تین چار آدمی ایک

قہوہ خانے میں جو عین لب دریا ہے، اکثر بیٹھا کرتے تھے اور عجب لطف و مزہ کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے۔ فواد کو گانا آتا ہے۔ مزے میں آکر عربی گیت گایا کرتے۔ ایک دن مجھ سے فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ۔ میں نے بہتیرا کہا کہ بھائی میں مولوی آدمی ہوں۔ مجھ کو گانے سے کیا واسطہ۔ لیکن وہ کب مانتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر میں نے اردو کے دو تین شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے اور کہا کہ ہندی میں یوں ہی گاتے ہیں۔

غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغۂ مجیدی کا عطا ہونا

یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چھ مہینے تک روسی مجروح و مقتول ہزار تک پہنچ گئے تھے، جس کے مقابلے میں شہنشاہ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا۔ جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا......

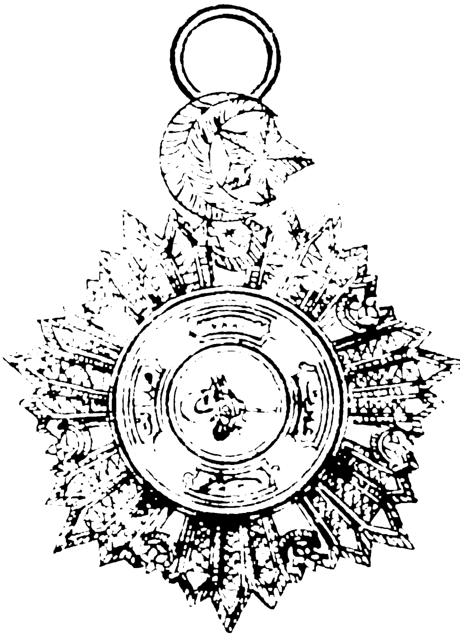
میں ایک مترجم کو ساتھ لے کر ان کے مکان پر گیا۔ گھنٹی بجنے پر دروازہ کھلا۔ دربان نے اندر جانے کی اجازت دی۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد پاشا ے موصوف تشریف لائے۔ جن صاحب کو میں نے مترجمی کے لئے ساتھ لے لیا تھا، وہ رشتہ تعلیم کے ایک افسر تھے۔ انھوں نے حسب قاعدہ آگے بڑھ کر پاشا ے موصوف کے دامن کا کنارہ چوما اور مودبانہ طور سے پیچھے ہٹے۔ میں نے طریقۂ سنت کے موافق سلام کیا۔ پاشا ے موصوف نے سلام کا جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مزاج پرسی کے بعد نام اور مقام پوچھا۔ مترجم نے کہا کہ ہندوستان کے

عثمانیوں سے ہیں اور تحقیقات علمی کی غرض سے آئے ہیں۔ یہ سن کر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی اور دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے۔ رخصت ہو کر میں اٹھا تو خود بھی اٹھے اور کہا آپ دوبارہ تشریف لائیں تو مجھکو خوشی ہوگی۔۔۔۔

دوسری دفعہ ملاقات کو گیا تو پہلے سے کمرے میں آبیٹھے۔ میں اندر داخل ہوا تو کرسی سے اٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے دن کی طرح ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد میں جب ان سے ملا تو اسی طریقے سے ملے۔ پاشاے موصوف مجھ پر نہایت مہربان ہو گئے تھے۔ جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور میں نے ان سے کہا کہ اب میں یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ ایک دو دن جانے سے پہلے مجھ سے مل لیں۔ اسی اثنا میں انھوں نے **سلطان** سے میرے لئے **تمغہ مجیدی** عطا ہونے کی درخواست کی اور منظور ہو گئی لیکن مجھکو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ میرے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے اور جگا کر کہا کہ شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان۔ مجھکو ایک گونہ تعجب ہوا اور میں نے کہا یوں ہی کہتے ہو۔ آخر تم کو معلوم کیونکر ہوا؟ بولے کہ تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے۔ میں اسی وقت اٹھا اور ایک قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر صحیح تھی۔ اسی وقت مجھکو خیال پیدا ہوا کہ میں انگریزی رعیت ہوں۔ اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ دوسرے دن میں سفیر کے پاس گیا۔ اتفاق سے وہ مکان پر نہ تھے۔ میں اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ دوسرے دن تمام احباب مبارکباد کو آئے۔ میں نے ایک مختصر جلسۂ دعوت ترتیب دیا۔ شیخ علی ظبیان، عبدالسلام آفندی، فواد، سامی، شریف اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے۔ دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وداعی ملاقات کو گیا۔ تمغہ کی خبر ایسی عام ہو گئی تھی کہ پاشاے موصوف کے مکان پر پہونچا تو سب سے پہلے دربان نے

کہا "تمغۂ مجیدی مبارک" مجھ کو تعجب ہوا کہ اس کو کیونکر خبر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے امرا اور پاشاؤں کے نوکر چاکر خوب پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اور فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھا کرتے ہیں۔ پاشائے موصوف سے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارکباد دی۔ تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ جس سے نکال کر پہنے تھے۔ انھوں نے آنکھوں سے لگایا، چوما، مجھ کو دکھایا پھر بہ تعظیم کھڑے ہوگئے اور سلطان کو دعا دی۔

تمغۂ مجیدی



تمغہ کے ساتھ ایک فرمان سلطانی بھی عطا ہوا تھا۔ وزیر [illegible] عثمان پاشا نے اپنا فوٹو بھی اپنے قلم سے تحدیہ لکھ کر علامہ کو دیا تھا۔ علامہ شبلی تمغۂ مجیدی کو کبھی استعمال نہ کر سکے اس لئے کہ انگریزی قانون کی رو سے کسی غیر سلطنت کا تمغہ قبول یا استعمال کرنا ممنوع تھا۔ سفرنامہ میں بعض دلچسپ واقعات اور بھی ہیں۔

(۵) الغزالی ۔ دسمبر ۱۹۰۱ء میں بمقام حیدرآباد لکھ کر ختم کی۔ اور سلسلۂ تصنیفیہ میں چھپی۔ اس کے بھی حسب معمول دو حصے ہیں۔ اس کی وجہ مصنف خود علامہ بیان کرتے ہیں:-

علم کلام جو مسلمانوں کی تصنیفی ایجادات میں سے ایک نہایت شاندار علم ہے اور جس پر مسلمانوں کو ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں، اور اس کے چار حصے قرار دئے ہیں:- (۱) علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف شاخیں، عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔ (۲) علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا اور کس حد تک کامیابی حاصل کی۔ (۳) علمائے کلام کی مختصر سوانح عمریاں۔ (۴) جدید علم کلام۔

یہ حصہ بقدر معتد بہ لکھا جا چکا تھا کہ یہ ارادہ رک گیا، اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا۔ اس حصے میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بطور مقدمہ کے یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔ امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور طرز استدلال کی تفصیل بھی ہے۔ اس طرح علم کلام کے ایک نہایت شاندار مسائل بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں۔

امام غزالی کی [illegible] تصنیفات اور ان کے موضوع اور عظمت شان بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

امام صاحب نے یوں تو بہت سے علوم و فنون میں کتابیں لکھیں، لیکن تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی، وہ فقہ، اصول فقہ، کلام اور اخلاق ہیں ۔۔۔۔۔ اس لحاظ سے اگرچہ ضروری تھا کہ ہم امام صاحب کی ان ایجادات اور استنباطات کو بہ تفصیل لکھتے جو ان علوم میں ان سے یادگار ہیں، لیکن ہمارے ناظرین کو شاید فقہ اور اصول فقہ سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم امام صاحب کے ان علمی کارناموں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو علم کلام اور علم اخلاق کے متعلق ان سے ظہور میں آئے۔ ملک کا مذاق اور ملک کی حالت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ فلسفہ آمیز علوم کے مسائل قوم کے سامنے پیش کیے جائیں۔

چنانچہ حصہ دوم میں سے اخلاق اور کلام کے متعلق دو اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

(الف) احیاء العلوم کو جن خصوصیتوں نے تمام قدیم و جدید تصنیفات سے ممتاز کر دیا ہے۔ ہم ان کو بترتیب لکھتے ہیں۔

(۱) بڑی خصوصیت جس نے عام و خاص، عارف و جاہل، سب میں اسے مقبول بنا دیا ہے، یہ ہے کہ حکمت و موعظت دونوں کو ساتھ ساتھ نباہا ہے۔ تحریر و تقریر کا سب سے مشکل پہلو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو مختلف طبیعتوں کے آدمیوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ واعظ اپنی جادو بیانی سے ایک جم غفیر کو وجد میں لا سکتا ہے۔ لیکن حکیمانہ طبیعت کا آدمی اس سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے ایک حکیم جب معارف و حقائق پر تقریر کرتا ہے تو عوام پر اس کا جادو نہیں چلتا۔ احیاء العلوم میں یہ خاص کرامت ہے کہ جس مضمون کو ادا کیا ہے، باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی سے فلسفہ و حکمت کے معیار سے کہیں اترنے نہیں پایا۔ یہی بات ہے کہ امام رازی سے لیکر ہمارے زمانہ کے سطحی واعظ تک اس سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

(۲) امام صاحب کے زمانہ تک یہ دستور تھا کہ فلسفہ اور متعلقات فلسفہ پر جس قدر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ عموماً پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں۔ اور بوعلی سینا نے تو فلسفہ کو گویا طلسم بنا دیا تھا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ فلسفہ کے مسائل خود دقیق ہوتے تھے۔ کچھ یہ کہ یونانیوں کے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ فلسفہ کو عام فہم نہ کرنا چاہیے۔ کچھ یہ کہ اکثر لوگ یہ قابلیت ہی نہ رکھتے تھے کہ پیچیدہ مطالب کو آسان عبارت میں ادا کر سکیں۔ فلسفہ کے اور اقسام کی بہ نسبت فلسفۂ اخلاق آسان اور سریع الفہم ہے۔ تاہم اخلاق پر جو بھی کتابیں لکھی گئی تھیں مثلاً کتاب الطہارت ابن مسکویہ اشکال سے خالی نہ تھیں۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ اخلاق کے مسائل اس طرح ادا کیے کہ دقیق سے دقیق نکتے افسانہ اور لطائف بن گئے۔ ایک ہی مضمون کو کتاب الطہارۃ اور احیاء العلوم دونوں میں دیکھو کتاب الطہارۃ میں غور اور فکر اور خوض سے کام لینا پڑے گا اور باوجود اس کے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کتاب کا مطلب تمھاری سمجھ میں آجائے۔ احیاء العلوم میں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم کوئی علمی کتاب پڑھ رہے ہو۔ تم قصہ کی طرح اس کو پڑھتے چلے جاؤ گے اور مضمون کی نسبت صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اس کو سمجھ جاؤ۔ بلکہ دل پر اس کی کیفیت طاری ہوگی اور تم سراپا اثر میں ڈوب جاؤ گے۔

(۳) اخلاق کی تعلیم میں ایک بہت بڑی غلطی ہمیشہ یہ ہوتی آئی ہے کہ اختلاف طبائع و امزجہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ کسی بانی مذہب کے نزدیک اگر تجرد اور ترک اختلاط پسندیدہ ہے تو وہ چاہے گا کہ تمام عالم تارک الدنیا ہو جائے۔ دوسرے کے نزدیک اگر حسن و شہرت اور فیض رسانی عام زیادہ مفید ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ سب اسی قالب میں ڈھل جائیں۔

لیکن چونکہ انسانی طبیعتیں مختلف ہیں اس لئے اس قسم کی یک طرفہ تعلیم کا اثر خاص طبائع تک محدود رہتا ہے اور باقی ہزاروں آدمیوں کے حق میں بیکار ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سب سے پہلے امام صاحب نے سمجھا۔ ان کے اصول کے مطابق اخلاق کی تعلیم اختلاف طبائع کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ جس شخص کا مزاج قدرتی طور سے معاشرت پسند واقع ہوا ہے۔ اس کو ہرگز تجرد اور ترک تعلقات کی تعلیم نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ معاشرت کے وہ اصول اور قواعد بتانے چاہئیں جن کے ذریعہ سے اس سے وہ نیکیاں ظہور میں آئیں جو معاشرت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً صلہ رحم، حاجت روائی خلق، [illegible]یت عام۔ اسی طرح جس کا مزاج تجرد پسند ہے اس کو ہرگز معاشرت کی ہدایت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ گوشہ گیری اور ترک تعلقات کے ایسے اصول سکھانے چاہئیں جن سے وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے پائے۔

(۴) امام صاحب نے معاشرت اور اخلاق کی بنیاد اگرچہ تمام تر مذہب پر رکھی ہے اور اسی وجہ سے ہر عنوان کی ابتدا میں روایات شرعیہ سے استناد کرتے ہیں۔ لیکن اس نکتہ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ شارع کے کون سے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے معاشرت اور عادت کی حیثیت سے۔ آداب طعام پر جو مستقل مضمون لکھا ہے اس میں [illegible] کھانا کھانے کے قاعدے لکھے ہیں۔ ایک قاعدہ یہ لکھا ہے کہ کھانا دسترخوان پر چن کر کھانا چاہئے۔ میز یا صندلی پر رکھ کر نہ [illegible]۔ اس مسئلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صندلی پر رکھ کر نہیں کھایا۔ پھر قدما سے [illegible] کہ [illegible] چیزیں بدعت ہیں جو آنحضرت کے بعد ایجاد ہوئیں۔

کھانے کی میز یا صندلیاں۔ اشنان۔ پیٹ بھر کھانا۔ ان اقوال کے بعد لکھتے ہیں گو دستر خوان پر کھانا اچھا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میز یا صندلی پر کھانا مکروہ یا حرام ہے۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی حکم شریعت میں وارد نہیں۔ باقی یہ امر کہ یہ چیزیں آنحضرتؐ کے بعد ایجاد ہوئیں۔ تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ ہر ایجاد بدعت ہے۔ بدعت ناجائز صرف وہ ہے جو کسی سنت کے مخالف ہو۔ یا جس سے شریعت کا کوئی حکم باوجود بقائے علت کے باطل ہو جائے۔ ورنہ حالات کے اقتضائے موافق بعض ایجادات مستحب اور پسندیدہ ہیں۔ صندلی پر کھانے میں صرف یہ بات ہے کہ کھانا زمین سے ذرا اونچا ہو جاتا ہے اور کھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی ممنوع امر نہیں۔ جن چار چیزوں کو بدعت کہا گیا ہے سب مساوی نہیں ہیں۔ اشنان ایک گھاس کا نام ہے جو صابن کے بجائے ہاتھ دھونے کے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ ہاتھ دھونا تو اچھی بات ہے۔ کیونکہ اس میں صفائی و نظافت ہے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں تو اور صفائی ہے۔ اگلے زمانے میں اگر اس کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس زمانہ میں اس کا رواج نہ تھا۔ یا وہ میسر نہ آتی ہوگی۔ یا وہ لوگ ایسی مہمات میں مشغول تھے جو صفائی پر مقدم تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھ بھی نہیں دھوتے تھے اور تلووں میں ہاتھ پونچھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہاتھ دھونا مستحب نہیں۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ امام صاحب نے معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں وہ ایشیائی طریقہ کی بہ نسبت زیادہ تر مہذب ملک کے طریقہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے آداب میں لکھتے ہیں۔ کھانا کسی دیگچی

چیز پر (عربی میں اس کو خوان کہتے ہیں) کھانا چاہیئے۔ کھانے باری باری سے آنے چاہئیں۔ کھانے کے بعد میوے یا کوئی شیرینی آنی چاہئے۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ تمام کھانوں کے نام پرچہ پر لکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کارڈ آف ٹیبل کا طریقہ یورپ نے ہمیں سے سیکھا ہے۔

(ب) امام صاحب کا خاص علم کلام (الٰہیات)

خدا کے اثبات پر امام صاحب نے کوئی نئی دلیل نہیں قائم کی۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ نہایت واضح و صاف ہے۔ متکلمین جو استدلال کرتے آتے تھے کہ عالم حادث ہے اور حادث خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی کچھ علت ہوگی اور وہی خدا ہے۔ امام صاحب اسی استدلال کو کافی سمجھتے ہیں۔

صفات باری تنزیہ تشبیہ

اس بحث کے متعلق جو نزاعیں تھیں اگرچہ درحقیقت لفظی تھیں۔ یعنی جو لوگ تشبیہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً خدا عرش پر ہے۔ آسمان پر اُتر کر آتا ہے۔ وہ بھی حقیقت میں تنزیہ کے قائل تھے۔ تاہم دونوں فرقے ایک دوسرے کے ہم زبان نہ ہوتے تھے۔ اور اختلاف کا پردہ درمیان سے نہ اٹھتا تھا۔ امام صاحب نے اس بحث پر ایک مستقل رسالہ الجام العوام کے نام سے لکھا ہے جس نے بہت کچھ اس اختلاف کو کم کر دیا اور تقریباً دونوں ڈانڈے ملا دئے۔ اس کے بعض نکتے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں۔ تنزیہ کے متعلق بڑی کھٹک یہ تھی کہ گر اسلام کا مقصد تنزیہ

تنزیہ اور تجرید تھا، تو قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے تشبیہ کے الفاظ
کیوں آئے، قیامت کے دن خدا فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا۔ آٹھ فرشتے
اس کا تخت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دوزخ کی تسکین کے لئے خدا اپنی
پاؤں دوزخ میں ڈال دے گا۔ اس قسم کی بیسیوں باتیں ہیں جو قرآن مجید یا
احادیث صحیحہ میں وارد ہیں۔ جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی
خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ انسان نے اپنے خیال کے پیمانے سے
موافق خدا کی ذات و صفات ٹھہرائے ہیں۔ امام صاحب نے اس عقدے
کو اس طرح حل کیا کہ بے شبہ قرآن و حدیث میں اس قسم کے الفاظ موجود
ہیں لیکن یکجا نہیں ہیں بلکہ جستہ جستہ متفرق مقامات پر ہیں اور چونکہ تنزیہ کے
مسئلے کو شارع نے نہایت کثرت سے بار بار بیان کر کے دلوں میں جانشین
کر دیا تھا۔ اس لئے تشبیہ کے الفاظ سے حقیقی تشبیہ کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا
تھا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال
پیدا نہیں ہوتا کہ خدا درحقیقت کعبہ میں سکونت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی
آیتوں سے بھی جن میں عرش کو خدا کا مستقر کہا ہے خدا کے استقرار علی العرش
کا خیال نہیں آ سکتا۔ کسی کو آئے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے تنزیہ کی
آیتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کو جب
استعمال فرماتے تھے تو انہی لوگوں کے سامنے فرماتے تھے جن کے ذہنوں میں
تنزیہ و تقدیس خوب جاگزیں ہو چکی تھی۔

اس جواب پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شارع نے صاف صاف کیوں
نہیں کہہ دیا کہ خدا نہ متصل ہے نہ منفصل۔ نہ جوہر ہے نہ عرض، نہ عالم میں
ہے نہ عالم سے باہر۔ اس قسم کی تصریحات موجود ہوتیں۔ تو کسی کو دھوکے سے

تشبیہ کا خیال ہی نہ آ سکتا۔ امام صاحب نے اس شبہ کو یوں رفع کیا کہ اس قسم کی تقدیس عام لوگوں کے خیال میں نہیں آ سکتی تھی۔ عام لوگوں کے نزدیک کسی چیز کی نسبت یہ کہنا کہ نہ وہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر، گویا یہ کہنا ہے کہ وہ شئے سرے سے موجود ہی نہیں۔ بے شبہ خواص کے ذہن میں یہ تقدیس آ سکتی ہے۔ لیکن شارع کو تمام عالم کی اصلاح مقصود تھی، جن میں بڑا حصہ عوام ہی کا تھا۔

لطیفہ علامہ ابن تیمیہ بظاہر تشبیہ کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اس عقیدہ کی رو سے خدا کا ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے حالانکہ خدا واجب الوجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے عقیدہ کے موافق خدا موجود تو ہوگا گو ممکن الوجود سہی۔ تمھارے اعتقاد کے موافق تو وہ ممکن بھی نہیں رہتا۔ بلکہ ناممکن اور محال بن جاتا ہے۔ کیونکہ ایسی شے جو ہر جگہ ہو اور کہیں نہ ہو، عالم سے خارج بھی نہ ہو اور عالم میں بھی نہ ہو، نہ متصل ہو نہ منفصل، نہ ذو مکان ہو نہ ذو جہت، سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ ارتفاع النقیضین ہے اور ارتفاع النقیضین محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اور جس قدر مذاہب ہیں، سب میں خدا کو بالکل انسانی اوصاف کے ساتھ مانا گیا ہے۔ توراۃ میں یہاں تک ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک رات ایک پہلوان سے کشتی لڑے اور اس کو زیر کیا، چنانچہ پہلوان کی ران کو صدمہ بھی پہنچی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ پہلوان خود خدا تھا۔ اسلام چونکہ دنیا کے تمام مذاہب سے اعلیٰ و اکمل ہے اس کا خدا انسانی اوصاف سے بالکل بری ہے۔ قرآن مجید میں ہے لیس کمثلہ شیئ۔ لا تجعلوا اللّٰہ اندادا۔ جہاں کہیں اس کے

خلاف تشبیہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں وہ حقیقت میں مجازات اور استعارات ہیں۔

(۶) علم الکلام جس ضخیم کتاب زیر تالیف کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کا یہ "علم کلام" پہلا حصہ ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے مختصر طور پر "علم کلام" کی تاریخ بیان کی ہے کہ یہ کیوں ایجاد ہوا، اس کا بانی اول کون تھا، پھر کیا کیا ایجادیں ہوئیں، علمائے کلام کون کون تھے، انھوں نے کیا کیا، اس علم سے کیا فائدہ ہوا۔

علامہ کی یہ کتاب بھی اردو میں اپنی نوعیت کی "پہلی اور آخری" ہے۔ لیکن اب اردو داں طبقہ اس علم کے ساتھ کم سے کم دلچسپی رکھتا ہے، اس لئے مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم کلام کا یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس کی بدولت یونانیوں کی غلامی سے آزادی ملی۔ یونانی فلسفہ نے دنیا میں اس قدر رواج و قبول حاصل کیا تھا کہ ان کے مسائل وحی کی طرح تسلیم کئے جاتے تھے، مسلمانوں نے بھی ان کے فلسفہ کو اسی نگاہ سے دیکھا۔ وہ ارسطو و فلاطون کو علم کا دیوتا سمجھے۔ فارابی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو ارسطو سے کیا نسبت ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں اگر ارسطو کے زمانہ میں ہوتا تو اس کا ایک لائق شاگرد ہوتا۔ بوعلی سینا نے "شفا" میں ایک ضمنی موقع پر لکھا ہے کہ اتنا مدید زمانہ گذر چکا لیکن ارسطو کی تحقیقات پر ایک ذرہ بھر اضافہ نہ ہو سکا۔

یونانیوں کی یہ حلقہ بگوشی اس وقت تک قائم رہی جب تک علمائے کلام نے فلسفہ کو نکتہ چینی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ سب سے پہلے نظام نے ارسطو کی "کتاب الطبائع" کا رد لکھا۔ پھر جبائی نے ارسطو کی کتاب "کون و فساد" کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ اس مذاق کو برابر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ امام غزالی

نے "تہافتہ الفلاسفہ" لکھی۔ اور ابو البرکات نے کتاب "المعتبر" میں فلسفہ کے
بہت مسائل کی غلطی ثابت کی۔ امام رازی نے اس پر ایک ذخیرہ کا دفتر تیار
کر دیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے خاص فلسفہ کی رد میں چار جلدوں میں ایک کتاب
لکھی۔ یہ تصنیفات اگرچہ جس غرض کے لئے لکھی گئی تھیں (یعنی علم کلام) اس سے
تو ان کو کچھ علاقہ نہ تھا لیکن اس کی بدولت فلسفہ کا رعب دلوں سے اٹھ گیا۔
اہل نظر فلسفہ کی تنقید پر آمادہ ہو گئے اور سیکڑوں مسائل کی غلطیاں کھل گئیں۔

اکثر یورپین مصنفوں نے لکھا ہے کہ مسلمان عموماً ارسطو کی کورانہ تقلید کرتے
تھے۔ یہاں تک کہ ایک زبان دراز نے لکھا ہے کہ مسلمان، ارسطو کی گاڑی کے
قلی تھے۔ ان کوتاہ نظروں کو چاہئے کہ وہ فارابی اور ابن سینا کے بجائے
ابو البرکات، امام غزالی، امام رازی، آمدی اور ابن تیمیہ کی تصنیفات پڑھیں۔
فلسفہ تو فلسفہ مسلمانوں نے تو یونانی منطق کی بھی غلطیاں ثابت کیں جن کی غلطی
کا احتمال بھی کبھی کسی کو پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز دولت عباسیہ
کی آزادی اور آزاد پسندی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز ہے جس نے
علم کلام کو اس رتبہ پر پہونچایا۔ ورنہ اگر ان بزرگوں کی ہدایت پر عمل کیا جاتا جو
ہر موقع پر السوال بدعۃ سے کام لیتے تھے تو آج علم کلام کا سرے سے
وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ اسی آزادی کا اثر تھا کہ ایک ہی صدی کے اندر گوناگوں
خیالات کا سیلاب سا آگیا، جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا اور جس کی بدولت بیسیوں
نئے نئے فرقے قائم ہوتے جاتے تھے۔ یہ فرقے اگرچہ اعتقادات میں باہم مختلف
تھے تاہم ہر فرقہ کو عام آزادی حاصل تھی۔ ہر فرقہ جس طرح اور جس تدبیر سے
اپنے اعتقادات اور خیالات کو پھیلانا چاہتا تھا پھیلا سکتا تھا۔۔۔۔

عباسیہ کے دربار میں پارسی، مانوی، یہودی، عیسائی، ہر فرقہ اور ہر ملت کے علما موجود تھے۔ دربار ہی میں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اکثر اوقات خلیفۂ وقت خود مناظرہ کا ایک فریق ہوتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ نہایت آزادی بے باکی اور دلیری سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے کہ خلیفہ کا کیا مذہب اور کیا اعتقادات ہیں۔

علم کلام نے اگرچہ بارہ سو (۱۲۰۰) برس کی عمر پائی لیکن کمال کے رتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو سخت مخالفت سے سامنا ہوا۔ تمام محدثین بلکہ ائمہ مجتہدین (بجز امام ابوحنیفہ کے) اس کے دشمن بن گئے۔ دولت عباسیہ کی حمایت کی بدولت وہ برباد ہونے سے بچ گیا لیکن مقبول عام نہ ہو سکا۔ جو محدود فرقہ اس کا طرفدار تھا اور اس کو ترقی دینا چاہتا تھا وہ اعتزال کے نام سے بدنام تھا۔ اہل سنت و جماعت مدت کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن وہ فلسفہ و عقلیات سے آشنا نہ تھے۔ کیونکہ اس گروہ میں ابتدا فلسفہ تو فلسفہ منطق کا سیکھنا بھی ناجائز تھا۔ امام غزالی نے جرأت کر کے منطق کو مذہبی گروہ میں روشناس کیا۔ اسی تعلق سے فلسفہ کو بھی اس بزم میں باریابی ہوئی۔ فلسفہ اور عقلیات کی آمیزش سے علم کلام نے ایک دوسرا مرتبہ اختیار کرنا شروع کیا تھا اور امام رازی و آمدی جیسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوئے تھے کہ دفعۃً تاتار کی طرف سے اس زور کی آندھی اٹھی کہ اسلام کا تمام دفتر پراگندہ ہو گیا۔ مشرق نے تو سنبھالا ہی نہیں لیا۔ شام و روم میں ملکی حالت سنبھل گئی۔ لیکن وہاں کی خاک مشرق کے سے دل و دماغ کہاں پیدا کر سکتی تھی۔ اشاعرہ کی تصنیفات کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ متاخرین اسی پر بڑھتے رہے۔ وہی عبارت آج مستقل علم بن گئی ہے۔ امام غزالی اور

ابن رشد نے جو مینا کاریاں اور جو نازک کاریاں کی تھیں، اس کی کسی کو خبر بھی نہیں۔

(۷) الکلام، یہ اس مجوزہ کتاب کا چوتھا حصہ تھا لیکن چونکہ وہ تصنیف تجویز کے مطابق مکمل نہ ہو سکی، اس لئے علم الکلام حصہ اول رہا، اور یہ الکلام حصہ دوم ہوا۔ اس میں "جدید علم کلام" بیان کیا گیا ہے۔

اب سے بارہ سو برس پہلے اس فن کی ایجاد کا سبب یہ تھا کہ مسلمان فلسفۂ یونانی پڑھ کر عقائد اسلامی سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔ ان کی حقیقت بیان کرنے اور حقانیت ثابت کرنے کے لئے یہ علم بنایا گیا۔ یہ ضرورت ہمارے زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ آج کل گمراہی کے دوگونہ اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ بے دینی وراثت بنتی جاتی ہے۔ اس زمانے کے اکثر نوجوان سائنس داں اور ماہر فلسفہ اس لئے مذہب سے بے تعلق ہیں کہ خود ان کے بزرگ جن کی مثالیں ان کے سامنے ہیں نہ اسلامی عقائد میں راسخ اور اعمال کے پابند نہیں ہیں۔ آگے اپنی اولاد کے سامنے یہ خود نمونہ ہوں گے۔

دوسرے اپنے ملک اور یورپ کے ممالک سے مادیت اور انکار خدا اور بے سود مذہب کی صدائیں ان کے کان میں آ رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں کہ (بالفاظ مصنف) "روح[5] مادہ کی ایک قوت کا نام ہے، جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہے" (ڈاکٹر شنلر)۔ "روح ایک قسم کی میکانکل حرکت ہے" (ویرشو)۔ "انسان صرف مادہ کا نتیجہ ہے" (بوشنر)۔ "زندگی فطرت کا کوئی اصلی قاعدہ نہیں، بلکہ ایک اتفاقی استثنا ہے جو مادہ کے عام اصولوں کے مخالف ہے" (دوتر شیہ)۔ ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا کا وجود ہی نہیں، دوسرا کہتا ہے کہ ہے تو سہی لیکن ظالم ہے۔

---

۵ یہ سب اقتباسات "الکلام" سے لئے گئے ہیں۔

یورپ و امریکہ کا تو یہ حال ہے۔ جاپان ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے اپنی تالیف "نظم و نسق جاپان" میں لکھا ہے کہ انھوں نے جاپان کے وزیر اعظم سے جاپان کے مذہبی رجحانات کے متعلق سوال کیا۔ وزیر اعظم نے جواب دیا کہ "ہم خدا کو اپنے ملک میں نہیں گھسنے دیتے"۔ ہندوستان میں پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں کہ سارا فساد خدا کا ہے، اس کو نکال دو۔ منشی پریم چند معاد اور حیاتِ ثانی کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے مرنے کے بعد کی کچھ فکر نہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک عرصہ ہوا کسی مسلمان پروفیسر کے متعلق لکھا تھا (مجھے نام یاد نہیں رہا) کہ وہ عمر بھر خدا کے منکر اور مذہب سے بے نیاز رہے۔ خواجہ صاحب سے خاص تعلق تھا۔ جب ثمہ پر مرنے لگے تو خدا یاد آیا اور تار دے کر خواجہ صاحب کو دہلی سے بلایا۔ یعنی (بقول اکبر الہ آبادی) "خدائی بزورِ موت" ماننی پڑی۔

قلب و روح کی یہ تباہیاں اور مذہب کی یہ بربادیاں دیکھ کر علامہ شبلی نے چاہا تھا کہ "الکلام" لکھ کر نوجوانوں کے لئے موافقت فلسفہ و مذہب کی راہ نکالیں۔ کتاب کے شروع میں انھوں نے اس "جنگ زرگری" کی صلح کے اصول بتائے ہیں۔ اسی کے مختلف حصے نقل کئے جاتے ہیں:-

علوم جدیدہ اور مذہب

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا، جس میں طبعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبعیات، سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دئے، جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے، ان کو سائنس کا لقب دیا۔ جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے، ان کا نام فلسفہ رکھا۔

مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقۂ علما میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہے یورپ میں آج فلسفہ کے بیسیوں اسکول ہیں اور ان میں شدت سے اختلاف ہے۔ اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہے اور سیاہ بھی۔

اب دیکھنا چاہیے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو ان سے مطلق سروکار نہیں۔ عناصر کس قدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے؟ زمین کے کس قدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔

مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ خدا موجود ہے یا نہیں؟ مرنے کے بعد اور کسی قسم زندگی ہے یا نہیں؟ خیر و شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ثواب و عقاب ہے یا نہیں؟ ان میں سے کون سی چیز ہے جس کو سائنس باطل کر سکتا ہے؟ سائنس کے ملاحدہ نے جب کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ ہم کو ان چیزوں کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے حاصہ سے باہر ہیں یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیونکہ ہم صرف ان باتوں کا یقین کرتے ہیں جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں، کوتاہ نظر عدم علم سے علم عدم سمجھ جاتے ہیں سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم کو یہ چیزیں معلوم نہیں کوتاہ بیں اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہم کو ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ......

خلطِ بحث اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سائنس اور مذہب دونوں میں کوئی اپنی حد سے بڑھ کر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے اور یہی خلطِ بحث تھا جس نے ملاحدہ اور منکرین مذہب کے خیال کو قوت دی بلکہ درحقیقت اسی خلطِ بحث نے الحاد اور بیدینی کے خیالات پیدا کر دئے۔ یورپ میں پہلے مذہب کو اس قدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ خاص اس مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلس انکوزیشن (محکمۂ احتساب عقائد) قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے مخالف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے۔ چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلا دئے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے اخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا جن میں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دئے گئے۔

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔ کوپرنیکس نے نظامِ بطلیموس سے انکار کرکے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔ اس پر مجلس انکوزیشن نے فتوے نافذ کئے کہ یہ رائے کتاب مقدس کی مخالف ہے اور اس بناء پر کوپرنیکس مرتد اور کافر ہے۔

گلیلیو نے جو دوربین کا موجد گزرا ہے ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی جس میں ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اس پر مجلس انکوزیشن نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا اور

یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ سے انکار کرے۔ لیکن جب وہ اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہا تو قید خانہ بھیج دیا گیا۔ اور دس سال محبوس رہا۔

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرہ کے دریافت کرنے کی امید پر سفر کرنا چاہا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے۔

زمین کے گروی ہونے کا خیال جب اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ اعتقاد کتاب مقدس کے خلاف ہے۔

غرض ہر قسم کے علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا ان کی کوششیں بیکار گئیں۔ اور علوم و فنون تمنہ ہی کے سایہ میں پھولے اور پھلے۔

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا اور اس بات پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہو گئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔

بے شبہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے تو سائنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن اسلام نے پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علوم جدیدہ اسی دنیا سے متعلق ہیں معاد اور آخرت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں۔

اس موقع پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے اور ان میں اس قدر اختلاف رہا کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی۔

یہ تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی۔ بلکہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا تھا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن علمی تحقیقات اور انکشافات کی بنا پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں کی گئی۔

قدمائے مفسرین کا خیال تھا کہ پانی آسمان سے آتا ہے یعنی آسمان پر ایک دریا ہے، بادل اس سے پانی لیتے ہیں اور برساتے ہیں، آفتاب پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہے۔ زمین مسطح ہے کروی نہیں۔ ستارے جو ٹوٹتے ہیں شیاطین کے شعلہ ہائے آتشیں ہیں۔ مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کے نصوص سے ثابت سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام رازی نے مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کئے ہیں۔

لیکن جب عباسیوں کا علمی دور آیا اور فلسفہ اور طبیعیات نے ترقی کی تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی۔ باوجود اس کے خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکر قرآن نہیں لکھا۔ معتزلہ کو محدثین اس بنا پر کافر کہتے ہیں کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں لیکن اس بنا پر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا کہ وہ جادو کی حقیقت سے منکر ہیں۔ غرض جس حد تک تحقیق و تفتیش کی جائے عموماً یہ ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا۔ بلکہ محققین نے صاف تشریح کر دی کہ اسباب کائنات اور مسائل ہیئت وغیرہ نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں اور انبیا کو تہذیب اخلاق کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں۔

(۸) **سوانح مولانا روم**، علامہ شبلی اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

سلسلہ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام، الکلام، الغزالی)

پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجب تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دلنشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔

یہ علامہ کی بڑی نادر جدت ہے کہ مولانا روم کو اہل کلام اور مثنوی مولوی معنوی کو تصانیف علم کلام میں شامل کر دیا۔ مثنوی کے علم کلام سے بحث کرتے وقت علمائے علم کلام کی تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں :-

ان تمام تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین و تشفی کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتے۔ بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقہ سے استدلال کرتے ہیں وہ دل میں اثر کر جاتا ہے، اور گو وہ شک و شبہات کے تیروں کو قطعیتہً نہیں روک سکتا تاہم طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آجاتا ہے جس کی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیروں کی پروا نہیں کرتا۔ نمونے میں ایک ایسا ہی مختصر مقام پیش کیا جاتا ہے :-

معجزہ دلیلِ نبوت ہے یا نہیں	اوپر گذر چکا کہ مولانا کے نزدیک نبوت کی تصدیق کے لئے معجزہ شرط نہیں جس کے

دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں۔

در دلِ ہر کس کہ از دانش مزہ است ۔۔۔ روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

لیکن مولانا نے اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ صاف صاف تصریح کی کہ معجزہ ایمان کا سبب نہیں ہوتا۔ اور اس سے ایمان پیدا بھی ہوتا ہے تو جبری ایمان پیدا ہوتا ہے، نہ ذوقی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

موجب ایماں نباشد معجزات بوئے جنسیت کند جذب صفات	معجزات ایمان کا سبب نہیں ہوتے جنسیت کی بو صفات کو جذب کرتی ہے
معجزات از بہر قہر دشمن ست بوئے جنسیت سوئے دل بردن ست	معجزے اس لئے ہوتے ہیں کہ دشمن دب جائیں لیکن جنسیت کی بو اس غرض کے لئے ہے کہ دل تک پہنچ جائے
قہر گردد دشمن اما دوست نے دوست کے گردد بہ بستہ گردنے	دشمن دب جاتا ہے، لیکن دوست نہیں ہوتا وہ شخص بھلا کیا دوست ہوگا جو گردن پکڑ کر لایا گیا ہے۔

مولانا نے اس بحث میں ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

معجزہ سے نبوت پر جو استدلال کیا جاتا ہے اس کی منطقی ترتیب یہ ہوتی ہے:۔

اس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہوا ہے،

اور جس شخص سے یہ فعل صادر ہو وہ پیغمبر ہے،

اس لئے یہ شخص پیغمبر ہے۔

اس صورت میں پیغمبر کا اثر بالذات خارجی چیز پر ہوتا ہے، مثلاً دریا کا پھٹ جانا،

سنگریزوں کا بولنا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثر سے پھر بواسطہ قلب پر اثر پڑتا ہے۔ یعنی آدمی اس بنا پر ایمان لاتا ہے کہ جب اس شخص نے دریا کو شق کر دیا تو ضرور پیغمبر ہے۔

لیکن بجائے اس کے کہ معجزہ کسی پتھر یا دریا یا اور جمادات پر اثر کرے، یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے پہل دل ہی پر اثر کرے۔ خدا جب یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں تو یہ زیادہ آسان اور زیادہ دل نشیں طریقہ ہے کہ بجائے جمادات کے خود لوگوں کے دلوں کو متاثر کر دے کہ وہ ایمان قبول کر لیں، اور یہی اصلی معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

معجزہ کاں بر جمادے گرد اثر — یا عصا یا بحر یا شق القمر
گر اثر بر جان زند بے واسطہ — متصل گردد بہ پنہاں رابطہ
بر جمادات آں اثر عاریہ است — آں پے روح خوش متواریہ ست
تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر — حبذا ناں بے ہیولائے خمیر
بر زند از جان کامل معجزات — بر ضمیر جان طالب چوں حیات

آخری شعر میں معجزہ کی اصلی حقیقت بتائی ہے، یعنی پیغمبر کا روحانی اثر خود طالب کی روح پر پڑتا ہے۔ کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اصل میں مولانا کی مثنوی علم کلام کی نہیں، بلکہ تصوف کی کتاب ہے۔ مولانا صوفی تھے اور صوفی بھی زاہد و مجاہد، مجذوب و مستغرق۔ انھوں نے "علم ظاہر" کی کتابوں کو آگ لگانے کے بعد مثنوی لکھی ہے۔ اس لئے ان کو مثنوی میں "کلام" کیا، قرآن و حدیث کی تعلیم سے بھی بحث نہیں۔ صرف تصوف سے تعلق ہے۔ اسی کے مسائل، مسائل کی طرح نہیں، بلکہ واردات قلبی کے طور پر بیان کئے ہیں۔ اسی لئے مثنوی میں شاعری نہیں، بلکہ الہام ہے۔ اور اسی لئے نظامی نے یہ کہا ہے:۔

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبان پہلوی

من چہ گویم وصف آں عالیجناب — نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

چونکہ علامہ شبلی صرف متکلمین میں ہیں، متصوفین میں نہیں، اس لئے انھوں نے مثنوی کے کلام پر تو ۰۰ صفحے لکھے لیکن مثنوی کے تصوف پر صرف ۲۸ صفحے صرف کئے۔ ورنہ "کلام" کے جتنے مسائل نکالے ہیں، ان سے کہیں زیادہ "تصوف" کے مسائل تھے۔

(۹) **موازنہ انیس و دبیر** - یہ بھی حیدرآباد میں لکھی گئی اور "سلسلۂ آصفیہ" میں شامل ہوئی۔ علامہ شبلی نے جتنی کتابیں لکھیں، عرب و ایران کی تاریخ، مشاہیر اور علم و ادب کے متعلق لکھیں۔ صرف یہ "موازنہ" ہندوستان اور اردو زبان سے متعلق ہے۔ بظاہر "علمائے کلام" اور "شعرائے عجم" کے درمیان میں "انیس و دبیر" کے آجانے کا کوئی قرینہ نہ تھا، لیکن حسن اتفاق سے اس زمانے میں علامہ شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے۔ وہاں تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی کا ہمیشہ سے بڑا اہتمام ہے۔ علامہ کے دوران قیام میں لکھنؤ کے مشاہیر مرثیہ، مرزا اوج (خلف مرزا دبیر)، میر نفیس، عارف، رشید حیدرآباد آئے۔ بڑی دھوم کی مجلسیں ہوئیں، بڑے زور کے مرثیے پڑھے گئے۔ ان کو دیکھ کر اور سن کر علامہ شبلی کو بھی "موازنہ انیس و دبیر" کا خیال آیا۔ لیکن اس طرح کی تصنیف کی تجویز بہت پہلے سے ان کے ذہن میں تھی۔ "موازنہ" کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی گئی ہے جو بعد کو شائع ہوئی یعنی مولوی امجد علی اشہری کی "حیات انیس"۔ اشہری صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۳۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے مشہور بانی سر سید احمد خاں بہادر کا انتقال ہوا، راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا۔ جو سر سید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالی شان کمرے میں سر سید کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب نعمانی

کے سپرد تھا۔ میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جا بیٹھتا۔ ایک روز علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اردو میں میرانیس کا درجہ ایسا ہے جیسے فارسی میں فردوسی کا درجہ۔ ..... مگر تعجب ہے کہ ان کے حالات زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اگر تم سے ہو سکے تو یہ کام کرنے کا ہے۔ میں بھی کچھ مدد دوں گا۔"

(دیباچہ حیات انیس ص ۱-۲)

اشہری صاحب نے اپنی تالیف کے متعلق ایک طویل نظم لکھ کر رسالہ مخزن لاہور میں چھپوائی تھی جس میں میرانیس کے جاننے والوں سے کتاب کے لئے مواد مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نظم میں بھی علامہ شبلی کی فرمائش کا حوالہ دیا ہے:۔

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے کہ میں انیس کی لائف لکھوں بر سم کبار

اس کے بعد اشہری صاحب لکھتے ہیں:۔

اس پر بھی بجز وعدہ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا..... مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ خود "موازنہ انیس و دبیر" لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ شبلی علی گڑھ سے مستعفی ہو کر حیدرآباد آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے بجائے اشہری صاحب کو مدد دینے کے خود "موازنہ" لکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اردو اور مرثیہ دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کو اس طرف توجہ ہوئی۔ ان کے ذہن رسا اور دقت نظر نے کلام انیس کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے۔ جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کئے ہیں، وہ دوسرے سے مشکل تھے۔ اشہری صاحب نے اپنی "حیات انیس" پہلے ہی شروع کر دی تھی اور "موازنہ" کے شائع ہونے سے پہلے تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ لیکن "حیات" سے پہلے "موازنہ" چھپ گیا تو اشہری صاحب نے جہاں مولانا حالی، علامہ آزاد، مولوی امداد امام اثر کی رائیں کلام انیس کے

تعلق لکھیں، علامہ شبلی کی رائے پیش کرنے کے لئے "موازنہ" سے بھی ۲۱ صفحے نقل کئے۔ ان صفحات میں علامہ شبلی کے وہ فقرے بھی ہیں جن میں مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے کہ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں۔ اس پر اشہری صاحب نے یہ نوٹ لکھا ہے:-

"میر انیس اور مرزا دبیر کے مقابلے کی بحث ان چند سطروں پر تمام نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دونوں صاحبوں کے مجامیع تصنیفات پر نظر کرنا اور بات کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھنا اور دکھلانا ہوگا۔"

یہ بحث اعتراضات کے سلسلے میں پہلے آ چکی ہے۔ "موازنہ" کی خوبیوں کے مقابلے میں ان چند اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں۔ علامہ شبلی کی یہ تصنیف بھی اردو میں اپنی نوعیت کی **پہلی** اور **بہترین** ہے۔ دو ایک نمونے یہ ہیں:-

(الف) **فصاحت** کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ روز مرہ اور کثیر الاستعمال ہو، اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور مضمون بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آ جاتے ہیں۔

مثلاً جہاں حضرت شہربانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہربانو کی زبان سے فرماتے ہیں: ع "تم تھے مرے دیور، مرے دیور، مرے دیور"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں "شہزادہ تو ان کی سب گرہ کا نکال لائے"

ابتذال کی صاف اور بین مثال **نظیر** اکبرآبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ ممیز نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال

کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ان کی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت۔ یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں صرف الفاظ کا فصیح ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ۔ فواد و قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں فواد کی جگہ قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے، لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہیں، ان کی آواز کا تناسب قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔

میر انیس کا مصرعہ ہے ع "فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور" صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ میر انیس نے جابجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرعہ میں **صحرا** کے بجائے **جنگل** کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔

میر صاحب کا ایک شعر ہے،

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں — جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ پھس پھسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں، لیکن میر صاحب کے اس شعر میں

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے، اس مصرعہ میں ع

"شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے"

شبنم کے بجائے اوس لاؤ تو فصاحت بالکل برباد ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے، اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے، ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو، ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ نغمہ تو آوازوں یا سُروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلآویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دیا جائے تو دونوں کرخت ہو جائیں گے۔ راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا راز یہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو ان میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں، اس لئے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لے میں ان کے مناسب ہوں۔

کتاب کے آخر میں انیس و دبیر کے متحد المضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے:۔

(ب) دبیر :-

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کے مانند تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کے مانند

انیس :- چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پاے پیر

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے۔ ان الفاظ سے" کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے، وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید نہ مذکور ہو، پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ "چلنے" کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے، اس سے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے، اس سے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے، مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا، اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

دبیر - جلاّد ہات مل کے جلاجل کہ الاماں

انیس - ہو گیا جوڑ کے ہاتوں کو جلاجل خاموش

جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلا کر الاماں کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے گو تشبیہ صحیح ہے لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اس قدر غالب ہوا کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہو گیا۔ رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل کے دونوں

حصے جب مل جاتے ہیں تو پھر جب تک جدا نہوں آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چپ ہو گیا۔

(۱۰) **شعر العجم** - فارسی شاعری اور شاعروں کا ضخیم تذکرہ ہے۔ ۵ جلدیں ہیں اور گیارہ سو سے زیادہ صفحے۔ آغاز تصنیف کی تاریخ تاریخ **تاریخ عجم** (۱۳۲۴ھ) ہے اور اختتام تصنیف کی تاریخ "**تذکرہ**" (۱۳۲۵ھ) ہے۔ یعنی سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی حصہ پنجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"شعر العجم کا تخیل مولانا کے دل میں ایک مدت سے موجود تھا۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سنہ ۱۸۹۹ء میں ان کو اس موضوع کا خیال آیا۔"

لیکن علامہ شبلی نے حصہ اول کا جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس سے بھی بہت پہلے کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"شعرا کے تذکرے بہت ہیں۔ لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دئے ہیں۔ شعرا کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں۔ اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔ میں اس کی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔ سنہ ۱۸۵۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمنی کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی۔ لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی۔

لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے جس میں ژند، پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ
بحث کی ہے اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے۔ شاعری کی
تاریخ سے اس کو لگاؤ نہیں۔"

علامہ اس کے آگے "شعر العجم" کے آغاز تصنیف کا ذکر کرتے ہیں:۔

"۶ ربیع ۱۳۲۶ھ میں نے اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا، لیکن بیچ
بیچ میں "موازنہ" نیز "الندوہ" سدِ راہ ہوتے رہے ۔۔۔ یہاں تک کہ
ستمبر ۱۹۰۸ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔"

باقی حصوں کی تالیف و اشاعت کے متعلق سید سلیمان ندوی صاحب حصۂ پنجم کے
دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"۱۹۰۸ء میں شعر العجم کی پہلی جلد زیر طبع تھی، دوسری اور تیسری زیر
تصنیف ۱۹۰۹ء کے آخر میں دوسری اور ۱۹۱۰ء میں تیسری جلد شائع ہوئی۔"

علامہ نے جنوری ۱۹۱۲ء کے "الندوہ" میں یہ نوٹ لکھا تھا:۔

"شعر العجم کا چوتھا حصہ زیر تالیف ہے، لیکن وہ اس قدر بڑھ گیا ہے
کہ اس کے دو حصے کر دینے پڑے۔ ایک حصہ طبع میں جا چکا ہے اور چھپ رہا
ہے، لیکن دوسرے کو میں نے روک لیا کہ اب مجھ کو سب سے مقدم اور اہم تر
کام یعنی **سیرۃ نبوی** کی تالیف میں مصروف ہونا چاہیے۔ اگر یہ کام انجام
پا گیا تو شعر العجم ہوتی رہے گی، اس کی کیا جلدی ہے۔"

سید سلیمان صاحب اس نوٹ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:۔

اب یہی "اوراقِ منوعہ" چھ برس کے بعد ۱۹۱۸ء میں شائع ہو رہے
ہیں۔ اور اس طرح سمجھنا چاہیے کہ شریعتِ حسن و عشق کے یہ پانچوں صحیفے تقریباً
۱۲ برس کے عرصہ میں بتدریج تکمیل کو پہنچے ۔۔۔۔ پانچویں حصہ کی تصنیف

سے درحقیقت مولانا مرحوم تمام و کمال فارغ نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے مسودات ان کی نظرثانی کے محتاج تھے۔۔۔۔ تاہم یہی مناسب سمجھا گیا کہ ان موتیوں کی لڑی میں پیوند نہ ملایا جائے۔ چنانچہ فصول و ابواب کی ترتیب کے علاوہ اصل متن میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی ہے۔ مولانا اپنی تصنیف بار بار کی حک و اصلاح اور مکرر نظر اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ بے ساختگی کے ساتھ اول وہلہ میں ان کے دماغ سے کیا خیالات اور ان کے قلم سے کیا الفاظ نکلتے تھے۔

اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اختتام تصنیف کی تاریخ "تذکرہ" (جس میں سنہ ۱۳۲۵ ہجری لکھتے ہیں) بطور تفاؤل متعین کوئی سنہ سے خالی ہوگی، ورنہ کتاب سنہ ۱۳۳۲ تک مرتب ہوتی رہی۔ اس لیے اختتام کا مادہ تاریخ "**تاریخ ادب عجم**" (۱۳۳۲ھ) ہو سکتا ہے۔

شعر العجم حصہ اول کے آغاز میں علامہ نے فارسی شاعری کے آغاز کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے قدیم اشعار لکھے ہیں۔ علامہ اس حصہ تاریخ کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کا اصل مقصود تنقید شاعری تھا اور ضمناً تاریخ شاعری۔ اس لیے انھوں نے آغاز شاعری کے متعلق ذاتی تحقیق نہیں کی۔ بلکہ مجمع الفصحاء، تذکرہ دولت شاہ وغیرہ کی مفروضہ و "سفینہ بہ سفینہ" روایت کو سرسری طور پر بیان کردیا۔ لیکن اس میں علامہ شبلی تنہا قابل الزام نہیں ہیں۔ ان کا تو یہ مقصود اصلی ہی نہ تھا۔ پروفیسر براؤن وغیرہ مستشرقین یورپ جن کا کام ہی کرید اور چھان بین ہے، ان کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی۔

ایران والوں نے "کتاب الوزراء"، "تاریخ سیستان" وغیرہ کے حوالے سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ رضا زادہ شفق نے "تاریخ ادبیات ایران" دو جلد

میں لکھی ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ عہدِ اسلام میں فارسی شاعری کی بنیاد حکومت بنی اُمیہ کے ابتدائی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ یزید بن معاویہؓ کے عہدِ حکومت (۶۰ھ تا ۶۴ھ، ۶۷۹ تا ۶۸۳ء) میں یزید بن مفرّغ نے زیاد کی ماں سُمیّہ پر ان موزوں فقروں میں طعن کیا تھا:-

آبست نبیذ است عصارات زبیب است سُمیّہ روسپید است

اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے آغاز (یعنی ۱۰۸ھ، ۷۲۶ء) میں جب اسد بن عبداللہ القصاری الختلانی نے خاقان کے ہاتھ سے شکست کھائی تو خراسان کے بچوں نے ان موزون الفاظ میں اس کا مذاق اُڑایا:-

از ختلان آمدیہ بروتباہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ خشک نزار آمدیہ

پھر ابوالینبغی عباس بن ترخان جو جعفر برمکی اور فضل برمکی (وزرائے خلیفہ ہارون رشید) کا درباری شاعر (۱۹۳ھ، ۸۰۹ء میں) تھا، اس نے شہر سمرقند کے متعلق یہ شعر کہے تھے:-

سمرقند کندمند بزینت کے افگند
از شاش نہ بہی ہمی شہ نہ جہی

"شعر العجم" کی پہلی تین جلدوں میں فارسی شاعری کی ابتدا یعنی شعرائے طاہریہ (تیسری صدی ہجری اور نویں صدی عیسوی) سے شعرائے شاہجہانی (گیارھویں صدی ہجری اور سترھویں صدی عیسوی) تک کا تذکرہ ہے۔ لیکن دوسرے تذکروں کی طرح تمام شاعروں کا احاطہ نہیں کیا، بلکہ صرف ۲۴ شاعروں کے تذکرہ و تبصرہ کو تین جلدوں کے ۲۸۷ صفحوں پر پھیلایا ہے۔ بعض ممتاز شعرا پر ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر صفحے لکھے ہیں۔ فردوسی پر پہلی جلد میں ۵۰ صفحے لکھے ہیں، اور پھر شاہنامہ پر چوتھی جلد میں ۰۰ صفحے۔ گویا پانچ جلدوں میں سے تقریباً ایک جلد اکیلے فردوسی پر ہے۔ حقیقت میں تذکرہ لکھنے کا یہی حق تھا۔ اور

تذکرے اس کے مقابلے میں (بقول علامہ) "بیاضِ اشعار" ہیں۔ علامہ کے حُسنِ انتخاب اور خوبی نقد و نظر کو قدیم و جدید کوئی تذکرہ نہیں پونہچا۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن و معائب سے بحث کی ہے آخری جلدیں جن میں مضامین شاعری کے مختلف اصناف عشق و حسن، اخلاق، فلسفہ، تصوف، مدح و ثنا پر ریویو کیا ہے، **فنِ تنقید میں ایجادِ نو** ہے۔ اس کی نظیر فارسی لٹریچر میں موجود نہ تھی۔ چنانچہ طہران میں آقاے محمد تقی فخر داعی گیلانی نے "فارسی جدید" میں ان کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

شعر العجم کے متعلق یہ دعوی ہے کہ جن شاعروں کا اس میں تذکرہ لکھا گیا ہے' ان سے بہتر کوئی شاعر باقی نہیں رہ۔ یہی جواب ہے اس اعتراض کا کہ علامہ شبلی نے **خاقانی، ظہیر فاریابی** اور **جامی** کو مستقل تذکرہ کے قابل نہیں سمجھا۔ قصیدہ میں خاقانی و ظہیر کی عظمت علامہ کو تسلیم ہے' جیسا کہ انھوں نے پانچویں جلد میں ریویو کیا ہے۔ لیکن خاقانی کا ذہن قصیدہ کے لئے صحیح طور پر متوازن نہ تھا۔ اس کے قصائد میں "بھاری بھرکم" ہونے کے سوا کوئی وصف نہیں۔ ظہیر نے قصیدہ میں جو محاسن پیدا کئے ' ان کو سلمان ساوجی نے بہت بڑھا دیا تھا۔ جب انتخاب ٹھہرا تو ظہیر و سلمان میں سے سلمان بہتر تھا۔ نظامی و خسرو کی مثنویوں کے سامنے جامی کی مثنویوں کا یقیناً تیسرا درجہ ہے۔ اور غزل میں خسرو، حافظ، نظیری وغیرہ کے مقابلے میں جامی کا تیسرا درجہ بھی نہیں ہے۔

شعر العجم کے چند نمونے یہ ہیں:۔

(الف) **حضرت امیر خسرو دہلوی** کا تذکرہ و تبصرہ ۲۷ صفحوں میں لکھا ہے۔ ان کی جامعیت اور کمالات بیان کرتے ہیں:۔

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع

ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔
صرف ایک شاعری کو لو، تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی،
انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ "اقلیم سخن کے" "جم دے کے" ہیں۔ لیکن ان
کی حدود حکومت ایک ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے
نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو
چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔
لیکن **خسرو** کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے،
اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد، اور صنائع و بدائع کا
تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری
کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔
صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ
سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا
کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ اس میں غالباً ایک غلط فہمی
ہے۔ امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک
سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ
اس میں اس قدر بیتیں ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ "عرفات" میں لکھا ہے
کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ کس
قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی
زبان ہے۔ عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں،

چنانچہ مثنوی "نہ سپہر" میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ع

من قدرے بر سر ایں کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی۔ اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا۔ لیکن ان کی نکتہ آفرینی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا۔۔۔

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیا سے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔۔۔۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے۔ اور دربادوں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی۔ کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اور اشغال تھے۔۔۔۔

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔

امیر خسرو کی غزل پر تبصرہ کرتے ہیں :۔

جدّت اسلوب

غزل کی ترقی کا دور دور لطفِ ادا اور جدّتِ اسلوب ہے، جس کے موجد شیخ سعدی ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا۔ امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدّتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے

پیرایے پیدا کر دیے، جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے یوں ادا کرتے ہیں۔

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز — دردہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود بندھتے ہیں۔ اسی مضمون کو دیکھو، امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را — در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا عام مضمون ہے۔ اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے۔

گل چہ داند کہ در دِ بلبل چیست — او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اس کو یوں باز رکھتے ہیں۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد — مسلمانی میا موز آں دو چشم نامسلماں را

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق۔

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی؟ — از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نکرد

سعدی کا شعر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن **امیر** نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی — زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بیچ اور شوخ کر دیا ہے،

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

جاں ز نظارہ خراب و ناز او ز انداز بیش
ابہوے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا۔

شراب لطف بہ ُ درجام می ریزی و می ترسم — کہ زود آخر شود این بادہ و من در خمار آخر

(شعر العجم حصہ دوم)

شعر العجم حصۂ چہارم کے آغاز میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

"شعر العجم کا یہ چوتھا یعنی آخری حصہ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگلے تینوں حصے اسی حصہ کے دیباچے اور تمہید تھے۔ اس حصہ میں ایران کی عام شاعری پر تنقید ہے"۔

چونکہ وہی مضامین جو تین حصوں میں تبصرۂ شعرا کے ذیل میں لکھے تھے، اب اصناف سخن در خصوص نفس شاعری کے تحت میں لکھنے ہیں، اس لئے اس مضمون کے مناسب و برمحل اپنا یہ شعر عنوان پر درج کیا ہے:۔

حدیث دلکش وافسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

اس چوتھے حصے کے طویل ہو جانے کے سبب سے، دو حصے کر دیئے تھے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ پانچواں حصہ اسی کا سلسلہ ہے۔ چوتھے میں مثنوی پر ریویو ہے، پانچویں میں قصیدہ، غزل وغیرہ پر۔ چوتھے حصہ میں پہلے "نفس شاعری کی حقیقت" سے بحث کی ہے، پھر ایران کی شاعری کی تدریجی رفتار دکھائی ہے۔ پھر صنف وار تنقید کی ہے۔

شاعری کے یہ مباحث اور اس طرح کے تبصرے **عربی، فارسی، اردو،** کسی زبان میں علامہ شبلی سے پہلے نہیں لکھے گئے۔

(ب) بطور نمونہ ایک مضمون **محاکات** کو درمیان میں سے کچھ حصے حذف کرکے نقل کیا جاتا ہے:۔

محاکات محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں گرچہ مادی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصور انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر، حیرت، استعجاب یرت کی اور بیتابی ظاہر ہو، جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے آنسو سے سہارے جا رہے ہیں آنسوؤں کے سہارتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا، تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی، سیکڑوں گوناگوں واقعات، حالات، اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں۔

خیالات، جذبات، اور کیفیات، کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے، تصویر اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں

نسب نامۂ دولت کے قباد ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہوگیا یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے، کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال

خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں، شاعر اکثر صرف اُن چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے، فرض کرو ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے، لیکن شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں، ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کردے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔

ایک اور بڑا فرق، مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو خود اس کے چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کرکے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوسکتا ہے، سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہوسکتا جو اس شعر سے ہوسکتا ہے،

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہوگیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے، لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کرسکتی، نہ اصل سے زیادہ دور ہوسکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی، اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا

پڑتا ہے، وہ ایسی تصویر کھینچتی ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے، لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لیئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیا، جاندار چیزیں بن جاتی ہیں، اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں، زمین آسمان، ستارے، بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے،

قوت تخئیل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے، اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ ایک منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخیل کے ذریعہ سے معمول کر لیتا ہے وہ اس کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

دوش از بزم چو رفتی آگہ نگشتم آرے عمری و رفتن عمر آواز پا ندارد

یعنی معشوق جو کو دی سے نکل کر چلا گیا تو مجھکو خبر نہیں ہوئی، کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے اور زندگی کے جانے کے وقت جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی، اس دلیل کے دو مقدمے ہیں "معشوق عاشق کی زندگی ہے۔ زندگی کے جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی" ان دونوں میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو۔

محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے، شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے، کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے، وہ شے اچھی یا بری ہے اس سے

بحث نہیں، مثلاً چھپکلی ایک بدصورت جانور ہے جس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک استاد مصور چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک مؤثر چیز ہے۔ اب اگر وہ چیزیں جن کی محاکات مقصود ہے، خود بھی دلآویز اور لطف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھ جائے گا۔

اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہییں جو ان خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں۔ سودی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا شان نزول یہ ہے کہ اس سے اس کے کمسن بچے نے پوچھا کہ "سیلاب کیونکر آتا ہے" سودی نے اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے۔ اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے گرنے، بہنے، پھیلنے، بڑھنے، وغیرہ وغیرہ کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں الفاظ کے لہجہ سے ان کا اظہار ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اس نظم کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہوگا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔

میرا طالب العلمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا۔

سرو بہ بستاں چو دہد جلوہ رعنائی را ۔۔۔ اوّل از سرو کند جامہ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں اس لئے شاعر اگر کند کے بجائے کشد کہتا

تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ "نہیں یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اُتار لیتا ہے، لباس اُتارنے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اُتار کر رکھدے یا اس کا نوکر اُتار لے - دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لیے جائیں یا نچوا لیے جائیں فارسی میں اُن کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق، ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اُتار لیتا ہے اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی۔

علی قلی کا شعر ہے۔

بگذشت زپیش من وغیرش بہ حکایت بہ بیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا اس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگا لیا کہ معشوق مڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکا اور نہ شاید میری طرف بھی اس کی نگاہ پڑتی) بہ بیچید کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آجاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آسکتی۔

(ج) **شاعری کی تدریجی رفتار**۔ اس قدر ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ فارسی شاعری کے مختلف دَور ہیں، اور ہر دور کا جُدا انداز ہے۔ اب ایک نکتہ سنج کا یہ فرض ہے کہ ہر دَور کی تمام خصوصیتوں کا پتہ لگائے، نہ صرف ان کا جو سطح پر نظر آتی ہیں، بلکہ ان کا بھی جو تہ میں ہیں، اور جن پر عام نگاہیں نہیں پڑ سکتیں - اس کے ساتھ ان خصوصیتوں کے وجوہ اور اسباب بتائے،

یعنی کیونکر پیدا ہوئیں، اور کس طرح ایک رنگ دوسرے رنگ سے بدلتا گیا۔

شاعری اگرچہ غیر مادی چیز ہے، لیکن وہ مادیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم ترقی کرتی ہے، تو ابتدا میں تمام چیزیں یعنی خوراک، پوشاک، مکان، اسباب، آرائش، وضع قطع، بے تکلف اور سادہ ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ نفاست، لطافت، اور تکلف پیدا ہوتا ہے، اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ حد سے بڑھ جاتا ہے، اور اس وقت ترقی رُک کر قوم برباد ہو جاتی ہے۔

شاعری کی یہی حالت ہے۔ ابتدا میں سیدھے سادے، صاف صاف، اور بے تکلف خیالات ہوتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارے کہیں کہیں آجاتے ہیں۔ الفاظ میں تراش خراش نہیں ہوتی۔ جس مضمون کو بیان کرنا چاہتے ہیں، بغیر کسی اینچ پیچ کے بے تکلف ادا کرتے ہیں۔ اس سے آگے قدم بڑھتا ہے تو خیالات میں بلندی شروع ہوتی ہے، استعارے رنگین ہو جاتے ہیں — تشبیہوں میں نزاکت آجاتی ہے۔ مبالغوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ میں تراش خراش شروع ہوتی ہے۔ جس مضمون کو ادا کرتے ہیں استعاروں کے رنگ میں ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد دقت آفرینی اور باریک بینی شروع ہوتی ہے، مبالغے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ استعارہ میں استعارہ پیدا کرتے ہیں۔ محسوسات سے گذر کر صرف خیالی چیزوں پر مدار رہ جاتا ہے۔ یہ ترقی کی آخری منزل ہے۔ جو تنزل سے ہمدوش اور ہم آغوش ہے۔

اس اصول پر فارسی شاعری کے دَورِ اول کی سب سے پہلی خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ایران میں جب شاعری شروع ہوئی تو تمدن اور معاشر

کا اوج شباب تھا۔ شاعری کا جو نمونہ سامنے تھا، وہ متنبی، ابونواس، ابن المعتز، بحتری، ابوتمام کی رنگینیِ بیان اور طلسم کاریاں تھیں۔ باوجود اس کے فارسی شاعری میں ابتداءً ایسے سادے بے تکلف اور سرسری خیالات نظر آتے ہیں کہ گویا قوم میں کسی طرح کا تمدن پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ ہر چیز ابتدا میں نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔

ہماری زبان کو دیکھو۔ **ولی دکنی** نے اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ ناصر علی اور بیدل کا معاصر تھا۔ جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے۔ **ولی** ان لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کا ماہر تھا۔ تاہم اردو میں شاعری شروع کی تو اس کا یہ انداز ہے:

جسے عشق کا زخم کاری لگے ہے ۔۔۔ تو پھر زندگی اس کو بھاری لگے ہے

سادگی کا یہ وصف قدر کے خیر دور تک قائم رہا، لیکن مدارج میں فرق آتا گیا۔ کیونکہ جس قدر زمانہ گذرتا تھا، سادگی کے بجائے آورد اور تکلف آتا جاتا تھا۔

اس مضمون کو کہ کمینہ آدمی تربیت سے شریف نہیں ہو سکتا **ابوشکور بلخی** نے اس طرح ادا کیا تھا:۔

درختے کہ تلخش بود گوہرا	جس درخت کی اصل تلخ ہے
اگر چرب و شیریں دہی مر ورا	اگر اس کو چرب اور شیریں غذا دو
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید	تب بھی وہی کڑوا پھل پیدا کرے گا
ازو چرب و شیریں نخواہی مزید	اس سے شیریں پھل نہیں پیدا ہو سکتا

اسی مضمون کو **فردوسی** یوں ادا کرتا ہے:۔

درختے کہ تلخست ویرا سرشت | گرش برنشانی بہ باغ بہشت
ور از جوے خلدش بہ ہنگام آب | بہ بیخش شکر ریزی و شہد ناب
سرانجام، گوہر بہ کار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد

بات وہی ہے۔ لیکن بندش کی چستی اور نشست الفاظ نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

شعراء "دل" کو "آگ" سے تشابہت دیتے ہیں، اور یہ عام مضمون ہے۔ لیکن اوّل جب یہ خیال ادا کیا گیا تو اس کی یہ صورت تھی،

احوال دلم مپرس کاں بیچارہ	میرے دل کا حال نہ پوچھو،
چوب ست درو فتادہ آتش۔ دل نیست	وہ ایک لکڑی ہے جس میں آگ لگ گئی ہے

اسی خیال کو متاخرین نے یوں ادا کیا۔ ع

یک پارہ آتشے ست، دلش نام کردہ اند

ایک ذرا سے تغیر سے مصرعہ چست ہو گیا۔ چوب کا لفظ جدا تھا، وہ نکل گیا۔ اس کے بجائے "پارۂ آتش" نے لطافت پیدا کر دی۔ "نام کردہ اند" نے لطافت کو اور بڑھا دیا۔

یہ مضمون کہ "معشوق گو نامہربان اور دشمن ہو، تاہم اس کی محبت دل سے نہیں جاتی"، اوّل اوّل فرخی نے اس کو یوں ادا کیا تھا،

ہمہ دشمنی از تو دیدم ولیکن	میں نے تجھ سے ہمیشہ دشمنی کا برتاؤ دیکھا، تاہم میں نہیں کہتا کہ تو دوستی کے ناقابل ہے۔
نگویم کہ تو دوستی را نشائی	

اسی خیال کو سعدی ادا کرتے ہیں،

بلطف وخوبی او درجہاں ندیدم کس
کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید

میں نے معشوق کی لطافت اور خوبی کے برابر دنیا میں کسی کو نہیں دیکھا کہ دشمنی کرتا ہے اور باوجود اس کے محبت اور بڑھتی ہے۔

شعرا معشوق کی کمر اور عاشق کے جسم کو لاغر کہتے ہیں۔ اسی طرح معشوق کے دہن اور عاشق کے دل کو تنگ باندھتے ہیں۔ یہ مضمون قدماء کے ہاں ابتدائی حالت سے ادا ہوا تھا۔ متاخرین نے اس کو صرف بندش سے نہایت خوبصورت کر دیا۔ **فرخی** کا شعر ہے ؎

گفتم بتا، تن و دل من چیست مر ترا
گفتا یکے میانِ من است دیگے دہن

یعنی میں نے پوچھا کہ میرا جسم اور میرا دل کیا چیز ہے؟ معشوق نے کہا، جس کو تم اپنا جسم سمجھتے ہو وہ میری کمر ہے اور جس کو اپنا دل کہتے ہو، وہ میرا دہن ہے۔

اسی بات کو **سعدی** یوں کہتے ہیں،

دہانِ تنگِ تو آموخت تنگی از دلِ من
وجودِ من ز میانِ تو لاغری آموخت

---

(۱۱) **سیرۃ النبی** (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) علامہ شبلی کی یہ آخری تصنیف ہے، اور "قامت" و "قیمت" دونوں میں بہتر ہے۔ صاحبِ سیرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ پاک میں کسی نے کہا ہے:-

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدۂ
ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

"سیرۃ النبیؐ" کے متعلق میں کہتا ہوں :-

بیش از ہمہ جلوہ ہاے نور آمدہ است ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ است

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام پاک محمدؐ[۵] (ستودہ، سراپا ہوا، تعریف کیا گیا) جس قدر صادق اور موزوں ثابت ہوا ہے، کسی دوسرے انسان کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ تمام عالم اور وجود آدمؑ سے تا ایں دم، کسی زمانے، کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب کے کسی پیغمبر یا بڑے سے بڑے شخص کی اتنی کثرت سے اور ایسی اعلیٰ مدح و ثنا نہیں کی گئی۔ اور چیزوں کو چھوڑ کر صرف اردو اور فارسی کی نعتیہ شاعری پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قدر کثیر و عظیم سرمایۂ مدح و ستائش دنیا کے کسی دوسرے انسان کے لئے موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام عالم کے کروڑوں مسلمان دن رات اٹھتے بیٹھتے اور اوقات نماز و عبادت میں جس کثرت سے صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں وہ بجائے خود تاریخ عالم کا عظیم الشان واقعہ ہے۔

یہی حال **سیرت پاک** کی کتابوں کا ہے۔ قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، سیر، مغازی، فضائل، شمائل کی کثرت تعداد اور عظمت ضخامت، کاوش تالیف اور کوشش تحقیق کو تمام عالم کے کسی دوسرے انسان کی لائف نہیں پہونچتی۔

---

[۵] دوسرا اسم مبارک **احمدؐ** بھی ایسا ہی صادق آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں "بہت حمد و ثنا کرنے والا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے بذات خود جس قدر عبادت الٰہی کی وہ عالم کے ہر فرد بشر سے زیادہ تھی۔ پھر اس کے ساتھ ان کی امت کی عبادت کو شامل کرنا چاہیے جو گویا خود اسی ذات اقدس کی عبادت ہے۔ تمام پیروان مذاہب میں مسلمانوں کی کثرت عبادت مسلّم ہے۔ دنیا میں اہل اسلام کی تعداد دوسرے مذاہب والوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باوجود اس کے مسلمانوں کے اوقات اشغال عبادت کی تعداد و مقدار سب سے زیادہ ہے۔ پابندی عبادت میں مسلمان تمام اہل مذاہب سے بڑھ کر ہیں۔

اردو میں با اصول، محقّق اور مکمّل "سیرۃ النبیؐ" لکھنے کی سعادت علامہ شبلی کے حصے میں آئی۔ اور سچ یہ ہے کہ ایسی جامع سیرت دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے حصہ اول میں جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف مرحوم کو ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۶ء) میں سیرتِ نبویؐ لکھنے کا خیال پیدا ہوگیا تھا اور "غزوۂ احد" تک لکھ بھی لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں "اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کرلیا"۔ اس کام کے لئے مالی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم فرماں فرمائے بھوپال نے "سوانح نگارِ نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کرکے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کرلیا"۔

علامہ شبلی نے اس کے ۵ حصے تجویز کئے تھے: (۱) عرب و کعبہ کی تاریخ، اور آنحضرتؐ کے حالات، غزوات، اخلاق، اولادِ اطہار، ازواجِ مطہرات۔ (۲) منصبِ نبوت، فرائض و احکام۔ (۳) قرآن مجید کی تاریخ اور حقائق و اسرار۔ (۴) معجزات کی حقیقت و تحقیق۔ (۵) یورپین تصانیفِ سیرت پر تنقید۔

علامہ اپنی تجویز کا صرف پہلا حصہ لکھ سکے، جس کو اعتدالِ ضخامت کے خیال سے دو حصوں میں شائع کیا گیا۔ پہلے میں غزوات و فتح مکہ تک، اور دوسرے میں حجۃ الوداع، وفات، اخلاق، ازواجِ مطہرات، تاسیسِ خلافت ۱۱ھ تک۔ باقی تین حصے علامہ سید سلیمان ندوی نے معجزات، منصبِ نبوت، مفہومِ عبادت کے متعلق لکھے۔

پہلا حصہ مصنف کی وفات کے بعد ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ سرنامہ کس قدر موثر و دلکش لکھا ہے:-

سرنامہ

ایک گدا ہے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لیکر آیا ہے

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

شبلی، شوال ۱۳۳۰ھ

"سیرت" کے چند نمونے یہ ہیں:-

(۱) ولادت باسعادت کا حال جس اسلوب کے ساتھ لکھا ہے، اس کا جواب نہیں۔

ظہور قدسی

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین

کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شرر آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمر ہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بُت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آ گئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اُٹھا۔

(۲) غزوۂ اُحد ۳ھ کے بیان میں سے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:-

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ مُصعب بن عمیر کو علم عنایت ہوا، زبیر بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہ کو اس حصۂ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن اُدھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ عبداللہ بن جبیر ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے...

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں کُشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے۔ ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ اشعار یہ تھے:-

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نَمْشِیْ عَلَی النَّمَارِق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں

اِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
اَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہوجائیں گے

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا، اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہوگیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو یہ خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آکر پکارا، "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں!" انصار نے کہا، "ہاں او بدکار، ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے۔"

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا، "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے؟"[1] علی مرتضیٰ نے صف سے نکل کر کہا، "میں ہوں۔" یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے، جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا۔

اِنَّ عَلٰى اَهْلِ اللِّوَاءِ حَقًّا	نیزہ بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون
اَنْ تُخْضَبَ الصَّعْدَةَ اَوْ تَنْدَقَّا	میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔

حضرت حمزہ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی۔ ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا، "میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں۔"

اب عام جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت حمزہ، حضرت علی، ابو دجانہ فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ ابو دجانہ عرب کے مشہور

---

[1] یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں (حاشیہ سیرۃ النبیؐ)

پہلوان تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دست مبارک میں تلوار لیکر فرمایا
ہے "کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟" اس سعادت کے لئے دفعتہً بہت سے
ہاتھ بڑھے۔ لیکن یہ فخر ابودجانہ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے ان کو
مغرور کردیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے،
لیکن اس وقت پسند ہے۔" ابودجانہ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے،
بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی۔ اس کے سر پر تلوار
رکھ کر اٹھالی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت
پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہ دودستی تلوار مارتے جاتے تھے، اور جس طرف بڑھتے
تھے، صفیں کی صفیں صاف ہوجاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غبشانی
سامنے آگیا۔ پکارے "او ختانۃ النساء کے بچے! کہاں جاتا ہے؟" یہ کہکر
تلوار ماری۔ وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا، اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا
نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کردے تو آزاد کردیا جائے گا۔ وہ حضرت
حمزہ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو
"حربہ" کہتے ہیں، اور جو حبشیوں کا خاص ہتیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں
لگا اور پار ہوگیا۔ حضرت حمزہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے
اور روح پرواز کرگئی۔۔۔۔

ابوعامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اس کے صاحبزادے
حضرت حنظلہ اسلام لاچکے تھے۔ انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی۔لیکن رحمت عالم نے گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے حنظلہ نے کفار کے سپہ سالار (ابوسفیان) پر حملہ کیا، اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے۔دفعۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو قتل کر دیا۔تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا۔علم برداروں کے قتل اور حضرت علی اور ابودجانہ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں، اور مطلع صاف ہو گیا۔لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی۔یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کئے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

عبداللہ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رک نہ سکے۔تیراندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا۔عبداللہ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے، لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔اب راستہ صاف تھا۔ خالد نے سواروں کے دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ مصعب بن عمیر جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صورت میں مشابہ اور علمبردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا، اور غل مچ گیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں، اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔حضرت حذیفہ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں، اور حضرت حذیفہ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں،

لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہوگئے، اور حضرت حذیفہ نے ایثار کے لہجہ میں کہا، "مسلمانو، خدا تم کو بخش دے"۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مڑکر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں۔ جناب علی مرتضیٰ، حضرت ابوبکر، حضرت سعد وقاص۔ زبیر بن العوام، ابودجانہ، طلحہ کا نام بتخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صرف طلحہ اور سعد رہ گئے تھے۔۔۔۔

جاں نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے۔ لیکن نگاہیں **سرور عالم** (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ڈھونڈھتی تھیں۔ سب سے پہلے کعب بن مالک کی نظر آپ پڑی۔ چہرۂ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ کعب نے پہچان کر پکارا، "مسلمانو، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں"! یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا۔ دل کا دل ہجوم کرکے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، "کون مجھ پر جان دیتا ہے"؟ زیاد بن سکن پانچ انصاری لیکر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے۔ اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑکر جانیں فدا کردیں۔ **زیاد** کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھدیا اور اسی حالت میں جان دی ؎

کچھ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

علامہ نے "سیرۃ" میں واقعات کی تحقیق و تصحیح بھی کی ہے۔ جہاں بیانات میں

اختلاف ہے یا غلط فہمی پیدا ہوئی ہے یا مخالفانِ اسلام کی حاشیہ آرائی ہے وہاں علامہ نے روایت و درایت (نقل و عقل) سے جانچ کر فیصلہ کر دیا ہے۔

---

(۱۲) **رسائل و مقالات**، علامہ نے سب سے پہلا مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھا تھا۔ اس کے بعد تصانیف کے ساتھ چھوٹے بڑے مقالات بھی مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ پھر ندوۃ العلماء کی طرف سے ماہوار رسالہ "الندوہ" جاری کیا۔ اس میں کثرت سے ہر قسم کے مضامین لکھے۔ تمہیدی مضامین "رسائل شبلی" کہلاتے ہیں۔ اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ اب دار المصنفین نے **مقالات شبلی** ۸ جلدوں میں اس ترتیب سے شائع کر دیے ہیں:۔

جلد اول۔ مذہبی مضامین۔ جلد دوم ادبی مضامین۔ جلد سوم تعلیمی مضامین۔
جلد چہارم تنقیدی مضامین۔ جلد پنجم سوانحی مضامین۔ جلد ششم تاریخی مضامین
جلد ہفتم فلسفیانہ مضامین۔ جلد ہشتم قومی مضامین۔

یہ تمام مضامین علامہ شبلی کے زورِ قلم، قوتِ استدلال، وسعتِ تحقیق اور دقتِ نظر کے شاہد ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے و نظریہ سے اختلاف ہو سکتا ہے، کہیں تحقیق میں جانبداری بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ جزئی باتیں ہیں۔ اس لئے لائقِ اعتنا نہیں۔ علامہ نے بعض ایسے مضامین (مثلاً تاریخی) پر قلم اٹھایا ہے جن کی طرف ان سے پہلے کسی کو توجہ نہ ہوئی تھی، اور جن کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ علامہ کے معاصرین میں سب سے بڑے "مقالہ نگار" مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے علامہ شبلی کے مقابلے میں نہایت کثیر و ضخیم ہیں۔ "مقالات شبلی" کے موضوعات میں سے چھ سات موضوع "مضامین شرر" میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے "تاریخ" میں دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر اپنے مضمون کو نادر

دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تحقیق کی کدوکاوش زیادہ نہیں کرتے، اور شبلی تاریخ و تحقیق کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین علامہ کے تاریخی مضامین کے متعلق لکھتے ہیں:-

"یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی حریت خیال جہاں مذہب اور اپنے زمانے کے پالیٹکس میں حاوی تھی، وہاں تاریخی معاملات میں خاص کر مطلق العنان و جابر بادشاہوں کی تائید میں وہ مفقود ہو جاتی تھی۔ ان کا دماغ اس قسم کے متباین رجحانات سے معمور ہے۔ ان کے اس میلان کی زیادہ تر یہی وجہ تھی کہ یورپین اور عیسائی مورخوں اور آریہ مناظروں نے طریقۂ اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمران پر اعتراضات کیے اور بےجا سختی روا رکھی تھی اور اس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ قرن کے افعال کو بدنیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اس بے اعتدالی کے جواب میں مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (معاذ اللہ) ان کے عام درباری اور اہل زمانہ نہایت مفید اور اچھے کام کرتے تھے۔ حالانکہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت آج اس قدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر، جہانگیر یا عبدالحمید خاں کی تائید سے اصل اسلام پر الزام تک کی نوبت نہیں پہنچے گی، ہمارا خیال اس کے خلاف ہے۔ ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔" (مضمون مطبوعہ سیر المصنفین)

اس مضمون کا مرکزی خیال بالکل درست ہے کہ علامہ کبھی جانب داری میں اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ شاہان جابر کے جن افعال سے

انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی تاویل کیوں کرتے ہیں۔ ان کو ظالم و خاطی ہی کیوں نہیں رہنے دیتے۔ ورنہ علامہ ایسا کبھی نہیں کرتے کہ بادشاہوں، ان کے درباریوں یا اہل زمانہ کے ایسے کاموں کو جو منافیِ اسلام و مخالفِ شرع ہوں، جائز و مستحسن قرار دیں۔ اس لئے ان کے افعال کی ذمہ داری خود انھیں بزرگوں پر رہتی ہے۔ اصل اسلام پر الزام کی نوبت نہیں آتی۔ علامہ کی تاویل صرف اس بات کے کہنے کی گنجائش نکال دیتی ہے کہ "ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو"

لیکن جہاں علامہ شبلی نے بے بنیاد الزامات کی تردید کی ہے۔ مشہور تاریخی مزخرفات کی بیخ کنی کی ہے۔ اور مخالفانِ اسلام کا تعصب ثابت کیا ہے، وہ ان کا غیر فانی کارنامہ ہے۔

ہر مصنف کی تصانیف میں مقالات و مضامین کا خاص مرتبہ ہوتا ہے۔ بعض مصنف اپنے مضامین ہی کی بدولت زندہ ہیں اور رہیں گے۔ علامہ شبلی کے مقالات بھی ان کی اکثر تصنیفات سے زیادہ مقبول و دیرپا ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق دہلوی نے اب سے دس برس پہلے لکھا تھا کہ "مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے گھن لگنی شروع ہو گئی ہے۔" (مقدمہ "خطوطِ شبلی" مطبوعہ ۱۹۱۶ء) یہ زمانہ کا "عمل جراحی" ہے، اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ اس حساب سے سرسید اور مولوی ذکاء اللہ کی دیواریں تو اس گھن سے ڈھے چکیں۔ باقی "عناصرِ اربعہ" کے آب و گل میں ابھی جان باقی ہے۔ ان میں علامہ شبلی ابھی ایک مدت زمانہ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن **مضامین و مقالات** ان سب مصنفوں کے بڑے جاندار ہیں۔ ان میں "بقائے اصلح" کا قانون جاری رہے گا، مگر فنا نہ ہوں گے۔

مقالاتِ شبلی کی جلدوں میں سو سے زیادہ چھوٹے بڑے مضامین ہیں۔ بعض مضمون ۴۰، ۵۰ صفحوں کے ہیں۔ بعض مضامین دو دو صفحے کے [illegible]

نادر و جدید ہیں۔ ہم ایک دو مقالوں کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ ہر مقالے میں سے کچھ عبارتیں چھوڑ دی ہیں۔

(الف) **زیب النسا کی ولادت** زیب النسا اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی، اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا، شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی تھی، شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں ہے، جہانگیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خاں کے خطاب سے ملقب ہوا، شاہ جہاں کے زمانے میں بھی کارہائے نمایاں کئے، چونکہ لیاقتِ ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا، شاہ جہاں نے ۱۰۴۷ھ میں کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا، اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کردی، چار لاکھ مہر باندھا گیا، طالب کلیم نے مادۂ تاریخ کہا ع

دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ

زیب النسا شادی کے دوسرے سال شوال ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئی، عالمگیری امرا میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا، اس کی ماں حافظہ مریم قابل اور تعلیم یافتہ تھی، زیب النسا جب پڑھنے کے قابل ہوئی، تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی، زیب النسا نے قرآن مجید حفظ یاد کیا، جس کے صلے میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النسا نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی، اور بڑے بڑے علما و فضلا اس کی خدمت میں رہتے تھے، لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور بار یاب ملا سعید اشرف ماژندرانی تھے، ملا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ عالمگیر کے آغاز جلوس میں ایران سے آئے اور عالمگیر نے ان کو زیب النسا کی تعلیم کے لئے مقرر کیا،

اس وقت زیب النسا کی عمر تقریباً اکیس برس کی تھی، اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر ممتد ہوتا تھا، زیب النسا نظم و نثر میں ملا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

ملا اشرف شاعر بھی تھے، اور شاعری ہی کے وصف سے مشہور ہیں۔ قریباً ۱۳-۱۴ برس، وہ تعلیم کے تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے، ۱۰۸۳ھ میں وطن جانا چاہا، زیب النساء کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست کو اس طرح ادا کیا تھا۔

یک بار از وطن نتواں برگرفت دل — در غربتم اگرچہ فزون ست اعتبار

پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند — گو خدمت حضور نباشد مرا شعار

نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان — دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندہار

زیب النساء نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس کا مذاق طبیعت جس قسم کا واقع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے وہ پالیٹکس سے بالکل ناآشنا تھی؛ تاہم عالمگیر کے پُرپیچ عہد حکومت میں وہ بھی اس بدنامی سے نہ بچ سکی، ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں نے جب عام بغاوت کی، اور عالمگیر نے ان کے دبانے کے لئے شہزادہ اکبر کو فوجِ گراں دے کر چتوڑ پور کی طرف روانہ کیا، تو راجپوتوں کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہوگیا، اور عالمگیر کے مقابلہ کو بڑھا، زیب النساء اور شہزادہ اکبر حقیقی بھائی بہن تھے، دونوں میں خط کتابت بھی تھی، یہ خطوط پکڑے گئے اور عالمگیر نے اس کے انتقام میں زیب النساء کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی بند کردی، اس کے ساتھ تمام مال و متاع ضبط کر لیا گیا، اور قلعہ سلیم گڈھ میں رہنے کا حکم ہوا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اس کی بے گناہی ثابت ہوئی، اور عفو قصور کر دیا گیا۔

زیب النسا نے شادی نہیں کی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطینِ تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے۔ لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے، خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النسا بیگم اور مہر النسا بیگم، سپہر شکوہ اور ایزد بخش پسر شہزادہ مراد سے بیاہی تھیں۔ چنانچہ مآثرِ عالمگیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمہ کی سب تاریخوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

عالمگیر زیب النسا کی نہایت عزت کیا کرتا تھا، جب وہ کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لیے شہزادوں کو بھیجتا تھا۔ سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا، کشمیر کے دشوار سفر میں بھی ساتھ تھی۔ لیکن جب عالمگیر دکن گیا تو اس نے غالباً اپنی علمی زندگی کی وجہ سے پایۂ تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی بہن زینت النسا عالمگیر کے ساتھ گئی، چنانچہ اس کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے۔ زیب النسا نے دلی میں قیام کیا، اور وہیں پیوندِ زمین ہو گئی۔[۱] زیب النسا نے ۱۱۱۳ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتیسواں سال تھا، دلی میں انتقال کیا۔ اُدْخُلِی جَنَّتِی، تاریخ ہے۔

[۱] اس فقرے میں یہ غلطیاں ہیں کہ (۱) ۱۱۱۳ھ عالمگیر کا اڑتیسواں سال جلوس نہیں ہے۔ (۲) اور مادۂ تاریخ "اُدْخُلِی جَنَّتِی" سے ۱۱۱۳ھ نہیں نکلتا۔

تاریخوں کے بیانات اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ سنین و واقعات کا تعین و مطابقت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں تاریخی مادّے بڑے کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ علامہ شبلی جیسے محبِ ادب و مورّخ تاریخی مادّے بھی غلط نقل کر کے دھوکے میں ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً مقالاتِ شبلی جلد سوم (تعلیمی) کے صفحہ ۹۰ پر ملا نظام الدین بانیِ درسِ نظامیہ [illegible] حاشیہ صفحہ ۹۰ پر

عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔ یہ خبر سن کر سخت غمزدہ ہوا، بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے، اور باوجود انتہا درجہ کے استقلالِ مزاج کے صبر کی تاب نہ لا سکا۔ سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصالِ ثواب کے لئے زکوٰۃ و خیرات دیں اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸۴)

سالِ وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے اور تاریخ وفات کا یہ مصرع لکھا ہے "ملک بود و بیک حرکت ملک گشت" لیکن اس میں سنہ وفات سے کئی سو زائد نکلتے ہیں۔ اب اگر کسی کو ملا صاحب کا سنہ وفات یاد نہ ہو اور علامہ کا لکھا ہوا مصرع یاد ہو اور وہ سنہ دریافت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ مزید لطف یہ کہ اس مضمون سے دس برس بعد علامہ نے ایک اور مضمون "درسِ نظامیہ" لکھا ہے۔ اس میں ملا صاحب کی کسی تاریخ وفات کا پورا قطعہ درج کیا ہے۔ اس میں مصرع تاریخ یہ لکھا ہے "ملک بود و بیک حرکت ملک شد" یہ صحیح ہے لیکن اس میں ذرا سا تغیر ہو گیا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہیے "ملک بود و بیک حرکت ملک شد" اب ۱۱۶۱ھ پورے ہو جائیں گے۔

بہرحال ہم سنین "زیب النساء" میں تاریخ گوئی کی سند اختیار کرتے ہیں۔ کسی قدیم تاریخ گو نے عالمگیر کے متعلق یہ تاریخیں نکالی ہیں:- تاریخ ولادت: **آفتابِ عالم تاب** (۱۰۲۸ھ) تاریخ جلوس: **آفتابِ عالم تابم** (۱۰۶۸ھ)، تاریخ وفات: **آفتابِ عالم تابِ من** (۱۱۱۸ھ)۔ اس حساب سے سالِ جلوس ۱۰۶۸ھ ہوتا ہے، تو اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوا۔ تاریخوں سے بھی یہی ثابت ہے اور خود علامہ شبلی کی ایک اور تحریر سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین صاحب مذکور الصدر کے حالات میں صفحہ ۵۳ پر ملا صاحب کے بھائیوں کے نام عالمگیر کا فرمان نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں "سنہ ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ" اس کے مطابق بھی اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوتا ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۷۸۶ پر)

خافی خاں نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النسا کا نام اور اس کے واقعات سنہ ۱۱۲۶ھ تک آتے ہیں۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے کاتبوں نے غلطی سے زینت النسا کو زیب النسا سے بدل دیا ہے۔

کمالات علمی اور عام اخلاق و عادات

تمام مورخین نے بتصریح لکھا ہے کہ زیب النسا علوم عربیہ و فارسی زباندانی میں کمال رکھتی تھی۔ نستعلیق نسخ و شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی۔ لیکن اس کی تصنیف سے آج کوئی چیز موجود نہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی۔ اور دیوان مخفی جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے اسی کا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعرہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا۔ اسی تذکرہ میں ملا سعید اشرف کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النسا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

زیب النسا کا انتقال ۲۶ ذی الحجہ ۱۱۱۳ھ کو ہوا ہے۔ لیکن مادہ تاریخ "داخلی جنتی" میں ۱۱۱۲ھ نکلتا ہے۔ اگر یہ تاریخ اسی زمانے میں کہی گئی ہے تو اتنا بڑا فرق نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک ہی تاویل و تطبیق ہمارے ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ ۲۵ ذی الحجہ کو انتقال ہوا جب ۱۱۱۲ھ کے ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے۔ ایسی صورت میں تاریخ گو سال آئندہ کا مادہ تاریخ کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس تاریخ گو نے بھی ۱۱۱۳ھ کا مادہ نکالا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اس آیت کے شروع میں واو بھی ہے۔ اگر اسے داخل مانتے تو مادہ تاریخ نکلتی ہے "وادخلی جنتی" میں ۱۱۱۳ھ نکلتے ہیں۔ تاریخوں میں نقل ہوتے ہوتے واو عطف چھوٹ گیا۔ ویسے ہی علامہ شبلی نے نقل کر دیا۔ ان کو اعداد گننے سے بڑی دقت ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی دقت عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ان کی والدہ کی تاریخ وفات نکالنے سے معذرت کی تھی۔ مرثیہ لکھ دیا تھا۔

حامد حسن قادری ۲۵ شعبان ۶۳ء

کی بیاضِ خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی، چنانچہ سعید اشرف نے اس پر ایک قطعہ لکھا جو آگے آئے گا، غالباً یہ اشعار کی بیاض ہوگی، تذکروں میں یہ دو شعر زیب النساء کے نام سے منقول ہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد | کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت | غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

زیب النساء کی تصنیفات و تالیفات سے زیب المنشآت کا ذکر البتہ تذکروں میں آیا ہے۔ تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے اس کو دیکھا ہے "یہ زیب النساء کے خطوط و رقعات کا مجموعہ ہے۔

علم پروری

زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن اس نے اپنی نگرانی میں اہلِ فن سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔

زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈمی (بیت العلم) تھی، ہر فن کے علماء اور فضلاء نوکر تھے جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے، یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جزء زیب کا لفظ ہوتا تھا، اس سے کہ تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے، اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیفات میں شمار کیں۔

زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں زیادہ قابل ذکر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اس لئے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے، حکم دیا کہ اس کو فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النسا نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک
عظیم الشان کتب خانہ کا ہونا بھی ضرور تھا جس سے مصنفین فائدہ اٹھا سکیں،
چنانچہ بیگم موصوف نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا۔ مصنف
مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی
مصنف مذکور کے اصلی الفاظ یہ ہیں :-

"در سرکار عالیہ کتب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظر ہیچ یکے در نیامدہ باشد"

(صفحہ ۵۳۵)

زیب النسا کے حسن مذاق سے بڑا نفع یہ ہوا کہ عالمگیر کی خشک مزاجی
نے جو نقصان پہنچایا تھا، اس کی تلافی ہوگئی۔ یاد ہوگا کہ دربار میں ملک الشعرائی کا
خاص عہدہ ابتدا سے سلطنت سے چلا آتا تھا، جس پر فیضی، طالب آملی، قدسی،
کلیم مامور رہ چکے تھے۔ عالمگیر نے اس عہدہ کو موقوف کردیا، اور دفعۃً شعرا گویا
بے خانماں ہوگئے، لیکن زیب النسا کی قدر دانی نے پھر وہ دربار قائم
کردیا۔ مختلف تقریبوں پر شعرا قصیدے اور نظمیں لکھ کر پیش کرتے تھے، اور
گراں بہا انعام پاتے تھے۔ زیب النسا کی شعر دوستی کا یہ اثر ہوا کہ اہل سخن
معمولی عرض و معروض بھی شعر ہی میں کرتے تھے۔

نعمت خان عالی اس زمانے کا مشہور شاعر تھا، ایک دفعہ اس نے ایک
مرصع کلغی جو دستار پر لگاتے تھے زیب النسا کی خدمت میں فروخت کے
لئے پیش کی۔ زیب النسا نے رکھ لی، لیکن جیسا کہ درباروں کا معمول ہے قیمت
کے ملنے میں دیر ہوئی۔ نعمت خان نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی :-

اے بندگیت سعادت اختر من
در خدمت تو عیاں شدہ جوہر من

گرچینہ خریدنی ست پس کو زرمن   ورنیست خریدنی بزن برسرمن

اگر خریدنا ہے تو دام دلوایئے   اور نہ خریدنا ہو تو میرے سر ماریئے

بیگم نے پانچ ہزار روپیے دلوائے، اور کلغی واپس کر دی۔

جہاں آرا بیگم (زیب النساء کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ کی سیر کو نکلی، ہر طرف پردہ کرادیا گیا، میر صیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا، وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا، بیگم کا ہاتھی جب اس سے گذرا تو بے ساختہ صیدی نے یہ مطلع پڑھا ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش   تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

باغ میں برقع پہن کر اس لے جاتی ہے   کہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں آئے

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں، بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپیے دلوادئے لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ شہر سے نکال دیا جائے (یعنی یہ گستاخی کیوں کی) اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے۔

اخلاق وعادات

زیب النساء اگرچہ درویشانہ و صوفیانہ مذاق رکھتی تھی، تاہم شاہجہاں کی پوتی تھی، اس لئے نفاست پسندی اور امارت کے سروسامان بھی لازمی تھے، عنایت اللہ خاں جو امرائے عالمگیری میں مقرب خاص تھا، زیب النساء کا میر خانساماں تھا، کشمیر میں جابجا جو خوشگوار اور خوش منظر چشمے ہیں، ان میں سے ایک چشمہ جس کا نام اچول تھا، زیب النساء کی جاگیر میں تھا، زیب النساء نے اس کے متصل ایک نہایت پرتکلف باغ اور شاہانہ عمارتیں تیار کرائی تھیں، چنانچہ عالمگیر جب ۱۰۷۳ھ میں کشمیر کے سفر کو گیا ہے، تو اس مقام پر ایک دن قیام کیا، اور زیب النساء نے قاعدہ

کے موافق نذر پیش کی اور روپے نچھاور کیے۔

۱۰۸۰ھ میں ابرک کا ایک بڑا خیمہ تیار کرایا تھا، جو تمام تر شیشہ معلوم ہوتا تھا۔ نعمت خان عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔

بھائیوں سے نہایت محبت رکھتی تھی۔ ۱۱۰۰ھ میں جب اعظم شاہ مرض استسقا میں سخت بیمار ہوا تو زیب النساء نے اس کی تیمارداری اس محبت سے کی کہ تمام ایام مرض تک اس پرہیزی غذا کے سوا جو خود شہزادہ کھاتا تھا کوئی اور غذا نہیں کھائی۔ محمد اکبر جس زمانے میں عالمگیر سے باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا ہے، اس زمانے میں بھی زیب النساء نے اس سے برادرانہ راہ و رسم اور خط و کتابت ترک نہ کی، جس کے صلے میں اس کی تنخواہ اور جاگیر ضبط ہو گئی۔

زیب النساء کے متعلق جھوٹے قصے

زیب النساء کے متعلق متعدد جھوٹے قصے مشہور ہو گئے ہیں، جن کو یورپین مصنفوں نے اور زیادہ آب و رنگ دیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیب النساء اور عاقل خاں سے عاشقی اور معشوقی کا تعلق تھا۔ اور زیب النساء اس کو چوری چھپے سے محل میں بلایا کرتی تھی۔ ایک دن عالمگیر محل میں موجود تھا کہ اس کو پتہ لگا کہ عاقل خاں محل میں ہے اور حمام کی دیگ میں چھپا دیا گیا ہے، عالمگیر نے انجان بن کر اسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ عاقل خاں نے اخفائے راز کے لحاظ سے دم نہ مارا اور جل کر رہ گیا۔ مرنے کے وقت یہ مطلع کہا تھا:۔

بعد مردن زجفائے تو اگر یاد کنم　　　زکفن دست بردل آرم و فریاد کنم

عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے، اور چونکہ شاعر تھا، تمام تذکروں میں اس کے حالات مذکور ہیں، لیکن اس واقعہ کا کہیں

نام و نشان نہیں، جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا اور جو مستند اور معتبر خیال کی جاتی ہیں حسب ذیل ہیں:۔ عالمگیر نامہ، ماثر عالمگیری، ماثر الامرا، تذکرۂ سرخوش، خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، ید بیضا۔ ان کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں، حالانکہ اس کی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے، جو ۱۱۱۳ھ میں واقع ہوئی۔

دوسرا واقعہ یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ زیب النساء نے یہ مصرع کہا:

اثر ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے، لیکن دوسرا مصرع اس کی جوڑ کا موزوں نہیں ہوتا تھا۔ ناصر علی کے پاس مصرع لکھ کر بھیجا۔ اس نے برجستہ کہا:۔

ز ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم — شاید رسیدہ بر لب زیب النسا لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ و جلال اور آداب و آئین سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ بیچارے ناصر علی کو خواب میں بھی اس گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

(الندوہ: جلد ۲ نمبر ۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

(ب) تحفۃ الہند

مسلمانوں کی توجہ سنسکرت بھاشا پر۔ برج بھاشا کا فن معانی و بیان

تحفۃ الہند جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ مصنف کا نام میرزا خان بن فخر الدین محمد ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ

میں شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تصنیف کی۔ کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے۔ اس میں ۷ باب ہیں۔

۱۔ پینگل یعنی علم عروض ۲۔ تک، یعنی قافیہ

۳۔ النکار یعنی علم بدیع ۴۔ سنگار رس یعنی عشق و محبت

۵۔ سامدرک یعنی علم قیافہ ۶۔ کوک، یعنی علم النساء

۷۔ لغات ہندی۔ اس میں برج بھاشا کے ضروری کثیر الاستعمال الفاظ لکھے ہیں اور ان کے معنی بتائے ہیں۔

یہ کتاب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے اور اس کے سب سے چہیتے اور منظور نظر فرزند کے مطالعہ کے لئے تصنیف ہوئی ہے۔ عالمگیر کی نسبت اس کے مخالفوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تعصب کا دیوتا تھا اور اس نے ہندوؤں کی نہ صرف عمارات بلکہ ان کے لٹریچر کو بھی مٹا دینا چاہا تھا اور اس لئے ان کی تمام درسگاہیں اور پاٹ شالے بند کرا دئے تھے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخ کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ عالمگیر ملک کے ایک ایک جزئی واقعہ سے اس قدر واقفیت رکھتا تھا کہ کسی حصہ ملک کا ادنیٰ سا واقعہ بھی اس کی نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، باوجود اس کے برج بھاشا کو جس قدر اس کے زمانہ میں ترقی ہوئی، مسلمانوں نے جس قدر اس کے زمانہ میں ہندی کتابوں کے ترجمے کئے اور خود جس قدر برج بھاشا میں نظم و نثر لکھی کسی زمانہ میں اس قدر ہندی کی طرف التفات نہیں ظاہر کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل ہم ایک مستقل مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ یہ کتاب (تحفۃ الہند) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ عالمگیر جو اپنے بیٹوں کی ایک ایک حرکت سے خبر

رکھتا تھا، اس کی نظر سے ایک ایسی کتاب جو اس کے محبوب ترین شہزادہ کے لئے لکھی جائے مخفی رہ جائے۔ نعمت خان عالی نے وقائع لکھی اور عالمگیر سے چھپانے کی بے انتہا کوشش کی، لیکن چھپ نہ سکی۔

اس کتاب میں سے ہم صرف صنائع وبدائع کے حصہ کا اقتباس درج کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی زبان کے فن بدیع کو عربی سے کیا نسبت ہے؟ اس موقع پر یہ بات بھی اظہار کے قابل ہے کہ مصنف نے ہندی صنائع و بدائع کی تفصیل لکھ کر، چند صنعتیں خود اضافہ کی ہیں۔ ان کے خود نام رکھے ہیں۔ اور ان صنعتوں میں خود ہندی اشعار کہہ کر درج کتاب کئے ہیں، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کو خود اس زبان میں کہاں تک قدرت تھی، یہ صنائع اکثر بلکہ قریباً کل عربی سے لئے ہیں۔ اور عربی ناموں کا ترجمہ بھاشا میں کر دیا ہے۔

بھاشا میں علم بدیع کو النکار کہتے ہیں، چونکہ بلاغت کا اصلی کام جذبات اور احساسات پر اثر ڈالنا ہے، اس لئے النکار کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

۱- **نورس**۔ اس میں تمام احساسات کا استقصار کیا ہے اور ان کی نو قسمیں قرار دی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سرنگار رس۔ اس کی دو قسمیں ہیں، سنجوگ۔ بیوگ سنجوگ، یعنی وصال و فراق۔

ہاسیہ رس۔ مسرت و خوشی۔ **کرنا رس**۔ رحم و ہمدردی

ویر رس۔ شجاعت و بہادری۔ **رَودر رس**۔ غیظ و غضب

بھے رس۔ خوف و بیم **بی بھتس رس**۔ نفرت و کراہت

۵۔ یہ لفظ علامہ کے مضمون میں "بی بھس" لکھا ہے، لیکن اصل میں "بی بھتس" ہے۔

شانت رس۔ سکون و اطمینان؛ **ادبھت رس**۔ استعجاب

عربی اور فارسی زبان میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہندی کو فارسی اور عربی پر ترجیح ہے۔

۲- وِنْ٥ے نیگ۔ کسی مضمون کو لطیف، نازک، اور شوخ پیرایہ میں ادا کرنے کو کہتے ہیں، مثلاً عورت اپنے محبوب شوہر سے جو کسی دوسری عورت پر عاشق ہے کہتی ہے کہ پیارے! تیری پیشانی پر جو سرخی ہے، یہ تیری سُرخ ٹوپی کا عکس ہے، یا رقیبہ کی حنا کا اثر ہے۔

سوال سے بظاہر صرف اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر سے رقیبہ کے پاس جانے، اور اس سے ملنے کی شکایت ہے، لیکن درپردہ وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ شوہر نے رقیبہ کے پاؤں پر پیشانی رگڑی ہے، جس سے پیشانی میں سرخی آگئی ہے، یہ وہ صنعت ہے، جس کو عربی میں تعریض کہتے ہیں۔

سنسکرت کا انشا پرداز اس صنعت کو اس قدر وسعت دیتا ہے کہ الفاظ اور عبارت کی ضرورت نہیں۔ صرف حالت کا دکھا دینا بھی اس صنعت میں داخل ہے۔ مثلاً محبوب رات بھر کا جاگا ہوا کسی صحبت سے آیا ہے، جس کی وجہ سے بال پریشان ہیں۔ آنکھیں مخمور ہیں، انگڑائیوں پر انگڑائیاں آرہی ہیں۔ عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ صرف آئینہ لاکر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ سب کچھ کہہ دے گا۔ یہ بھی اسی صنعت میں داخل ہے۔

۳- اُپمان، اس کے معنی تشبیہ کے ہیں، تشبیہ ایک نہایت لطیف صنعت ہے، عربی میں اس کو نہایت وسعت دی ہے، اور اس کی

---

٥ اس کو علامہ نے "دسے نیگ" لکھا ہے۔ لیکن "ودسے نیگ" درست ہے۔

بہت سی قسمیں کی ہیں۔ بھاشا میں بعض باتیں تو مشترک ہیں مثلاً **مکھ اُپمان**،
یعنی جب تشبیہ کے الفاظ مذکور ہوں، مثل چوں، مثل وغیرہ۔

لُپت اُپمان، حرف تشبیہ مذکور نہیں لیکن مقدر رہے جیسے "قندِ لب"
یعنی لب چوں قند۔ اس کو عربی میں استعارہ کہتے ہیں۔

ورود یا بھاس النکار: یعنی عبارت کے معنی واقع میں صحیح ہوں،
لیکن بظاہر غلط معلوم ہوں جب ایک لفظ کے معنی مختلف ہوتے ہیں، تو اس
صنعت سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً بھاشا میں سیام سیاہ کو بھی کہتے ہیں، اور
معشوق کو بھی، اسی طرح لال، سرخ کو بھی کہتے ہیں اور محبوب کو بھی، اب اگر
یہ کہا جائے کہ "سیام زرد ہے" تو بظاہر غلط ہوگا۔ کیونکہ سیاہ چیز زرد نہیں
ہوسکتی، لیکن اگر سام کے معنی محبوب کے لئے جائیں تو یہ جملہ صحیح ہوسکتا ہے۔

عربی میں اس صنعت کو نہایت وسعت دی ہے، مقامات حریری
میں سو فقہی سوال اور جواب ہیں، جواب تمام تر غلط معلوم ہوتے ہیں، لیکن
واقع میں صحیح ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کے بعد، نعل
کو چھوئے تو کیا حکم ہے۔ جواب دیا ہے کہ "وضو ٹوٹ جائے گا" نعل عربی
میں جوتی کو کہتے ہیں اور یہ معنی زیادہ متداول ہیں، لیکن نعل عورت کو بھی
کہتے ہیں اور شافعیوں کے نزدیک عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

؎ "قندِ لب" کو استعارہ نہیں کہتے بلکہ تشبیہ ہے بغیر حرف تشبیہ کے۔ جیسے لُجَیْنُ الْمَاءِ
(سیم آب: پانی کی چاندی) یعنی مَاءٌ کَالُّجَیْنِ (آب چوں سیم، چاندی جیسا پانی)۔ یا مثلاً
"گلِ رخسار" تشبیہ ہے، اور "رخسارِ گل" استعارہ۔ استعارہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ
میں سے صرف ایک مذکور ہوتا ہے۔ اور تشبیہ میں دونوں ہوتے ہیں۔ "قندِ لب" میں دونوں
ہیں، لب مشبّہ۔ قند مشبّہ بہ۔

سکارن اُت پریکھیا، حسن تعلیل کو کہتے ہیں، یہ صنعت عربی اور فارسی میں بہت مستعمل ہے، بھاشا میں اس کے نہایت لطیف نئے نئے پیرایے ملتے ہیں، مثلاً چاند معشوق کا حسن چرا کر آسمان پر بھاگ گیا، اسی وجہ سے ہمیشہ چوروں کی طرح رات کو نکلتا ہے۔ فارسی کا شاعر کہتا ہے ؎

زشرمِ ابروانِ بلندِ تو ماہِ نو — خود را چناں نمود کہ کس دید و کس نہ دید

یعنی معشوق کے ابرو کی شرم سے ماہِ نو اس طرح چھپ کر نکلا کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا۔

اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ہمارے انشا پردازوں نے سنسکرت اور برج بھاشا کے علم ادب کے نکتہ نکتہ کو سمجھا اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا، لیکن اس کے فیض سے نثر بھی محروم رہ گیا، جو سب سے زیادہ حقدار تھا، یہ ظاہر ہے کہ اردو بھاشا سے نکلی اور اس کے دامن میں پلی لیکن بھاشا سے جو ورثہ اس کو ملا، صرف الفاظ تھے۔ مضامین اور خیالات سے اس کا دامن خالی رہا۔ بخلاف اس کے عربی زبان، جس کو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ سنسکرت اور بھاشا دونوں سے مستفید ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج سے ۵۰ برس پہلے مسلمان، اردو کو کوئی علمی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ خط کتابت تک فارسی میں تھی، اردو شعرا جس قدر گزرے ان میں سے ایک بھی عربی کا فاضل نہ تھا، یا یوں کہو کہ کوئی عالم اردو کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں انشا پردازی یا شاعری کا کمال دکھائے۔ علمی زبان اس وقت صرف عربی تھی، اس لئے جہاں سے جو سرمایہ ملتا تھا اسی کے خزانہ میں جمع کیا جاتا تھا، بہرحال ہندی شاعری کے مضامین عربی زبان میں جیسے نقل ہوئے، یعنی علم سے [illegible] سے سنسکرت [illegible] بھاشا کی

نظموں کا بعینہ عربی میں ترجمہ کیا۔ ہم چند مثالیں ذیل میں لکھتے ہیں۔ یہ مثالیں سبحۃ المرجان سے لی گئی ہیں، مولوی غلام علی آزاد نے ہر جگہ تصریح کر دی ہے کہ وہ ہندی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

نَحَلْتُ غَداةً فِي يَوْمِ رَاحَ حَبِيبُهَا   إِلَى أَنْ هَوَى عَنْ سَاعِدَيَّ أَسَاوِرُهَا
وَلَمَّا أَتَاهَا مُخْبِرٌ عَنْ قُدُومِهِ   عَلَى سَاعِدِ الْمَلْآنِ ضَاقَ سِوَارُهَا

(یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندی میں عاشق عورت ہے اور مرد معشوق ہے)

یعنی جس دن معشوق نے سفر کیا، میں اس قدر دبلی ہو گئی کہ ہاتھ کے کڑے ڈھیلے ہو کر گر پڑے، لیکن جس دن قاصد نے آ کر معشوق کے آنے کی خبر دی اور میں نے کڑوں کو پہننا چاہا تو اب وہ تنگ ہو گئے اور چڑھتے نہ تھے۔

مَا لَاحَ فِي شَفَتَيْكَ كُحْلٌ رَائِقٌ   إِنِّي أُبَيِّنُهُ بِحُسْنِ بَيَانِ
خَتَمَتْ عَلَى شَفَتَيْكَ ذَاتُ تَدَلُّلٍ   كَيْلَا تُكَلِّمَنِي عَلَى الْأَحْيَانِ

واقعہ یہ ہے کہ شوہر کسی اور محبوبہ سے مل کر آیا، اور چونکہ اس نے اس کی سرمگیں آنکھوں کو چوما، اس لئے اس کے ہونٹوں پر سیاہی لگ گئی ہے، اب عورت شوہر سے کہنے آئی ہے کہ تیرے ہونٹوں پر جو سیاہی ہے، میں بتاؤں کیوں ہے، اور کہاں سے آئی ہے، کسی کافر ادا نے تیرے ہونٹوں پر مہر کر دی ہے، کہ تو کبھی مجھ سے بات نہ کرے۔

(الندوہ فروری ۱۹۱۱ء)

(۱۲) **مکاتیب و خطوط** ۔ علامہ کے خطوں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دو حصے "مکاتیب شبلی" کے نام سے دار المصنفین نے شائع کئے ہیں۔ ایک میں علامہ کے عام مکتوبات ہیں۔ دوسرے میں خاص ان کے تلامذہ کے نام۔ یہ خطوط ایسے ہی ہیں جیسے دوسرے مشاہیر علم و ادب کے ہیں۔ لیکن ایک تیسرا نادر مجموعہ

خطوطِ شبلی کے نام سے مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے ۱۹۲۶ء میں
شائع کیا ہے۔ یہ دو مشہور خاتونوں کے نام لکھے گئے ہیں یعنی عطیہ فیضی بیگم اور
زہرا فیضی بیگم کے نام۔ یہ دونوں نواب بیگم نازلی فیضی اہلیہ محترمہ ہز ہائی نس نواب
صاحب جنجیرہ (بمبئی) کی بہنیں ہیں۔ بمبئی کے مشہور خاندان فیضی سے تعلق رکھتی ہیں۔
بمبئی میں علامہ شبلی کا اس خاندان سے تعارف ہوا۔ زبیری صاحب "خطوط" کے
دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

> جس وقت بمبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے ان کا تعارف ہوا اس وقت
> عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انھوں نے آزادانہ
> تعلیم پائی تھی اور پہلی مسلمان خاتون تھیں جو یورپ کو تعلیم کے لئے گئی تھیں۔
> بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان خاندانوں کی طرح آزادانہ معاشرت تھی۔ یہ خاندان عرصہ
> تک استنبول میں بھی مقیم رہا تھا۔ ان کے والد تاجر تھے اور بسلسلہ تجارت
> وہاں قیام تھا۔
>
> عطیہ بیگم صاحب کی دوسری بہنوں زہرا بیگم صاحب اور نازلی رفیعہ بیگم
> صاحب نے اگرچہ عطیہ بیگم صاحب کی طرح باقاعدہ تعلیم نہیں پائی لیکن تاہم
> نہایت قابل ہیں۔ اردو سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ صاحب تصنیف و تالیف
> ہیں۔ اہل کمال کی قدرشناس ہیں۔ ان کی مجلس میں علمی تذکرے رہتے
> ہیں۔ زہرا بیگم صاحب کو واقعہ نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ عطیہ بیگم صاحب
> سب سے چھوٹی ہیں لیکن سب سے زیادہ تیز اور ذہین ہیں۔ مولانا نے
> ان میں وہ سب جوہر دیکھے جن سے ایک خاتون قابلِ رشک مرتبہ حاصل
> کر سکتی ہے۔ ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کو جلا دیں
> اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنا دیں۔ رفتہ رفتہ اس خاندان سے ان کے عزیزانہ

تعلقات ہوگئے۔ پھر ندوہ کی امداد اور اتحادِ دنیاں نے ان میں اور مضبوطی پیدا کر دی۔ راقم کو بارہا ان بیگمات سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ مولانا کی نسبت محبت و احترام کا جوش جو ان میں نظر آیا وہ قریب ترین احباب اور تلامذہ میں بھی بہت کم پایا گیا۔

عطیہ بیگم کے متعلق ایک نوٹ میں لکھتے ہیں :-

عطیہ بیگم صاحبہ کی شادی رحمین سے ہوئی جو یہودی مذہب رکھتے تھے۔ انھوں نے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ نہایت ممتاز و مشہور اور کامل الفن آرٹسٹ و مشہور ہیں، جن کے آرٹ کی یورپ میں خاص شہرت ہے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی بھی ایک تصویر بنائی تھی جو گویا ان کے کمالِ مصوری کی تصویر ہے۔ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۳ء میں وہ رکھی گئی تھی، اور اس کی بے انتہا قدر ہوئی۔ نہایت معقول قیمت لگی لیکن عطیہ بیگم صاحبہ نے اس کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا، اور ایوان رفعت (محل جناب نازلی بیگم صاحبہ واقع بمبئی) کی زینت ہے۔

عطیہ بیگم کی شادی کے متعلق علامہ شبلی نے ایک شعر اور ایک قطعہ کہا تھا، جو عطیہ بیگم کی بیاض سے زبیری صاحب نے دیباچہ خطوط میں نقل کئے ہیں۔ وہ یہ ہیں :-

شعر

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

قطعہ

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف اس لئے مجھ کو قرابت سے بہت دوری تھی

آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں آپ نے کھینچ لیا مجھ کو تو مجبوری تھی

علامہ نے یہ قطعہ عطیہ بیگم کو بھیجنے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی سنایا ہوگا۔ اسی زمانے

میں مشہور ہوگیا تھا۔ جب علی گڈھ کالج میں پونہچی تو ایک ذہین ذظریف طالب علم، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے (جو اب ایم اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ ہیں) اس کے جواب میں یہ قطعہ کہا:-

قطعہ

کب یہودی سے عطیہ عقد زیبا تھا تمھیں
بنت فیضی تم ہو، یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمھیں
میں نے یہ مانا۔ وہ مانی ہے تو تم تصویر حسن
تم کو کھینچا تھا۔ مصور نے جو کھینچا تھا تمھیں

اور شوہر عطیہ کی زبانی یہ شعر کہا:-

صفحہ دل پر جو کھینچی آپ کی تصویر حسن
مستحق تھا جس "عطیہ" کا وہ میں نے پالیا

یہ شبلی و سہیل کے قطعات اسی زمانے میں شاہ دلگیر اکبرآبادی مرحوم کے رسالہ نقاد آگرہ میں شائع ہوئے تھے۔

"خطوط شبلی" چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ ۹۰ صفحوں میں ۸۲ خط ہیں۔ ۵۵ عطیہ بیگم کے نام اور ۲۷ زہرا بیگم کے نام۔ سب خطوط ساڑھے تین سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں پہلا خط ۱۷ فروری ۱۹۰۸ء کا ہے اور آخری ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کا۔ اس مجموعہ کے ساتھ مولوی محمد امین صاحب زبیری جامع خطوط کا مختصر دیباچہ اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب دہلوی سکرٹری انجمن ترقی اردو کا مفصل مقدمہ شامل ہے۔

ان مکتوبات کی خصوصیت نہیں، جن جن بزرگوں کے خطوط شائع ہوئے ہیں، سرسید آزاد، حالی وغیرہ، کسی کو لکھتے وقت یہ تصور بھی نہ آیا ہوگا کہ ان پرائیویٹ اور خانگی خطوط کو ان کے مرنے کے بعد شائع کیا جائے گا۔ یہ بعد کے لوگوں کی "ستم ظریفی" ہے کہ مرے ہوؤں کے گھر کے بھید اور دل کی باتیں سر بازار تشہیر کر دیتے ہیں۔ اور "ستم ظریفی" کا لفظ اگر کہیں صادق آسکتا ہے تو اس کا بہترین محل یہ "خطوط شبلی" ہیں۔

"خطوط شبلی" کے دیباچۂ اشاعت ثانی (۱۹۳۵ء) میں زبیری صاحب لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے مؤلف **سیرۃ النبی** صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا، بعض نے ان کی اشاعت کو اس عقیدت و نیازمندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے۔ بعض نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی جو خود ان کے اپنے خیالات نے پیدا کر دی۔"

ہمارے نزدیک ان تینوں قسم کے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کے اظہار میں عجلت سے کام لیا۔ اور (بقول زبیری صاحب کے) یہ سب توہمات اور اپنے نفوس کے قیاسات تھے اور اپنی طبیعت کا رنگ تھا۔ اس لئے کہ عطیہ بیگم اور زہرا بیگم نے خوشی کے ساتھ ان کی اشاعت کی اجازت دیدی۔ اور علامہ شبلی خود ان جذبات و تعلقات میں کوئی بات ناقابل اشاعت نہ سمجھتے تھے۔ ان کے جواب میں ان بہنوں کے جو خطوط آتے تھے ان کو علامہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے، اپنی بھتیجی کو دکھاتے تھے۔ ان کے اقتباسات الہ آباد و حیدرآباد بھیجتے تھے۔ ان بہنوں کے لئے خاص خاص موقعوں پر جو فارسی و اردو کی غزلیں اور قطعے کہتے تھے، وہ خطوط میں لکھنے کے بعد سنایا بھی کرتے تھے۔ اور مجموعہ کلام فارسی میں چھپوایا بھی کرتے تھے۔ علامہ کے یہ خطوط، بمبئی و جنجیرہ کے سفر، فارسی کی غزلیں "معلوم عوام" تھیں۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا حالی مرحوم نے فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ "دستہ گل" دیکھ کر تحریر کیا تھا:-

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے "سیرۃ النعمان"، "الفاروق" اور "سوانح مولانا روم" جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے، جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے

تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں "
اس لئے درحقیقت "خطوطِ شبلی" کے چھاپنے میں "ستم" کچھ نہیں ہے، "ظریفی" سہی
ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ ان کے نوادرِ مقدمات میں ہے۔ ان خطوط کی شاعت کی ضرورت بتاتے ہیں :۔

"ایک تو ان کا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا، دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے، اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا۔۔۔۔ تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بُو آتی ہے، جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے، اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے "

بعض لوگوں نے "مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی"[۵۱] لیکن "شوخی" ہم کو بھی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

مولانا کے ارشد تلامذہ نے حال ہی میں شعر العجم کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے۔ گویا واقعات، شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ "شعر العجم" واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے (تو معلوم ہوتا[۵۲] (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور ان کے ذہن میں تھا، وہ شعر العجم میں نہیں، ان خطوط میں ہے۔ اُس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک

---

[۵۱] علامہ سید سلیمان ندوی۔
[۵۲] یہ بریکٹ ہم نے جملہ کو مربوط کرنے کے لئے بڑھا دیا ہے۔ دوسرا بریکٹ مولوی صاحب کی تحریر میں ہے۔

دستۂ گل تیار کیا ہے، اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ نقل ہے اور یہ اصل ہے، وہ جگ بیتی ہے یہ آپ بیتی۔ اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے، وہ جگ بیتی میں کہاں۔

ہم ان **خطوط** میں سے علامہ شبلی کے چند جذبات و خیالات کا اقتباس کرتے ہیں۔

محبت و خلوص۔

"اب تو تمہارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں، اور لوگ سر دُھنتے ہیں۔ پولیٹکس کے متعلق تمہارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے الہ آباد و حیدرآباد بھیجے۔ ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں۵۱ وَ اٰتٰی اٰقوال الغَایدین" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی" (عطیہ بیگم کے نام)

"تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بیساختہ میں نے آنکھوں سے لگا لیا، اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا" (عطیہ بیگم کے نام)

"عطیہ، لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے"

"خاتونوں کے نام سے بورڈنگ۵۲ کے کمرے بنیں گے، اور بیگم صاحب سے کہدیجئے کہ کم از کم ایک ان کے نام کا بھی ہوگا۔ تمہارے نام کا کمرہ ہو سکا

---

۵۱ اور میں پہلا پوجنے والا ہوں گا۔

۵۲ یعنی ندوۃ العلما کے بورڈنگ ہاؤس کے۔

تو خود اپنے صرف سے بنواؤں گا، لیکن اس سے کتبہ پر اشارہ نہ ہوگا۔ صرف تمھارا نام ہوگا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو میں اس زمانہ میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں چاہتا تھا کہ میرے کسی کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو۔ اس کا اصلی طریقہ تو یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمھارے نام ڈیڈیکیٹ کرتا، لیکن افسوس نہیں کر سکتا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

میں آپ کی طرح آزاد ہوتا تو سال بھر جزیرہ[ے] ہی میں رہتا۔ لیکن ندوہ" کی زنجیر غضب کی ہے۔ اب بھی تو "زنجیرہ" میں ہوں۔ (زہرا بیگم کے نام)

فارسی پڑھانے کا شوق:-

"میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھاؤں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے ..... لیکن یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں تو جزیرہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم عرش سے اتر نہیں سکتیں۔ تاہم ناامیدی نہیں، کبھی تو ندوہ کے جھگڑوں سے فرصت ملے گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر یہ موقع پھر ملا تو میں چاہوں گا کہ میں تمھاری کچھ علمی خدمت کرسکوں۔ تم کو فارسی پڑھاؤں اور اردو کی انشاپردازی سکھاؤں۔ معلوم نہیں تم اس کو اپنی تحقیر تو نہ خیال کروگی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

ے اصل میں یہی نام ہے۔ لیکن لوگوں نے بگاڑ کر "جنجیرہ" کر لیا ہے۔ علامہ یہ دونوں نام سمجھتے ہیں۔ اور ایک جگہ شاعرانہ اسلوب میں "زنجیرہ" بھی کر لیا ہے۔ یہ بھی اس کا ایک نام یا نام کی ایک صورت ہے۔

" ولایت سے آجاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا استاد بنا دوں، گو خود شاگردی کے قابل نہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

افسوس یہ ہے کہ آپ کا موقع نہیں ملتا کہ میں دو چار جز کسی دیوان یا اپنے ہی کلام کے آپ کو پڑھا سکتا۔ اس سے یہ ہوتا کہ تمام ضروری فارسی اصطلاحات اور محاورات پر آپ کی نظر پڑ جاتی، اور فارسی شاعری کی خوبیاں ذہن نشیں ہو جاتیں۔ پھر آپ خود پڑھ لیتیں اور لطف اٹھاتیں۔ (زہرا بیگم کے نام)

موسیقی سکھانے کا شوق:۔

" گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدتوں سے دل میں تھی، لیکن کہنے کی جرأت نہ تھی۔ میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سنے۔ تم کو خدا نے خوش آوازی عطا کی ہے۔ اور نہایت موثر آواز ہے لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔ اس سے تم بالکل بے سُرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں۔ ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رُک گیا کہ تمہاری گستاخی۔ وہ بہنیں بے قاعدہ تھیں۔ بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے، یہاں تک کہ جن کا پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

" گانا میں خود نہیں جانتا لیکن سمجھ سکتا ہوں۔ یعنی جو گانا خلاف فن ہوگا میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے۔ گراموفون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں، ان کو سنو۔ پیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً دادرا، جھنجوٹی وغیرہ۔ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ گانے میں کس قسم کے سُر اور

تان اور گٹکری ہیں۔ یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو، بیکار ہوجاتی ہے۔ البتہ میں رواں طور پر مثنوی یا اور اشعار کے پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

اگر بالفرض تم کبھی لکھنؤ آؤ تو موسیقی ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو جن سے سیکھنا عیب میں داخل نہ ہو۔ بےشک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات ہے۔ وہ لوگ سوسائٹی سے خارج ہیں۔ (عطیہ بیگم کے نام)

عورتوں کے اوصاف علامہ کی نظر میں :۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریزی اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ لیکن اردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے۔ صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں آچکیں۔ اس سے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ بڑھتا جائے، اور بات چیت رفتار گفتار نشست برخاست مذاق زبان سب الگ ہوجائیں۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں دو مختلف نوع ہو جائیں گے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں، اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دلیر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔ لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے۔ جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری، دلیری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہے۔ ہاں، یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے بچے خاندان سے اجنبی ہوجاتے ہیں۔ لیکن خاندان سے زیادہ تر چسپیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں۔ مہمات امور رک جاتے ہیں" (عطیہ بیگم کے نام)

"عورتوں کی دلیری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی، لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلم ہے کہ صحت کے لئے تندرستی کے لئے جسم کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہوجاتا ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں، بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے" (عطیہ بیگم کے نام)

"مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں۔ لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے، اور عطیہ، میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو"

اپنی تصانیف اور شاعری کے متعلق :-

میرا چھوٹا سا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں، اور میں نے

"برعکس نہند نام زنگی کافور" ان کانٹوں کا نام "دستہ گل" رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں۔ لیکن زیادہ شوخ اور آزادانہ قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لئے ان کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے۔ (زہرا بیگم کے نام)

"بوئے گل" بھی اگر تم سمجھ کر پڑھو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں معلوم ہو جائیں۔ (عطیہ بیگم کے نام)

"بوئے گل" کہیئے تو بھیجدوں۔ "دستہ گل" کی نسبت مہذب ہے۔ (عطیہ بیگم کے نام)

"چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ تیاری پر بھیج دوں گا۔ افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر معتدل واقع ہوا ہے، اور میں بھی اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ بہرحال مضامین کچھ ہوں، لیکن زبان ایران کی ہوگی" (عطیہ بیگم کے نام)۔

"موازنہ انیس و دبیر" اگر دیکھ سکو تو دیکھا کرو۔ اس سے اردو میں بصیرت ہو سکتی ہے" (عطیہ بیگم کے نام)۔

"شعر العجم کا دوسرا حصہ جو زیر تحریر ہے۔ تمھارے دیکھنے کے قابل ہے" (عطیہ بیگم کے نام)

"مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی ہے کہ تم نے میری تشریح کو اور خود اشعار کو پسند کیا۔ ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہو سکتا ہے" (عطیہ بیگم کے نام)۔

اس طویل تجزیہ اور کثیر اقتباسات کے بعد اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم ایک پورا خط عطیہ بیگم کے نام کا درج کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ اشعار اور ان کی تشریح ہے جس کا ذکر اوپر کے آخری اقتباس میں ہے۔

عزیزی!

آج جی چاہتا ہے کہ "بوئے گل" کے بعض اشعار لکھوں، اور تم کو اس کا مطلب سمجھا دوں تاکہ رفتہ رفتہ فارسی اشعار کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد
داغم ازیں کہ دل نتواں کرد دیدہ را

ذوقِ نظر، دیدار کا لطف۔ کاوش، محبوب کے دیکھنے سے جو دل کو بیتابی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ داغم یعنی مجھکو رنج ہے یا افسوس ہے۔ نمی رسد یعنی برابر نہیں یا اس کو نہیں پہنچتا۔

اب یہ مطلب ہوا کہ دیدار میں بھی ایک لطف ہے اور دل کی بیتابی اور تڑپ میں بھی ایک لطف ہے۔ لیکن دیدار کا لطف دل کی تڑپ کے لطف کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھ کو افسوس ہے کہ آنکھوں کو دل نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی کاش اگر آنکھیں دل بن جاتیں تو دونوں لطف ساتھ حاصل ہو سکتے۔

چشمش بہ سوے ما نگہ ناتمام کرد
ساقی بجام ریخت مے نا رسیدہ را

نارسیدہ شراب، جو خوب پختہ اور نشہ آور نہ ہو اس کو نارسیدہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھوں نے میری طرف دیکھا لیکن خوب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ بلکہ یوں ہی سی اچٹتی نظر ڈال دی تو گویا ساقی نے جام میں شراب ڈالی لیکن شراب خام تھی۔ خوب تیار نہیں ہونے پائی تھی۔

با ما بہر معاملہ بدگماں نبود
خوش بود آنکہ راز محبت عیاں نبود

نصاف ہے۔

از لذت ادائے ستم می تواں شناخت،

کیں جور از تو بودہ و از آسماں نبود

آسمان بھی ظلم کرتا ہے اور محبوب بھی کرتے ہیں ۔لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ آسمان کے ظلم میں لطف نہیں آتا، اور محبوب کے ظلم میں لذت اور مزا ہوتا ہے ۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ جب ہم پر ظلم ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے ظلم کیا تو ہم یوں پہچان لیتے ہیں کہ اگر ظلم میں لذت ملی تو محبوب کا ظلم ہے ۔

صد حرف راز بود نہاں در نگاہ من

شادم کہ کار با صنمے نکتہ داں نبود

شادم، میں خوش ہوں۔ کار، یعنی معاملہ۔ صنم، یعنی محبوب ۔ نکتہ داں، جو بات کی تہ کو پہنچ جائے ۔مطلب یہ ہے کہ میری نگاہ میں سینکڑوں راز چھپے ہوئے ہیں یعنی محبت، شوق، حسرت، آرزو، شکایت، گلہ وغیرہ۔ لیکن غنیمت یہ ہوا کہ محبوب نکتہ داں نہ تھا کہ میری نگاہ ہی سے سمجھ جاتا کہ اس کے دل میں کیا کیا خیالات ہیں ۔

شبلی ۲۲ر جون ۱۹۰۹ء لکھنؤ

مولوی سید احمد دہلوی

مؤلف فرہنگِ آصفیہ

۸ر جنوری ۱۸۴۶ء (مطابق ۱۲۶۲ھ) کو دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ سید عبدالرحمن ہے۔ رسمی تعلیم مختلف مشہور اساتذہ سے اور پھر نارمل اسکول دہلی میں حاصل کی۔ ابتدا سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا ۔

طالب علمی کے زمانہ میں ایک طویل فارسی نظم "**طفلی نامہ**" لکھی تھی۔ یہ خط و کتابت کی تعلیم کے لئے **انشائے تقویۃ الصبیان** لکھی جس میں اردو مکالمہ و ضلع قائم رکھا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کو اپنی عظیم الشان لغت **فرہنگ آصفیہ** کی تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کی تیاری شروع کی۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے **مناظرہ تقدیر و تدبیر** "ہنر اخوندان" کے نام سے شائع کی۔ اس پر سرکار نے ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا۔

اس زمانے میں مسٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) اپنی مشہور "اردو لغت" مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اس تالیف کی اعانت کے لئے مولوی سید احمد کو بلالیا۔ یہ سات برس دانا پور رہے اور ان کی کتاب کو مکمل کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا کام بھی کرتے رہے۔ یعنی وہاں سے "انشائے ہادی النسا" شائع کی اور فرہنگ آصفیہ کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۸۸۰ء میں فیلن صاحب کا کام تکمیل کو پہنچا۔ تو اسی وقت مہاراجہ الور نے اپنا "سفرنامہ" مرتب کرنے کے لئے طلب کر لیا۔ مہینے میں وہ کام پورا کیا اور معقول تنخواہ اور انعام لیکر واپس آئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں نائب مترجم ہو کر چلے گئے۔

مولوی سید احمد نے دہلی اور شملہ کے اسکولوں میں سرکاری ملازمت کی اور پنشن پائی۔ گورنمنٹ نے **خان صاحب** کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب پرنس آف ویلز دہلی تشریف لائے تو مولوی صاحب نے ایک نظم خیر مقدم اور اپنی ایک تالیف "رسوم دہلی" پیش کی۔ ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی کے زمانے میں مولوی صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام دربار احمد رکھا۔ ایک بار ان کے مکان میں آگ لگی اور تمام کتب خانہ اور "فرہنگ آصفیہ" کی جلدیں نذر آتش ہو گئیں۔ دولت آصفیہ نے اس موقع پر دست فیض بڑھایا

اور اسی شاہانہ امداد سے دوبارہ کتاب شائع ہوئی۔ مولوی صاحب نے ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔

مولوی سید احمد کی تصانیف

مولوی صاحب نے بڑی کثرت سے کتابیں تصنیف کیں۔ اگرچہ ضخیم کتابیں کم ہیں۔ لیکن بعض تالیفات موضوع کے لحاظ سے مفید و جدید ہیں۔ فہرست یہ ہے :۔

(۱) تقویۃ الصبیان، (۲) کنز الفوائد (مناظرۂ تقدیر و تدبیر)۔ (۳) وقائع دُرّانیہ (تاریخ) (۴) انشاء رہا دی النساء۔ (۵) قصہ راحت زمانی (عورتوں کے لئے اخلاقی فسانہ) (۶) تحریر النساء (لڑکیوں کی درسی کتاب)۔ (۷) اخلاق النساء۔ (۸) لغات النساء (عورتوں کے خاص الفاظ و محاورات)۔ (۹) طبعی تعلیم۔ (۱۰) قواعد اردو۔ (۱۱) علم اللسان (اردو زبان دانی اور اس کی ترقی)۔ (۱۲) رسوم دہلی، (۱۳) تکمیل الکلام (پیشہ وروں کی اصطلاحات)۔ (۱۴) تحقیق الکلام (اردو زبان کی خوبیاں)۔ (۱۵) محاکمہ مرکز (دہلی کو مرکز اردو قرار دینے کے دلائل)۔ (۱۶) رس کھان (ہندی زبان کے دوہے، گیت، پہیلیاں)۔ (۱۷) ریت کھان (ہندوؤں کے رسم و رواج)۔ (۱۸) ناری کتھا (ہندو عورتوں کے محاورات)۔ (۱۹) سیر شملہ (مع تاریخ شملہ)۔ (۲۰) روزمرۂ دہلی۔ (۲۱) رسوم اہلِ ہنود ان دہلی۔ (۲۲) اردو ضرب الامثال۔

(۲۳) **فرہنگ آصفیہ**۔ اس کا نام سب سے آخر میں لیا گیا ہے، لیکن اہتمام و عظمت میں سب پر مقدم ہے۔ مولوی صاحب اپنے نام سے زیادہ اس کتاب کے نام سے "مولف فرہنگ آصفیہ" مشہور ہیں۔ آغاز تالیف میں بھی بہت قدیم ہے۔ ۱۸۶۸ء سے اس کی ترتیب شروع کی۔ ۱۸۷۸ء میں "ارمغان دہلی" کے نام سے بطور نمونہ شائع کی، لیکن تکمیل جاری رہی۔ ۲۴ سال کی محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچائی۔ مولوی صاحب کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس قدر ضخیم کتاب کو شائع

کر سکیں۔ اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں جب وہ شملہ کے اسکول میں مدرس تھے امیر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدر آباد شملہ آئے۔ مولوی صاحب نے حاضر ہو کر اپنی تالیف کا مسودہ پیش کیا۔ وہ اس کو ساتھ لے گئے۔ مولوی سید علی بلگرامی کو دکھایا۔ انھوں نے بہت پسند کیا اور منظوری کی سفارش کی۔ چنانچہ دربار دکن سے انعام کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں بعد تکمیل فرہنگ آصفیہ نام رکھا گیا۔ دولت آصفیہ سے پانچ ہزار روپیہ انعام ملا اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ گورنمنٹ پنجاب نے پانچ سو روپیہ انعام دئے اور ایک ہزار روپیہ کی کتابیں خریدیں۔

اردو لغات کی مختصر تاریخ اس "داستان اردو" میں صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۲ کے حاشیوں پر لکھی گئی ہے۔ لغات اردو کی آغاز تالیف سے تقریباً دو سو برس بعد **فرہنگ آصفیہ** مرتب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس سے زیادہ ضخیم، مکمل اور مستند فرہنگ اردو موجود نہ تھی۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے چار جلدوں میں ۵۵ ہزار الفاظ و محاورات تحقیق، تشریح اور سند وحوالے کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اب اگر اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی واقع ہوگئیں تو ایسی فروگذاشتوں سے اور کوئی **لغت** بھی خالی نہیں ہے۔ "نور اللغات" "فرہنگ" سے ۵۲ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی صرفی و لسانی تحقیقی و استنادی غلطیاں بہت ہیں۔ بہرحال تقدیم تکمیل کی فضیلت مولوی سید احمد صاحب کو حاصل ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ صرف پہلی اور دوسری جلد ملتی ہے۔

فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات کا مقابلہ

مولوی سید احمد صاحب نے فرہنگ آصفیہ کے دیباچے میں لکھا ہے:-

جس طرح جامع امیر اللغات نے اردو لغات مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں سے

لفظ (آنکھ) لیکر اس کے مشتقات اور معانی کی ہو بہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی، اسی طرح مولف نور اللغات نے بھی ان کی پیروی کرکے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگ آصفیہ میں سے لفظ (بات) اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی ہے۔

یہ بڑا سخت اعتراض ہے۔ حضرت امیر مینائی اور مولوی نور الحسن نیر کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کی کتاب ہو بہو نقل کرکے اپنے نام سے چھپوا دیں۔ ہمارے سامنے فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات تینوں موجود ہیں۔ اور ہم نے لفظ (آنکھ) اور لفظ (بات) کو ان میں پڑھا ہے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ اور محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے، ہر شخص ان کو تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ جمع کرکے مرتب کر دینا، مولف کا کارنامہ ہوتا ہے۔ لیکن لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہہ جامع و مولف کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان کی ہو بہو نقل بیشک سرقہ اور قابل الزام ہے۔

مولوی سید احمد کی اس فضیلت میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو کی سب سے بڑی اور مکمل لغت سب سے پہلے مرتب کی اور ۱۸۷۸ء میں "ارمغان دہلی" شائع کی۔ منشی امیر احمد مینائی کو "امیر اللغات" کا خیال بعد کو آیا اور انھوں نے ۱۸۸۴ء میں لفظ (آنکھ) کا نمونہ مرتب کیا۔ امیر مینائی کے سامنے فرہنگ کا نمونہ موجود تھا۔ یقیناً اس سے استفاضہ کیا، لیکن اس کی ہو بہو نقل نہیں کی، بلکہ سید صاحب کے لغات کو خود جانچا، غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا، ضروری محاورے جو رہ گئے تھے، ان کا اضافہ کیا، سند کے اشعار الگ تلاش کرکے لکھے۔ چند مثالیں یہ ہیں:-

آنکھوں کی سوئیاں۔ اس کی مثال فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے سند میں داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں پھرنا۔ فرہنگ میں سند کے ۱۱ شعر ہیں، جن میں سے دو چار بھی کافی تھے۔ اس لئے کہ اس محاورے کے صرف ایک معنی ہیں۔ امیر مینائی نے ۴ شعر لکھے ہیں۔ جن میں سے صرف ناسخ کا شعر مشترک ہے۔ ظفر، آتش، رشک کے اشعار امیر نے الگ لکھے ہیں۔

آنکھوں میں تنکے بھیجنا۔ اس کی سند فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں تُلنا، تولنا۔ یہ محاورے فرہنگ میں بالکل نہیں ہیں۔ امیر نے مع اسناد لکھے ہیں۔

آنکھوں میں جہان اندھیر ہونا، تاریک ہونا، سیاہ ہونا۔ ان سب کی مثالیں امیر نے بالکل الگ لکھی ہیں۔

آنکھوں میں باتیں ہونا، آنکھوں میں بہار پھولنا، آنکھوں میں خاک لگانا، فرہنگ میں نہیں ہیں۔ امیر نے مع مثال لکھے ہیں۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں ٹھیرنا، آنکھوں میں چڑھنا۔ امیر اللغات میں نہیں ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ہیں۔ یہ سب محاورے ہیں۔ ان کو شامل نہ کرنا امیر اللغات کی خامی ہے۔

آنکھوں میں آنسو بھر آنا۔ فرہنگ میں بطور محاورہ درج ہے، اور اس کی یہ مثال لکھی ہے: "آنسو شہ مظلوم کی آنکھوں میں بھر آئے" (انیس)۔ اصل میں یہ کوئی محاورہ نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے، حقیقی معنی مراد ہیں۔ اس کو محاورہ گرداننا غلطی ہے۔

آنکھوں میں آنا۔ اس محاورے کے دو پہلو ہیں۔ دونوں لغت والوں کو دونوں مفہوم لکھنے ضروری تھے۔ لیکن سید صاحب اور امیر صاحب نے

یک ایک پہلو یہ ہے۔ امیر اللغات میں اس کے معنی ہیں: نظروں میں سمانا

اور مثال یہ ہے:۔

مری آنکھوں میں تم آؤ اگر شتہ ذوقِ مست ہو
شجر رہتا ہے اکثر سبز دریا کی ترائی میں (امیر لکھنوی)

یہاں انسان کا مجسم آنکھوں میں آنا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ صرف شاعرانہ تخیل ہے

اس لئے امیر مینائی نے اس خصوصیت کی صراحت کر دی ہے۔

فرہنگ آصفیہ میں اس محاورہ (آنکھوں میں آنا) کے یہ مفہوم بتائے

ہیں: اچھا لگنا، سمانا، نظر پر چڑھنا، نگاہ پر چڑھنا، خیال میں آنا، دھیان میں آنا۔

اور سند میں یہ شعر دیا ہے:۔

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے (میر)

یہاں نگاہ میں جچنا مراد ہے۔

اسی طرح نور اللغات پر بھی یہ اعتراض غلط ہے۔ مولوی نور الحسن صاحب نیّر کے سامنے بھی فرہنگ تھی، اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن ہو بہو نقل نہیں کی۔ فرہنگ میں **بات** کے ۲۴ معنی ہیں۔ نور اللغات میں ۲۸ ہیں۔ ان کی اسناد کے چند شعر نیّر صاحب نے سید صاحب سے لئے ہیں۔ باقی بطور خود تلاش کئے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں یہ کمی ہے کہ **بات** کے سوا سو سے زیادہ محاورے لکھے ہیں لیکن سند کے اشعار خال خال ہی لکھے ہیں۔ کالم کے کالم اشعار سے خالی ہیں۔ فقروں کی مثالیں بھی کم ہیں۔ لفظ **بات** کے دس دس معنی ایک جگہ لکھ دئے ہیں اور مثال ایک بھی نہیں لکھی۔ نور اللغات میں اکثر سندیں اشعار میں ہیں۔ کہیں فقرے لکھ دئے

دونوں کا فرق مختصراً یہ بتایا جاتا ہے:۔

فرہنگ آصفیہ میں لفظ (بات) کے معنی بتانے کے بعد اس کے

مشتقات اور محاورے لکھے ہیں۔ ان میں (الف) سے شروع ہونے والے
محاورات صرف تین ہیں، یعنی بات اٹھانا، بات اڑنا، بات آنا۔ ان کے بعد
کا محاورہ (بات بات میں) لکھا ہے۔ لیکن نور اللغات میں ان تین محاوروں
کے علاوہ ۲۷ محاورے اور لکھے ہیں۔ مثلاً بات آن پڑنا، بات آگے آنا،
بات آئی گئی ہونا، بات اٹھا رکھنا، بات اٹکنا، بات اڑنا، بات اڑانا وغیرہ
یہ سب محاورے ہیں۔ فرہنگ میں ان کا نہ ہونا ضعف تالیف ہے۔

نور اللغات میں بھی تالیف کی خامیاں بہت ہیں۔ لغات کی تحقیق و تشریح
میں غلطیاں کی ہیں۔ مفہوم اور تلفظ میں مسامحت ہے۔ مثلاً **بات** کے متعلق
ایک محاورہ لکھا ہے: بات آنکھوں سے سننا۔ اس محاورے کو **بات** سے
کچھ تعلق نہیں بلکہ **آنکھوں** کا محاورہ ہے۔ اس میں بات سننا اصلی معنوں
میں ہے۔ آنکھوں سے کا مفہوم ہے، توجہ سے، ادب سے۔ اسی
طرح ایک محاورہ بتایا ہے: بات کا مادہ۔ بات کا گودا، بات کو تھمنا۔
یہ بھی محاورہ نہ ہوا۔ معمولی بات ہوئی۔

ک کے متعلق لکھا ہے کہ آخر کلمات میں معنی مصدری کا فائدہ دیتا
ہے، جیسے **بیٹھک**، روک، ٹوک۔ حالانکہ ان الفاظ میں **ک** یکساں نہیں ہے۔
بیٹھک میں معنی مصدری کے لیے بڑھایا گیا ہے، لیکن روک اور ٹوک میں
اصلی ہے، اضافہ نہیں ہے۔ **پرواز اڑنا** (اڑنا سیکھنا) اس کی مثال
میں قلق کا یہ شعر لکھا ہے:

سیکھے نالہ جو نگاہ سے طرز نیاز رنگ رخ سے سیکھے پرواز جب

حالانکہ یہاں پرواز اڑنا کے معنی نہیں ہیں بلکہ پرواز سیکھنے کے معنی ہیں:
یعنی میرے رنگ رخ نے اڑنا سیکھے۔ اگر یہاں ... یہی طرز ہوتا مضمون

ناتمام رہتا ہے۔ کس چیز کی طرح؟

غرض، امیر اللغات اور نور اللغات دونوں پر سید احمد صاحب کا یہ الزام غلط ہے کہ فرہنگ آصفیہ کی ہوبہو نقل کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نے سالہا سال کی محنت سے فرہنگ تیار کی تھی، اور چاہتے تھے کہ

اقلیم لغت میری قلمرو سے نہ جائے[۵]

اس لئے انھوں نے حضرات امیر و نیر کے لغات کو اپنی ملک پر دست درازی تصور کیا۔ شکر ہے سید صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے ریاض کو سرسبز دیکھ لیا اور اپنی ریاضت کا پھل پا لیا۔ اب یہ زمانے کی "کارستانی" نہیں کہ امیر اللغات تمام نہ ہوسکی۔ فرہنگ آصفیہ باوجود مکمل وشائع ہونے کے اب نایاب ہے، اور نور اللغات بازار میں سب کی ملکیتوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔

مولوی سید احمد کا طرز تحریر

مولوی صاحب نے دو درجن کتابیں مختلف عنوانوں اور موضوعوں پر لکھی ہیں۔ ان میں دو چیزیں نہایت نمایاں ہیں۔ ایک عورتوں کی تعلیم و تربیت، دوسرے زبان اردو اور محاورۂ دہلی کی اشاعت۔ ان میں گویا ایک تو اپنی زبان ومحاورہ سے فطری گرویدگی تھی، دوسرے، ہر تصنیف میں اس کی اشاعت کا شوق۔ تیسرے اس کے تحفظ وحمایت کی ضرورت۔ لکھنؤ اور پنجاب کی طرف سے دہلی کی مرکزیت پر حملے ہورہے تھے، اور دہلی والے لکھنؤ کی بولی کو بھی ٹکسال باہر سمجھتے تھے۔ اس لئے دہلی کے ادبی مصنفین نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں مقامی بول چال و محاورے کثرت سے استعمال کئے۔ جن لوگوں نے علوم وفنون کی کتابیں لکھیں، انھوں نے موضوع و مضمون کے مطابق زبان اختیار کی۔

---

[۵] میر انیس کا مصرع ہے: "اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے"۔

ڈپٹی نذیر احمد کی زبان و اسلوب کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں
میر ناصر علی خاں نے کم، اور مولوی سید احمد اور میر ناصر نذیر فراق نے زیادہ دہلی کا
روزمرہ لکھا۔ پھر آغا شاعر اور راشد الخیری نے اسی پر اپنی تحریر کی بنیاد رکھی،
راشد الخیری نے ایک اسلوب خاص ایجاد کرکے اپنا انفرادی رنگ پیدا کرلیا۔ اب
عصر حاضر کے "قدیم دہلوی" آغا حیدر حسن اور مرزا فرحت اللہ بیگ، اور "جدید دہلوی"
خواجہ عبد المجید اور خواجہ محمد شفیع اسی طرز میں لکھتے ہیں۔

یہ وصف اہل دہلی کے ساتھ خاص نہیں۔ اہل لکھنؤ بھی ان کے ہم پلہ ہیں۔ مولوی
عبد الحلیم شرر، پنڈت سرشار، مرزا ہادی رسوا، منشی سجاد حسین مضمون نگار ان "اودھ
اخبار" و "اودھ پنچ"، خواجہ عبد الرؤف عشرت وغیرہ نے لکھنؤ کا روزمرہ و محاورہ
برتا۔

یہ اسلوب بلاشبہ نہایت دلکش و دلاویز اور ضروری و ناگزیر ہے۔ زبان و
محاورہ کی رفتار، ترقی، اشاعت اور استناد کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں لیکن
باوجود اس کے مرکزیت کے دور میں یہ نکتہ پیش نظر رکھنے کے لائق ہے کہ زبان و محاورہ
تحریر و طباعت میں آکر جمہوری حیثیت اور آفاقی شان پیدا کرلیتا ہے۔ صرف "مقامی"
نہیں رہتے۔ بلکہ بین الاقوامی بن جاتے ہیں اور اب اس کا مقصد حفظ نفس سے زیادہ
نشر عام ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ الفاظ، محاورات اور امثال جو مقامی طور
پر بھی کم استعمال ہوتے ہیں، باہر بالکل نہیں سمجھے جاتے، اور پنجاب و دکن کے لوگ
ان سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان میں باوجود صحت و فصاحت کے ایک قسم
کی غرابت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی کثرت پسندیدہ نہیں رہتی۔

مولوی سید احمد دہلوی نے بھی دہلی کی زبان بہتر سے بہتر لکھی ہے۔
محاورے برمحل، فقرے برجستہ، عبارت سلجھی ہوئی، مضمون واضح و مدلل لکھتے ہیں

ان کی تحریروں کے دو ایک نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ فرہنگِ آصفیہ کے مندرجہ لغات کے متعلق کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"تذکیر و تانیث کی تمیز اہلِ دہلی و لکھنؤ کے موافق اس میں موجود ہے، زبانوں کا فرق اور ان کی اصلیت کا پتا اس سے لگتا ہے، عام محاورے اس میں درج ہیں، خاص خاص محاورے اس میں داخل ہیں، فقیروں کی صدائیں اس میں سن لو، سودے والے کی آوازیں اس میں دیکھ لو، دل لگی اس میں ہے، ظرافت اس میں ہے، بعض بعض موقعوں پر جواریوں، ٹھگوں، دلالوں، بدمعاشوں، مختلف پیشہ وروں کے وہ سلتے جلتے روزمرے جن کے نہ جاننے سے اکثر انسان دھوکا کھا جاتا ہے، بہ ترتیب حروف اس کتاب میں شامل ہیں، جو الفاظ جس درجے کے آدمیوں میں مروّج ہے، وہ انھیں کے نام سے لکھا گیا ہے۔ عورتوں کی بولی اس میں نہیں چھوڑی، جاہلوں کی باتوں سے اس میں پرہیز نہیں کیا۔ ہاں اگر چھوڑا ہے تو مغلظات و فحش چھوڑا ہے۔۔۔

قصّہ مختصر ہم نے نہ غیب چینوں کا خوف کیا، نہ خردہ بینوں کی پروا، جیسی بری بھلی اپنی بساط تھی، اردو زبان کی خدمت بن پڑی، وہ کر دی۔ آیندہ جو اس کام کے اہل اور سچے ہو خواہ ہوں گے وہ ترقی دے لیں گے۔

قطعہ

اے اہلِ شہر کچھ تو ادھر بھی کہ بیٹھے ہیں | کب سے دعائے خیر کے امیدوار ہم
جو کچھ بن سکی سے وہی چھوڑا ہے یادگار | یہی لغات چھوڑ چلے یادگار ہم

۲۔ محکمۂ مرکزِ اردو۔ مولوی سید احمد صاحب نے یہ طولانی مضمون ۱۲ فروری ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔ جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ وجہ تحریر یہ لکھی ہے کہ انشی

وجاہت حسین جھنجھانوی اڈیٹر رسالہ اصلاح سخن نے دہلی کے بعض محاوروں پر اعتراض کر کے اس کی مرکزیت تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے یہ "محاکمہ" لکھا تھا۔ نہایت دلچسپ تحریر ہے۔ دہلی کی مرکزیت کے سلسلے میں دہلی و لکھنؤ کے محاوروں کا فرق، اس کی مثالیں اور لطیفے، اردو زبان کی مختصر تاریخ، دہلی لکھنؤ لاہور کے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر، بہت سی دلچسپ باتیں دوران کلام میں آگئی ہیں۔ اگرچہ طول کلام و تکرار بیان سے ذرا سی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر جواب اعتراض کا ایک حصہ درمیانی تفصیلات کو حذف کر کے درج کیا جاتا ہے:۔

انھوں نے لکھا ہے کہ اہل دہلی زیادہ محبت کے واسطے "جان چھڑکنا" بولتے ہیں اور آگ لگ جانے کے واسطے "پھول پڑا" استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اصل عبارت یہ ہے کہ "وہ زمانہ دور نہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے ایجاد کردہ الفاظ و محاورات سے زیادہ وقعت نہیں رکھیں گے۔ مثال کے طور پر دہلی کے ایک آدھ محاورے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے زیادہ محبت ہو تو دہلی والے کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اس آدمی پر جان چھڑکتا ہے۔ بتلائیے یہ ہوئی کوئی گلاب یا کیوڑے کا عرق ہے۔ اب علمی دنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔۔۔

اس محاورے کا لطف اور اس کی عدم واقفیت تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن پہلے انھیں کی عبارت میں سے دو ایک فقرے پیش کر کے الزامی جواب دیتے اور ان کی طرف سے یہ مصرعہ پڑھتے ہیں۔

ع - میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

"کانوں کو مزا نہیں دیتے" "کان نہ ہوئے کوئی زبان ہوئی جو ذائقہ سے تعلق رکھے" "صورتیں فسانہ ہوگئیں" "صورتیں نہ ہوئیں کوئی ذکر اذکار ہوئے جو فسانہ سے نسبت دی گئی" "دُنیا کی ہر چیز انقلاب پسند ہے" لفظ پسند کو ملاحظہ فرمائیے اور ہر چیز کو جو ذی روح بن کر انقلاب پسند فرماتی ہے۔

خیر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ جان چھڑکنا اوّل تو یہ فرمائیے کہ آپ نے اپنے کانوں سے سُنا ہے؟ کہاں سُنا ہے؟ اور کس سے سُنا ہے؟ مردوں سے یا عورتوں سے یا صرف کُتبِ لغات میں دیکھا ہے۔ یا کسی اُستاد کے کلام میں نظر پڑا ہے۔ بیشک جان چھڑکنا بولا جاتا ہے مگر عورتوں میں اور وہ بھی اولاد یا مثلِ اولاد کسی نہایت قریبی رشتہ دار کی محبت میں۔ نہ کہ عام محاورہ ہے اور ہر جگہ فرطِ محبت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ گرچہ عورتیں اس کی اصلیت سے واقف نہیں مگر اس موقع کے واسطے اس سے بہتر اور پُر اثر لفظ ملنا مشکل ہے۔ جان کے لغوی معنی روح ہیں اور اطبّا کی اصطلاح میں جوہر لطیف یا بخار لطیف۔ ان دونوں صورتوں میں جان کا استعمال ہونا پایا جاتا ہے اور سیّال چیز کا چھڑکنا ممکنات سے ہے اور اس جگہ فرطِ محبت سے جان نثار کرنے کے معنی ہیں۔ اب ایک اور طرح سے سُنئے۔ اردو محاورے میں جان بمعنی خون بھی آجاتا ہے۔ جیسے خوف کے موقع پر جہاں دم خشک ہونا بولتے ہیں وہاں جان سوکھنا بھی استعمال کرتے ہیں اور دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ آپ نے کلام سے جان چھڑانا بھی سُنا ہوگا۔ بھلا اس جگہ جان نہ ہوئی کوئی گٹھڑی یا جوکھوں ہوئی کہ کوئی چھڑا کر لے جائے گا۔

حالانکہ صرف اُسی کی ذات کے متعلق بولتے ہیں۔ جو جان بوجھ کر کام سے بچتا ہے۔ اب دیکھئے یہ گلاب کا عرق ہے یا کیوڑا۔ اور لیجئے جانفشانی فارسی کا محاورہ ہے اور اُسی کا یہ ترجمہ ہے۔ اہلِ فارس پر آپ کا اِس موقع کے لئے فرمائیے کیا اعتراض ہے اسی جگہ آپ فرماتے ہیں "کہ اب علمی دُنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اُس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں" اگر آپ بے انتہا محبت یا صرف کسی کے ساتھ محبت کرنے کے دوسرے معنی پر توجہ فرماتے تو ہرگز ہرگز یہ لفظ زبان پر نہ لاتے۔ ایسی ہی باتیں آدمی کو پابندیٔ زبان سے آزادی حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہمارے نزدیک علمی دُنیا کو سب سے زیادہ زباندانی کی ضرورت ہے، ورنہ مفہوم کچھ ہوگا اور سمجھا کچھ جائے گا۔

اب دوسرے محاورے اور لفظ کو بھی ملاحظہ فرمائیے:۔ آپ ارشاد کرتے ہیں کہ "اسی طرح کسی کے گھر میں آگ لگ جانے کا مفہوم اہلِ دہلی یوں ادا کرتے ہیں۔ کہ فلاں شخص کے گھر میں پھول پڑا۔ آگ نہیں کہتے۔ اِس کو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں۔ یہ اچھا پھول پڑا کہ سارا گھر جل کر خاک ہوگیا اور یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔ صاف بات کیوں نہ کہی جائے کہ فلاں آدمی کا گھر جل گیا"، مہربانی فرما کر اوّل تو یہ ارشاد کیجئے کہ آپ کبھی دہلی میں آئے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو آپ کو گوشِ خود اس محاورے کے سُننے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کتاب یا کبھی کسی شعر

میں دیکھ لیا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اِس محاورے کو عورتیں بولتی
ہوں گی یا مرد۔ اگرچہ آپ کا یہ فقرہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اِس کو وہ لوگ
بدشگونی سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ محاورہ ہو نہ ہو عورتوں کا ہے کیونکہ یہی فرقہ اپنی
زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالتا جس سے بدشگونی ہو۔ مثلاً ذرہ خیر
سے "آپ نے" ہی کی جگہ برتا ہے۔ "خدا کی سنوار" بجائے خدا کی مار
آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ "تمھیں خدا کی نیکی" بھی گوش زد فرمایا ہوگا۔
"وہ جی جم گھر میں ہیں" یہ بھی کبھی نہ کبھی ضرور گوش آشنا ہوا ہوگا۔
اسی طرح پھول پڑنا بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو عورتیں ہی بولتی ہوں گی۔
مگر آپ نے اپنے ثبوت میں مرد و زن سب کو لے لیا۔ اور بہت بڑی اپنی
ناواقفیت ظاہر فرمائی۔ اب ہم سے سُنیے دہلی میں کوئی بھی اس محاورے
کو اب نہیں بولتا اور نہ پہلے یہ محاورہ شہر کے اندر بکثرت بولا جاتا تھا۔
البتہ قلعہ معلی میں بیگماتوں نے اس کا کسی قدر استعمال کر رکھا تھا۔
لیکن عام آگ لگنے کے واسطے نہ تھا۔ اگرچہ رنگین کے ایک شعر میں
یہ محاورہ موجود ہے۔ مگر اس میں جو لفظ گوئیاں آگیا ہے۔ یہ اِس
امر میں شبہ ڈالتا ہے۔ کیونکہ گوئیاں خاص پوربی محاورہ ہے جو
آج تک دہلی کیا اطرافِ دہلی میں بھی نہیں بولا جاتا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بھول کر بھی جو کسی اور کے گھر پھول پڑے
تو الٰہی کرے گوئیاں مرے گھر پھول پڑے

عجب نہیں جو یہ شعر انشاء اللہ خاں کا ہو۔ اور اگر بالفرض رنگین کا مانا جائے
تو اُس زمانہ کا ہوگا جس زمانہ میں سعادت یار خاں رنگین لکھنؤ میں جاکر
اپنے پگڑی بدل بھائی انشاء اللہ خاں کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اور

باہم دونوں کی ریختیوں کا موازنہ ہوا کرتا تھا - لیکن رشک لکھنوی نے اس کو صاف کر دیا ہے چنانچہ اُس کا شعر ہے ؎

اہلِ جنت کو ہو جنت پر جہنم کا خیال
پھول اگر پڑ جائے میری آہِ آتش بار کا

اس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ کسی شاعر نے بھی نہیں باندھا جن لوگوں نے مردانہ زبان کا نام ریختہ اور بیگماتی بول چال کا نام ریختی رکھ چھوڑا تھا۔ اُنھوں نے اُس زمانہ میں شاذونادر باندھا ہے - اہلِ لکھنؤ میں سے بحر و آتش نے صرف ایک ایک شعر میں استعمال کیا ہے - اور اہلِ دہلی میں سے نکہت اور رنگین نے - ان کے سوا ذوق - ظفر - مومن - درد - غالب وغیرہ کسی نے بھی اس کا استعمال نہیں فرمایا - اگر یہ محاورہ مرقجِ عام ہوتا - تو کوئی بھی اسے نہ چھوڑتا - اہلِ لغت کو چونکہ ہر زمانہ کا محاورہ دکھانا منظور تھا اُنھوں نے بیشک داخلِ لغات کر دیا - محاورہ کی خوبی میں شبہ نہیں لیکن آپ نے بے وقت مثال دی -

پھول کے لفظ پر آپ نے طعنہ مارا تھا یہاں وہ طعنہ بیکار رہا بلکہ آپ نے جو لکھا ہے کہ "یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں " سبحان اللہ کیا اچھا خیال ہے - انگارے کی تعریف بھی جناب کو معلوم نہیں - کیا انگارا اڑ کر جا سکتا ہے ؟ یا انگارا اڑ سکتا ہے ؟ اگر آپ ان الفاظ کے محل موقع سے واقف ہوتے تو اس جگہ چنگاری شرارہ - یا آگ کا پتنگا تحریر فرماتے - دیکھئے اہلِ زبان اور مقلدِ زبان میں کس قدر فرق ثابت ہوا - اب دوسری طرح سے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے - جب کوئلے جلتے وقت چٹختے ہیں تو اُن کو آپ کیا فرمائیں گے -

کیا اُن کے روشن ذرّوں کو پھول یا چنگاری یا پتنگے سے تعبیر نہیں کرتے ؟ کبھی آپ نے چراغ کو بھڑکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اُس وقت جو روشن پتنگا سا یا اُس کی جلتی ہوئی ٹیم نیچے گرتی ہے تو اُسے بھی پھول کہتے ہیں یا نہیں ؟ کیا تو اجس وقت جگمگ جگمگ کرتا ہے تو اُسے تو اہمنا کسی وجہ سے کہتے ہیں یا نہیں ۔ آتش بازی کے پھول تو آپ نے ضرور سُنے ہوں گے ۔ ان کو انگارا کیوں نہیں کہا ۔ پھلجھڑی ۔ ہتھ پھول ۔ مہتابی انار ۔ جائی جوہی ۔ ہتاسے وغیرہ آتشبازی میں نظر اقدس سے گذرے ہوں گے ۔ ان میں سے انگارے اُچھلتے ہیں یا پھول نکلتے ہیں ۔ تیسری مثال اور لیجیے ۔ مُنہ سے پھول جھڑنا کیوں بولتے ہیں ۔ مُنہ نہ ہوا کسی باغ کا بوٹا یا گُلِ گلزار وجاہت ہوا ۔

میر ناصر علی خاں دہلوی

۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ان کے دادا ریاست بھوپال کی ریزیڈنسی میں میر منشی رہے ۔ نانا فوج میں صوبہ دار تھے ۔ والد مولوی سید ناصر الدین ابوالمنصور علی ایک ادیب تھے ۔ بڑے بھائی میر نصرت علی ”نصرت الاخبار“ کے مالک اور اڈیٹر تھے ۔ میر ناصر علی نے دہلی کالج میں تعلیم پائی ۔ اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں نان پارہ ضلع بہرائچ میں مدرس ہو گئے ۔ وہاں سے آپ محکمۂ نمک میں لیے گئے ۔ اس محکمہ میں ۴۰ سال نیک نامی کے ساتھ خدمت کر کے پنشن لی ۔ خدمت سرکاری سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست پاٹودی ضلع گڑگاؤں میں دیوان ہو گئے ۔ گورنمنٹ نے ”خان بہادر“ کا خطاب دیا ۔ ۱۹۱۱ء میں دربار تاجپوشی کے موقع پر جب دہلی کے قلعہ معلّٰی میں عجائب خانہ مرتب کیا گیا تو اس کے اہتمام میں

میر ناصر علی خاں بھی شریک تھے۔ پھر ملک معظم جارج پنجم کی خدمت میں بھی باریاب ہوئے۔ طویل عمر پاکر رحلت فرمائی۔ (سال وفات دریافت نہ ہوسکا)۔

ادبی خدمات

میر ناصر علی خاں اُن ادیبوں میں ہیں جو صرف ایڈیٹری اور مضمون نگاری کے سبب سے نامور ہوئے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ لیکن زبان و ادب کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ آغاز شباب سے مضمون نگاری شروع کردی تھی۔ اردو اخبارات و رسائل میں مقالہ نگاری کا صحیح مذاق سرسید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (جاری شدہ ۱۸۷۰ء) سے پہلے پیدا نہ ہوا تھا۔ سرسید کی تحریروں نے انشاپردازی میں نئی روح پھونکی۔ میر ناصر علی خاں نے اپنے لئے اخبار و رسائل کی ادارت کو اردو کی خدمت کا ذریعہ تجویز کیا۔ چنانچہ "تیرھویں صدی" "زمانہ" وغیرہ پرچے نکالے۔ اور ان کے ذریعہ سے صحیح زبان، دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کئے۔ آخر میں "**صلائے عام**" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ اسی پرچے سے اس کے مالک و مدیر کی ساری شہرت ہے۔ "صلائے عام" اور میر ناصر علی خاں کے مقالات کی تمام ادبی دنیا میں دھوم تھی۔

میر ناصر علی خاں لکھنؤ میں بھی رہے تھے، اور وہاں کی زبان کا اپنی زبان سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کا فرق ایک مضمون میں بتاتے ہیں :-

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا، یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جونل پر مشک بھر رہا ہے، دوسرے سقہ سے جس زبان میں باتیں کر رہا ہے، اسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں سُنتے چلے جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔ لکھنؤ میں خاص کی زبان اور ہے عوام کی زبان اور۔"

میر صاحب شاعر نہ تھے، لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ یہ "نثر کی شاعری" مولوی عبدالحلیم شرر نے ایسی کی کہ کمال کی حد ختم کردی، لیکن اس کی ایجاد و ابتدا کرنے والوں میں میر ناصر علی خاں بھی تھے۔ شرر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نئے خیالات اور خیال آفرینی کے اسلوب، انگریزی انشا پردازوں سے لیے اور ان کو اردو زبان کے طرز ادا کے ساتھ اور شعرائے ہند کے مذاق ادب کے مطابق مرتب کرکے پیش کیا۔ یہی کام ناصر علی خاں اور عبدالحلیم شرر سے پہلے علامہ محمد حسین آزاد نے "نیرنگ خیال" میں کیا تھا۔ لیکن وہ "تمثیلی رنگ" ہونے کے سبب سے ایک صنف خاص تھا۔ شرر اور میر صاحب صرف تمثیل کے پابند نہ تھے۔ نئی بات نئے انداز سے کہنا چاہتے تھے۔ پاکیزہ خیالات پیدا کرنے چاہتے تھے۔ میر ناصر علی خاں "صلائے عام" میں لکھتے ہیں:۔

> "صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقت علمی سے خالی ہوں مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم و لیاقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اہل علم و کمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خون جگر کھانا پڑتا ہے اس کے سمجھنے کے لئے دل و دماغ چاہیے وہ دل و دماغ بخت عرفی[۵] کی طرح ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔"

میر صاحب کا **طرزِ تحریر** بھی یہی ہے کہ زبان شستہ و صاف سادہ سلیس لکھتے ہیں

۵ اس فقرے کے حوالے میں میر صاحب نے حاشیہ پر عرفی کے قصیدے کا یہ مطلع درج کیا ہے:۔

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار — نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

لفظوں اور ترکیبوں میں استعارے پیدا نہیں کرتے بلکہ پوری بات یا سارے مضمون کو خیالی و مجازی بنا دیتے ہیں۔ دو چار نمونے یہ ہیں۔

۱۔ "عرس و سالگرہ" ۔ صلائے عام کا مضمون ہے۔ شروع میں تقریب تحریر بیان کر دی ہے مختلف حصے نقل کئے جاتے ہیں۔

ان بزرگوں کو جن کو سخن گستری کا شوق ہے، سال کے انجام و آغاز کے دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے ان دونوں دو مضمون علحدہ علحدہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ ایک مضمون کی بحث نکال کر سال کے انجام و آغاز کو میں عرس و سالگرہ سے تشبیہ دیتا ہوں۔ ۳۱ دسمبر کو تو گویا پیر گردوں کا عرس سمجھئے۔ اور یکم جنوری کو گردش روزگار کی سالگرہ ....

ہر سال کا خیر میری نگاہ میں زمانہ کا عرس ہے کہ جس طرح اولیاء اللہ کو کہتے ہیں کہ فنا نہیں۔ ان کا ہماری نظر سے غائب ہونا "وصال" سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سال کا غائب ہونا جزو کل میں مل جانا ہے۔ اسے وصال نہیں تو اور کیا کہئے؟ ورنہ زمانہ وہی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گئے ہوئے زمانہ کو آپ فاتحہ خیر سے یاد کریں کہ حاصل عرس بزرگاں یہی ہے اور گردش روزگار کی سالگرہ منائیں کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے ؎

لو ابتدا سے ہم کہیں اب داستان عشق
آخر شب فراق کو تو انتہا نہیں

اتفاقات زمانہ سے پیر گردوں کی سالگرہ کا دن یہی تھا جو گردش روزگار کی سالگرہ کا دن ہے کہ آغاز عالم میں تمام کائنات ایک ہی وقت "کن فیکون" سے پیدا ہوئی۔ پیر گردوں کی سالگرہ کی

یادگار کہکشاں آسمان پر موجود ہے ؎

دوستانِ رفتہ کی روداد کس سے پوچھئے
بات کے لائق کوئی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

سال گرہ دراصل کوئی عقدۂ لاینحل نہیں۔ حسین وعدہ کی گرہیں خضر کے رشتۂ عمر سے زیادہ لگاتے ہیں۔ گو قطرہ اشک کی شکل گرہ سے زیادہ متشابہ ہے ؎

غفلت شریکِ حال تھی پہلے بھی حسن کے
یوسف کنوئیں میں دیدۂ یوسف میں خواب تھا

پھر بے ثباتی عالم کی مثالیں بیان کر کے مضمون کو ان فقروں پر ختم کرتے ہیں۔
انگریزی میں کسی شاعر کا مضمون ہے کہ حسن اس لئے دلفریب ہے کہ ہماری ہستی کی طرح بے ثبات ہے۔ اور علم کی قدر ہماری نگاہ میں اس لئے ہے کہ اس میں کمال مشکل ہے۔ مرنے کے بعد کسی چیز کو کمال حاصل ہو تو عالم اسباب میں کمال کی قدر نقص سے ہے اور ہنر کی قدر عیب سے۔ بیداری کی قدر غفلت سے اور زندگی کی قدر موت سے بچے جن کھلونوں پر جان دیتے ہیں جوان انھیں پھینک دیتے ہیں۔ اور جوانوں کو جو باتیں عزیز ہیں بوڑھے انھیں فضول سمجھتے ہیں۔
لیکن مجھ سے پوچھئے تو اس عالم کی مختصر سے مختصر زندگی مرنے کے بعد قیامت تک زندہ رہنے سے کہیں اچھی ہے اور اس دار فانی کی الجھن عالمِ بقا کے وعدوں سے جن کے پورا ہونے کا حال معلوم نہیں (آگے کیا عرض کروں)؎

چھوٹی سے چھوٹی رات بھی اچھی ہے وصل کی
چھوٹے سے چھوٹا دن بھی ہے اچھا بہار کا

میر صاحب کے آخری خیال سے آجکل کے انقلاب پسندوں اور مادہ پرست نوجوانوں کو سند ہاتھ آتی ہے۔

۲۔ "خیال بمقابلہ زبان" اس مضمون کے بعض فقرے زبان و خیال کے متعلق اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد میر ناصر علی خاں انگریزی انشاپردازوں کے چند خیالات پیش کرتے ہیں:-

اَور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو۔ آئینہ کو ہم حیراں باندھنے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یونان کے کسی شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے زہرہ کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں۔ جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہیکو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اُس کو دیکھ کر کیا کروں گی؟ جوانی کے بعد جو میری صورت ہو گی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی۔ اب آئینہ کو رکھ کر کیا ہو گا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائے گی۔

ایک کم سن لڑکی جو اب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی صغیر سنی کی شادی میں از روے رسم مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ اور یوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل چکی ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں۔ دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے گڑیوں سے کھیلیں گی۔ شادی کے بعد کھیلنا معلوم۔

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے مگر تیرے ساتھ اگر دخترِ رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے۔

شکاری بھاگتے ہوئے شکار کے پیچھے پیچھے کوہ و بیاباں میں دوڑتے ہیں مگر مارا ہوا جانور مل جائے تو اُس کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ یہ حال عشق ہرجائی کا ہے جو گھر کی پارسا عورت کو چھوڑ کر بازار میں پھرتا ہے۔

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ۔ اس کی آنکھ کھل گئی:۔ وہاں سے اُٹھ کر بھاگا اس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچا لیا۔ ورنہ دب کر مرجاتا۔ آواز آئی کہ ہم نے اس موت سے اس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی تجھے اُس تکلیف کی موت سے سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں۔ دیوار سے دب کر مرنا مرگِ ناگہاں میں سمجھا جاتا۔ تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلاد کے ہاتھ سے مارا جائے۔

ایک بچے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اُٹھائیں۔ ادھر کی کسر اُدھر نکل گئی

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی بھلا میرے ساتھ تو کر۔ کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے؟۔

یہ چند خیال میں نے اہل علم و کمال کی طبع آزمائی کے لیے جمع کر دیے کہ ان پر مضمون لکھیں۔ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں جن سے میں عاری ہوں۔ شعرا اگر وہ ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے۔ میں نے بُری بھلی اُردو میں ان کا مطلب ادا کر دیا اب آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں ؎

کیوں خاک میں ملاتے ہو رفتار ناز سے
مٹی میں لوٹتا ہے دوپٹہ اٹھائیے

خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں۔ اگست ۱۸۶۵ء عیسوی (ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود ایک رباعی میں اپنا نسب بیان کرتے ہیں :-

حمد حق لکھوں گا، نعت نبیؐ لکھوں گا ۔۔۔ وصف سبطین کا، تعریف علی لکھوں گا
زیدی النسل ہوں، سید ہوں، مجھے بھاٹ نہ جان ۔۔۔ مدح غیروں کی نہ لکھی نہ کبھی لکھوں گا

ان کے دادا منصب دار تھے۔ والد میر محسن علی بڑے عالم، درویش صفت بزرگ تھے۔ والدہ بھی علوم ظاہر و باطن میں کامل تھیں۔ میر ناصر نذیر نے خواجہ میر درد کی سوانح عمری "میخانۂ درد" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"میں نے اپنے والدین ماجدین کی صحبت چوالیس سال اٹھائی، اور ان دونوں حضرات نے مجھے ان کمالات ظاہری و باطنی سے، جو وراثۃً خواجہ

؎ ان حالات میں دوسری کتابوں کے علاوہ حضرت فراق کے فرزند ارجمند حکیم سید ناصر خلیق نگار دہلوی کے مضمون مطبوعہ یادگار لاہور (بابت اپریل ۱۹۳۳ء) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

میر درد صاحب سے پہنچے تھے، مالا مال کر دیا۔"

اس فیضان کے علاوہ میر فراق نے فارسی و عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور درس نظامیہ ختم کر کے سند لی۔ پھر فن طب کی طرف توجہ کی۔ پہلے حکیم بدر الدین خاں دہلوی سے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر حکیم محمود خاں دہلوی اور ان کے فرزند اکبر حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں سے طب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

غدر کے بعد میر فراق کے والد اور دادا کو رئیس دھرم پور (ضلع بلند شہر) نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ پھر فراق صاحب کو رئیس نے اپنا طبیب خاص اور اپنے صاحبزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک عرصہ تک ان سے وابستگی رہی۔ اور علاج معالجہ میں خوب شہرت پائی۔ رئیس کے انتقال کے بعد فراق صاحب علی گڈھ کالج کی طرف سے سفیر بن کر بمبئی، بڑودہ، احمد آباد تشریف لے گئے۔ اس تعلق کے ختم ہونے کے بعد اپنے وطن دہلی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اور کوچہ چیلاں بارہ دری خواجہ میر درد میں باقی عمر گذار دی۔

میر فراق صاحب شاعری میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ علامہ آزاد لاہور سے دہلی آئے اور خان بہادر مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ میر فراق کی جوانی کا آغاز تھا۔ درشاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی اور وہ ان کو ساتھ لیکر علامہ آزاد کی خدمت میں گئے۔ یہ غزل لے گئے تھے۔ آزاد کے ارشاد پر غزل سنائی۔ انھوں نے سن کر فرمایا: "ماشاء اللہ،

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بھئی کیوں نہ ہو، آپ حضرت درد کے خاندان سے ہیں اور کلام میں پورا پورا رنگ حضرت درد کا ہے۔ بھلا میں کیا اصلاح دے سکتا ہوں۔"

جب فراق صاحب کے والد نے اصرار کیا تو علامہ آزاد نے فرمایا "اچھا میر صاحب میں بھی دلی میں ایک دوسرا آزاد بنائے دیتا ہوں، جاؤ میاں مٹھائی لے آؤ"۔ چنانچہ فوراً مٹھائی آئی اور آزاد نے ان کی غزل میں اصلاح دی۔ پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

میر ناصر نذیر فراق کے خاندان میں قدیم سے سلسلۂ نقشبندیہ جاری تھا۔ خواجہ میر درد اسی سلسلے کے درویش کامل تھے۔ لیکن میر فراق نے چشتیہ طریقہ میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی قدس سرہٗ کے پوتے حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرا سلوک پورا ہو گیا اور میں اپنے مقصد کو پہنچ گیا۔ مرض الموت میں بھی اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ "تم کو معلوم نہیں ہے۔ میرا پاس انفاس ہر وقت جاری رہتا ہے"۔ بعض رباعیوں میں اپنا مسلک بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

کچھ بھی نہیں یہ نمود - الا اللہ   سب ہیچ ہے تار و پود - الا اللہ
کہتے ہیں فراق جن کے دل روشن ہیں   لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْد الا اللہ

وفات سے ایک مہینہ قبل جنوری ۱۹۳۳ء میں فرما دیا تھا کہ "ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے۔ اور وہ فقیر کیا جو اپنی مرگ سے آگاہی نہ رکھتا ہو"۔ انہی دنوں میں ان کے ایک دوست مزاج پرسی کے لئے آئے، تو ان سے فرمایا "بھائی اب روانگی ہے۔ میں نے یہ شعر اپنے حسب حال کہا ہے"۔

کرے گا اس عالم کی تو سیر کب تک   منائے گی بکرے کی ماں خیر کب تک

چنانچہ دوشنبہ کی شب میں ۱۸ فروری ۱۹۳۳ء (شوال ۱۳۵۱ھ) کو رحلت فرمائی۔

تصانیف اور طرز تحریر | میر ناصر نذیر فراق کی فہرست تصانیف یہ ہے:

۱- **میخانۂ درد** - حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔

۲۔ **دلی کا آخری دیدار** ۔ دہلی دبادشاہ دہلی ۔ اہل شہر واہل قلعہ کی معاشرت رسم ورواج ، اشغال ، میلے ، تہوار ، سب کچھ بیان کیے ہیں ۔

۳۔ **لال قلعہ کی ایک جھلک** ۔ دہلی کے آخری تاجدار ابوظفر بہادر شاہ کے زمانے کا لال قلعہ پورا اس کتاب میں منعکس ہے ۔

۴۔ **دلی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ** مختصر کتاب ہے ۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شاہرخ میرزا کے شکار کھیلنے کے حالات ہیں ۔

۵۔ **بیگموں کی چھیڑ چھاڑ** ۔ ایک شادی کی محفل کا نقشہ ایک بیگم کی زبانی پیش کیا ہے ۔

۶۔ **سات طلاقنوں کی کہانیاں** ۔ سات عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی کہانی کہتی ہیں کہ ان کو کس وجہ سے طلاق ملی ۔

۷۔ **دکن کی پری** ۔ ایک طویل افسانہ ۔

۸۔ **مضامینِ فراق** ۔ مصنف کے افسانوں کا مجموعہ ۔

۹۔ **چار چاند** ۔ مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ ۔

میر ناصر نذیر فراق جس دلی کی خود یادگار رہتے تھے اسی دلی کی یادگار ان کی زبان اور ان کی کتابیں ہیں ۔ انھوں نے کوئی علم وفن کی کتاب نہیں لکھی ۔ ان کا قلمی کارنامہ لطف زبان اور حسن بیان کے ساتھ دہلی کی تہذیب وتمدن کا آخری نمونہ پیش کرتا ہے ان کے طرز تحریر کی داد ان کے ایک ہم پایہ اور ان سے بزرگ ادیب دیتے ہیں ۔ فراق صاحب کے صاحبزادہ نے ان کے حالات میں لکھا ہے ۔

منشی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے ، اور فرمایا ، بھائی صاحب ، کمال کیا ہے ، اتنے چھوٹے سے افسانہ " اختر محل " میں اتنے دلی کے ٹھیٹھ محاورے آپ نے بھر دئے

کہ مجھ کو حیرت ہے۔ میں تو آپ کو سلطانِ زبانِ اردو کہتا ہوں۔ چنانچہ خطوط میں ان کو "سلطان زبان اردو" لکھا کرتے تھے۔

دو ایک نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ ۔ اس مضمون میں سید ناصر نذیر فراق نے دلی میں بیاہ کی ایک محفل جمائی ہے۔

(۱) ایک بیوی کالے محل سے مہمان آئی تھیں۔ ان کا نام تھا حضرت بیگم وہ بڑی اکھل کھری اور مزاج کی بڑی کڑوی تھیں حسن جہاں کی باتیں سُن سُن کر بہت گھٹتی تھیں اور بیٹھی کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔ بی دولتی اپنے تیہے میں آپ ہی آپ گھولتی، کھانا پینا پان چھالیہ، زردہ، الائچی، چٹنی، اچار مُربہ، مٹھائی، ناشتہ، سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔ تیخ تو مخ خالہ جان نے انہیں کُل کُلاں کا مالک کر دیا تھا۔ اس مارے بعض بیوتوفیں اُن سے اور کھسیانی تھیں۔ ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں کا مچیٹہ ہو گیا۔ حضرت بیگم کے دل میں حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں اے بوا رضیہ سلطان سنتی بھی ہو قلعہ کی بیگمیں بلی کو نکٹی کہا کرتی تھیں یہ چھوٹی ناک بھی کیا بُری معلوم ہوتی ہے۔ کمبخت پتا پھرا ہوا اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے جیسے پھیکا شلجم"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی اُن کا ٹپکا پڑتا تھا سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈھالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں کہنے لگیں "پھیکا شلجم تمباکو کے پنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہوتا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے سل کا بٹہ کسی نے چہرے

پر دھر دیا ہے۔ اونچی ناک سو جھے کیا خاک، چھوٹی ناک سُہاگ کا بُڑا اونچی ناک کو لا دُ چھرا" یہ مثل تو تم نے سُنی ہو گی"۔ حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی اُن کی بیڈول اونچی تھی۔ حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں بیگمیں ہنس پڑیں۔ اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہو گئی اور بی حسن جہاں کی اور ان کی خوب دنگو دنگ ہوئی۔

(۲) رات کے بارہ بجے برات آئی۔ سمدھنیں بڑے جلوہ کے ساتھ اُتریں جھڑاں جال کے جوڑے، کمخواب، زری۔ بوٹی پوتھ کی تہ پوشیاں نیچے نیچے کُرتے، ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کُرتہ پہنے آجایا کرتی تھی تو اُس پر تیلن گھوسن کی پھبتیاں اُڑا کرتی تھیں یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی ہے۔ سچ ہے "کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات"۔ سمدھنیں بڑے ٹھسے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھیں۔ شربت پلانے کے لئے بھی ہماری کجلی بسنت بی حسن جہاں اور لنکا مبارک نسار کھڑی ہوئیں۔ مبارک نسار کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی اور اس میں شربت کا شیشہ بلور کی پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال مُنہ پوچھنے کے لئے۔ اللہ کی بندی رومال کا گھسّا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی پھڑک جاتی تھی۔ مُنہ اور باچھیں چھل کر لال ہو جاتی تھیں بعض ملاتن کہدیتی تھیں "اے پھٹکار یہ مُنہ پونچھتی ہو یا کبھی کا بیر نکالتی ہو؟"

آغائی بیگم۔ دولہ کی بہن کا جو مُنہ پونچھا تو رگڑے کے ساتھ اُن کی ناک کی کیل اُلجھ کر ناک میں سے نکل گئی اور ذرہ بیچاری مُنہ پکڑ کر کہنے لگیں

"شاباش بُوا شاباش دیکھت کی تو تم کامنی سی ہو مگر ہاتھ تو ماشاء اللہ لوہے کی میخیں ہیں دیکھو میری ناک کی کیل تمھارے رومال میں اُلجھ کر چلی گئی ہے!"

حسن جہاں بیگم بولیں ہا اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیوں ڈرتی ہو خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپے ڈھیر سارے تمھارے تلڑ میں جائیں گے۔ سمدھن بننا ٹھٹھا ہے ابھی تو مُنہ ہی کھُلوانے میں بولا گئیں جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہوگا کہ کے بیسی کا سا ٹھ ہوتا ہے اور بُوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن گھر سے پہن کر بھی آئی تھیں یا مُفتِ خدا میں مجھے لئے مرتی ہو۔

رومال جھاڑا تو اُس میں سے کیل نہ نکلی۔

آغائی بیگم بھی: اللہ جانتا ہے ہماری کیل ڈھونڈو اُس میں تر ملی جُڑی ہوئی ہے۔

حسن جہاں نے بہن آغائی بیگم تم کیل کے مارے کیوں ہلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمھاری نہ ملے گی تو میں اپنی ہیرے کی کیل تمھیں دیدوں گی۔ مگر تم ذرا ٹھہری رہنے دم تو لو۔

اتفاق کی بات کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی کہنے لگیں "واہ بوا بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا کیل تو آپ چُرائے بیٹھی ہیں اور لوگوں کے اوپر ڈرسے پکڑتی ہیں۔"

اس دور کی نثر پر تبصرہ

۱- یہاں تک جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا یہ سب وہ ہیں جن کی کم سے کم نصف عمر اُنیسویں صدی میں گذری اور جو ختم صدی سے پہلے مستقل مصنف اور انشا پرداز کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ ان میں چند ایسے ہی ممتاز مصنفوں کی کمی بیک نظر معلوم ہوتی ہے مثلاً

(۱) پنڈت رتن ناتھ سرشار
(۲) مولوی عبدالحلیم شرر
(۳) مرزا محمد ہادی رسوا
(۴) منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ

لیکن ان کو بالقصد اس تاریخ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کی سب سے پہلی اور بڑی حیثیت **ناول نگار** کی ہے۔ اگرچہ ناول نویسی کی بنیاد ان سے پہلے پڑ گئی تھی۔ اور ان کے بھی اکثر ناول اُنیسویں صدی ہی کے ہیں۔ لیکن اس فن کا ارتقا بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی طرح ظرافت نگاری عصر حاضر میں کمال کو پہنچی ہے۔ شرر و رسوا، اور سرشار و سجاد حسین **ناول** اور **ظرافت** کے پیش رو ہیں۔ اس حیثیت سے جدید ناول نویسوں اور مزاحیہ نگاروں سے پہلے ان بزرگوں کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ اور اس کے لئے علاحدہ تالیف کی ضرورت ہے۔

۲- جس زمانے تک اس تالیف کو ختم کیا گیا ہے، اس میں تصانیف کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ مصنفوں کے صرف ناموں کا شمار و احاطہ بھی محال ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جن مصنفوں کا ہم نے تذکرہ لکھا ہے، ان سے بہتر اور مشہور تر

کوئی مصنف نہ تھا (بجز مذکورۂ بالا ناول نگاروں کے)۔

۳۔ انیسویں صدی کے آخری ۳۰ سال کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ یہ "**دورِ مشرقیت**" اور "**زمانۂ تصنیف و تالیف**" ہے۔ اور بیسویں صدی **عصرِ مغربیت**" اور "**عہدِ ترجمہ**"۔ سرسید سے پہلے تو اس تفریق کا محل ہی نہ تھا۔ سرسید سے شبلی تک اکثر مصنفوں نے یا کتابیں تصنیف کی ہیں، یا عربی و فارسی سے تالیف۔ انگریزی سے ترجمے بہت کم ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے قانونی ترجموں کو چھوڑ کر، سب سے مشہور مولوی سید علی بلگرامی کے ترجمے ہیں۔ ان کے علاوہ جو ترجمے ہوئے ان کو شہرت اور قبولِ عام حاصل نہ ہوا۔

۴۔ انیسویں صدی کی تصانیف میں مغربی علوم و فنون کا اثر کم، اور انگریزی کے طرزِ ادا، اور جدّتِ اسلوب کا اثر بہت کم ہے۔ سرسید اور ان کے رُفقا نے شبلی تک یورپ کے خیالات سے فائدہ حاصل کیا لیکن بالواسطہ۔ اسی لئے ان کے ہاں یہ رنگ ہلکا ہے۔ ان کے دوسرے معاصرین، مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بلگرامی، جسٹس کرامت حسین، مرزا ہادی رسوا، مولوی عبد الحلیم شرر وغیرہ نے براہ راست یورپ کی زبانوں سے فیض پایا، اس لئے ان کی تصانیف کے موضوع، اسلوب، ترتیب سب میں یہ اثر زیادہ نمایاں ہے۔ (مرزا ہادی رسوا کی خدمات دار الترجمہ اس وقت زیر بحث نہیں ہیں، وہ خالص بیسویں صدی کی چیزیں ہیں۔ ان کا تذکرہ الگ ہوگا)۔

۵۔ پُرانی تعلیم کے زیرِ سایہ اور "نئی روشنی" کی صبح صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیبِ بیان پیدا ہو سکتے تھے، وہ سرسید سے شبلی و شرر تک پیدا ہو گئے۔ اس امر میں سرسید کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ اکیلے سرسید کی تحریر میں، عالمانہ و فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم، ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی،

اپنے اسلوب کے توازن و تناسب، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں، لیکن سرسید کے جوش کی ان میں کمی ہے۔ حالی ان دونوں کے درمیان میں ہیں، اگرچہ جوش ان میں بھی نہیں ہے۔ حالی نے سرسید کی صحت صفائی کو آگے بڑھایا، لیکن حسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ کے موجد و خاتم ہوئے۔ سرشار و سجاد حسین "پنچ" طرز ظرافت کے خداوند تھے۔

بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیب بیان ایجاد ہوئے، اور تقریباً سب انگریزی زبان و علوم سے متاثر ہیں۔ عصر حاضر میں مغربی تعلیم سے اردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا، اور زبان و ادب کی اصلی خدمت ہوئی، وہ یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت، ادب و انشا، تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ، وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہو گئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی، خال خال تھی جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان دو زمانوں (انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں کا ابتدائی زمانہ) کے مصنفوں میں عجیب و دلچسپ فرق یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء و معاصرین کو جو اسلوب پسند تھا، وہ انھوں نے ابتدائے تحریر سے اختیار کر لیا، اور آخر تک اس پر قائم رہے۔ آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی کا انداز و طرز ان کی پہلی تصانیف سے موجود ہے۔ اس کی تکمیل و پختگی میں البتہ کچھ دیر لگی، لیکن اتنی ہی جتنی کسی اسلوب کے ہموار ہونے اور منجھنے میں لگتی ہے۔ برخلاف عصر حاضر کے، کہ اس زمانے کے سب نہیں تو بہت سے مشہور اہل قلم اسلوبوں اور اندازوں کے پیچھے دوڑتے پھرے۔ پھر کہیں مدت کے بعد کوئی روش اختیار کر سکے۔ ابوالکلام آزاد کی ند عالمانہ

شاندار نثر "الہلال" سے شروع ہو کر تفسیر قرآن تک رہی۔ پھر نئی پیڑھی نیاز فتحپوری کی نثر میں شاعری اور ٹیگوریت کچھ عرصہ جاری رہ کر ختم ہوگئی۔ دوسرے نثر میں نثر لکھنے لگے۔ خواجہ حسن نظامی نے زبان میں چٹکلوں کا رنگ پیدا کیا، چٹکیاں لیں، گدگدیاں کیں، لیکن ان کی بھی حد ہو لی۔ ملا رموزی نے اردو کو گلابی رنگ دیا یعنی "گلابی اردو" کے نام سے ملایانہ لفظی ترجمہ کا طرز نکالا، لیکن یہ رنگ پختہ نہ تھا، دھل گیا۔ پھر مزاحیہ شوخ رنگ اختیار کیا۔ اب وہ بھی "دامی" رہ گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے طنزیات میں انفرادی طرز نکالا، شوخی میں ادبیت پیدا کی۔ لفظوں کے معنی اور معنوں کے لفظ ایجاد کئے۔ لیکن یہ اسلوب تھکا دینے والا تھا، چنانچہ تھک کر بیٹھ رہے۔ اس طرح کے تجربات اور الٹ پھیر اور اسالیب و اہل قلم میں بھی ہوئے۔ یہ چند نام مثال کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

ان میں یک رنگی قائم نہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ یہ سب روشیں اصل میں تحریر کی "جوانیاں" تھیں۔ لکھنے والوں کے شباب تک رہیں۔

۶۔ علوم و فنون: اور مضمون و موضوع کے اعتبار سے بھی انیسویں صدی کا آخری دور کامیاب ہے۔ تعداد میں سب سے زیادہ مذہبی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے بعد داستانیں اور ناول، پھر تاریخ و سیرت کا نمبر ہے۔ تذکرہ زبان و ادب دو چار سے زیادہ نہیں۔ تنقید کا صرف آغاز ہوا۔ فلسفہ، سائنس، معاشیات وغیرہ بہت کم ہیں۔ سیاسی تصانیف برائے نام۔ لغات کی کتابیں متعدد لکھی گئیں۔ "فرہنگ آصفیہ" سب سے بڑی جامع تالیف ہے۔

یہ سرمایہ بعد کی تصانیف سے زیادہ وسیع و متنوع نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں بڑی بات یہ تھی کہ مصنف عالم ہوتے تھے۔ فضل و کمال حاصل کرنے سے پہلے مصنف بننا اور شہرت حاصل کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس لئے جس موضوع پر قلم اٹھاتے

سے کمال و تبحّر کے ساتھ لکھتے تھے اور تصنیف کا حق ادا کر دیتے تھے۔ ۔۔
پیشِ نظر نہ تھا، علم و ہنر مقصود تھا۔ اس معیار و مسلک کی اہمیت عام طور پر دلوں میں تھی۔
اس لئے کم استعداد مصنفوں اور فرومایہ تصانیف کو قبولِ عام حاصل نہ ہوتا تھا۔

بیسویں صدی میں یہ بات بدل گئی، لیکن بتدریج بدلی۔ اس زمانے کے دو دَور ہیں۔ یعنی موجودہ صدی کے پہلے ۲۰ سال، اور بعد کے ۲۰ سال۔ پہلے دَور کے مصنف وہ ہیں جن کا شباب انیسویں صدی میں شروع ہوا، اسی صدی میں یا بیسویں کے آغاز میں تعلیم ختم کی، اور پھر میدانِ تصنیف و تالیف میں قدم رکھا۔ ان اہلِ قلم میں قدیم وضع، اخلاق، تعلیم، مذاق کا بہت کچھ اثر تھا اس لئے ان کی تصانیف کا معیار بھی صحیح ہے۔ دوسرے دَور کے مصنف وہ ہیں جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئے یا انیسویں صدی میں صرف پیدا ہوئے تھے۔ باقی ہر نشو و نما بیسویں صدی میں پایا۔ یہ زمانہ انقلاب در انقلاب اور پوری کایا پلٹ کا دَور ہے۔ معاشرت، اخلاق، تعلیم، مذاق سب بدل گئے، اور بدل رہے ہیں۔ آجکل دُنیا چل نہیں رہی، بلکہ دوڑ رہی ہے۔ ہر کام میں عجلت بہت ہے، ذمہ داری کا احساس کم ہے، اور پروا بالکل نہیں۔ "کسبِ کمال" سے پہلے "عزیزِ جہاں" بننے کی دُھن ہے۔ پھر شہرت کے ذرائع آسان اور بے شمار ہیں۔ انہی اسباب کا نتیجہ آجکل کا اکثر لٹریچر ہے۔

عصرِ حاضر کے مصنفوں میں جو لوگ فطری صلاحیت اور ذوقِ سلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم، ذہنی تربیت اور با اصول علمی تحقیق سے فیض یاب ہیں، وہی ٹھوس اور اصلی کام کر رہے ہیں۔ باقی، جہانِ علم و ادب کے "حشرات الارض" ہیں، اور ہر زمانے سے زیادہ ہمارے زمانے میں ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ (بقولِ اکبر الہ آبادی) "جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے"۔ ان بزرگ عالموں اور ادیبوں کی تصانیف عصرِ حاضر کی غیر فانی دولت ہے، اور ان کی رہنمائی

نئے مصنف و انشا پرداز پیدا ہو رہے ہیں۔

۷۔ بیسویں صدی کا یہ زمانہ زیرِ تبصرہ اخبارات و رسائل کے لحاظ سے بھی گراں مایہ ہے۔ اودھ اخبار لکھنؤ، اخبارِ عام لاہور، پیسہ اخبار لاہور، اودھ پنچ لکھنؤ، آگرہ اخبار، ریاض الاخبار گورکھپور، دبدبۂ سکندری رامپور، وکیل امرتسر، وطن لاہور، البشیر اٹاوہ، نیر اعظم مراد آباد، ہندوستانی لکھنؤ، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، مشیر دکن وغیرہ اپنے اور اپنے زمانے کے رنگ میں نہایت پختہ تھے۔ ان سب نے زبان کی خدمت اور ملک کی قیادت زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے بہت اچھے بہتر کی۔ اگلے زمانے میں سیاسی رائے آزاد و بیباک نہ تھی پھر بھی ان اخباروں کا لہجہ حسبِ موقع نرم و گرم رہا۔ اخبارات مذکورہ میں سے بجز وکیل اور وطن اور ہندوستانی کے سب ابتک جاری ہیں۔ اودھ اخبار کی عمر ۷۰ سال کی ہے۔ بعض کی ۶۰ سے زیادہ۔ ۴۰ سال سے کم کسی کی نہیں۔ ماہوار رسائل بھی اس دور میں اعلیٰ پایہ کے تھے۔ تہذیب الاخلاق (بادارت سرسید) سب کا پیشرو اور سب سے بہتر تھا۔ دلگداز لکھنؤ (بادارت شرر لکھنوی) ادب و تاریخ میں اپنے رنگ کا موجد تھا۔ ان دو رسالوں نے فنِ مقالہ نگاری کے ارتقا میں سب سے زیادہ مدد دی۔ ادب و انشا اور فکر و تخیل کو تھوڑے دنوں میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ پیام یار لکھنؤ (بادارت منشی نثار حسین) نے شعر و غزل کا جو صحیح معیار اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا وہ اپنی نوع میں منفرد تھا۔ مرقع عالم ہردوئی (بادارت حکیم محمد علی)، حسن حیدرآباد، معارف علی گڑھ (بادارت مولوی وحید الدین سلیم) اپنی علمی و ادبی خدمات میں نہایت وقیع و ممتاز تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مخزن لاہور (بادارت شیخ عبد القادر بیرسٹر)، زمانہ کانپور (بادارت منشی دیا نرائن نگم)، اردوئے معلیٰ (بادارت حسرت موہانی) اور ان کے کچھ بعد دکن ریویو (بادارت ظفر علی خاں)، الناظر لکھنؤ (بادارت ظفر الملک علوی) اور نقاد آگرہ (بادارت شاہ دلگیر) نے اگلوں کی جگہ لے لی، ان کے نقشِ قدم پر چلے اور ان کی "موجِ خرامِ ناز" عجب گل کتر گئی، جن کی خوشبو سے آج تک مشامِ ادب معطر ہے۔ ان میں سے آج صرف ایک زمانہ کانپور زندہ ہے (زندہ باد!) اور ۴۰ برس سے زبان، ادب اور ملک کی خدمت نہایت

سلامت روی اور وضعداری کے ساتھ کر رہا ہے۔ الہلال کلکتہ (ادارت ابوالکلام آزاد) اخبار و رسالہ کی درمیانی جنس یعنی ما ہوار مجلہ تھا جس کی وضع، معیار، ادبیت، صحافت، سب کی تعریف میں ایک لفظ "شاندار" کافی ہے۔ یہ چند نام لئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی قابل قدر رسالے جاری اور بند ہوتے رہے۔

بیسویں صدی کا موجودہ دَوْر اخبار و رسائل میں دَوْر سابق سے کم رتبہ نہیں ہے لیکن اس اعتبار سے بھی ان دونوں زمانوں میں وہی فرق ہے جو تصانیف کے سلسلے میں بیان کیا گیا۔ اگلے زمانہ کے رسالوں کا معیار اور مذاق صحیح، پختہ اور ہموار تھا۔ جن رسائل کا نام لیا گیا، ان میں جو مضمون شائع ہوتا تھا، اعلیٰ یا اوسط درجہ کا ہوتا تھا۔ ادنیٰ درجہ کا کوئی نہ تھا۔ اب یہ امتیاز اٹھ گیا ہے۔ اکثر رسائل کی اکثر اشاعتوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ مضامین پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں۔ آج کل بقول ایک ایڈیٹر کے "سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے"۔ سب میں بازاری و عوام بھی ہیں۔ نوجوان طالب علم بھی، آزادخیال و انقلاب پسند بھی، پرانے استاد بھی، بوڑھے فلسفی بھی، عالم و ادیب بھی۔ گویا "از شمار افزوں خداوندانِ او"۔ اس کا نتیجہ ہے کہ "شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا"۔ صرف گنتی کے چند رسائل صحیح اصول اور اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، اور انھیں سے "مجلہ نگاری" کی لاج قائم ہے۔

آجکل کے اخبارات کا بھی یہی حال ہے۔ اس صدی کے پہلے پندرہ بیس سال میں بعض روزانہ اخبار ایسے جاری ہوئے جن کو زبان و ادب کا معیار بھی ملحوظ تھا۔ ان میں اوّل و افضل "زمیندار" تھا۔ مولوی ظفر علی خاں نے زمیندار میں ادارت و صحافت کی جو خوبیاں اور جدتیں پیدا کیں، وہ انھیں کی "اوّلیات" تھیں۔ بعد کے سب روزنامے ان کے ناقل و متبع ہوئے۔ ادبیت اور صحیح ادارت میں سید جالب دہلوی (اڈیٹر روزانہ ہمدم لکھنو) قاضی عبدالغفار مرادآبادی (اڈیٹر روزانہ جمہور و صباح کلکتہ) مولانا محمد علی (اڈیٹر روزانہ ہمدرد دہلی) کی خدمات بھی ممتاز ہیں۔ سید جالب ان سب سے کہن سال و کہنہ مشق اڈیٹر تھے۔ اب وہ اور محمد علی مرحوم ہو گئے۔ ظفر علی خاں ادارت سے دستکش ہیں، لیکن قاضی صاحب حیدرآباد میں ادارت و صحافت کی رہبری کر رہے ہیں۔

ان کے بعد حال کے پندرہ بیس برس میں جو اخبار جاری ہوے، ان کی نظر میں سیاسی جد وجہد تمام تر لازم ملانت پر مقدم ہے۔ پھر بھی اچھے اخبارات سے زمانہ خالی نہیں ہے۔

۸۔ مطابع کے حق میں پوری انیسویں صدی گویا اجارہ دار تھی۔ دہلی، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، لاہور میں جس کثرت سے اور جیسے بڑے اور اچھے چھاپہ خانے قائم ہوے، ان کا نظیر بیسویں صدی اب تک پیدا نہیں کر سکی۔ بلکہ انھیں میں سے بہت سے مطابع بیسویں صدی کی طباعت میں بھی معقول حصہ دار ہیں۔ ان میں **مطبع نولکشور** سب سے ممتاز ہے۔ منشی نولکشور سی۔ آئی۔ ای کے حسنِ نیت، خلوصِ ارادت، ذوقِ علم، شوقِ خدمت نے جو احسان کیا ہے اس سے ملک و زبان اور علم و فن کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ مطابع مجتبائی، مصطفائی، مجیدی، انتظامی، نامی، مفید عام، آگرہ اخبار وغیرہ کی خدمات و احسانات بھی کچھ کم گراں قدر نہیں ہیں۔

بیسویں صدی نے طباعت میں جو حسن و خوبی پیدا کی ہے، وہ بلاشبہہ نہایت دلکش و شاندار ہے۔ اس زمانے کے نئے مطابع شمار و حصار سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہی امتیاز کارفرما ہے کہ اگلے زمانے والے نفع سے زیادہ خدمتِ علم و فن مدنظر رکھتے تھے، اور اب تجارت پہلے ہے، باقی سب کچھ پیچھے۔

۹۔ انیسویں صدی کی علمی انجمنوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ صدی کے آخر میں ان کے علاوہ ایک اور ممتاز انجمن یا ادارۂ تصنیف و تالیف قائم ہوا، یعنی حیدرآباد میں مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں، جس کی مطبوعات "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان میں علامہ شبلی کی بھی بعض تصانیف شامل تھیں۔ ان کے حالات میں چند بار اس سلسلے کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقی اردو قائم ہوئی۔ اس کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی آگیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی نگرانی میں اردو علم و ادب کی خدمت کر رہی ہے۔ تالیفات و تراجم کے علاوہ دو بلند پایہ سہ ماہی رسالے، "اردو" اور "سائنس" اور ایک پندرہ روزہ پرچہ "ہماری زبان" اس کے اہتمام میں جاری ہیں۔ یہ انجمن اپنے

معتمد و سکرٹری کی طرح حرفِ مُشدّد کا خواص رکھتی ہے کہ ہماری تقسیم اَدوار کے لحاظ سے اس کا آغاز ہمارے اس دائرۂ تبصرہ کے اندر رہے، اور اس کی ترقیاں زمانۂ بعد (بیسویں کے دوسرے ۲۰ سال) سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس کا باقی تبصرہ "داستان تاریخ ار کے دوسرے حصے کے لئے رکھا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی خصوصیت جس میں "حیاتِ اردو" کا کوئی زمانہ مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کے عظیم الشان ادارے، مکتبے اور انجمنیں ہیں۔ (۱) دارالاشاعت پنجاب (۲) انجمن ترقی اردو (۳) دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ (۴) مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔ (۵) دارالترجمہ دولت آصفیہ دکن، (۶) ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد (سب سے ممتاز اور وسیع ہیں۔ ان کے علاوہ دہلی، لکھنو، الہ آباد، لاہور، حیدرآباد وغیرہ مقامات پر چھوٹے ادارے بھی بڑے کام کر رہے ہیں۔ یہ سب مل کر اردو زبان اور لٹریچر کی ترقی، وسعت اور جامعیت کی جو کوشش کر رہے ہیں، ایسی ہندوستان میں کسی دوسری زبان کے لئے نہیں ہو رہی۔ بلکہ عرب و مصر ایران بھی اپنی اپنی زبانوں کے لئے اس سے بہتر خدمت کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔

یہ تصنیفی حیثیت کا ذکر تھا، اسی کا لاحقہ ان سب اداروں کی "تجارتی" حیثیت اور خدمت ہے۔ اس خصوصیت میں ان کے علاوہ اور بہت سی بُک ایجنسیاں "بُک ڈپو"، مکتبے، کتاب گھر اور کتبستان شامل ہیں۔ یہ بجائے خود اس قدر اہم اور ضروری ہیں کہ ان کے بغیر اشاعت دشوار تھی اور تصنیف و تالیف بیکار۔

انیسویں صدی میں یہ شُعبے بہت کم تھے۔ اور ایسے وسیع و جامع نہ تھے۔ اس زمانے کے مطابع اپنی اپنی مطبوعات فروخت کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے علی گڈھ کالج میں بُک ڈپو قائم ہوا جس نے مطبوعاتِ غیر کی فروخت کا بھی انتظام کیا۔

۱۰۔ اس تبصرے میں داستان تاریخ اردو کے آخری دَور کا تذکرہ مقصود اصلی تھا، صرف موازنہ کی غرض سے زمانۂ حال کا مختصر حوالہ آگیا ہے کہ "اول بآخر نسبتے دارد"۔

تمام شد

کتبہٗ محمد حفیظ الدین الدہلوی

مولانا حامد حسن قادری کی دوسری تصانیف

۱۔ باغبان ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" کا اردو ترجمہ۔ مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی کلکتہ قیمت ۱۲ آنے

۲۔ کمال داغ حضرت داغ دہلوی کے چاروں دیوان (گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ) کا بہترین انتخاب مع مقدمۂ تنقیدی۔ مقدمہ میں اردو غزل گوئی اور داغ کی شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ قیمت مجلد ۱ روپیہ

۳۔ تاریخ و تنقید ادبیات اردو تاریخ ادب اردو اور تنقید کے متعلق بہترین مقدمین۔ عام شائقین کے علاوہ یونیورسٹیوں اور آئی سی ایس کے امتحانات کے لئے نہایت کارآمد ہے۔ مطبوعہ لکشمی نرائن اگروال پبلشر آگرہ۔ قیمت مجلد ۱ روپیہ

۴۔ تاریخ مرثیہ گوئی اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ۔ مشاہیر مرثیہ کا تذکرہ، مرثیہ کا ارتقاء، انیس و دبیر کے محاسن و خصوصیات، دونوں کی ترجیح کے مسئلہ پر بحث اور فیصلہ۔ مطبوعہ گیا پرشاد اینڈ سنز پبلشرز آگرہ قیمت ۲ روپے

۵۔ شاہکار انیس میر انیس لکھنوی کا ایک مرثیہ محشی۔ مع تاریخ مرثیہ گوئی قیمت ۱ روپیہ

۶۔ الکحل اور زندگی شراب خواری کے نقصانات کے متعلق ایک انگریزی تالیف کا ترجمہ۔ مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی کلکتہ قیمت ۱۲ آنے

۷۔ تربیتِ اطفال بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اصول۔ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ۔ مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ قیمت ۴ آنے